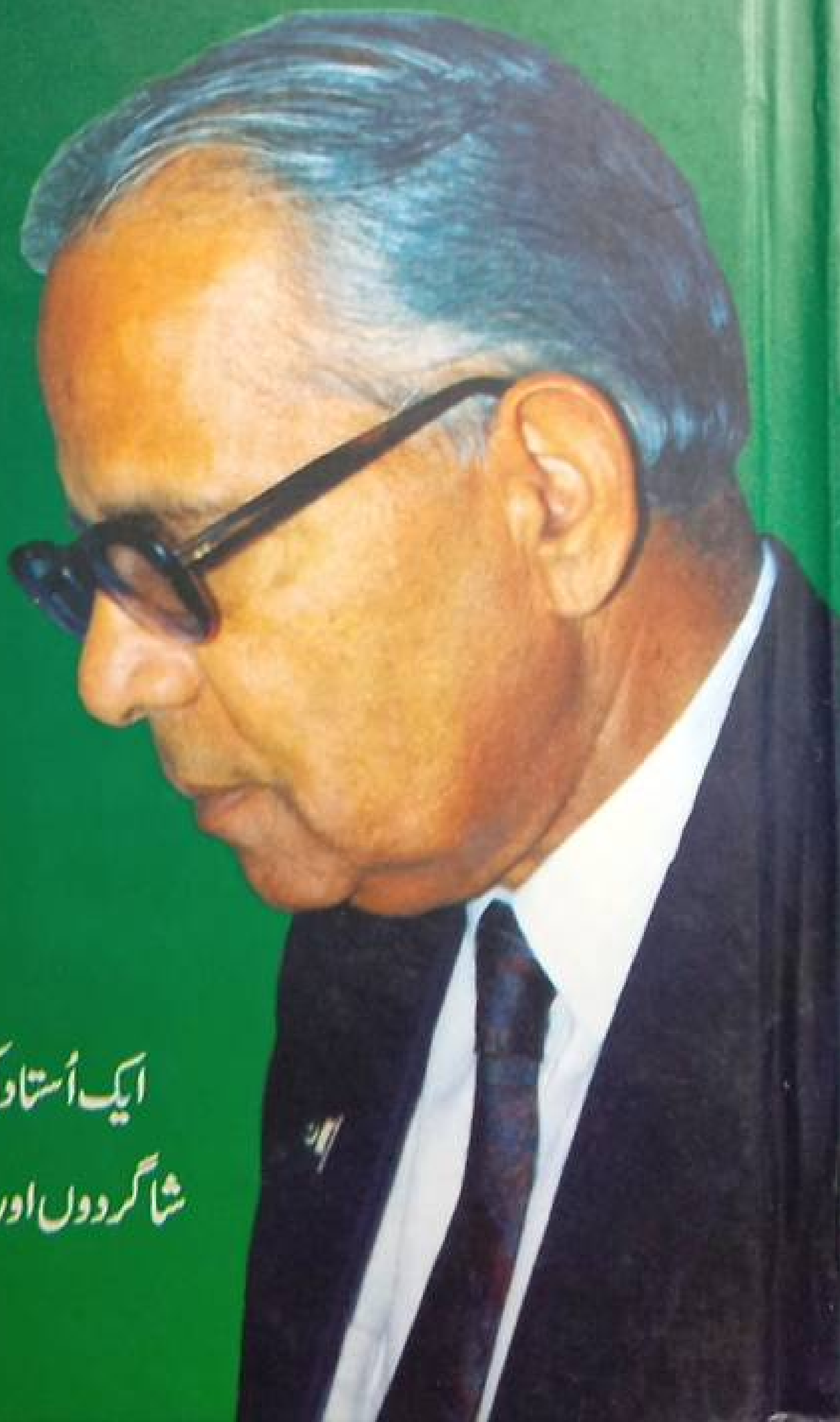
آندھی میں چراغ



ایک اُستاد کی داستانِ حیات

شاگردوں اور رفقائے کار کی زبانی

پروفیسر سعید راشد

آندھی میں چراغ

ایک استاد کی داستانِ حیات

شاگردوں اور رفقائے کار کی زبانی

عالمگیرینز ایسوسی ایشن

نام کتاب: آندھی میں چراغ

اشاعت: اگست، 2012ء

اہتمام: عالمگیرین ایسوسی ایشن

قیمت:

ناشر:

سرِ ورق: اسداللہ خٹک

ملنے کا پتہ: ملٹری کالج جہلم، سرائے عالمگیر

مطبع: اظہار سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

رفقائے کار

انٹرویوز

بیگم سعیدراشد

راشدنامہ

پیش لفظ

سعید راشد، ایک عظیم معلم و مربی

''آندھی میں چراغ''............ایک طرح سے بائیوگرافی ہے جو شاگردوں اور رفقائے کار نے ایک زیرک استاد کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کتاب کے مضامین، ایسے متنوع تاثرات کے باوجود، راشد صاحب کی زندگی اور شخصیت کے ایسے دریچے وا کرتے ہیں جو آگہی کا خزینہ بھی ہیں اور راہنمائی کا سامان بھی۔ پاکستانیت کا فروغ، طلبہ کی ذہنی و روحانی تربیت، پروفیشن سے مکمل لگن، جہد پیہم کا جذبہ، قومی سوچ بیدار کرنے کی سعی مسلسل، تخلیقی اندازِ فکر، تحقیقی اپروچ، مشن اور ادارے سے جذباتی وابستگی...........یہی وہ روشنی کی کرنیں ہیں جو پاکستان کے گوشے گوشے میں ان کے نام کی عظمت کو زندہ و جاوید رکھے ہوئے ہیں۔

میں نے ذاتی طور پر راشد صاحب سے بہت Inspiration لی ہے۔ ذاتی مسائل، انکے کام کی کوالٹی پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے۔ ایسی خوش وضع شخصیت کہ ان کا دل بھی ان کے پیرہن کی طرح باصفا رہا۔ دنیاوی حرص وہوس کی آلائشیں نہ کبھی ان کے مشن کے راستے میں حائل ہوئیں اور نہ ان کی انصاف پسندی کو مات دے سکیں۔ ان کی ذات، شخصیت اور پروفیشن کے بارے میں یہ کتاب ایک سوانح عمری بھی ہے، عقیدت مندوں کے دل کی آواز بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ایک معلم کی زندگی کے "راہنما اصول" بھی ہیں، جن سے بے حد استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

دعا گو ہوں کہ سعید راشد صاحب کی شخصیت پر لکھی جانے والی یہ کتاب قبول خاص و عام حاصل کرے اور دنیائے علم و ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے۔ (آمین)

جنرل اشفاق پرویز کیانی
چیف آف آرمی سٹاف
کالج نمبر 2828
(1964-1968ء)

تقریظ

سعید راشد۔۔۔عظیم انسان ، بہترین استاد

میں نے اپنی تعلیمی زندگی کا جو وقت ملٹری کالج جہلم جیسی مادرِ علمی کی آغوش محبت میں گذارا اس کا اثر ساری زندگی محسوس کیا۔ یہ وہ مرحلہء عمر تھا جس میں ایک بچے کی روحانی، ذہنی اور نفسیاتی پرورش و پرداخت کے لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس دوران جو کچھ بھی ہمارے دل و دماغ پر ثبت ہوتا ہے امر ہو جاتا ہے اور میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں اپنے اساتذہ کرام کو جنہوں نے اس معاملے میں کوئی فروگذاشت نہ آنے دی اور ہمارا اس طرح سے خیال رکھا کہ والدین کی کمی تک بھی محسوس نہ ہونے دی۔ ان قابلِ ذکر اور قابلِ قدر اساتذہ کرام میں عین الدین علوی صاحب، ایف۔ ایچ حیدری صاحب ،سعید راشد صاحب سمیت کئی اور روشن ستارے شامل ہیں کہ جن کی چمک آج بھی میرے ذہن و دل کو خیرہ کر دیتی ہے۔

سعید راشد صاحب کے بارے میں کچھ بھی لکھنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس سوچ میں مستغرق ہوں کہ علم و ادب کے پیکر، خوبی و کمال کے مجسمہ اور سیرت و کردار کے اس مرقع کو کن الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کروں۔ ایک طرف ذخیرہءِ الفاظ کی عاجزی کا احساس دامن گیر ہے تو دوسری طرف دریا کو کوزے میں بند کرنے کے ہنر سے بھی مطلقاً نابلد ہوں۔

ایک استاد کے کندھوں پر نسل نو کی تربیت، تعمیر کردار اور شخصیت کے نکھار کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے یہ ذمہ داری وہی استاد بہ طریقِ احسن سرانجام دے سکتا ہے جو کردار کا سچا، بات کا کھرا اور کام کا مخلص ہو اور محترم سعید راشد میں یہ تمام خوبیاں بدرجہء اتم موجود تھیں۔ کمرۂ جماعت ہو یا اس سے باہر وہ ہر جگہ ہمارے لیے معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ طلبہ کی کردار سازی پر انہوں نے ہمیشہ بہت زور دیا اور اس پر بھرپور توجہ دی۔ جماعت کے نسبتاً کمزور طلبہ ان کی خصوصی توجہ اور شفقت کے حامل رہے۔ وہ اکثر ہم سے کہتے تھے ''کہ مجھے زیادہ فکر ان بچوں کی ہے جنہیں اپنے مستقبل کا خیال نہیں ہے''۔ وہ کیڈٹس سے اس طرح ملتے کہ ہر کیڈٹ انہیں اپنا مربی و مہربان سمجھتا۔ اسی خوبی کی بنا پر ہم اپنا ہر مسئلہ ان کے پاس بلا

جھجک لے جاتے اور وہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کو حل فرماتے۔

آپ مسلمانوں کی تاریخی درسگاہ علی گڑھ کے چشمۂ علم سے سیراب ہونے والے اصحاب میں سے تھے۔ اور اپنی نشست و برخاست، خوش مزاجی وخوش لباسی سے اس پر مہر تصدیق ثبت کرتے تھے۔ آپ اچھے استاد ہونے کی ساتھ ساتھ بہترین منتظم بھی تھے۔ بطور ہاؤس ماسٹر اپنے ہاؤس کے تمام معاملات میں ہر دم سرگرمِ عمل رہتے تھے۔ غرضیکہ میں ان کی کس کس خوبی کو بیان کروں۔ بس ان کے لیے اتنا ہی کہوں گا کہ بظاہر منحنی اور کمزورصحت کے حامل شخص کے اندر ارادے کا مضبوط اور نہایت مستقل مزاج انسان چھپا بیٹھا تھا۔

میں اپنے آپ کو باقی ہم جماعت طلبہ کی نسبت زیادہ خوش قسمت اس لیے گردانتا ہوں کہ میں نے اُن کی نسبت سعید راشد صاحب کے سایہء شفقت میں زیادہ وقت گزارا۔ ملٹری کالج جہلم میں بطور کمانڈانٹ تعیناتی پر جن اصحاب نے مبارک باد دی آپ ان میں سرِ فہرست تھے۔ اس وقت بھی آپ نے میرا حوصلہ بڑھایا اور کارآمد مشوروں سے میری معاونت فرمائی۔ مبارک دیتے ہوئے لکھا ''یاد رکھو جتنا بڑا امتحان اتنا بڑا انعام''۔ اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ملاقات کے مواقع میسر آتے رہے، فون پر بھی رابطہ رہا اور ہر بار اُن سے بات کر کے مجھے حوصلہ ملا۔ ان کی بیماری کے دوران مسلسل رابطہ، وفات پر نمازِ جنازہ میں شرکت، کالج بلاک کو ان کے نام سے منسوب کرنا، انکی تحریر شدہ کالج History اور اب موجودہ کتاب کی اشاعت میں اپنا حقیر کردار ادا کرنے کے مواقع ملنا میرے لیے باعث فخر وسعادت ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سعید راشد جیسے استاد کا میسر ہونا نصیب کی ہی نہیں بلکہ بہت ہی اعزاز کی بات ہے۔ اگر ملکِ عزیز کے ہر تعلیمی ادارے کو سعید راشد صاحب جیسے اساتذہ میسر ہوں تو وہ دن دور نہیں کہ ایک مضبوط کردار اور قوتِ ارادی کا حامل پاکستانی معاشرہ وجود میں آجائے۔ کیونکہ کردار کی تعمیر اساتذہ کی ہی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ رب تعالیٰ آپ کو غریقِ رحمت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

آمین

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

بریگیڈیئر (ر) محمد افضل ملک (ستارہ امتیاز ملٹری)
کمانڈانٹ ملٹری کالج جہلم

حرفِ چند

"آندھی میں چراغ" آپ کے ہاتھ میں ہے۔ 1927ء میں بریلی میں شروع ہونے والا سفر، علی گڑھ یونیورسٹی سے ہوتا ہوا 1950ء میں اپنے پہلے پڑاؤ پر ملٹری کالج تک پہنچا اور مسلسل چالیس سال نسل درنسل پاکستان کے معماروں کی آبیاری کرنے کے بعد 1999ء میں اپنی آخری منزل پر پہنچا اور ایک لحاظ سے اختتام پذیر ہوا۔ مگر یہ سفر شاید بلکہ یقیناً نہ اپنی آخری منزل تک پہنچا ہے نہ ختم ہوا ہے۔ کسی استاد کے اثرات کب تک اور کہاں تک پہنچتے ہیں، یہ کہنا ناممکن ہے اور ایک ایسا استاد جس نے اپنی زندگی کے تجربات کتابوں اور انسانوں کی صورت میں رقم کر دیئے ہوں تو یہ کہنا بجا ہوگا کہ اس کی زندگی کے آدرش، مقاصد اور قدریں ہمیشہ نہیں تو کم ازکم ایک طویل عرصہ تک ضرور محسوس کی جاتی رہیں گی۔

"آندھی میں چراغ" کسی ایک شخص کی داستان حیات نہیں، یہ ایک شخصیت کا عکس ہے۔ یہ کچھ قدروں کا پرتو ہے۔ یہ ان خوابوں کا عملی اظہار ہے جن کو لے کر پاکستان کی تشکیل ہوئی اور تعمیر کی ابتدا کی گئی۔ اس کتاب کے مندرجات کہنے کو تو ایک فردِ واحد کے حوالے سے کچھ واقعات کو، کچھ یادوں کو، تاثرات کو صفحہ قرطاس پر لا رہے ہیں لیکن دراصل یہ ہر اس استاد کی متاع حیات ہے جس نے پاکستان سے محبت کی ہے۔ یہ ہر اس استاد کی سعی مسلسل کا اعتراف ہے جس نے اپنا ہر دن، ہر لمحہ اپنے شاگردوں کی ذہنی نشو ونما اور کردار سازی کے لئے وقف کر دیا۔

ابا کی پہلی اور آخری محبت پاکستان تھا اور پھر جو کچھ تھا یہی تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کو پاکستانیت کے حوالے سے ہی جانا، سمجھا اور بسر کیا، انھوں نے علی گڑھ کے ایک صاحب علم اور صاحب نظر استاد کی بات کو جز جاں بنالیا کہ پاکستان کو افسروں کی نہیں، استادوں کی ضرورت ہوگی، اور پھر اگلے 49 سال ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ صرف پاکستانیت کے فروغ کے لئے ہی وقف ہو گیا۔ ان کا طریقہ تعلیم عملی تھا اور وہ جن قدروں کو، جن رویوں کو پاکستان کی آئندہ نسلوں میں دیکھنا چاہتے تھے انہوں نے اپنی زندگی کو انہیں قدروں اور رویوں کی عملی تفسیر بنا دیا کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ "Character is caught,

"not taught" ''آندھی میں چراغ'' پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ خود کیجئے گا کہ وہ اس کاوش میں کتنے کامیاب رہے۔

"آندھی میں چراغ " کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ یہ "چراغوں کی قطار" کا دوسرا حصہ ہے۔ ملٹری کالج جہلم کی تاریخ "داستاں علم وعمل" کے لئے 80 کی دہائی میں جب مواد اکٹھا کیا جا رہا تھا تو بہت سے عالمگیریز نے اپنے اساتذہ کرام کو بھی یاد کیا۔ چونکہ ان یادوں کو تاریخ کا حصہ بنانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے "چراغوں کی قطار" تالیف کی گئی۔ جس میں ان تمام شخصیات کا ذکر تھا جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں اپنے شاگردوں کی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ یہاں مسئلہ یہ اٹھا کہ بہت سے اولڈ بوائز نے ابا کے بارے میں بھی لکھا جس کو "چراغوں کی قطار" میں شامل کرنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ابا کے اپنے بارے میں تمام write ups کو محفوظ کر لیا گیا۔ اور انھیں باقاعدہ شکل دے کر "آندھی میں چراغ" کا عنوان دیا گیا۔ اس سلسلے میں 'ادارہ تحریر' تشکیل دیا گیا جس میں ڈاکٹر سرفراز مرزا، لیفٹیننٹ کرنل سلطان حیدر بجنوری، اصغر علی خان، سلیم اختر کیانی اور بریگیڈیر مقصود الحسن شامل تھے۔ اس کتاب کا زیادہ تر کام 1990ء تک مکمل ہو چکا تھا لیکن اس کی اشاعت، ابا کی اپنی خواہش پر موخر کر دی گئی۔ انھوں نے اس تالیف کا مسودہ 'ادارہ تحریر' کے حوالے کرتے ہوئے اس کے وقت اشاعت کا تعین بھی اولڈ بوائز پر چھوڑ دیا۔ 1999ء میں ابا کی وفات کے فوراً بعد کالج میں ایک Reference منعقد کیا گیا اور اسی حوالے سے "راشد نامہ "مرتب کیا گیا جس میں ان کے شاگردوں، رفقاء اور اہل خانہ کی چند تحریریں شامل تھیں۔ گزشتہ آٹھ نو سال کے عرصہ میں "سعید راشد ٹرسٹ" کے تحت چند دوسری کتابیں تو منظر عام پر آئیں لیکن "آندھی میں چراغ" کی طباعت مختلف وجوہ کی بنا پر ملتوی ہوتی رہی۔ گزشتہ سال کرنل بجنوری کی پیش قدمی پر Alamgirians' Association Executive Committee نے اصولی طور پر اس کی طباعت کا فیصلہ کیا۔ میری درخواست پر بریگیڈیر مقصود الحسن نے معاملہ آگے بڑھایا۔ میں پوری سچائی کے ساتھ یہ ریکارڈ پر لانا چاہوں گا کہ ان کی ذاتی توجہ اور مسلسل عملی مساعی کے بغیر یہ کتاب موجودہ صورت میں طبع ہونا ممکن نہ تھی۔ کتاب کی ترتیب و تالیف کے حوالے سے میں خصوصی طور پر یوسف عالمگیرین کی معاونت کے لئے ان کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ میں محترم اصغر علی خان سمیت اپنے مرحوم استاد کے حوالے سے اس بے لوث خدمت کی جزاء تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ !Thank you very much, sir

ان تمام محترم اولڈ بوائز کا تہہ دل سے مشکور وممنون ہوں جنہوں نے اس تالیف کے لئے اپنی یادیں قلم بند کیں۔ کتاب کی ترتیب کالج نمبر کے اعتبار سے رکھی گئی اور چونکہ یہ تحریریں اسی کی دہائی کے آخری سالوں

میں جمع کر دی گئی تھیں اس لئے لکھنے والوں کے رینکس اور عہدے، اسی دور کے برقرار رکھے گئے ہیں۔اس کے علاوہ "راشد نامہ" کے کچھ حصوں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ 1997ء میں ریڈیو سے نشر ہونے والا ایک انٹرویو بھی شامل اشاعت ہے جو یقیناً اولڈ بوائز کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

آخر میں قارئین سے یہ بھی درخواست ہے کہ اگر وہ ابا کے بارے میں مزید کچھ یادیں شیئر کرنا چاہیں تو یہ ہمارے لئے بے حد خوشی کا باعث ہوگا۔

اپنی دعاؤں میں یاد رکھیئے گا۔

آصف سعید راشد

کالج نمبر DS-63 (1983-88)

asf_349@hotmail.com

راولپنڈی

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد کیانی (ستارہ جرأت)

(کالج نمبر 752، زمانہ تعلیم 1938-1943ء)

راشد صاحب سے میں نے باقاعدہ کلاس روم میں تو نہیں پڑھا کہ جس طرح میرے بیٹے طارق، بھتیجوں نثار، مشتاق، ظہور اور بھانجے واجد نے پڑھا ہے۔ لیکن کالج سے تعلق اور بچوں کے واسطے اور ان تعلقات کی وجہ سے جو عالمگیرین ایسوسی ایشن کے حوالے سے ان سے بیس سال سے قائم ہیں، میں ان کو اپنا استاد سمجھتا ہوں اور اس رشتہ پر فخر کرتا ہوں۔

1967-68ء میں جب میرا بیٹا طارق رشید راشد صاحب کے شیر شاہ ہاؤس میں تھا تو میں نے انھیں ہاؤس میں کام کرتے دیکھا۔ میرا واسطہ اپنے زمانے میں بڑے بڑے ہاؤس ماسٹروں سے پڑ چکا تھا لیکن راشد صاحب نے اپنی بیگم کو ساتھ ملا کر جس طرح ہاؤس ماسٹری کی، میں سمجھتا ہوں پاکستان میں پبلک سکول ایجوکیشن کی تاریخ میں ایک نئے تجربہ اور کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کے فلسفہ اور طریق کار کو تاریخ میں محفوظ کر لیا جائے۔

اکتوبر 1968ء کی ری یونین کا وہ منظر نا قابل فراموش تھا جب رات کے فنکشن پر اولڈ بوائز نے راشد صاحب کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور سمی کی تال پر دھمال ڈال رہے تھے۔ راشد صاحب سے اس وقت تک میں زیادہ واقف نہ تھا لیکن جس طرح اولڈ بوائز نے ان کی پذیرائی کی، اس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے کچھ ٹھوس کام کیا ہوا ہے۔ اس لئے کہ شاگرد کی نظر لائق استاد کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتی اور اس کا دل اس کی قدر کرنے میں دیر نہیں لگاتا۔

راشد صاحب کے قومی جنون کی پہلی علامت 1978ء میں اس وقت نمودار ہوئی جب انھوں نے بیٹھے بٹھائے خود ہی بغیر کسی کے کہے یا سرپرستی کے "تذکرہ شہدا" پر کام کرنا شروع کر دیا۔ میرا تعلق چونکہ حق نواز کیانی شہید اور مشتاق شہید دونوں سے بہت قریبی تھا اس لئے انھوں نے مجھ سے بھی رابطہ کیا۔ رابطہ کیا قائم کیا، یوں کہنا چاہیے کہ انہوں نے میرا گھیراؤ کیا کہ ان دونوں کے بارے میں جو جانتے ہو، ریکارڈ کراؤ۔ مشتاق شہید چونکہ میرا بھتیجا تھا، اس لئے ذاتی طور پر میں جانتا ہوں کہ انھوں نے بھائی حق نواز اور دوسرے عزیزوں سے مشتاق شہید کے سوانحی کوائف حاصل کرنے میں کتنی جدوجہد کی۔ "تذکرہ شہداء" کے فوراً بعد انھوں نے "جرأتوں کے نشان" کا ڈول ڈال دیا۔ واضح رہے کہ یہ کام بھی انہوں نے بغیر کسی سپانسر شپ کے شروع کیا۔ یہاں لاہور میں تین ستارہ جرأت۔ جنرل جمشید، جنرل ممتاز اور میں (کرنل رشید) تھے۔ تینوں ریٹائرڈ اور حد سے زیادہ مصروف۔ اب نہ پوچھئے کہ انھوں نے تینوں سے اپنے سوالنامے کے جوابات حاصل

کرنے اور انٹرویو لینے کے لئے کتنی تگ ودو کی۔ سال بھر کس طرح مسلسل خطوط لکھتے رہے۔ زبانی پیغامات بھی آئے اور آخر آخر میں تار بھی۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہم تینوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کتاب لکھی جائے گی اور چھپے گی بھی۔ 1965ء کی جنگ کو پندرہ برس گزر چکے تھے اور کسی نے پوچھا نہ تھا۔ لیکن جب سال گزر گیا اور راشد صاحب کا اصرار جاری رہا تو میں نے انھیں لکھا ہم ٹھہرے کھلاڑی اور آپ بنا رہے ہیں لکھاری' بات بنے تو کیسے؟ انھوں نے جواب میں وضاحت کی ''آپ صرف سوالنامے کے جوابات لکھنے کی زحمت کیجئے باقی کام میں کرلوں گا۔ دوسروں نے چار چار صفحے لکھ کر جان چھڑائی ہے، میں آپ سے 44 صفحے لکھواؤں گا۔ بھاگ لیں جتنا بھاگنا چاہیں میں نے پیچھا نہیں چھوڑنا۔ یہ قومی کام ہے۔ اس کے لئے اگر کسی کے دروازہ پر سو بار بھی دستک دینا پڑے تو میں نہیں جھجکوں گا اور نہ شرماؤں گا۔'' اس طرح وہ جیتے، میں ہارا۔ پھر سوالنامہ دیکھا، بیسیوں سوالات تھے، زور اس بات پر تھا کہ ان ستارۂ جراتوں کی اٹھان کس طرح ہوئی۔ اس میں ان کے والدین، ماحول اور اساتذہ کا کیا رول تھا۔ مختصر یہ کہ پھر میں بھی شروع ہوگیا۔ جب 444 صفحے ہوگئے تو انہوں نے لکھا بس کیجئے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ انھوں نے 444 صفحوں کا نچوڑ پچاس صفحوں میں لکھا۔ جو ''جرأتوں کے نشان'' میں شامل ہے۔ اس طرح جنرل جمشید تو دو سال ٹالتے رہے۔ آخر کار کہنے لگے ''بھائی مانتا ہوں اس شخص کو''، پھر انھوں نے اپنا سوالنامہ نکالا اور جوابات لکھے اور انٹرویو بھی دیا۔ اس طرح وہ بیالیس ہفت خوانوں سے گزرے ہونگے۔ اگلا مرحلہ کتاب کو چھپوانے کا تھا، وہ بھی انھوں نے اپنی کاوشوں سے طے کیا۔ رائلٹی کہاں کی، اپنے پاس سے پیسہ لگایا۔ شکر ہے کہ کتاب مقبول ہوئی۔ اور دوسرا ایڈیشن بھی نکلا۔ جب راشد صاحب کی کتاب ''کردار ساز'' آئی تو میں نے علوی صاحب مرحوم کو لکھا کہ وہ راشد صاحب پر کچھ لکھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ قلم اٹھاتے، وہ خود اللہ کو پیارے ہوگئے اور پھر راشد صاحب نے ان پر ''علوی نامہ'' مرتب کیا اور اسے خود ہی چھپوایا بھی۔ میں تو بس یہی کہوں گا کہ راشد صاحب پر اللہ کا کرم ہے کہ ان کا قلم جب اٹھتا ہے تو کالج اور قوم کے محسنوں اور کردار سازوں پر اٹھتا ہے۔

میں ایک عرصہ سے کہہ رہا تھا کہ عالمگیرینز کا فرض ہے کہ وہ اپنے عظیم اساتذہ کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ شکر ہے کہ 'چراغوں کی قطار' میں سعید راشد صاحب نے یہ تقاضا پورا کردیا ہے۔ ہمیں اپنے اساتذہ پر فخر ہے اور خاص کر سعید راشد صاحب پر کہ انھوں نے کالج کے شہیدوں، غازیوں، بریگیڈیئر رفیق اور مسٹر علوی جیسے محسنوں پر اتنا زیادہ لکھ کر کالج کے نام اور کام کو امر کردیا ہے۔ کالج کی تاریخ ''داستان علم و عمل'' تو ان کے شاہکار ہیں۔ اگر ہمارے بس میں ہوتا تو ہم راشد صاحب کی خدمت میں معلّمی کا سب سے بڑا اعزاز پیش کرتے۔

حسن اختر کیانی
(کالج نمبر 1063 ' زمانہ تعلیم 1949-1942ء)

پروفیسر راشد سے میرا تعارف ان کی کتاب ''گفتار و کردار قائداعظم'' کے ذریعے سے ہوا۔ ہیکٹر بولیتھو کی کتاب "The Creator of Pakistan" سے لیکر سٹینلے والپرٹ (Stainly Valpert) کی کتاب ''جناح آف پاکستان'' تک قائداعظم پر تمام قابل ذکر کتابیں میری نظر سے گزری ہیں۔ میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ ''گفتار و کردار قائداعظم'' اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ یہ قائداعظم کی ایسی بائیوگرافی ہے جو کم وبیش انکے اپنے الفاظ میں ان کے کردار کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ اسکو پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے ''گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان''۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ راشد صاحب کی سب سے اہم کتاب ہے۔ یہ قومی نوعیت کی کتاب ہے۔ کتاب کے فلیپر پر راشد صاحب نے اپنے تعارف میں لکھا ہے کہ ان کا مشن پاکستانیت کا فروغ ہے۔ بلاشبہ پاکستانیات میں یہ قابل قدر اضافہ ہے۔ افسوس مجھے اسکا ہے کہ یہ کتاب بین الاقوامی بک مارکیٹ میں متعارف نہیں۔ اگر وہ اسکو انگریزی میں منتقل کر سکیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ پھر اسکا یہاں جرمنی میں، جرمن زبان میں ترجمہ کروالینا میرے لئے چنداں مشکل نہ ہوگا۔

ان کی کتاب ''مکالمات اقبال'' بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے اور اقبال کے تعارف کے لئے اسکو بھی بین الاقوامی سطح پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ پروفیسر راشد کی یہ دونوں کتابیں پاکستان میں کتنی تعداد میں چھپیں اور کتنی مقبول ہوئیں۔ بہر حال وہ اس نوعیت اور معیار کی کتب ہیں جو ہر پاکستانی گھر میں ہونے کا استحقاق رکھتی ہیں۔

پروفیسر راشد نے ملٹری کالج پر جو چھ کتابیں لکھی ہیں، وہ بھی ایک ریکارڈ کارنامہ ہے۔ شاید پاکستان میں کوئی اور ایسا ادارہ نہیں جس کے فرزندوں پر اتنا کچھ لکھا گیا ہو۔ ''تذکرۂ شہدا'' اور ''جراتوں کے نشان'' اپنی نوعیت کی یکتا و یگانہ تالیفات ہیں۔

میری ان سے روبرو ملاقات دسمبر 86ء کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ہوئی۔ میں نے انہیں فنافی الکالج پایا۔ ان کا یہ جملہ مجھے بار بار یاد آتا ہے کہ میرے لئے ملٹری کالج ہی پاکستان ہے۔ اس کی خدمت پاکستان کی خدمت ہے۔ ڈائمنڈ جوبلی ہی کے موقع پر وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل کے ایم عارف کے ہاتھوں کالج کی تاریخ پر ان کی نئی تالیف ''داستانِ علم و عمل'' کی افتتاحی تقریب کو میں نے فخر سے دیکھا۔ ملٹری کالج کی خوش قسمتی ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہی سہی، اسے ایک مورخ تو ملا۔ کالج سے رخصت ہوتے وقت راشد صاحب

نے مجھے ''اکرم شہید نشان حیدر'' اور ''حق نواز شہید'' کے علاوہ اپنی کتابیں ''کردار کی کرنیں اور ''شاد باد منزل مراد'' بھی عطا کیں۔ ان کا موضوع بھی پاکستانیت ہے۔ ابھی حال ہی میں انکی چار انگریزی کتابوں Living with ،In Search of Light, Ripeness is All, Leadership اور Learning to Lead کا سیٹ ملا۔ 'Ripeness is All' پر بریگیڈیئر صدیق سالک اور 'Living with Leadership' پر جنرل کے۔ ایم عارف کا بصیرت افروز پیش لفظ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ ملٹری کالج پروفیسر راشد پر جتنا فخر بھی کرے، کم ہے۔ راشد صاحب نے جب 1982ء میں'' گفتار و کردار قائد اعظم'' کی ایک کاپی مجھے بھیجی تھی تو ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا۔ ''میں Overseas پاکستانیوں کے لئے عطیہ کے طور پر کچھ کتابیں بھیجنا چاہتا ہوں، تم لکھو کہ تمہیں بھیجوں یا براہ راست ان اداروں کو جو پاکستانیوں کے لئے اردو میں لٹریچر فراہم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں''۔

مجھے نہیں معلوم کہ ملٹری کالج نے ان کے کام کو جاری رکھنے اور آگے بڑھانے کا کیا اہتمام کیا ہے۔ کم ازکم ''ادارہ تعلیمی تحقیق وترقی''، جس کے وہ پہلے ڈائریکٹر تھے، ایک فعال تحقیقی اور تخلیقی مرکز کے طور پر ان کے نام سے زندہ رکھا جائے کہ Research and Development Cell کو کسی ادارہ میں دماغ کی حیثیت حاصل ہوا کرتی ہے۔

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) محمد اقبال، سابق گورنر پنجاب

(کالج نمبر 1333، زمانہ تعلیم 1944-1951ء)

میں پروفیسر سعید راشد صاحب کا براہ راست سٹوڈنٹ نہیں رہا لیکن میں انہیں اس وقت سے جانتا ہوں۔ جب وہ جونیئر کلاسز کو پڑھایا کرتے تھے بعد میں وہ رابرٹ ہاؤس کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر مقرر ہوگئے۔ میں نے انہیں ہمیشہ سادہ مگر پروقار لباس میں دیکھا۔ میں نے انہیں کبھی کسی تقریب میں لیٹ ہوتے نہیں دیکھا اور کبھی Improper ڈریس میں نہیں دیکھا۔ ان کے بارے میں ہمیں وقتاً فوقتاً جو بھی معلوم ہوتا رہا وہ یہ کہ وہ کلاس روم میں سبجیکٹ پر مکمل اتھارٹی اور عبور کے ساتھ لیکچر دیا کرتے۔ وہ اپنا مطمح نظر پوری انڈرسٹینڈنگ کے ساتھ Convey کرنے پر ملکہ رکھتے تھے۔

راشد صاحب کی شخصیت کا خاص وصف تربیت کا تھا وہ صرف تعلیم ہی نہیں ساتھ ساتھ تربیت کو بھی اتنی ہی اہمیت دیا کرتے تھے۔ وہ کبھی کسی کو سخت انداز میں ڈائریکٹ نہیں کرتے تھے بلکہ انتہائی عام فہم انداز میں اشارے کنایوں میں اور مثالیں دے کر Convince کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔

سادگی، باقاعدگی، بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا ان کا خاصہ تھا۔ وہ ہر ماحول میں خوش رہتے تھے گویا انہیں خود کو خوش رکھنا آتا تھا۔

راشد صاحب نے عالمگیرین ایسوسی ایشن کے قیام کے سلسلے میں بھی انتہائی اہم اور کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ نہ ہوتے تو شائد عالمگیرین ایسوسی ایشن بھی اس طرح فعال نہ ہو پاتی۔ ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کے طور پر ان کی خدمات بھی تا دیر یاد رکھی جائیں گی۔ پروفیسر سعید راشد علی گڑھ یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کی تاریخ اور روایات کی مثالیں دیا کرتے تھے۔ وہ ملٹری کالج جہلم کو بھی اسی قسم کے باوقار اور اعلیٰ روایات سے بھرپور درس گاہ کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس میں انہیں بجا طور پر کامیابی نصیب ہوئی۔ آج ملٹری کالج جہلم جہاں ہے اس میں پروفیسر سعید راشد کی خدمات اور کردار روشنی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

پروفیسر سعید راشد ایک صاحبِ کمال شخصیت تھے جب بھی انکی یاد آتی ہے تو ایک ''آؤٹ سٹینڈنگ پرسنیلٹی'' نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔

محمد اعظم خاں

(کالج نمبر 1520، زمانہ تعلیم 1951-1946ء)

اس وقت وہ تھے تو بہت ینگ لیکن ان کی نفسیاتی counselling مشہور تھی۔ ان پر سینئر لڑکوں کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ اپنے ہر قسم کے ذاتی معاملات، مسائل اور الجھنوں میں ان سے مشورہ کرتے تھے۔ آئی ایس ایس بی کے لئے بھی وہ رہنمائی کرتے تھے۔ میں اور انور چیمہ (کالج نمبر 1781) اکثر ان کے پاس جاتے تھے۔ 1950ء میں، جب آئی ایس ایس بی سے ناکام واپس آیا تو ظاہر ہے دل شکستہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کہا "نہیں ہوئے نا!۔ میرا بھی یہی خیال تھا" مجھے کچھ افسوس بھی ہوا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پھر مجھے بٹھایا اور سمجھایا۔ ہر آدمی کا اپنا مزاج اور ذہن ہوتا ہے۔ تمہارا pattern آرمی کا نہیں ہے۔ انشا اللہ باہر بہت ترقی کرو گے۔ گو یہ سفر بہت لمبا ہے۔ پھر ملٹن کی ایک لائن سنائی جس میں pastures anew کا فقرہ آتا تھا۔ مطلب یہ تھا قوت بازو پر بھروسا کرو اور دنیا کو explore کرو۔

محمد زمان بھٹی

(کالج نمبر 1569، زمانہ تعلیم 1955-1946ء)

آواخر 1950ء میں ہم چند کیڈٹس رابرٹس ہاؤس میں ان سے ملنے گئے۔ اس زمانہ میں وہ نئے آئے تھے۔ اور اپنی خوش لباسی اور شائستگی کے لئے مشہور تھے۔ ان کے کمرہ میں سب سے نمایاں چیز آرٹ

کے وہ شاہکار تھے جو دیوار پر آویزاں تھے۔ ہمارے استفسار پر انھوں نے 'مونا لیزا' اور 'ھوپ' کی کلاسیکی تصاویر کا تعارف کرایا۔ وہ اس زمانہ میں ٹالسٹائی کا ناول ''وار اینڈ پیس'' پڑھ رہے تھے اسکے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ان کے صحن میں بیڈمنٹن کورٹ تھا۔ بعض سینئر لڑکے ان کے ساتھ بیڈمنٹن بھی کھیلتے تھے لیکن میں ان میں سے نہ تھا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے کالج کو خیر باد کہا۔ ان سے اصل ملاقات 26,25 سال کے بعد 1976ء میں ہوئی جب میں اپنے بڑے بیٹے مسرور زمان کو لے کر شیر شاہ ہاؤس پہنچا۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ مسرور کی وجہ سے شیر شاہ ہاؤس میں اکثر جانا ہوا اور یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ شیر شاہ ہاؤس کو انہوں نے ایک ادارہ بنا رکھا تھا۔ جہاں آٹھویں درجہ کے طلباء کو بڑے آئیڈیل ماحول میں ہمہ جہتی تربیت دی جا رہی تھی۔ میں نے شیر شاہ ہاؤس کا سالانہ یوم والدین بھی دیکھا۔ یہ بالکل نئی اور کمال کی چیز تھی۔ ہاؤس کے صحن میں چار پانچ گھنٹے کے پروگرام میں ہاؤس کے تمام لڑکوں نے والدین کے سامنے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ ترانے، اردو انگریزی تقریریں، ڈرامے، مذاکرے سب کچھ تھا۔ مجھے جس چیز نے متاثر کیا وہ یہ کہ تمام انتظام اور انصرام جونیئر لڑکوں کا تھا، حتیٰ کہ مہمان خصوصی، بریگیڈیئر آر ڈی بھٹی سے انعامات بھی ایک جونیئر لڑکے ہی نے تقسیم کروائے۔ راشد صاحب ہمہ وقت حاضرین کی صف میں بیٹھے رہے۔ شیر شاہ ہاؤس میں بچوں کو جو نفسیاتی تحفظ اور سکون میسر تھا، وہ اس خوف کی فضا سے بالکل مختلف تھا جس میں ہم regimentation کے زمانہ میں مبتلا رہتے تھے۔ پھر جس طرح ہاؤس میں جونیئر لڑکوں کی تخلیقی صلاحیتیں جلا پا رہی تھیں، وہ ایک انتہائی خوشگوار اور inspiring تجربہ تھا۔

کرنل محمد یونس

(کالج نمبر 1606، زمانہ تعلیم 1947-1954ء)

راشد صاحب کا نام فوج سے متعلق بے شمار گھرانوں میں ایک جانا پہچانا نام ہے۔ محبت، عزت اور شکر گزاری کے گہرے جذبات کے ساتھ انھیں یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ تقریباً چالیس سال سے کالج میں استاد اور ہاؤس ماسٹر ہیں۔ غالباً کالج کی تاریخ میں کوئی اور فرد اتنے طویل عرصے تک کالج سے وابستہ نہیں رہا ہے۔ یہ امتیاز بھی کم اہم نہیں ہے لیکن خود ان کے بقول We live in deeds, not in years، اس لئے محض ملازمت کی طوالت ہی اس مقبولیت کی وجہ نہیں ہوسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اصل سبب طلباء کے ساتھ بلکہ انکی پوری زندگی کے ساتھ ان کی وابستگی ہے۔ جس بیک گراؤنڈ سے بیشتر طلباء یہاں آتے تھے اور رجمنٹیشن کا جو ماحول یہاں تھا، اس کا تقاضا تھا کہ کوئی اس

مزاج، قابلیت، devotionاور vision کا استاد یہاں ہوتا۔ بلاشبہ اس ضرورت کو راشد صاحب نے بڑی حد تک بڑی خوبصورتی سے پورا کیا۔

اگست 1950ء میں جب وہ یہاں آئے تو وہ خود نوجوان تھے۔ لیکن اس وقت بھی ان میں نفاست، شائستگی، دردمندی روشن طبع کی وہ صفات موجود تھیں، جن میں بعد کے زمانے میں نکھار آتا گیا۔ تا آنکہ 70 اور80 کی دہائیوں میں وہ کالج کے ایک دانشور اور مورخ، اولڈ بوائز کے دوست، رہبر و رہنما اور ان کے گھرانوں کے ایک بزرگ کی حیثیت سے ابھرے۔

1951ء میں جب میں آئی ایس ایس بی سے ناکام لوٹا تو سب سے پہلے راشد صاحب سے ملنے گیا۔ اس وقت وہ گھر پہ نہیں تھے۔ میں نے ایک چٹ پر x کا نشان لگا کر نیچے اپنا نمبر 1606 لکھا اور تالے میں اڑوس کر چلا آیا۔ اس ناکامی سے میں جتنا دل برداشتہ ہوا تھا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس روز انھوں نے مجھے بہت سنبھالا۔ ان کا ایک فقرہ آج بھی یاد آتا ہے۔ Luck is a whole, life is a whole آخر میں انھوں نے بڑے وثوق سے کہا'' مجھے یقین ہے کہ تم اگلے کورس کے لئے منتخب ہو جاؤ گے اور ریڈ ٹیپ تک تو ضرور پہنچو گے۔ میرے خیال میں فی الحال تم میں جذباتی پختگی (emotional maturity) کی ایک آنچ کی کسر باقی ہے۔ مجھے تعجب ہوتا اگر تم اس بار منتخب ہو جاتے''۔ میں نے کہا'' سر! میں اپنے ساتھیوں سے جونیئر ہو جاؤں گا۔'' انھوں نے جواب میں زور دے کر کہا'' اس کا فیصلہ تو بیس پچیس سال بعد ہو گا کہ کون جونیئر ہو گا اور کون سینئر۔ یہ marathon race ہے۔ اس میں ایک دو چکر کے آگے پیچھے ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنی کوشش بلکہ اپنی جدوجہد جاری رکھو''۔

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اس دن سے میں راشد صاحب کو صرف محسن ہی نہیں اپنا پیر مانتا ہوں۔ ان کی باتوں میں اتنی تاثیر تھی کہ جب میں اپنے کمرہ میں واپس آیا تو نہ صرف میرا اعتماد بحال ہو چکا تھا بلکہ میں اپنے اندر ایک تازہ ولولہ محسوس کر رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ پہاڑوں سے ٹکرا جاؤں۔ مختصر یہ کہ ان کی پیشنگوئی صحیح ثابت ہوئی مجھے کمیشن بھی ملا اور شکر الحمد للہ کہ ریڈ ٹیپ بھی ہوا۔ اس طرح وہ غیر رسمی طریقے سے guidanceاور counselling کرتے رہتے تھے۔ چند سال بعد جب میری شادی کا سلسلہ چلا تو میں نے پھر ان سے مشورہ کیا۔ اس وقت سے ان کی وفات تک ان کے ہاں آنا جانا رہا۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ خط و کتابت ہوتی رہتی۔ ان کی حیثیت ہمارے گھر کے بزرگ اور مرشد کی سی تھی اور یہ سلسلہ تنہا

میرے ساتھ نہیں۔ بے شمار اولڈ بوائز سے ان کا یہ ناطہ قائم رہا ہے۔

ان سے ہر ملاقات ایک نئی روشنی اور ایک ولولہ تازہ کر دیتی تھی۔ انہیں میں نے ہمیشہ پُر امنگ اور پر جوش پایا۔zest for life سے بھر پور۔ پچھلے سال کی بات ہے کہ میں ہارٹ پرابلم کے بعد بستر سے جب اٹھا۔ کہنے لگے۔ ''یونس! جلد ٹھیک ہو جاؤ۔ میں بھی ریٹائر ہو رہا ہوں۔ دنیا میں گھوم پھر کر اچھی صورتوں کو دیکھیں گے۔ اچھی آوازوں کو سنیں گے اچھی تصویروں کو اور اچھے مناظر کو دیکھیں گے، اچھی کتابوں کو پڑھیں گے اچھے لوگوں سے ملیں گے''۔ فبای آلاء ربکما تکذبان! وہ بڑے ولولہ سے، بڑی خیال انگیز اور دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ ان کی ہر بات quote کرنے کے قابل ہے۔ ایک بار understanding کی بات ہو رہی تھی کہنے لگے سمرسٹ ماہم ٹھیک کہتا ہے کہ To be understood is a luxury اور خلیل جبران بھی غلط نہیں کہ ہم سب باتیں کرتے رہتے ہیں تا کہ تنہائی محسوس نہ ہو، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ loneliness انسان کا مقدر ہے۔ محبت اس لئے بھی کی جاتی ہے کہ تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔

راشد صاحب عام معنوں میں مذہبی نظر نہیں آتے لیکن ان کی سوچ میں تصوف کا رنگ تھا۔ مجھ سے اکثر کہا کہ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھا کرو اور کبھی کبھی مراقبہ بھی کیا کرو۔ (خود شناسی خدا شناسی کی طرف پہلا قدم ہے۔) محبت اور خدمت میں ان کا بڑا belief تھا اور اس معاملہ میں وہ یک طرفہ کارروائی unilateralism کے قائل تھے۔ جب میں سعودی عرب اور بعد میں مصر میں کنٹریکٹ پر فلائنگ کر رہا تھا انھوں نے مجھے اصرار سے کہا یونس تم ایک فلاحی ٹرسٹ قائم کرو تا کہ تمہارے رزق میں جو فراخی خدا نے دی ہے اس میں برکت ہو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور برکت محسوس کی۔

ایک روز میں نے اپنے بچوں محمود اور فواد کی تعلیم کے بارے میں ان سے مشورہ کیا تو انھوں نے ایک نئے پہلو کی طرف میری توجہ دلائی۔ فرمایا ''دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں professional curriculum بھی broad based ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ انجینئرنگ اور میڈیسن میں بھی Humanities کے کریڈٹ مل جاتے ہیں۔ ویسٹ پوائنٹ کے نصاب میں فلاسفی اور بشریات (Anthropology) بھی شامل ہے۔ لیکن ہمارے یہاں جو طلباء اور طالبات سائنس گروپ لیتے ہیں اور بعد میں پروفیشنز میں چلے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق Humanities اور جنرل ایجوکیشن سے رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں عموماً ان کی imagination اور ان کی قوت تخلیق میں وہ وسعت اور گہرائی نہیں آ پاتی جو ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ، نفسیات وغیرہ کے مطالعہ سے پیدا ہوتی

ہے۔ چونکہ ان کی ایجوکیشن کی کلچرل اور intellectual dimension عموماً کمزور رہ جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں آخر کار ان کی quality of life بھی متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے محمود اور فواد بیشک پروفیشنز میں جائیں لیکن ان کی شخصیت کے ارتقاء کا بھی خیال رکھیں۔ Humanities اور لٹریچر وغیرہ کا مطالعہ بھی جاری رکھیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہوگی۔ آئن سٹائن کی موسیقی سے دلچسپی مشہور ہے۔ Bethoven کی symphonies وہ خود بجا سکتا تھا۔ آئی اے سی کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر بھابھا شاعری بھی کرتے تھے۔ خود ہمارے مشہور سائنس دان ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی مصور بھی رہے ہیں۔ ابھی جنرل عارف کا دوسرا مجموعہ ''ایک دریا'' چھپا ہے۔ میجر جنرل ڈاکٹر شفیق الرحمان، میجر ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں، بریگیڈئر سالک فوج کے معروف اہل قلم ہیں۔ فوج کے ڈاکٹروں میں لیفٹیننٹ جنرل سید اظہر احمد کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اقبال اور پاکستانیات کے عالم ہیں۔ لیکن میں نے professions میں بڑے بڑے جاہلوں کو بھی دیکھا ہے اپنی speciality کے دائرے کے باہر صفر ہوتے ہیں۔ پس اس توازن کا خیال رکھیں۔''

راشد صاحب دھن کے بھی بہت پکے تھے۔ جس زمانہ میں ان کی اہلیہ سی ایم ایچ راولپنڈی کے آئی ٹی سی وارڈ میں تھیں، اس زمانہ میں بھی انھوں نے کالج کی تاریخ اور ''کردار ساز'' پر کام جاری رکھا۔ وہ دن میں تیمارداری کرتے تھے اور رات کو ٹرانزٹ کیمپ کے ایک کمرہ میں رائٹنگ۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا اور انسپائریشن بھی حاصل کی۔

راشد صاحب کا اپنا لائف اسٹائل تھا۔ اس اسٹائل میں ان کا خط و کتابت کا اپنا انداز بھی شامل ہے۔ وہ خط کا جواب فوراً دیتے۔ لیکن بہت ہی مختصر اور بہت ہی اپنائیت کے ساتھ۔ ان کا ہر خط لفظ ''میاں''...... سے شروع ہوتا اور اس کے بعد یہ فقرہ۔ ''خدا تمھیں خوش رکھے''۔ تقریباً ہر خط میں ضرور ہوتا۔

راشد صاحب نے ایک گفتگو کے دوران کہا ہر تعلق relationship کو grow کرتے رہنا چاہیے۔ باپ ہے تو پہلے والد کے منصب سے شروع ہو۔ پھر ایک ہمدرد لیکن دانا دوست کے طور پر سامنے آئے۔ آخر میں ایک seer اور روشن دماغ بزرگ کے طور پر ابھرے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف لفظی معنوں میں والدین ہونا کافی نہیں۔ اگر علم و ذہن کے اعتبار سے نہیں تو کم از کم کردار کے اعتبار سے ضرور بڑائی کا حامل ہونا چاہیے۔ اگر وہ عمر کے ساتھ ساتھ شخصیت و کردار کے لحاظ سے بھی آگے نہ بڑھتے جائیں تو اولاد بیشک مروتاً خاموش رہے لیکن والدین کی قدر و قیمت کم ہوتی جاتی ہے اور اگر وہ خدانخواستہ حرص و ہوس، بے انصافی یا کسی اور انسانی کمزوری کا مظاہرہ کریں تو والدین بھی ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک بہت اچھی تاریخی مثال سکندر اعظم کی ماں اولمپیاس کی ہے۔ سکندر جب ایران کی مہم پر

روانہ ہوا تو اسے مسلسل ماں کا یہ پیغام ملتا رہتا تھا کہ مالِ غنیمت میں سے یہ بھیجو، وہ بھیجو۔ سکندر سکندر تھا۔ وہ مال غنیمت میں سے اپنے لئے کچھ نہ رکھتا تھا۔ ماں کی فرمائشوں کو کہاں تک پورا کرتا۔ آخر تنگ آ کر اس نے کہا۔

''اس عورت نے نو مہینے تک جو مجھے اپنے پیٹ میں رکھا ہے میں اس کا کافی خراج ادا کر چکا ہوں''۔

میاں بیوی کے تعلقات کی dimensions میں بھی اضافہ ہونا چاہیے۔ ورنہ جذباتی گرمی سرد پڑنے اور اولاد کی پرورش و پرداختگی یا باہمی ذمہ داری کم ہونے کے دور میں یعنی پچاس کے پیٹے میں یا ریٹائرمنٹ کی عمر کے آس پاس میاں بیوی میں بھی اجنبیت کا احساس پیدا ہوسکتا ہے۔

وہ جو شعر ہے۔

ترے قرب نے جو بڑھا دیئے
کبھی کم ہوئے نہ وہ فاصلے

بہت معنی خیز ہے۔ قرب کے فاصلے شخصیت کی کمی یا فقدان سے پیدا ہوتے ہیں۔ بیوی اگر ذہنی طور پر ساتھ نہیں دے سکتی تو کم از کم بیوی سے مادریت کی طرف تو سفر کر سکتی ہے۔ جس طرح ٹی وی کا اگر ایک ہی چینل ہو اور وہ خراب ہو جائے تو ٹی وی بلیک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بیوی اگر ایک ہی channel رکھتی ہو اور اگر وہ channel کسی وجہ سے فنکشن نہ کر سکے تو تعلقات کا ٹی وی بھی بلیک ہوسکتا ہے۔ میاں ایک طرح کی اجنبیت محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب اس کو رفاقت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ استاد پر بھی یہ مثال صادق آتی ہے۔ کوئی استاد صرف کلاس میں پڑھا کر کسی شاگرد سے اپنے رابطہ یا تعلق استوار نہیں رکھ سکتا۔ جب تک وہ مختلف dimensions میں مسلسل آگے نہ بڑھتا رہے۔ اپنے علم میں، تجربہ میں، دانائی میں اور کردار میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بیشتر شاگرد بیشتر استادوں کو بھلا دیتے ہیں اور ان کی قدر بھی ان کے دل سے رفتہ رفتہ کم بلکہ معدوم ہو جاتی ہے چونکہ ان میں علم، فضل یا کردار کی کوئی غیر معمولی صفت نہیں ہوتی۔''

میں ان کو 1950ء سے جانتا ہوں یہ رابطہ 1999ء میں ان کی وفات تک قائم رہا۔ اس عرصہ میں، مَیں نے خود ان کو ہر بار خوب سے خوب تر پایا۔ پہلے وہ استاد تھے پھر دانشور دوست ہوئے۔ پھر ان کی حیثیت ایک مرشد کی سی ہوگئی۔ یہی حال کالج میں ان کی خدمات کا ہے۔ پہلے وہ صرف انسٹرکٹر تھے پھر اس میں ہاؤس ماسٹری کا اضافہ ہوا۔ پھر یہ بھی وقت آیا کہ انہوں نے کالج سے متعلق اور قومی موضوعات پر متعدد کتابیں بھی لکھیں۔ یہ تیسری dimension تھی۔

راشد صاحب کی دانشوری سال بہ سال بڑھتی رہی ہے۔ ان کی باتیں، میں کبھی ان کے حوالے سے

اور کبھی اپنے تاثرات کے طور پر، اپنے بچوں اور دوستوں کو بتاتا رہا ہوں اور زندگی کے مشکل مرحلوں میں ان سے راہنمائی لیتا رہا ہوں، دوسال پہلے جب میں شدید ہارٹ پرابلم سے دوچار رہوا تو کچھ عرصہ ذہنی اور جذباتی ڈپریشن بھی رہا۔ وہ جالا کٹا تو راشد صاحب سے ڈسکشن کے بعد! وہ روایتی معنوں میں مذہبی نہیں لیکن ان کی اپروچ مذہبی ہوتی ہے۔ ان کے دوقول پیش کرتا ہوں۔

We live in deeds not in years

اصل چیز طول حیات، نہیں، عرض حیات ہے۔ (بقول انکے یہ فقرہ اقبال کا ہے۔ وہ سنائی کا یہ قول آخری عمر میں اکثر دہرایا کرتے تھے)۔ دوسرے یہ کہ ہماری ذمہ داری، محدود ہے۔

They also serve who only stand and wait

دیکھنا یہ ہے کہ جتنی بھلائی بھی کوئی کرسکتا تھا وہ اس نے ایمانداری سے کی یا نہیں۔ ایک اور فقرہ جو میرے دل میں چبھ گیا، یہ تھا:

What matters is the performance not the position

اس لئے کہ پوزیشن یا منصب کلی طور پر ہمارے اختیار میں نہیں۔ اسلام میں بھی فضیلت کا معیار تقویٰ (performance) ہی کو بنایا گیا، پوزیشن کو نہیں۔

میں نہایت دیانت داری سے لکھ رہا ہوں کہ راشد صاحب کی ان تشریحات نے مجھے بہت sustain کیا، اور اب میں امکانی حد تک ایک مطمئن آدمی ہوں۔ وہ اکثر نظام ربوبیت کی بات کرتے ہیں۔ سورۃ رحمٰن ان کی پسندیدہ سورۃ ہے۔ مجھے یقین ہو چکا ہے کہ راشد صاحب کا ملٹری کالج میں آنا اور اس طرح serve کرنا اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا مظہر تھا۔ وہ محض ایک استاد نہیں تھے۔ اس سے زیادہ بہت کچھ اور اس قدر زائد کہ ان کے الفاظ میں surplus value ہی میں ان کی اصل value تھی۔ جو باتیں میں نے لکھی ہیں مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سینکڑوں دلوں کی ہوگی۔

ایک بار انہوں نے علامہ اقبال کا یہ قول سنایا کہ Motherhood is the major part of Prophethood اور پس منظر اس قول کا یہ تھا کہ ایک بار کسی بلی نے مسجد نبوی میں رات کے وقت بچے دے دیئے۔ جگہ خراب ہوگئی، صبح سویرے ایک صحابی نے دیکھا تو غصہ میں آ کر بلی اور اس کے بچوں کو اٹھا کر پھینکنا چاہا۔ رسول کریم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اس واقعہ پر اقبال نے یہ تبصرہ کیا تھا کہ ''مادریت رسالت کا جزو عظیم ہے۔'' یہ واقعہ راشد صاحب نے اپنی دو کتابوں ''کردار کی کرنیں'' اور ''مکالمات اقبال''

میں نقل کیا ہے اور مجھے بھی کئی بار سنایا۔اس سے ان کے اپنے ذہن کی غمازی ہوتی ہے۔ مادریت ان کے اپنے رویے میں بھی رچی بسی ہوئی ہے۔

1988ء کے اوائل میں جب میں ان سے ملا تو انھوں نے صاف کہا ''یونس اب میں زندگی صرف اس لئے چاہتا ہوں کہ کالج کی تاریخ کی دوسری جلد مکمل کرسکوں۔ باقی ساری چیزیں آؤٹ آف فوکس ہوگئی ہیں۔اب زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس کام کو پورا کروں تا کہ کالج اور پاکستان کے احسانات کا کچھ حق ادا ہوجائے''۔ یہ تخلیقی انہماک بھی انکی مادریت ہی کا ایک رخ تھا۔

باتیں تو ہزار ہیں۔ایک بار کہا'' ہر انعام ایک چیلنج،ایک آزمائش بھی ہوتا ہے۔ ہر عزت ہر محبت جو ملتی ہے وہ کچھ ذمہ داری بھی ساتھ لاتی ہے''۔ آخر میں کچھ ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی کہنا چاہوں گا۔ آنٹی کا انتقال 1985ء میں ہوا۔ 1955ء سے میں اور میری مسز ان کو جانتے تھے۔ آنٹی غیر معمولی فراست رکھتی تھیں۔انھوں نے گھر کو سنبھالا۔ بچوں کو سنبھالا اور سب سے بڑھ کر راشد صاحب کو سنبھالا ورنہ راشد صاحب ایسے committed اور dedicated آدمی کے ذاتی معاملات اور گھر بار کو برباد ہوتے دیر نہیں لگتی۔ راشد صاحب نے لکھا بھی بہت کچھ، ہاؤس ماسٹری بھی بہت کامیابی سے کی۔ان کارناموں کے پیچھے بلاشبہ آنٹی تھیں۔ راشد صاحب کے کام کا بہت سا کریڈٹ آنٹی کو جاتا ہے۔ جب میں ان کی تعزیت کے لئے ان کے گھر گیا تو راشد صاحب نے انھیں ان الفاظ میں خراجِ شکرگزاری پیش کیا۔'' دیوانہ تو اپنی دھن میں چلتا رہتا ہے۔ ہوش میں یعنی عملی زندگی کی تمام ذمہ داریوں کے ساتھ، دیوانہ کے ہم قدم رہنا بڑی بات ہے اور بہت بڑی بات ہے۔ وہ آخر میں میرے لئے ماں، بہن، بھائی، guide, philospher, friend سب ہی کچھ تھیں۔'' میری طرح بہت سے اولڈ بوائز نے ان کی گھریلو زندگی سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ عالمگیریینز کی ایک مشترکہ میراث ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین

(کالج نمبر 1623، زمانہ تعلیم 1947-1954ء)

راشد صاحب اسکین ہاؤس میں اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر تھے۔ ادب، آرٹ اور اسٹیج سرگرمیوں میں میری دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس لئے ان دائروں میں ان کی راہ نمائی سے محروم رہا لیکن ان کی توجہ سے محروم نہیں رہا۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ تقریباً بیس برس کے بعد 1975ء میں سیالکوٹ میں اپنی پوسٹنگ

کے زمانہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ٹوٹ کے ملے۔ بیوی بچوں کو فرداً فرداً پوچھتے رہے، اس وقت جاوید ساتویں میں پڑھ رہا تھا۔ پوچھا اس کو کالج میں داخل کیوں نہیں کراتے۔ میں نے کہا ابھی سوچا نہیں، یوں بھی ابھی چھوٹا ہے۔ بولے اگلے ہفتہ ہاؤس کا سالانہ یوم والدین کا فنکشن ہو رہا ہے تم سب آؤ۔ گھر والوں کو بھی ساتھ لاؤ۔ ان کے اصرار پر ہم لوگ آئے۔ فنکشن دیکھا، میری تو آنکھیں کھل گئیں۔ صبح دس بجے سے شروع ہو کر کھانے کے ڈیڑھ گھنٹے کے وقفہ کے بعد، شام ساڑھے چار بجے تک جاری رہا۔ پہلے اردو، انگریزی تقریریں، مکالمے، مذاکرے، ترانے، کورس، پھر کھانے کے بعد اردو انگریزی ڈرامے اور خاکے پیش کئے گئے۔ ہر آئیٹم لاجواب تھا۔ پھر لطف یہ کہ ہاؤس کے سارے لڑکوں نے حصہ لیا۔ انتظام بھی ان ہی کا تھا۔ شام کو ہم واپس سیالکوٹ روانہ ہوئے۔ بیوی بچے تمام راستے پروگرام کی باتیں کرتے رہے، میں سمجھ گیا کہ راشد صاحب نے ہمیں بااصرار پروگرام دیکھنے کی دعوت کیوں دی تھی۔ جاوید نے ازخود داخلے کے لئے کہا تو میں نے داخلہ فارم بھجوا دیا اور راشد صاحب کو اطلاع دی کہ درخواست بھیج دی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ جاوید کو گرمیوں کی چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لئے یہاں بھیج دو تاکہ ضروری تیاری ہو جائے۔ خدا جنت نصیب کرے ان کی بیگم کو کہ انھوں نے جاوید کو تقریباً ایک ماہ گھر میں رکھ کر تیاری کروائی۔ ان کے بچوں نے بھی تیاری میں مدد دی۔

داخلہ کے بعد راشد صاحب کا گھر دوسرے لڑکوں کی طرح جاوید کے لئے بھی آؤٹ آف باؤنڈ تھا۔ بلکہ اس پر ڈسپلن کی سختیاں زیادہ تھیں۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا مجھے اس بچہ میں اسپارک نظر آتا ہے اس لئے میں اسے تربیت کے کٹھن تر مراحل سے گزار رہا ہوں۔ پانچ سات برس کے بعد جب جاوید نے سترویں پی ایم اے لانگ کورس میں اعزازی تلوار لی تو مجھے خیال آیا کہ وہ جاوید کو اس دن کے لئے تیار کر رہے تھے۔ راشد صاحب کو جوہر قابل کو کندن بنانے کا فن آتا تھا۔

میجر گل بادشاہ

(کالج نمبر 1668، زمانہ تعلیم 1952-1947ء)

1950ء میں سر راشد کے ساتھ ایک اور نوجوان بہت ہی اسمارٹ استاد ماجد صدیقی بھی کالج میں آئے تھے جو ہسٹری کے بہت اچھے استاد تھے۔ خوش مزاجی اور خوش پوشی کے لئے دونوں مشہور تھے۔ راشد صاحب نے آتے ہی کالج کو یوں اپنا لیا جیسے برسوں کے بچھڑے ملے ہوں۔ غالباً دوسرے یا تیسرے دن

سے ایف اے سی سی میں حیدری صاحب کا ہاتھ بٹانے لگے۔ 1951ء میں ''چنار کا درخت'' لکھا اور پروڈیوس کیا۔ یہ ڈرامہ آزاد کشمیر کی جنگ پر تھا۔اس کے ایک منظر میں فضل الرحمٰن نے دریائے جہلم پر روش صدیقی کی نظم کے دو بند بڑی خوبصورتی سے گائے تھے۔جس کے چند مصرعے مجھے یاد آ رہے ہیں۔

تیری موجوں میں ہے آتش سادات اے جہلم
خدا جانے کہاں سے آرہا ہے کارواں تیرا
ہمالہ بھی تری موجوں کا ہے اک باب اے جہلم

راشد صاحب کے کورٹ یارڈ میں ہم بیڈمنٹن کھیلتے تھے۔کھیل کے بعد ان کی میزبانی سے بھی فیض یاب ہوتے تھے۔لیکن انھوں نے استاد کی وضع داری کو ہمیشہ قائم رکھا۔میں کے۔جی۔آر۔اجمیر سے آیا تھا۔میرے کچھ مسائل تھے۔انھوں نے بزرگانہ انداز سے انکو بھی سلجھایا۔جون 1948ء میں، میں کالج سے بھاگ کر جہاد کشمیر میں شریک ہو گیا تھا۔دو تین معرکوں میں حصہ بھی لیا۔جب انھیں میرے اس ایڈونچر کا علم ہوا تو وہ بقول ان کے میرے جہاد کے جذبہ سے بہت متاثر ہوئے۔میں نے انھیں رازداری سے بتایا بھی کہ سر یہ جہاد کا شوق نہیں محبت میں ناکامی کے بعد جائز طریقے سے جان دینے کی ایک کوشش تھی۔چونکہ پاکستان آتے وقت اجمیر کی ایک ہندو لڑکی نے میرے لئے خودکشی کر لی تھی۔لیکن وہ مصر ہی رہے کہ وہ جہاد ہی تھا۔میں اگر یہ کہوں کہ وہ اس وقت بھی جب وہ عمر میں ہم سے صرف چند سال ہی سینئر تھے ہمارے گائیڈ فلاسفر اور فرینڈ تھے تو غلط نہ ہوگا۔

1953ء میں کالج چھوڑنے کے بعد سے ان کی وفات تک میری ان سے خط و کتابت رہی۔آنا جانا رہا۔آنٹی مرحومہ کو اللہ غریق رحمت کرے وہ میری بیوی کو گل دلہن کہتی تھیں اور اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔مئی 1985ء کے پہلے ہفتہ میں ان کے انتقال سے صرف چند دن پہلے میں انھیں دیکھنے سی ایم ایچ راولپنڈی گیا تو انھوں نے گلہ کیا۔تم گل دلہن کو کیوں نہیں لائے۔میرا دل اس کو دیکھنے کو چاہتا ہے۔راشد صاحب اپنی جگہ لیکن میں آنٹی کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

بریگیڈیئر سلطان احمد

(کالج نمبر 1738،زمانہ تعلیم 1953-1948ء)

راشد صاحب 1950ء میں جب آئے تو استادوں میں سب سے کم عمر تھے اور اس سے زیادہ دھان پان۔لیکن رکھ رکھاؤ بہت زیادہ تھا۔لڑکوں میں اپنے intellectual calibre اور نفاست cultural sophistication کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ان سے میں نے 52-1951ء میں اردو

پڑھی تھی۔

لیکن وہ ان کلاسیکی اساتذہ میں سے تھے جو صرف مضمون ہی نہیں پڑھاتے بلکہ اور بہت کچھ بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ ان سے گاہے بگاہے رابطہ رہا۔ 64ء میں جب میں کھاریاں میں پوسٹ تھا اور میرے ساتھ کے گھر میں کالج نمبر 1600 کیپٹن (اب کرنل) عزیز رہتے تھے۔تو ہم نے راشد صاحب کو کھاریاں آنے کی دعوت دی۔ وہ اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ آئے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے میرے بیٹے کو ایک سوئیٹر بھی دیا تھا۔ پھر جب جولائی 65ء میں کشمیر میں اپنے خاص مشن پر جا رہا تھا تو راستہ میں ملٹری کالج میں رک کر انکی blessings لینے ان کے گھر پر بھی حاضر ہوا تھا۔ 65ء کی تگ و تاز کے بعد جب کشمیر سے لوٹا اس وقت تک میرے پہلے ستارہ جرأت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔تو ایک بار پھر ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اس ٹرافی (رائفل) کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے جو اس معرکہ کی یادگار کے طور پر میرے پاس تھی۔اس کے بعد میں پی۔ایم اے پوسٹ ہوگیا اور صرف عید کارڈ کے ذریعہ ان سے رابطہ رہا۔ مجھے یاد ہے کہ 1971ء کی عید پر میں نے بلوچ رجمنٹ کا عید کارڈ انہیں جمال پور (سابقہ مشرقی پاکستان) کے محاذ سے بھیجا تھا۔اس کا ذکر انھوں نے ''داستان جرأت'' میں بھی کیا ہے۔میدان جنگ جیسی چیز میں اگر کوئی سپاہی جم کر کھڑا رہتا ہے تو اس کے پیچھے کوئی طاقت ہوتی ہے۔ یہ طاقت خاندانی روایت،قومی تاریخ اور اس ادارہ کے استادوں کی ہوتی ہے جہاں اس نے تعلیم و تربیت پائی ہے۔ جمال پور جیسے تاریخی میدان جنگ سے اگر میں نے ملٹری کالج کے کسی استاد کو یاد رکھا تو اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ملٹری کالج کی تربیت (جس میں راشد صاحب کی پاکستانیت اور رفیق صاحب کی لیڈر شپ کو بڑا دخل ہے) نے میری عسکری جدوجہد کی لاشعوری آبیاری میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ انڈیا میں جنگی قیدی (پی او ڈبلیو) ہونے کے زمانہ میں بھی ان سے خط و کتابت رہی۔اس زمانہ میں مادر علمی (ملٹری کالج) سے رابطہ انہیں کے ذریعہ سے تھا۔ جمال پور کے تاریخی معرکہ کے بارے میں نیوز ویک، ٹائم وغیرہ میں جو کوریج آئی تھی اس کے تراشے وہ رکھ رہے تھے۔ 1974ء میں وطن واپسی پر انہوں نے مجھے کالج میں ہیروز ویلکم دیا اور شیر شاہ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں جمال پور اور کمال پور کے معرکوں پر مجھے انٹرویو کیا اور ہاؤس کے آڈیٹوریم کو ''کرنل سلطان آڈیٹوریم'' کا نام دیا۔ ان تمام عزت افزائیوں کے لئے میں ان کا از حد ممنون رہوں گا۔ مجھے اس امر کا بھی احساس ہے کہ راشد صاحب ملٹری کالج کی ترجمانی کر رہے تھے اور میں ان کے نزدیک ان تمام وار ہیروز کی علامت تھا جنہوں نے میدان جنگ میں داستانِ جرأت رقم کی تھی۔Victor Hugo نے Les Miserables میں تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ لڑائی لڑتا کوئی اور ہے لیکن اس کی ٹرافیز کوئی اور لے جاتا ہے جنھیں وہ

scavengers کہتا ہے۔ راشد صاحب نے ''تذکرہ شہداء'' اور ''جرأتوں کے نشان'' لکھ کر وار ہیروز کی شہرت کو کم از کم scavengers سے بچا لیا ہے۔ راشد صاحب نے قومی اہمیت کا یہ بہت بڑا کام کیا ہے۔ ''تذکرہ شہداء'' اور ''جرأتوں کے نشان'' میں مستقبل کی ملٹری منصوبہ بندیوں کے لئے غور کا کافی سامان ہے۔ ان کتابوں میں شہیدوں اور غازیوں کے کردار کا مطالعہ psychological اور sociological پس منظر کے perspective میں کیا گیا ہے اور اس سوال کا جواب ہے کہ میدان جنگ کے شیر کن کچھاروں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ''جرأتوں کے نشان'' اور ''تذکرہ شہداء'' پڑھ کر مجھے بار بار یہ احساس ہوا ہے کہ جنرل اختر ملک ایسے پاکستان کے کتنے مایہ ناز قابل فخر وار لیڈرز اور ہیروز ہیں جن کی شخصیتیں اور کارنامے اب ایک قیمتی قومی اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک ناقابل تلافی قومی نقصان ہوگا اگر راشد صاحب یا کوئی اور مورخ یا قلم کار اس میراث کو اپنے قلم سے محفوظ نہ کرے۔ پشکن (Pushkin) نے ''Captain's Daughter'' کو رہتی دنیا تک کے لئے اپنے قلم سے inspiration کا لازوال سرچشمہ بنا دیا ہے۔ اپنے وطن کی Captains Daughters بھی کسی پشکن کی منتظر ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ 1947ء کے بعد کے عشرہ میں ملٹری کالج نے جو قابل فخر ترقی کی اس کی موونگ سپرٹ بریگیڈیئر رفیق کے علاوہ برصغیر کی نامور یونیورسٹیوں کے پرداختہ وہ اساتذہ بھی تھے جو علم ہی میں یکتا نہیں قومی جذبے سے بھی سرشار تھے۔ چراغوں کی یہ قطار ٹوٹنی نہیں چاہئیے۔

1983ء سے 1985ء تک راشد صاحب سی ایم ایچ راولپنڈی میں زیر علاج اپنی بیگم کی تیمارداری کے سلسلہ میں پنڈی آتے جاتے رہے۔ اس عرصے میں میری طرح بہت سے اولڈ بوائز نے نوٹ کیا ہوگا کہ وہ تیمارداری کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے زیادہ ''جرأتوں کے نشان'' اور کالج کی ہسٹری کا کام کرتے رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس دوران چکلالہ میں انکا ذاتی مکان بھی بن رہا تھا۔ لیکن ان کی پہلی ترجیح ہسٹری کا کام تھا۔ dedication کو سخت ترین آزمائشوں سے گزرتے ہوئے اور intact رہتے ہوئے دیکھنا زندگی کا بہت ہی inspiring تجربہ ہے۔

میجر نصیر احمد

(کالج نمبر 1807، زمانہ تعلیم 1948-1955ء)

1950ء میں ساتویں میں جب راشد صاحب نے ہمیں اردو پڑھانا شروع کی تو وہ کالج کے سب سے ینگ استاد تھے۔ پڑھاتے بھی اچھا تھے لیکن ہماری نظر انکے لباس پر رہتی تھی۔ گرمیوں میں ہفتے کے دن سفید پتلون کے ساتھ کریم کلر کی پوری آستین کی سلک بشرٹ زیب تن کیا کرتے تھے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی

تھی۔ پیر کو اسی طرح پوری آستین کی سفید سلک کی بشرٹ اور سفید پتلون منگل کے دن لائٹ براؤن ٹراپیکل ٹو پیس سوٹ، اس پر چاکلیٹی رنگ کی ٹائی جس پر نرگس کے زرد پھول بنے ہوئے تھے۔ بدھ کو گرے رنگ کے سوٹ کے ساتھ لائٹ بلیو ٹائی پر سفید ستارے۔ جمعرات کو پھر سوٹ اسی ترتیب سے، سوٹ کے دنوں میں کوٹ کی جیب سے سفید رومال بھی جھانکتا ہوتا اور کوٹ کے لیپل پر چنبیلی کا ایک پھول یا گلاب کی بہت ہی نازک سی کلی نمایاں ہوتی۔ جمعہ کے دن کے لئے سفید شیروانی تنگ موری کا پاجامہ، سفید شوز اور سفید موزوں کے ساتھ، جاڑوں میں جمعہ کو سیاہ شیروانی باقی دنوں میں، باری باری تین دن combination کوٹ پتلون استعمال کرتے تھے۔ ٹائیاں گرمیوں کی ہی، جو غالبًا ان کی پسندیدہ تھیں۔ اس لباس میں ترتیب کے اتنے پابند تھے کہ ان کے سوٹ اور بشرٹ کے رنگ سے ہم دن کا تعین کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔

1955ء میں کرنل رفیق نے آ کر سویلین انسٹرکٹرز کے لئے بھی جب تک یکساں لباس (گرمیوں میں سفید قمیض پتلون، سیاہ جوتے، سیاہ موزے، جاڑوں میں تھری پیس گرے گیبرڈین کا سوٹ کالج ٹائی کے ساتھ) مقرر نہ کر دیا راشد صاحب کے لباس میں یہ ترتیب باقی رہی۔ لیکن یونیفارم ڈریس آنے کے بعد بھی انھوں نے اپنے لباس کی انفرادیت باقی رکھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ دوسروں نے ان کے لباس کی ترتیب اور نفاست سے کتنا اثر قبول کیا۔ لیکن یہ اثر میرے گھر کے کمروں میں، میری میز پر، پھولوں کی ان کیاریوں میں جو میں نے اپنے اسلام آباد کے گھر کے پہلو میں بنائی ہیں۔ غرض ہر اس جگہ جس کی ترتیب اور تزئین میرے اختیار میں ہو دیکھا جا سکتا ہے۔ جہلم ضلع کے ڈسٹرکٹ سولجر بورڈ میں میں نے بحیثیت سیکرٹری کچھ عرصے کام کیا وہاں بھی راشد صاحب کی ترتیب کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔

راشد صاحب نے ہمیں زندگی میں کلچر کے حسن سے آشنا کیا۔ ایک اور بات راشد صاحب اور ان کی بیگم جس طرح اولڈ بوائز کے پورے خاندان کو اپنا لیتے تھے اور پھر اس تعلق کو نبھاتے بھی تھے۔ یہ بھی ہمارے لئے زندگی کا بہت قیمتی تجربہ تھا۔ God bless him

میجر جنرل محمد اکرم، (ہلالِ امتیاز)

(کالج نمبر 1826، زمانہ تعلیم 1953-1948ء)

ایک اچھا معلم ایک اچھا کتابی استاد ہونے کے علاوہ اپنے طالب علم کے ذوق آگہی کو بھی بیدار کرتا ہے۔ اس کی خودی کو بھی ابھارتا ہے۔ اسے اخلاقی قدروں کا شعور دیتا اور سماجی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلاتا ہے۔ انسانی رشتوں کی پہچان بھی کراتا ہے۔ نصابی تدریس کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اگر تعلیم کا یہ

اقداری پہلوتشنہ رہ جائے یا کردار سازی صحیح طور پر نہ ہو سکے تو اس کے دور رس نتائج فرد اور قوم کے لئے بہت تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ اچھے اور مؤثر ادارے وہی ہوتے ہیں جہاں ایسے ہمہ گیر اساتذہ ہوں اور ایسا ماحول ہو جہاں اقداری تعلیم فروغ پا سکے۔

ملٹری کالج جہلم میں میرے زمانہ طالب علمی میں ایسا تعلیمی وتربیتی ماحول موجود تھا جس سے بے شمار طلباء فیض یاب ہوئے اور عملی زندگی کے مختلف شعبوں میں کامیاب وسرفراز ہوئے جس کا کریڈٹ بڑی حد تک اس دور کے اساتذہ کو جاتا ہے۔ یوں تو ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ ممتاز تھا لیکن اس وقت میں خاص طور پر مسٹر راشد کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ جو لوگ میری طرح 1950ء کے ابتدائی عشرہ میں راشد صاحب کے شاگرد رہے ہیں انھیں یاد ہوگا کہ وہ ایک معلم کے علاوہ ایک دور اندیش رہنما، ایک سنجیدہ دوست اور ایک منفرد طرز فکر کے حامل استاد تھے۔ وہ ہمارے ساتھ کھیل میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کھیل کے بعد اکثر ہماری خاطر تواضع بھی کرتے تھے اور عموماً ایسی ہی غیر رسمی نشستوں میں درس زندگی بھی دیتے تھے۔ ان محفلوں میں انھوں نے لن یوتانگ کی ''The Importance of Living'' اندرے موروا کی ''The Art of Living'' اور ولیم میکڈوگل کی ''The Character & Conduct'' اور ایڈورڈ مرو کی ''This I Believe'' جیسی فکر انگیز کلاسیکی کتابوں سے ہمارا تعارف کرایا۔ ان ہی ملاقاتوں میں انھوں نے ہمیں War and Peace، Les Miserables اور Brothers Karomzov اور Crime and Punishment جیسے عظیم ناولوں سے روشناس کرایا۔ روشناس میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ان کی ذاتی لائبریری میں یہ کتابیں موجود تھیں۔ وہیں یہ کتابیں شیلف سے نکال نکال کر دکھاتے تھے۔ انکو discuss کرتے تھے۔ ان کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقع تو بہت بعد میں ملا لیکن ان سے تعارف انہی دنوں ہوا تھا اور مسٹر راشد نے کرایا تھا۔ اس چڑھتی عمر میں صرف یہ احساس کہ امتحان اور کمیشن سے آگے بھی زندگی کی بہت سی منزلیں ہیں میں سمجھتا ہوں کہ بہت بڑا بریک تھرو (breakthrough) تھا۔ یہ vision زندگی میں بہت کام آیا اور مسلسل ایک قوت محرکہ (motivating force) کے طور پر کام کرتا رہا۔

مسٹر راشد ہی نے ہمیں واضح طور پر پاکستانی قومیت (جسکو انھوں نے بعد میں اپنی کتاب ''گفتار و کردار قائداعظم'' میں پاکستانیت کا نام دیا) کے تصور سے متعارف کرایا۔ 1950ء کے عشرہ میں وہ کہتے تھے کہ ہمیں پاکستانی قومیت کو اپنی قومی زندگی کی اساس بنانا چاہیے۔ اس وقت کالج کے ماحول میں بھی (غالباً کمانڈانٹ کرنل رفیق کی وجہ سے بھی) پاکستانی وطنیت patriotism کا بہت غلغلہ تھا۔

جیسا کہ میں نے ''داستان علم وعمل'' کی جلد اول کے تعارف میں بھی ذکر کیا ہے کہ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ملٹری کالج ابتداء سے ہی ایک مسلم قومی ادارہ رہا ہے اور پاکستانیت کا جذبہ یہاں شروع ہی سے شعوری اور لاشعوری طور پر پروان چڑھتا رہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس جذبہ کا آغاز کیسے ہوا اور اسے کیوں کر مستحکم رکھا جا سکا؟ پاکستانیت کے جذبے کو ابھارنے میں جہاں اور بہت سی شخصیات اور عوامل کا ہاتھ ہے وہاں مسٹر راشد کا بہت واضح اور خصوصی کردار ہے۔ اس زمانے میں انھوں نے ہمیں پاکستانیت کا نہ صرف احساس دلایا بلکہ یہ جذبہ بھی ابھارا کہ یہی ہمارا اول اور یہی ہمارا آخر ہے اور میرے خیال میں کالج کے طلباء کا قومی محاذ پر جان نثاری کا جذبہ اور قومی قدروں کی حفاظت کا کردار اسی سوچ کے بل بوتے پر پروان چڑھا ہے۔

1953ء میں میں نے کالج کے مانوس اور مہربان در و دیوار کو خیر باد کہا تھا۔ ایک عرصے کے بعد جب راشد صاحب سے دوبارہ رابطہ ہوا تو وہ ''تذکرہ شہداء'' کے ذریعہ سے تھا۔ اس کے فوراً بعد کالج کے دو نامور شہیدوں محمد اکرم نشان حیدر، کرنل حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت پر ان کی دو کتابیں نظر سے گزریں۔ ان تصانیف پر حیرت اور مسرت کا احساس ابھی کم نہ ہوا تھا کہ کالج کے جنگی اعزاز یافتہ اولڈ بوائز پر ان کی کتاب ''جرأتوں کے نشان'' چھپ کر سامنے آئی۔ سبحان اللہ۔ یہ 1985ء کی بات ہے۔ اس سال اس کتاب کے دو ایڈیشن چھپے۔ اسی سال کے آخر میں کالج کے ایک یکتا و یگانہ کمانڈانٹ ایک ممتاز فوجی کمانڈر اور بہت ہی فائق انسان بریگیڈیئر رفیق پر ان کی کتاب ''کردار ساز'' شائع ہوئی۔ 1986ء کی ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ان کی تالیف ''داستانِ علم وعمل'' کا افتتاح وی سی او ایس جنرل عارف نے کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لمحہ مسٹر راشد کی معلمانہ زندگی کا نقطہ عروج تھا۔ کتنی بڑی بات ہے کہ ایک انسان اپنی تمام زندگی کو اور اپنی ذہنی اور قلمی صلاحیتوں کو ایک قومی ادارہ کے لئے وقف کر دے۔ اس کو بھی چمکا دے اور اس عمل میں خود بھی چمک جائے۔

چونکہ ''داستان علم وعمل'' کی طباعت و اشاعت اور کسی حد تک اس کی تالیف اور ترتیب کے عمل سے ایک دو سال میرا واسطہ رہا۔ اس لئے میں ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر راشد کا اس کام میں involvement جنون کی حد تک تھا۔ اس سلسلہ میں انہیں بہت جدوجہد کرنی پڑی اور بہت سی ذاتی قربانیاں دینی پڑیں۔ ان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا چونکہ وہ اس کو کبھی پسند نہیں کریں گے۔ اب وہ ''داستانِ علم وعمل'' جلد دوم کی تدوین کے سلسلہ میں دن رات ایک کر رہے ہیں۔ یوں ان کی تربیت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم میں سے جو جہاں ہے وہ پچھلے چالیس برس سے ان سے انسپائریشن لے رہا ہے اور اب بھی وہ آگے ہیں۔ ان کی کتابوں کی تصنیف و تالیف ایسے وقت ہوئی جبکہ یہ کالج mature ہو چکا تھا اور مختلف

میدانوں میں اس کی فتوحات سامنے آ رہی تھیں۔اس لئے یہ ضروری تھا کہ ان کارناموں کو مرتب کیا جائے اوران کے مطالعہ وتحقیق کے بعد یہ دکھایا جائے کہ یہ کارنامے کس سسٹم، کس تعلیمی وتربیتی پروگرام اور کن ہاتھوں کے مرہون منت رہے ہیں۔ میں یہ بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کام میرے قابل فخر استاد نے بڑی کامیابی سے کیا ہے۔تاریخی اورادبی لحاظ سے بھی ان کتابوں کا ایک مقام ہے۔

ایک دفعہ کرنل یونس(1606) سے اس موضوع پر بات ہورہی تھی۔ انھوں نے کہا''ملٹری کالج کو پچاس سال میں ایک سعید راشد ملا۔اب دوسرا سعید راشد ملنے میں کتنا وقت لگے گا۔اللہ ہی بہتر جانتا ہے''۔ اس پر میں نے برجستہ کہا۔''ہم اتنا عرصہ انتظار نہیں کر سکتے۔ہمیں مسلسل مسٹر حیدری، مسٹر علوی، مسٹر راشد جیسے استادوں کی ضرورت رہے گی اوراس سسٹم کی بھی کہ جس کا پروردہ چیف آف آرمی سٹاف ہو، چیف آف جوائنٹ اسٹاف کمیٹی کا چیئرمین ہو، ائر چیف مارشل ہو، سی این ایس ہو، کورکمانڈر ہو، سٹاف کالج اور نیشنل ڈیفنس کالج کا کمانڈانٹ ہو، ملٹری سیکرٹری ہو، اٹامک انرجی کمیشن کا سائنس دان ہو، سنٹر فار ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کا پی ایچ ڈی ڈائریکٹر ہو، انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز میں روسی زبان کا پروفیسر ہو، سفیر ہو، اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہو، پی ایچ ڈی انجینئر ہو پاکستان ہاکی ٹیم کا کیپٹن ہو، پاسکو کا ایم ڈی، سٹیٹ آف پاکستان کا سینیٹر، وفاقی وزیر پیداوار......غرض جو عالمگیرین جہاں بھی ہو وہ اس تعلیم وتربیت کی بنیاد پر کامیاب وکامران ہو اوراس کی کامیابی محض ذاتی نہ ہو بلکہ اس کا وجود، اس کا کام، اس کی شخصیت قومی اورانسانی آب و رنگ بھی رکھتی ہو۔''

وہ سسٹم جو عالمگیرینز کو اخلاقی طور پر قابل اعتماد اور committed، جسمانی طور پر مضبوط، انتظامی طور پر مؤثر efficient، کارگر (effective) مختصر یہ کہ leader of men ہونے کا اہل بنائے اور یہ سسٹم زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ ایڈجسٹ بھی ہوتا رہے۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ جب راشد صاحب جیسے لوگ موجود ہوں۔

کرنل محمد افضل خاں

(کالج نمبر1832، زمانہ تعلیم1955-1948ء)

1951ء میں ساتویں کے سالانہ امتحان کے پرچے میں ایک سوال تھا''اگر میں بادشاہ ہوتا''۔اس کو میں نے یوں شروع کیا تھا۔''ایک روز بیٹھے بیٹھے میں خیالوں میں کھو گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسا کہ میں بادشاہ ہوں۔''اس پرچے کو راشد صاحب نے چیک کیا ہوگا، اس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ پرچہ کے چند روز بعد رابرٹس ہاؤس میں راشد صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھنے لگے۔کیا تم day dreaming کرتے

ہو؟ مجھے اس وقت day dreaming کے معنی تک معلوم نہیں تھے۔ بہر حال وہ مجھ سے بہت دیر تک اس مسئلہ پر گفتگو کرتے رہے جو بیشتر میری سمجھ سے باہر تھی۔ بہر حال میرا اب خیال ہے کہ ان کا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں میں کسی نفسیاتی محرومی کا شکار تو نہیں ہوں۔ اس لئے تحلیل نفسی (psychoanalysis) کے انداز میں سوال و جواب کر رہے تھے۔

لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی

(کالج نمبر 1862، زمانہ تعلیم 1949-1956ء)

میں 1949ء سے 1955ء تک ملٹری کالج میں زیر تعلیم رہا۔ اب جب میں اس زمانہ کی طرف مڑ کے دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ جیسے قضا و قدر نے خاص اہتمام کیا تھا کہ ملٹری کالج کو جہاں مستقبل کی آرمی لیڈرشپ پروان چڑھ رہی تھی تعلیم و تربیت کے خصوصی مواقع اور ذرائع مہیا کئے جائیں۔ چونکہ تعلیمی و تربیتی عمل میں بنیادی اہمیت معلم کی ہوتی ہے غالباً اس لئے اس زمانہ میں وہاں بہت سے غیر معمولی استادوں کو concentrate کر دیا گیا تھا جو برصغیر کی بہترین یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے اور علم و دانش اور کلچر کی گونا گوں سمتوں dimensions کی نمائندگی کرتے تھے اور یہی تنوع ان کے مزاجوں اور شخصیتوں میں تھا۔ مثلاً کرنل زیدی لکھنو یونیورسٹی کے پروردہ تھے۔ انگریزی کے انشا پرداز، اردو کے شاعر، موسیقی کے دلدادہ، ساتھ ہی ہاکی کے کھلاڑی بھی تھے۔ کیپٹن منظور الرحمان پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے liberalism کی چھاپ نمایاں تھی۔ موسیقی کے ماہر بھی تھے۔ وہ بنگالی کلچر کی نمائندگی کرتے تھے۔ مسٹر حیدری بمبئی کے ایک پارسی اسکول سے وابستہ رہنے کی وجہ سے پارسی کلچر sophistication کی چلتی پھرتی تصویر تھے اور انگریزی انگریزوں سے بڑھ کر بولتے تھے اور فنون لطیفہ، ڈراما، موسیقی اور مصوری کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ مزید برآں انگریزی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ راشد صاحب، بلگرامی صاحب اور علوی صاحب کا تعلق علی گڑھ گروپ سے تھا۔ ان کی خوبیاں علیحدہ تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے دائرہ میں امتیازی شان رکھتا تھا۔ آرمی آفیسرز میں کیپٹن شفیع، میجر ابراہیم، کیپٹن این ڈی حسن، کیپٹن اے اے آفتاب، کیپٹن این ڈی احمد اپنی جگہ انفرادیت کے حامل تھے۔ غور کیجئے اس ادارہ میں اس دور میں talent کا کتنا ارتکاز اور کتنی variety تھی۔ اس کے برعکس یہ دیکھئے کہ جو طلبہ زیر تعلیم تھے ان میں سے بیشتر دور افتادہ علاقوں سے کلچر کے بہت محدود پس منظر سے آئے تھے۔ اس دور کے ان اساتذہ سے ان کے ذہنی افق میں وہ ضروری توسیع و ترقی ہوئی جو آگے چل کر کارزارِ حیات میں بہت کام آئی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں کے طلبہ کو پاکستانی قومیت اور کلچر کی رنگا رنگی کا عملی تجربہ ہوا اور ایک قومی نقطہ نظر اور قومی

شعور(outlook)از خود ابھرا۔ پاکستان بھر کے طلبہ کے ایک ساتھ رہنے سے ایک عالمگیر برادری کے علاوہ پاکستانی برادری کا بھی تصور پیدا ہوا۔ چنانچہ ملٹری کالج کے طلباء ذات، زبان، نسل اور علاقہ کے محدود دائروں سے باہر آنے لگے۔

پاکستانیت کے اس جذبہ اور شعور کو شعوری طور پر فروغ دینے میں مسٹر راشد کا خاص ہاتھ تھا۔ ان کے اپنے مزاج کا خمیر liberalism اور humanism سے اٹھا تھا۔ مزید برآں یہ کہ وہ علی گڑھ اور تحریک پاکستان کے veteran بھی تھے۔ ان وجوہ کی بنا پر وہ اس مقدس کام کو احسن طریقے سے ادا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے اور ان کو یہ امتیاز بھی حاصل ہوا کہ انھوں نے اس موضوع پر وقیع کتابیں لکھیں۔

محمد اصغر

(کالج نمبر 1859، زمانہ تعلیم 1956-1949ء)

کرنل رفیق کی پہلی کمان کے زمانہ میں جو انقلابی اصلاحی اقدامات کئے گئے ان میں سے ایک کارروائی خوش اخلاقی کی مہم بھی تھی۔ راشد صاحب اس مہم کے نگراں تھے۔ مہم کا آغاز جونیئر ہاؤس اسکین ہاؤس سے ہوا جس کے وہ ہاؤس ماسٹر بھی تھے۔ فروری 1953ء سے ہر ہفتہ ہر ہاؤس کے نوٹس بورڈ اور انفارمیشن روم میں سرخ اور نیلی روشنائی سے لکھے چھوٹے چھوٹے پوسٹر نمودار ہونے لگے۔ ''کیا آپ کو شکریہ کہنے کی عادت ہے؟ کیا آپ please کہنے کے عادی ہیں؟ کیا آپ بوقت ضرورت I'm sorry کہتے ہیں؟'' وغیرہ وغیرہ۔ میرے سپرد یہ کام تھا کہ میں مختلف بورڈوں سے پچھلے ہفتہ کا پوسٹر اتار کر دوسرا پوسٹر لگاؤں۔ اور اس کا ریکارڈ رکھوں۔ پھر ایک روز انھوں نے مجھ سے کہا ''اصغر میگزین میں اس موضوع پر کچھ لکھو۔ چنانچہ میں نے'' شکریہ'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اس سال (1953) میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر بھی وہی تھے۔ انھوں نے اس مضمون کو پسند کیا اور کہا۔ اس میں نظیرا کبرآبادی کا یہ بند بھی شامل کرنا چاہو تو کر دو۔

کانٹا کسی کے مت لگا ، گر مثل پھولا ہے تو
وہ ترے حق میں زہر ہے کس بات پر بھولا ہے تو
تو اور کی تعریف کر ، تجھ کو ثنا خوانی ملے
کر مشکل آساں اور کی تجھ کو بھی آسانی ملے

اس بند سے راشد صاحب کی اپنی سوچ کی غمازی بھی ہوتی ہے۔

جب میں کالج سے رخصت ہونے لگا تو میں نے عرض کیا۔ ''سر کوئی parting advice'' فرمایا ''رشید احمد صدیقی کا وہ قول جو بار بار دہرایا کرتا ہوں''۔ میں نے آٹوگراف بک آگے کر دی تو انہوں

نے اپنے خوبصورت خط میں ہلکی نیلی روشنائی سے لکھا:

''زندگی کا حاصل یا انسانیت کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان نے جو زندگی یا زمانہ پایا اس کو اپنے حسن خیال یا حسن عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے، بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لئے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔''

یہ لکھ کر ''حسن عمل'' کو انڈر لائن کیا۔ اور فرمایا ''میں ذاتی طور پر حسن عمل ہی کا قائل ہوں۔'' میں نے عرض کیا کہ ''سر کچھ انگریزی میں بھی لکھ دیجئے۔ تو انھوں نے فرمایا۔ ''ابھی چند روز ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ میں ایک بڑی اچھی Quotation نظر سے گزری تھی۔ وہی لکھے دیتا ہوں''۔

"The greatest want of the world is the want of the men. Men who will not be bought or sold; men who in their innermost soul are true and honest; men who do not fear to call sin by its right name; men whose consience is as true to duty as the needle to the pole; men who will stand for the right, though the heavens fall."

چونکہ آدمی اپنے انتخاب سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے آخر میں راشد صاحب کی مرتب کردہ کتاب Book of Quotations سے ایک اور دانش پارہ نقل کرتا ہوں۔

''اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے۔ انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا متلاشی وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان۔ سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپ کو دے سکیں، نہ کہ وہ جو دوسرے سے ملے۔''

کموڈور سید سجاد حیدر

(کالج نمبر 1871، زمانہ تعلیم 1949-1956ء)

آج جو میں مجلسیں پڑھتا ہوں۔ انگریزی اور اردو کا بڑا مقرر اور واعظ سمجھا جاتا ہوں۔ اگر یہ کوئی کمال ہے تو اس مہارت اور کمال کی ابتدا، بہت خاموشی سے رابرٹس ہاؤس میں 1951ء میں راشد صاحب کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ انہی نے مجھے فن تقریر کے اسرار و رموز سمجھائے بلکہ ان کی عملی تربیت دی۔ وہ جس طرح اور جس توجہ سے میری انگریزی اور اردو تقریروں کی نوک پلک درست کرتے تھے، وہ یاد کر کے مجھے حیرت ہوتی ہے۔ تقریر کے فن سے بھی زیادہ قیمتی چیز جو میں نے ان سے سیکھی وہ ان کا طریق تربیت ہے۔

سلف کے اہل تصوف اور اہل علم وفضل کے تذکار، کتابوں میں تو ملتے ہیں مگر اس طریق تربیت کو آج کے تناظر میں کس طرح برتا جا سکتا ہے، اس کا حوالہ میرے لئے راشد صاحب کی ذات رہی ہے۔ اس امر کو میں ایک مثال سے واضح کروں گا۔ 1955ء میں انگلش ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا پریزیڈنٹ اور اردو ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا سیکرٹری تھا۔ اتفاق سے جس دن پی ایم اے کی پاسنگ آؤٹ پریڈ دیکھنے کے لئے لڑکے جا رہے تھے اسی دن کالج میں ایک اردو مباحثہ تھا۔ جس کا نہ صرف انتظام مجھے کرنا تھا بلکہ اس میں ہاؤس کی طرف سے مجھے حصہ بھی لینا تھا۔ ان دونوں ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں کاکول چلا گیا۔ اس غلطی کا احساس تو مجھے اس وقت سے ہونا شروع ہو گیا تھا جب میں نے کالج کے گیٹ سے باہر قدم نکالا تھا۔ بہر حال اب کیا ہو سکتا تھا۔ یہ خیال ضرور تھا اور نہیں تو زبردست جھاڑ تو پڑے گی لیکن ہوا کیا؟ جب واپس آیا تو راشد صاحب نے ہاؤس آفس میں بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر راشد صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ان کا چہرہ دکھ سے پیلا تھا۔ مجھے غور سے دیکھا اور کہا ''تم جا سکتے ہو، حیدر!'' تعمیلاً تو میں واپس جانے کے لئے مڑا لیکن پھر قدم رک گئے اور بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ''سر'' ہی کہہ سکا اور تقریباً رو پڑا۔ وہ اٹھے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ''It's all right'' اور کہا ''اس وقت تم جاؤ۔ پھر بات کرونگا۔''

پھر کئی روز کے بعد بلایا اور فرمایا ''میں نے تمہاری پیشانی پر چمک دیکھی ہے۔ اگر تم اپنی ترجیحات کو ابھی سے درست نہیں رکھو گے تو بات کیسے بنے گی۔ زندگی انعام بھی ہے اور آزمائش بھی۔ اگر آج چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں پورے نہیں اترو گے تو کل بڑے بڑے مرحلوں سے کیسے عہدہ برا ہو گے۔'' ڈرتے ڈرتے لیکن ان کی شفقت کے بھروسا پر میں نے پوچھ لیا لیکن سر، غلطی تو میری تھی آپ کو کیوں اتنا دکھ ہوا۔'' اس کا جواب تمہیں خود بیس تیس سال کے بعد مل جائے گا۔'' ان کا جواب تھا۔ حسن اتفاق 1982ء میں، جس دن مجھے کموڈور کا رینک لگا، راشد صاحب اسلام آباد میں مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ کموڈور کے رینک میں سب سے پہلا سلام میں نے انہی کو کیا۔ وہ میرے ساتھ ہی نیول ہیڈ کوارٹرز آئے۔ بہت خوش تھے۔ راستہ میں تقریباً پچیس سال پہلے کا وہ واقعہ میں نے انہیں یاد دلایا تو فرمایا۔ ''اس روز مجھے اتنا دکھ کیوں ہوا تھا۔ اس کا جواب، اس سوال میں ہے کہ آج میں اتنا خوش کیوں ہوں۔ حیدر، یوں تو ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارا ہوتا ہے لیکن ملٹری کالج ایسے ادارہ میں یہ بات ہر طالب علم پر بہت زیادہ صادق آتی ہے۔ خصوصاً ان پر جو زیادہ promising ہوں۔ اس لئے ان کی تربیت بہت احتیاط سے پاکستان کے مستقبل پر نظر رکھ کے کرنی چاہیے۔'' راشد صاحب پاکستان کے عاشقوں میں سے تھے اور جس نے بھی ان سے فیض حاصل کیا وہ تھوڑا بہت ضرور ان کے اس عشق اور humanism کو share کرتا رہے گا۔

واجد علی قریشی

(کالج نمبر 1891، زمانہ تعلیم 1955-1949ء)

اگست 1949ء میں کالج کی سرزمین پر میں نے قدم رکھا اور اس کے ٹھیک ایک سال کے بعد یعنی 1950ء میں جناب سعید راشد فیضی کالج کے افق پر چمکے۔ انہوں نے کالج میں کم و بیش 40 سال گزارے۔ اس دوران راشد صاحب کے جوہر کچھ اس طرح کھلے اور ان کی شخصیت کچھ اس طرح نکھر کر سامنے آئی کہ مجھے پاکستان کے عروس البلاد اسلام آباد کے قومی پارک شکر پڑیاں کے چمن زار میں ہونے والی پھولوں کی سالانہ نمائش میں پیش کیا جانے والا خوبصورت تر و تازہ گلاب کا وہ پودا یاد آ گیا جس کی سات شاخیں تھیں اور ہر شاخ میں پھول کھلے تھے مگر ہر شاخ کے پھولوں کا رنگ اور مہک جدا جدا تھی۔

یوں تو اس درسگاہ کے آسمان پر بہت سے شہاب ثاقب نمودار ہوئے جو اپنے اپنے وقت میں چمکے اور خوب چمکے لیکن راشد صاحب اپنے پیچھے کچھ ایسی روشن لکیریں چھوڑ گئے ہیں جن کی آب و تاب کالج کے ماہ و سال کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔ انھوں نے اپنی تعلیمی و تربیتی صلاحیتوں کا مرکز ہی نہیں اپنی تخلیقی قوتوں کا موضوع بھی کالج اور صرف کالج کو بنایا۔ یہ ایک امتیاز ہے جو انھیں غیر معمولی انفرادیت بخشتا ہے۔

منجملہ دیگر صفات کے ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے لعل گدڑیوں میں ڈھونڈتے تھے اور پھر بے انتہا جانفشانی سے ان کی تراش خراش کرتے رہتے تھے۔ جو درماندہ ہوں، neglected نظر انداز کئے ہوئے ہوں ان میں complexes بھی بہت ہوتے ہیں۔ اس صبر آزما کام کو انھوں نے بہت کامیابی سے نبھایا۔ ان کی توجہ کی کاوشوں سے وہ چنگاریاں بھی دمک اٹھیں جن پر وقت اور ناقدری کی راکھ کی تہہ جمتی جا رہی تھی۔ وہ اس وقت خاصے کم عمر استاد تھے لیکن رویہ مرشدانہ تھا۔ سینئر لڑکے اپنے مسائل ان سے بے جھجک بیان کرتے تھے۔ پھر وہ بڑے نفسیاتی طریقے سے سمجھاتے تھے اور مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی بڑی تفصیل سے وضاحت کرتے تھے۔ ان کی راہنمائی اور مشوروں سے بہتوں نے فائدہ اٹھایا۔ ایک اور خصوصیت ان کی مہمان نوازی کی تھی۔ جو جاتا اسکی تواضع ضرور کی جاتی۔ گاجر کا حلوہ غالباً ان کی پسندیدہ ڈش تھی۔ ایک بار ان کے باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو ایک بہت بڑی کڑاہی بلکہ کڑاہ میں حلوہ بن رہا تھا۔ ان کے صحن میں ایک بیڈمنٹن کورٹ تھا۔ یہ کھیل ہمارے لئے نیا تھا۔ عموماً ہفتے کی شام اور اتوار کو اس کورٹ پر بہت ہجوم رہتا تھا۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور بہت تیز کھیلتے تھے۔ بعض کی دلچسپی کھیل سے زیادہ حلوہ کی اس قاب میں ہوتی جو کھیل ختم ہوتے ہی ان کا ملازم ان کے کمرہ کی گول میز پر سجا دیتا تھا۔ ان کی پسندیدہ چائے دارجلنگ لیبل ٹی تھی۔ جو ایک ایک پونڈ کے گول ٹن میں آتی تھی۔ یہ چائے وہ خود ہمارے سامنے بڑی

نفاست سے بناتے تھے۔

ان کے آنے سے ہمارے ہاؤس کی Saturday evening functions چمک اٹھیں۔ لیکن یہاں بھی ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس پروگرام میں وہ کم گو اور شرمیلے لڑکے بھی حصہ لیں جو مختلف وجوہ سے سامنے آنے سے جھجکتے تھے۔ وہ انکو تقریری مقابلوں اور سوشل فنکشنوں میں حصہ لینے کی تلقین و ترغیب دیتے تھے۔ ان کی توجہ سے بہت neglected لڑکوں نے کینچلی اتارنا شروع کردی اور پھر ایسے ابھرے کہ بایدشاید 1951ء کی سالانہ تقریب انعامات کی شب، راشد صاحب کا لکھا ہوا اور ڈائریکٹ کیا ہوا ڈراما ''چنار کا درخت'' اسٹیج ہوا تھا۔ یہ کشمیر کے جہادِ آزادی کے متعلق تھا۔ اس میں ایک جگہ اسٹین گن کے ڈمی راؤنڈ چلنا تھے۔ اس کے لئے تقریب کے مہمان خصوصی لیفٹیننٹ جنرل ناصر علی خاں سے اجازت لی گئی تھی۔ اس میں (کالج نمبر 1805) فضل الرحمان اور (1551) خادم نے بھی حصہ لیا تھا۔

اس زمانہ میں ایک سلسلہ انگریزی میں توسیعی لیکچروں کا شروع ہوا تھا۔ اس میں پہلا لیکچر راشد صاحب نے ''کلچر'' کے موضوع پر اس وقت کے کالج ہال (موجودہ میوزیم) میں دیا تھا۔ اس کا تعارف چیف انسٹرکٹر میجر ابراہیم صاحب نے کرایا تھا۔ کرنل رفیق کے آنے پر اردو انگریزی میں جو Declamation Contest ہوا تھا اس میں شاعر اور جوگی کا ٹیبلو راشد صاحب نے تیار کروایا تھا۔ جس میں شاعر کا کردار یونس کیانی اور جوگی کا کردار میں نے ادا کیا تھا۔ رفیق صاحب نے جہاں اور بہت سی نئی چیزیں شروع کی تھیں ان میں سے ایک چیز Brains Trust بھی تھی۔ اس کے پینل میں راشد صاحب بھی شامل تھے۔ انھوں نے نفسیاتی سوالوں کے جوابات دیئے تھے۔ ایک سوال یہ تھا۔

When you weep, you weep alone but

When you laugh, the whole world laughs with you.

اس کی نفسیاتی توجیہہ انھوں نے بڑے موثر انداز میں کی تھی۔ اس کا اثر کم از کم مجھ پر یہ ہوا کہ اس وقت سے میں اپنے آنسوؤں کو ہمیشہ اپنی تنہائیوں کی امانت سمجھتا ہوں۔ آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گا کہ 87ء کے اوائل میں جس ذوق وشوق سے انھوں نے مجھ سے حیدری صاحب اور علوی صاحب کے بارے میں طویل انٹرویو لیا اور جس خوبصورتی سے انھوں نے علوی نامہ میں پیش کیا، اس سے انکی اپنی شخصیت کا ایک نیا رخ سامنے آیا۔ اب ہم خود ان کے بارے میں جتنا لکھیں کم ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل سردار خاں
(کالج نمبر 1955، زمانہ تعلیم 1957-1950ء)

1952ء میں ، میں نے ساتویں سی میں راشد صاحب سے بیسک انگلش پڑھی۔ بیسک انگلش ڈائریکٹ میتھڈ سے پڑھائی جاتی تھی اور اس میں الفاظ کی اور جملوں کی ڈرل بہت کرنی پڑتی تھی جس میں ظاہر ہے کہ غلطیاں بھی ہوتیں۔ اول تو راشد صاحب اس لڑکے سے سوال پوچھتے ہی نہیں تھے جس سے جواب غلط ہونے کا امکان ہو۔ اتفاق سے اس سے پوچھ بھی لیں اور وہ جواب نہ دے پاتا تو فوراً کہتے'' I am sorry''۔ پھر دوبارہ اس سے اس وقت پوچھتے جب انہیں یقین ہوتا کہ اب کے جواب ضرور صحیح آئے گا۔

بڑوں اور استادوں کی عزت کی روایت سے تو ہم واقف تھے لیکن شاگردوں اور چھوٹوں کی عزت اور خاطر داری کے تصور اور مثال سے اس طرح ہمیں راشد صاحب ہی نے آشنا کیا۔ یہ تجربہ کم از کم میرے لئے بالکل نیا تھا۔ یہ ایک ایسی ہی تہذیبی تربیت تھی جس میں میری طرح ان کے بے شمار طالب علم متاثر ہوئے ہوں گے اور انکی گھریلو اور دفتری زندگی میں اس کے مثبت اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

راشد صاحب کی خدمت کا ایک پہلو جس کا ذکر کم سننے میں آتا ہے وہ انکی ڈراموں کی پروڈکشن اور ڈائریکشن تھی۔ 1952ء میں جب وہ رابرٹس ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر تھے تو انھوں نے ایک ورائٹی پروگرام پیش کیا تھا۔ ایف اے سی سی کالج کے اسٹیج پر جو ڈرامے پیش کرتا تھا وہ ہوتے تو بہت اونچے معیار کے تھے لیکن وہ بہت talented اور معدودے چند لڑکوں تک محدود ہوا کرتے تھے۔ راشد صاحب نے ڈراما کو ''عوامی'' بنایا جس میں ہم جیسے غریبِ شہر بھی جو چمک دمک سے خالی تھے، حصہ لے سکتے تھے۔ راشد صاحب نے رابرٹس ہاؤس کے اس ڈراما میں نہ تو کاسٹیوم استعمال کئے نہ کسی کا میک اپ کیا، نہ ہی کسی کو لڑکی بنایا چونکہ بنیادی مقصد دیکھنے والوں کو خوش کرنا نہیں بلکہ ڈراما کرنے والوں کو جو عام سے لڑکے تھے بولنا سکھانا اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنا تھا۔ راشد صاحب نے glamour کے بغیر بھی محض اپنی مہارت اور dedication سے اس شو کو کامیاب بنایا۔ آج مجھے ان کی خواص کے بجائے عوام دوستی ہی زندگی کے ایک بہت قیمتی اصول اور مثال کے طور پر یاد آتی ہے۔

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

ڈاکٹر سرفراز حسین مرزا۔ پی۔ ایچ۔ ڈی
(کالج نمبر 2000، زمانہ تعلیم 1956-1950ء)

مشرقی روایت میں استاد کی تین جہتیں (dimensions) ہیں یعنی مدرسِ، معلم اور مرشد۔ مدرس

کا مطمح نظر نصاب ہوتا ہے۔معلم نصاب کے جوہر سے بہت آگے جا کر تخلیقی انداز میں پڑھاتا ہے تاکہ متعلم کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوں اور وہ نہ صرف علم حاصل کرے بلکہ بقول اقبال علم پیدا بھی کر سکے۔ مدرس اور معلم ہونے کے علاوہ استاد کا ایک روپ اور بھی ہے۔ وہ مرشد کے رول میں سامنے آتا ہے اور اپنے شاگردوں کی تہذیبی، اخلاقی اور روحانی تربیت کو بھی ملحوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔راشدی صاحب (وہ اس زمانہ میں اپنے آپ کو راشدی ہی لکھتے تھے) کا تعلق استادوں کی اس تیسری قسم سے تھا۔وہ معلم بھی بہت اچھے تھے کہ تخلیقی انداز میں پڑھاتے تھے۔لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی پہچان انکی یہ تیسری حیثیت تھی۔

میرے ذہن میں انکی پہلی یاد 51-1950ء میں پانچویں درجہ کی ہے۔جب وہ ہمیں اردو پڑھاتے تھے اور عام روش سے ہٹ کر تدریس و تعلیم کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور اقداری تربیت پر خاصا بلکہ زیادہ زور دیتے تھے۔زیادہ غالباً اس لئے کہ اس روایتی فوجی ڈسپلن کی گھٹن میں ہم جیسے کچی عمر کے طلبا کو اس رویے اور اس قسم کی تربیت کی زیادہ ضرورت تھی۔

ان کی کلاسیکی نفاست اور شائستگی شروع شروع میں ہمارے لئے ایک عجوبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔اگر کسی سوال کا جواب ہم نہ دے پاتے تو بجائے تھپڑ کی آواز سننے کے ہم یہ سنتے ''بیٹھ جایئے''۔ (please sit down)۔اس طرز تکلم سے ہم واقف نہ تھے۔بہرحال ان کے رویے سے ہمیں احساس ہوا کہ ہم بھی کچھ ہیں۔اپنی ذات کی اہمیت کا شعور خواہ وہ کتنا ہی مبہم کیوں نہ ہو۔''خودی'' کی تلاش اور استحکام کی طرف پہلا قدم ہوتا ہے۔زندگی میں شائستگی بلکہ sophistication کا احساس پہلی بار ان ہی کے حوالے سے ہوا۔

پانچویں اے میں ان دنوں چند لڑکے بہت حساس اور خاصے ذہین بھی تھے۔راشدی صاحب کے طرز تدریس سے وہ زیادہ مستفید ہوئے۔اور ان میں خاموشی سے ''علم'' حاصل کرنے اور اپنی انفرادیت کو پروان چڑھانے کا شوق پرورش پانے لگا۔

چند برس کے بعد میری فطری آزاد روی رنگ لانے لگی۔میری خودی اس روایتی فوجی ڈسپلن کی جکڑ بندیوں سے ٹکرانے لگی جس نے راشدی صاحب کے لئے مشکلات بھی پیدا کیں۔جب میں نے اپنے نام سے پہلے کیڈٹ کے بجائے سویلین لکھنا شروع کیا اور اس کی پاداش میں مجھے سزا ملی تو بہت آزردہ ہوئے۔ اس وقت سے میں ان کی دردمندی کا گرویدہ ہوں۔یہ سب سے قیمتی وصف ہے جو کسی فانی انسان میں ہوسکتا ہے۔میں اپنے لئے نت نئے باغیانہ اور رومانٹک نام آزمارہا تھا۔غالباً انھیں صحیح اندازہ ہوا کہ میری خودی،

اپنا راستہ نکالنے کے لئے بے چین ہے۔ چنانچہ انھوں نے میرے اندر کے ''جن'' کو راہ پر لگانے کے لئے مجھے تحریر و تقریر کی چھوٹی چھوٹی ذمہ داریاں دینی شروع کیں، میرا خط اچھا تھا۔ لکیروں سے حسن کاری کر سکتا تھا۔ کچھ لکھنے کا شوق بھی ہو چلا تھا۔ اپنے آپ کو تلاش کرنے اور اپنی منزل پانے کے لئے میں نے برسوں جدوجہد کی۔ لہولہان بھی بہت ہوا۔ لیکن اس تمام عرصے میں راشد صاحب کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی ہر قدم پر میرے ساتھ رہی۔

اپنی تصانیف ''کردار ساز''، ''مکالمات اقبال'' اور ''پھر علوی نامہ'' کے لئے انھوں نے بار بار مجھے یاد کیا۔ ''چراغوں کی قطار'' کے لئے خود یہ نذرانہ لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ آخر میں میں راشد صاحب کا ایک بہت اہم تاریخی اہمیت کا حامل تخلیقی کام ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔ تفکر و تدبر تعلیم کا مقصود و منتہا ہے۔ لیکن ہمارے نصاب میں جہاں تک مجھے معلوم ہے پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک کوئی ایسا باقاعدہ اہتمام نہیں جس سے تفکر و تدبر کی ذہنی قوت کے پروان چڑھنے میں مدد ملے۔ راشد صاحب نے تفکر کی مرحلہ وار مشقیں مرتب کر کے ایک نادر تخلیقی کام کیا ہے۔ میں نے ایک عرصہ ہوا اس کی کاپی ان سے اپنے استفادہ کے لئے مستعار لی تھی آج یہ امانت میں ملک و قوم کی نذر کر رہا ہوں۔

میجر جنرل طارق نظامی

(کالج نمبر 2015، زمانہ تعلیم 1956-1950ء)

1959ء میں کمیشن لے کر جب پہلی بار کالج آیا تو شام کا وقت تھا اور کالج کا سالانہ کنسرٹ شروع ہوا ہی چاہتا تھا۔ راشد صاحب مجھے موسیٰ ہال کے کاریڈور میں ملے اور میں ان کے ساتھ ہی ہال میں جا کر بیٹھ گیا۔ ڈراما شروع ہو گیا۔ بیچ بیچ میں راشد صاحب مجھ سے سرگوشیوں میں باتیں بھی کرتے رہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے ساتھ والی کرسی پر کیپٹن سید واصف علی بیٹھے تھے۔ ڈراما ختم ہونے پر انھوں نے ان سے مسلسل باتیں کرنے کی بے انتہا معذرت کی۔ قبلہ واصف صاحب اسلامیہ کالج بریلی میں ان کے استاد رہے تھے۔ وہ سرگوشیاں کیا تھیں؟ میرا ہی کیریر زیر بحث تھا۔ میں نے برسبیل تذکرہ کہا تھا کہ اے ایس سی میں گیا ہوں۔ نہ جانے ان کو یہ احساس کیسے ہوا کہ میں اس تقسیمِ کار سے خوش نہیں۔ پھر وہ شروع ہو گئے۔ انھوں نے کہا جہاں تک مجھے معلوم ہے، اب جی ایچ کیو کی پالیسی بدل گئی ہے، وہ ہر calibre کے آفیسرز کو ہر آرم اور سروس میں بھیج رہے ہیں اور ان کا ہر فیصلہ صحیح ہے۔ چونکہ talent کی تو ہر جگہ ضرورت ہوتی ہے انھوں نے بہت دل سوزی سے مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اصل چیز place نہیں

performance ہے۔ ان کے الفاظ یہ تھے ''طارق! تم جیسے ہو، ماشاءاللہ اپنی جگہ بنالو گے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ جو جہاں ہے جان لڑا کر اپنے کام کو کرے۔ اسی میں اسکی نجات بھی ہے اور قوم و ملک کی بھی۔ ملٹن نے تو یہاں تک کہا ہے ''They also serve who only stand and wait'' میں نے وضاحت بھی کی کہ سرایسی کوئی بات نہیں، مجھے تو نوکری کرنی ہے۔ جہاں حکم ملے گا خدمت بجا لاؤں گا۔ بہر حال وہ جو اتنی دیر بے چینی سے مصروف گفتگو رہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں میرا اور میرے کیرئیر کا کتنا خیال تھا۔

50 کے عشرہ میں ابتدائی ایام میں کالج میں اچھا خاصا ریجی منٹیشن (regimentation) تھا۔ ruthlessness کی وہ فضا تھی جو اس طرح کے طرز تربیت کا لازمی نتیجہ ہے۔ طلباء بھی بڑی حد تک cultural sophistication سے ناآشنا تھے۔ اس ماحول میں راشد صاحب کی نرم روی، نرم خوئی، شاعرانہ طبیعت اور دانشورانہ رکھ رکھاؤ ایک خوشگوار تضاد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سے بڑھ کر ان کی ہمہ گیر درد مندی تھی۔ ان کے دل میں سب کے لئے جگہ تھی۔ جو ہر قابل کو ڈھونڈنے کے لئے وہ سرگرداں رہتے تھے۔ گرتوں کو تھامنا انکی ہابی تھی۔ انھوں نے ریجی مینٹیشن کے مضر نفسیاتی عواقب کو خاصی حد تک کم کیا اور اپنی ذات اور رویوں سے تہذیبی نزاکتوں سے طلبہ کو لاشعوری طور پر مانوس کیا۔ یہ ان کی بڑی خدمت ہے۔ 1959ء کے بعد سالہا سال ان سے نیاز حاصل نہ ہو سکا۔ 81-1980ء میں ان سے ان کے گھر پر پھر ملاقات ہوئی۔ انہی دنوں میرے چند مضامین ''ہلال'' میں چھپے تھے۔ سعودی عرب میں ہوتے ہوئے اسلامی تاریخ اور تصوف کا جو تھوڑا بہت مطالعہ میں نے کیا تھا اس کے حوالے سے میں نے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ وہ میری قلم کاری سے بہت خوش بلکہ excited تھے۔ کہنے لگے ''اصل کام تخلیق ہوتا ہے مجھے خوشی ہے کہ تم تحقیق کی طرف آرہے ہو۔ اس سلسلہ کو آگے بڑھانا۔'' پھر ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد یکایک بولے، ''طارق! تم اپنے آپ کو نظامی کہلواتے اور لکھتے ہو۔ یہ بہت بڑی نسب ہے، اسکا خیال بھی رکھنا۔''

اگست 1983ء میں جب انکی اہلیہ سی ایم ایچ راولپنڈی کے آئی۔ ٹی۔ سی وارڈ میں تھیں تو جب پہلی بار میں اپنی بیگم کے ساتھ انکو دیکھنے گیا تو راشد صاحب وارڈ کے باہر ہی ملے۔ ان دنوں میری بیگم خود بھی کچھ علیل تھیں۔ راشد صاحب نے بیٹی کہہ کر میری مسز کی مزاج پرسی کی۔ وہ ان کی صحت کی طرف سے حد درجہ متفکر ہوئے اور بعد میں بھی استفسار کرتے رہے۔ مجھے مزید حیرت اس بات پر ہوئی کہ مسز راشد کے ''کوما'' میں ہونے کے زمانہ میں بھی بڑے انہماک سے ''کردار ساز'' کے لئے انٹرویو کر رہے تھے۔ میں نے اس پر

تعجب کا اظہار کیا تو کہنے لگے یہ کام میں صدقہ کے طور پر کر رہا ہوں۔ اللہ دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ تم اس کی کرامت دیکھنا۔ پھر واقعی کئی دن کے بعد مسز راشد ہوش میں آ گئیں اور سال ڈیڑھ سال اور حیات رہیں۔

راشد صاحب ایسے استاد افراد کا ہی نہیں قوم کا کردار بھی بناتے ہیں۔ جیسا کہ ''کردار ساز'' میں سلیم اختر کیانی نے انکے تعارف میں لکھا ہے کہ ان کا قلم ہی ان کے کردار اور کام کا بڑا بلیغ تعارف ہے۔ آخر میں ایک اور بات جس کا تذکرہ بطور خاص کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ 1950ء میں جب راشد صاحب کالج کے اسٹاف پر آئے تو نہ صرف سب سے کم عمر تھے بلکہ دیکھنے میں کم impressive بھی تھے۔ یوں کہنا چاہیے کہ سٹاف کی galaxy میں ایک ایسے ستارہ کا اضافہ ہوا تھا جو بظاہر زیادہ چمکدار نظر نہ آتا تھا۔ اس وقت حیدری صاحب اور اقبال صاحب ایسے تجربہ کار اساتذہ پہلے سے موجود تھے۔ ان کے ساتھ دو اور نئے استاد بھی آئے۔ مسٹر ماجد صدیقی اور مسٹر ریحان احمد بلگرامی صاحب کی اپنی بزرگانہ شان تھی۔ پھر کچھ عرصے کے بعد مسٹر علوی اور مسٹر شفیق آئے۔ یہ سب استاد اپنی اپنی جگہ بھاری پتھر تھے اور اپنے اپنے دائرہ کار میں یکتا و یگانہ۔ راشد صاحب موسیقی کی اصطلاح میں بہت دھیمے سروں میں شروع ہوئے۔ دوسروں کا جلال و جمال اپنی جگہ قائم رہا۔ اس میں کوئی قابل ذکر گروتھ (growth) نہیں ہوئی لیکن راشد صاحب کے ہاں یہ عمل جاری رہا۔ دو ایم اے انھوں نے یہیں مکمل کئے۔ ڈراما لکھنا اور پروڈیوس کرنا سیکھا۔ وہ اپنا مٹی کا دیا خاموشی اور عاجزی سے ان گوشوں میں جلاتے رہے جو نسبتاً کم روشن تھے۔

1967ء سے ایک جونیئر ہاؤس شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر ہوئے اور بیس برس تک اس کو اس طرح ایک منفرد ادارہ کی حیثیت سے چلایا کہ ملٹری کالج کا نام مزید روشن ہو گیا۔ یہ سب سے اہم کارنامہ ہے۔ آج آرمی کے بے شمار گھروں میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے اور کوئی یونٹ ایسی نہ ہو گی۔ جہاں کوئی نہ کوئی انھیں جانتا پہچانتا نہ ہو۔ یہ بڑی حد تک اسکین ہاؤس اور رابرٹس ہاؤس میں انکی انتہائی devoted اور creative ہاؤس ماسٹری کا ثمر ہے۔

1972ء سے انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ یہ بھی انکی اپنی growth کا قابل قدر پہلو تھا۔ انھوں نے کالج اور آرمی کے حوالے سے پاکستان کے لئے انگریزی میں دو کتابیں ایجوکیشن پر، دو لیڈر شپ پر، دو قائداعظم پر، دو اقبال پر، تین شہیدوں، ایک غازیوں اور ایک ''کردار ساز'' کے علاوہ کالج کی تاریخ کی دو جلدیں لکھیں یہ سولہ کتابیں اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ وہ جو ہمیں بتایا کرتے تھے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

وہ خود بھی اس اصول پر عمل پیرا رہے اور ایک اچھے طالب علم کی طرح ہر دم سیکھتے اور آگے بڑھتے رہے۔

ان کتابوں سے ملٹری کالج کو شہرت ہی نہیں ملی اس کا تشخص بھی ابھرا۔

غلام احمد

(کالج نمبر 2042، زمانہ تعلیم 1956-1951ء)

جوں ہی پیریڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجی ایک نوجوان نئے استاد کریم کلر سوٹ میں ہم رنگ فلیٹ ہیٹ لگائے کلاس میں داخل ہوئے۔ ہیٹ کو ہاتھ لگا کر کلاس کے تعظیمی کھڑے ہونے کا جواب دیا اور سٹ ڈاؤن پلیز کہہ کر اپنا ہیٹ اتار کر میز پر رکھا۔ ہم نے نوٹ کیا، ہلکے براؤن رنگ کی ٹائی پر سیاہ ستارے بنے ہوئے ہیں اور مانگ بیچ سے نکلی ہوئی ہے۔ لباس کی نفاست تو ان کی عمر کی مناسبت سے سمجھ آتی تھی۔ لیکن بیچ کی بزرگانہ مانگ سمجھ میں نہیں آئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ علی گڑھ کے اپنے کسی آئیڈیل استاد کی یاد میں مانگ بیچ سے نکالتے ہیں۔ یہ واقعہ 1951ء کا ہے۔ اس وقت میں ساتویں میں داخل ہوا تھا۔ یہ راشد صاحب تھے پروقار smartness کی تصویر۔ اپنے مختصر تعارف کے بعد وہ شروع ہو گئے ''پہلے تو آپ لوگ پراپر پوسچر (proper posture) سے بیٹھیے'' انہوں نے سننے، پڑھنے اور لکھنے کے پلس، مائنس اور زیرو پوزیشن میں بیٹھنے کے تین پوسچر باقاعدہ ڈیسک سامنے رکھ کر اور کرسی پر بیٹھ کر بتائے۔ پھر انھوں نے کتاب کاپی، قلم، پنسل کو ڈیسک پر رکھنے کا پیٹرن بتایا۔ قلم پنسل ڈیسک کی پین ٹرے میں کتاب دائیں طرف، اس کے بعد کاپی رکھوائی پھر کلاس کے ڈیسکوں کی ترتیب پر توجہ دی اور ان کو ایک سیدھ میں کروا دیا۔

یہ راشد صاحب سے میرا پہلا تعارف تھا۔ دو سال بعد راشد صاحب اسکین ہاؤس میں ہاؤس ماسٹر ہو کر آئے تو انھوں نے ہاؤس وال پیپر شروع کیا جس کا ایک حصہ انگریزی اور دوسرا اردو میں تھا۔ اردو سیکشن کی ایڈیٹری انھوں نے میرے سپرد کی۔ ہر سیکشن میں نمائندے مقرر کئے گئے اور لڑکوں سے لکھوانے کی مہم شروع ہوئی۔ اس وال پیپر کی وجہ سے بہت سے لڑکوں کی لکھنے کی جھجک دور ہوئی۔ خود میں کہانیاں نقل کرتے کرتے خود بھی کہانیاں لکھنے لگا۔ راشد صاحب کی مسلسل حوصلہ افزائی سے میں نے چند افسانے بھی لکھے۔ میرا ایک مختصر افسانہ جس کا عنوان 'خون' تھا انھوں نے لاہور کے ہفت روزہ 'قندیل' میں چھپوا بھی دیا۔ میری طرح پتہ نہیں کتنوں کو راشد صاحب نے ادب کے ذوق سے آشنا کیا ہوگا۔

تربیت کرنے کا بھی ان کا اپنا اسٹائل تھا۔ سکین ہاؤس ہی کا یہ واقعہ ہے کہ ہفتہ کے دن میں چھٹی جانے کے لئے کپڑے بدل کر تیار بیٹھا تھا کہ یکا یک بارش شروع ہو گئی۔ تمام کورٹ یارڈ میں پانی کھڑا ہو گیا۔ جب بارش رکی تو میں برآمدہ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب جاؤں گا کیسے کہ کچھ لڑکوں نے پانی کا کھیل

شروع کر دیا۔ جولڑ کا پانی میں گرتا لڑکے تالیاں بجاتے۔ کسی نے مجھے بھی پانی میں دھکا دیدیا اور خود غائب ہو گیا۔ میں پانی میں گر کر اٹھا تو طیش میں آ کر گرانے والے کو دو چار گالیاں دے دیں۔ ٹھیک اس وقت راشد صاحب اپنے گھر سے برآمد ہوئے۔ انھوں نے یقیناً مجھے گالیاں دیتے سن لیا تھا۔ انھوں نے صرف اتنا کہا۔ ''سفید چادر پر کوئی داغ اور بھی زیادہ برا لگتا ہے۔'' اس زمانہ میں ہفتہ وار چھٹی اتوار کو ہوتی تھی اور جمعہ کو ہاف ڈے ہوتا تھا۔ راشد صاحب جمعہ کو بڑے اہتمام سے علی گڑھ کٹ پائجامہ کے ساتھ سفید شیروانی پہنتے تھے۔ اہتمام اس لئے کہ جوتے اور موزے بھی سفید ہوتے تھے۔ یادش بخیر صبح جمعہ کے دن ہی کلاسز سے پہلے کمانڈانٹ کے دفتر کے پیچھے کالج فالن ہوتا تھا اور مولوی عزیز احمد تلاوت اور ترجمہ پیش کرتے تھے۔

1956ء میں، میں نے کالج کو خیر باد کہا تھا۔ 1972ء میں لندن سے واپس آیا تو ایک دن جی چاہا کہ کالج جا کر پرانی یادوں کو تازہ کروں۔ گیٹ پر جا کر سنتری سے پوچھا کہ کوئی پرانا استاد ہے۔ اس نے کہا یہ سامنے (شیر شاہ ہاؤس کا پہلا گھر) راشد صاحب رہتے ہیں۔ ابھی ابھی ادھر سے گزر کر گئے ہیں۔ گھر ہی پر ہوں گے۔ راشد صاحب کا نام سن کر دل بہت خوش ہوا۔ اس وقت میرے ساتھ ایک عزیز تھے۔ میں نے ان سے راشد صاحب سے اپنی پرانی نیازمندی کا تذکرہ کیا تو وہ بولے ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ تمھیں پندرہ بیس برس کے بعد پہچانیں گے کیسے'' میں نے کہا ''راشد صاحب، راشد صاحب ہیں ضرور پہچانیں گے۔'' مختصر یہ کہ شرط یہ ٹھہری کہ اگر وہ نہ پہچانیں تو میں سو روپے دونگا۔ اگر وہ پہچان گئے تو وہ مجھے صرف دس روپے دیں گے۔ دس قدم کا تو فاصلہ تھا ہم باتیں کرتے ہوئے شیر شاہ ہاؤس کی طرف مڑے ہی تھے کہ سامنے راشد صاحب کھڑے نظر آئے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ شرط سے زیادہ اپنی انا کی بات تھی۔ ہم ادھر سے آگے بڑھے، ادھر سے وہ بڑھے۔ انھوں نے ایک لمحہ لیا اور کہا ''ہیلو غلام احمد! 2042 ہاؤ آر یو؟'' میں شرط جیت چکا تھا۔

جنوری 88ء میں میں اپنے دونوں بچوں کو انہیں دکھانے لے گیا۔ یہ ہیں میرے سر، ''کردار ساز'' انہوں نے لکھی ہے۔ دوران گفتگو میں نے گلہ کیا آپ نے ''علوی نامہ'' مفت ہی بانٹ دیا ہمیں کچھ contribute کرنے نہیں دیا۔'' غلام احمد نذرانہ کی چیز کو بیچا نہیں جاتا۔ میرا ارادہ تو ''ایک معلم'' کے عنوان سے ان پر پوری کتاب کرنے کا ہے۔ اتنا بڑا intellectual شاید پھر کبھی کالج کو نہ ملے۔ لیکن ملنا چاہیے تب ہی تو بات بنے گی، اس لئے تو '' علوی نامہ'' لکھا اور اس لئے ''ایک معلم'' لکھوں گا۔ تا کہ علوی کالج کو ملتے رہیں۔''

شربت خان محسود
(کالج نمبر 2053،زمانہ تعلیم 1960-1951ء)

1951ء میں راشد صاحب نے مجھے پانچویں میں اردو پڑھائی تھی۔وزیرستان کے پختون بچہ کو اردو زبان وبیان کی نزاکتوں کا کیا علم ہوتا۔میں اپنے انداز سے اردو بولتا تھا۔ایک روز میں نے کسی بات پر نہیں جی، کہا اور کئی بار دہرایا۔انہوں نے مجھے ٹوکا۔نہیں جی، 'نہیں' جی نہیں کہیئے جی نہیں۔یا جی ہاں۔ہاں جی، نہیں۔انھوں نے یہ نکتہ اتنی نرمی سے سمجھایا کہ آج تک میرے دل میں نقش ہے۔بجائے بیٹھو کہنے کے ہمیشہ تشریف رکھیئے کہتے۔خواہ لڑکے نے کتنا ہی غلط جواب دیا ہو۔انسان ہونے کے ناطے چھوٹے بڑے ہر ایک کا احترام۔یہ بات میں نے خاص طور پر راشد صاحب سے سیکھی۔انھوں نے اس کم عمری میں ہمیں social graces سے آگاہ کیا۔ہماری تہذیبی تربیت انہوں نے کی اور وہ عادتیں جو کارکردگی کو بڑھاتی ہیں اور کسی بھی پروفیشن میں کامیابی کی بنیاد ہیں، انہوں نے خاص طور پر پروان چڑھائیں۔کیریئر بلڈنگ اور کیریکٹر بلڈنگ یہ دونوں کام انھوں نے ساتھ ساتھ کیئے۔انہوں نے ''کردار ساز'' کتاب لکھی لیکن وہ خود بھی بڑے پائے کے کردار ساز تھے۔چالیس سال تک وہ کلاس اور کلاس سے باہر کردار سازی کرتے رہے، اب ان کی کتابیں وسیع تر دائرہ کار میں کردار سازی کر رہی ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالحلیم (امتیازی سند)
(کالج نمبر 2069،زمانہ تعلیم 1958-1951ء)

ان کی ایک ادا جو مجھے بہت اچھی لگی ہے اور جسے میں نے بھی اپنا لیا وہ یہ ہے کہ ہم لوگ جب بھی انہیں السلام علیکم کہتے تو وہ بھی السلام علیکم کہتے۔ایک روز ہمت کر کے میں نے پوچھا۔سر آپ بھی جواب میں اسلام علیکم کیوں کہتے ہیں۔فرمایا۔میں جواب میں نہیں کہتا، میں پہل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔جو آپ کے تیز تیز السلام علیکم سے ٹکرا جاتا ہے اور آپ لوگوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے جواب میں السلام علیکم کہا ہے پھر کہا ''سلام کیا ہے؟ سلامتی کی دعا ہے نا۔اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے بچوں کو پہلے میں دعا دوں۔''

میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی چھوٹے بڑے ہر ایک کو السلام علیکم کہتے ہونگے۔آدمی اپنی سوچ سے پہچانا جاتا ہے۔بہرحال مجھ ایسا کھلنڈرا لڑکا بھی انکی اس سوچ سے متاثر ہوا۔اب میں التزام سے پہلے سلام

کرنے اور السلام علیکم کہنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہ عادت اتنی راسخ ہوگئی ہے کہ جب بھی سلام کرتا ہوں السلام علیکم منہ سے نکلتا ہے۔ راشد صاحب نے جو کچھ پڑھایا تھا وہ کبھی کا پرانا ہو چکا۔ ان کتابوں سے بہت آگے بہت سی کتابیں پڑھیں لیکن انھوں نے جو کچھ سکھایا تھا جو تربیت دی تھی وہ آج بھی تازہ ہے بلکہ اس سے زندگی بنی ہے۔ پہلے سلام کرنے ہی کو دیکھا جائے تو یہ ایک علامت ہے اس رویے کی کہ آدمی اچھی بات میں پہل کرے۔ کار خیر میں پہلا قدم اٹھائے ۔اگر میدان جنگ ہے تو خود آگے بڑھ کر سینہ سپر ہو۔

خدا کرے کالج کو سعید راشد ملتے رہیں

لیفٹیننٹ جنرل محمد اشرف

(کالج نمبر 2079، زمانہ تعلیم 1951-1956ء)

1983ء میں راشد صاحب اپنی بیگم کے علاج معالجے کے سلسلہ میں سی۔ایم۔ایچ راولپنڈی آتے جاتے رہتے تھے۔ اس زمانہ میں میں جی ایچ کیو میں پوسٹ تھا۔ چنانچہ ایک آدھ بار ان سے سی ایم ایچ میں ملاقات بھی ہوئی۔ اس دوران پنڈی میں اور اسکے بعد جب میں بہاولپور میں تعینات تھا ان کے پیغامات بڑے تواتر سے ملتے رہے کہ میں انکی کتاب ''کردار ساز'' کے لئے کچھ لکھوں۔ آخر کار ان کے اصرار سے مجبور ہو کر اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود میں نے ایک آرٹیکل اپنے قلم سے لکھ کر بھیجا۔ 1950ء کے عشرہ میں، میں نے کالج میں ان کا dedication دیکھا تھا اس سے زیادہ 1980ء کے عشرہ میں دیکھا۔ dedication کے بغیر کوئی ادارہ زندہ و تابندہ نہیں رہ سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ dedication ان کا ذاتی commitment تھا یا institutionalised تھا۔ بنیادی اہمیت فرد کی نہیں ادارہ کی ہوتی ہے۔ ایک فرد خواہ کتنا ہی باکمال اور devoted ہو بہرحال ایک life span رکھتا ہے اور وہ حرف آخر بھی نہیں ہوتا۔ دیر سویر اس کو منظر سے ہٹنا بھی ہوتا ہے۔ کسی کا اس کی جگہ لینا اور اس سے آگے بڑھنا ادارہ کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کوشش کرنی چاہیے کہ traditions اور معیار institutionalized ہوں۔ ملٹری کالج کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیدری صاحب کی آج تک جگہ خالی ہے۔ پھر علوی صاحب گئے۔ ان کا میدان بھی سونا پڑا ہے۔ پھر راشد صاحب ریٹائر ہوئے۔ ہم کب تک افراد کے سہارے چلتے رہیں گے کہ ان کے منظر سے ہٹتے ہی ان کی جگہیں بھی خالی پڑی رہیں۔ The institution, the country can not afford it اس لئے میں ضروری سمجھتا ہو کہ infrastructure میں ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی جائیں تا کہ talent اور dedication کا

inflow نہ صرف جاری رہے بلکہ اس کی quality میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔علم کی روشنی کو، کردار کو، dedication کو پہلی ترجیح بنانے کی روایت کی ابتداء کبھی نہ کبھی تو کرنی پڑے گی اور جتنی جلد کر لی جائے بہتر ہے۔

''چراغوں کی قطار'' کا مسئلہ اس ادارہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اس لئے یہ دیکھنا لازمی ہے کہ یہ قطار ٹوٹنے نہ پائے۔

کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

ڈاکٹر محمد خاں

(کالج نمبر 2087، زمانہ تعلیم 1957-1951ء)

ہم آٹھویں درجے میں تھے کہ راشد صاحب نے ایک روز اردو زبان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آریائی، عبرانی اور سامی زبانوں کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ زبان کا مطالعہ ایک علیحدہ علم ہے یعنی لسانیات (philology) اور کہا کہ کبھی موقع ملے تو لسانیات پر ایک دلچسپ کتاب The Loom of Language پڑھنا۔غور کیجئے کہ کہاں آٹھویں کلاس اور کہاں یہ تحقیقی باتیں۔لیکن اس سے زیادہ حیرت کی بات میرے لئے یہ ہے کہ جب کالج سے میڈیکل گراؤنڈ پر فارغ ہو کر میں نے ایبٹ آباد میں پڑھنا شروع کیا تو میں نے انگریزی کو لاشعوری طور پر اپنی خصوصی دلچسپی کا مرکز بنایا اور جب مختلف مرحلوں سے گزر کر پی۔ایچ۔ڈی کی منزل آئی تو خود میرا قدم روسی زبان کے تحقیقی مطالعہ کی طرف اٹھا۔گویا Loom of Language نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔فی الحال پاکستان میں روسی زبان میں اس منزل تک پہنچنے کا شرف تنہا مجھے حاصل ہوا ہے اور اس اعزاز کا سرا ملٹری کالج تک اور وہاں مسٹر راشد تک پہنچتا ہے۔

1951ء میں انہوں نے کالج ہال میں کلچر کے موضوع پر ایک توسیعی لیکچر دیا تھا۔جس کا تعارف سی آئی کیپٹن ابراہیم نے کرایا تھا۔راشد صاحب نے اس لیکچر میں کلچر اور بلیف (belief) وغیرہ پر بحث کی تھی۔اس وقت تک میں ان لفظوں کے معنی اور مفہوم دونوں سے ناواقف تھا۔بہر حال دوسرے دن میں نے کلاس میں پوچھا سر آپ کا لیکچر ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔کلچر، بلیف اور environment یہ کیا بلا ہیں۔وہ مسکرائے اور بولے ہر چیز کا فوراً سمجھ میں آ جانا ضروری نہیں ہوتا۔کھیت میں بیج ڈالنے اور فصل لہلہانے میں کچھ وقت کا فاصلہ بھی ہوتا ہے۔میں نے بیج ڈال دیا ہے کہ کتاب، امتحان، کمیشن سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔آگے تم جانو۔کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولے۔belief اور کلچر میں بیج اور فصل کا رشتہ

ہے۔ بلیف سے ہی کلچر پھوٹتا ہے۔ کہنے لگے اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ مہمان سے خواہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو معانقہ کرنا، دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملانا اپنے ساتھ ایک قاب میں کھانا کھلانا ہمارے قبائلی کلچر کا خاص طور سے حصہ رہا ہے۔ اس رواج کی اصل، زمانہ قدیم کا یہ belief تھا کہ جسمانی لمس اور کھانے کے اشتراک سے روحوں میں بھی اشتراک ہو جاتا ہے اور پھر جادو کا اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اب بھی عورتوں کے بالوں کو دیواروں کے سوراخوں اور بچوں کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کو چھت پر پھینکنے کا رواج ہے۔ اس کی اصل بھی یہی belief ہے کہ انسانی جسم کے حصے بال، دانت، جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی جسم سے روحانی رابطہ برقرار رکھتے ہیں۔ اگر بالوں یا دانتوں پر کوئی عمل کیا جائے تو اس کا اثر اس پر پڑے گا جس کے وہ بال یا دانت تھے وغیرہ وغیرہ۔ فرمایا یہ علم بشریات Anthropology کہلاتا ہے۔ کبھی علم کی سرحدوں کو وسیع کرنے کو دل چاہے تو جارج فریزر کی کلاسیکی کتاب 'شاخِ زریں' 'The Golden Bough' پڑھنا، ذہن کے بہت سے دریچے کھلیں گے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس طرح کسی موقعہ پر انھوں نے رابرٹ برلفالٹ کی کتاب The Making of Humanity کا ذکر بھی کیا تھا۔

اس وقت ہمیں یہ باتیں اور یہ حوالے قطعاً دور از کار نظر آتے تھے۔ لیکن یقیناً وہ visionary تھے۔ ان کی آنکھیں یقیناً وہ بہت کچھ دیکھ رہی تھیں جس کا ہمیں اس وقت وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جب میں نے زبان، ادب اور علم کی وسیع تر دنیا میں قدم رکھا اور کلچر اینڈ انارکی، لوم آف لینگوئج، دی میکنگ آف ہیومینٹی وغیرہ نظر سے گزریں تو راشد صاحب بہت یاد آئے۔ اب میں خود تعلیم کے شعبے سے متعلق ہوں اور میرا یہ پختہ خیال ہے کہ ہمیں تخلیقی استادوں (creative teachers) کی ضرورت سب سے زیادہ ہے۔ وہ بھی پرائمری اور ثانوی مدارج میں تاکہ شروع سے رخ سورج کی طرف ہو۔

بریگیڈیئر رب نواز خان

(کالج نمبر 2092، زمانہ تعلیم 1958-1951ء)

ملٹری کالج کے بہت سے طلبہ کے لئے جو پچھلے 38 سال سے وہاں زیرِ تعلیم رہے ہیں مسٹر راشد کی حیثیت ایک جگت باپ کی سی ہے۔ اگر میں کہوں کہ ہم میں سے کچھ پر ان کی شخصیت کا اثر ہمارے والدین سے بھی زیادہ ہے تو یہ کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کیونکہ ہم تاثر پذیر عمر میں ان کے زیرِ تربیت اس سے زیادہ عرصے رہے جتنا وقت اس زمانہ میں ہم نے اپنے گھروں میں گزارا اور جن کو ان سے زیادہ قریب ہونے یا رہنے کا موقع ملا انکے لئے تو وہ استاد، راہنما اور دوست سب کچھ رہے ہیں۔

مسٹر راشد کے بارے میں میری طرح بہت سے اولڈ بوائز نے یہ ایک بات ضرور نوٹ کی ہوگی کہ ان کے شاگردوں سے بھی زیادہ شاگردوں کے والدین انکو محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔ آرمی کے بے شمار گھروں میں ان کا نام ایک جانا پہچانا نام ہے۔ بعض نے تو اپنے بچوں کے نام بھی انکے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔ خود میرے والد صاحب ان سے پہلی بار جولائی 1951ء میں ملے تھے جب وہ مجھے کالج میں داخل کروانے لے گئے تھے۔ اب انکی عمر 84 برس کی ہے لیکن جب بھی کبھی ملٹری کالج کا ذکر آتا ہے یا میں مٹور جاتا ہوں تو وہ راشد صاحب کا ضرور پوچھتے ہیں۔ ''بڑا سچا بندہ ہے۔'' یہ فقرہ ہمیشہ کہتے ہیں۔ پچھلے چھتیس سینتیس برس سے وہ انھیں یاد کرتے نہیں تھکتے۔ مجھ سے بااصرار کہا کرتے ہیں کہ سر کی کوئی خدمت کرو۔ پچھلے سال میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی ان کی ملاقات کیسے ہوئی۔ بولے ''یہی تو خاص بات ہے۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ جولائی 1951ء کی سات تاریخ کو میں تمھیں کالج داخلے کے لئے لے کر گیا تو روزوں کے دن تھے۔ افطار کے وقت میں تمھیں لئے اس جگہ کھڑا تھا جہاں اس زمانہ میں وار میموریل تھا (اور اب یادگار شہداء ہے) سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ افطار کے لئے سرائے جاؤں یا کیا انتظام کروں کہ اتنے میں آپ کے راشد صاحب سفید کرتے پائجامے میں ادھر آئے اور اپنے تعارف کے ساتھ کہا افطار کا وقت ہوگیا ہے آپ کو زحمت نہ ہو تو میرے ساتھ افطار کرلیں۔ وہ اس زمانہ میں رابرٹس ہاؤس کے بائیں ہاتھ کے گھر میں اکیلے رہ رہے تھے۔ برآمدہ میں دو کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہاں انھوں نے ہمیں سادہ سا افطار کروایا اور نماز کے لئے اندر سے کپڑے کی جائے نماز لائے۔ یہ ہے ہماری پہلی ملاقات کی روداد۔ پھر جب تم سے ملنے جاتا تھا تو ان سے ضرور ملتا تھا۔ پھر وہ اس ہاؤس میں چلے گئے جو کمانڈانٹ کے دفتر کے ساتھ ہے۔ وہاں ان سے بارہا ملاقات ہوئی لیکن اس پہلی ملاقات کی یاد دل سے نہیں جاتی۔ اسی دن میں نے ان سے کہا تھا کہ اس بچے کا خیال رکھئے گا۔ پھر تمہارا کتنا خیال رکھا۔ اس کا حال تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔''

یہ تاثرات صرف میرے والد ہی کے نہیں ہیں، ان بے شمار والدین کے ہیں جن سے ان کی رسم و راہ ہے۔ یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ کراچی اور سکھر میں انکے بھائی بھتیجے اور دوسرے قریبی عزیز رہتے ہیں لیکن نہ کبھی انھوں نے ان کا تذکرہ کیا اور نہ وہاں آئے گئے۔ ان کی رشتہ داری، قرابت داری جو کچھ بھی ہے اپنے شاگردوں سے ہی ہے۔ حد یہ کہ انھوں نے اپنی ڈاکٹر بیٹی کی شادی بھی ایک اولڈ بوائے سے ہی کی۔ میں نے اس زمانے میں ان سے پوچھا تھا کہ لڑکا کیسا ہے تو انھوں نے اس کی جو خوبیاں گنوائیں ان میں سے پہلی خوبی یہ تھی برخوردار، اولڈ بوائے ہے اور انکے ہاؤس شیر شاہ ہاؤس کا پریفکٹ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آج تک کسی اور نے ملٹری کالج سے اتنی اور اس طرح محبت نہ کی ہوگی۔ میں نے ایک بار ان سے

پوچھا تھا کہ آپ نے بہتر کیریر بشمول پی ایم اے کی انسٹرکٹری کے بہت سے مواقع قربان کر دیئے کیوں؟ تو انہوں نے انگریزی میں جواب دیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ یہ ایک قومی اہمیت کا ادارہ ہے، یہاں آپ کو ان طلبہ کی تعلیم وتربیت کا موقع ملتا ہے جو ملک وقوم کیلئے براہ راست کچھ معنی رکھتے ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے پاکستان کی بہت موثر خدمت ہوسکتی ہے۔ ملک کے طول وعرض میں ملٹری اور سول میں انکے شاگرد عالمگیریز جس طرح کلیدی جگہوں پر ہیں اور جس انداز سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملٹری کالج میں بظاہر بہت گھاٹے پر نوکری کرنا ان کے نقطہ نظر سے دراصل کتنے فائدہ کا سودا تھا۔

میں نے پہلی بار انکو 7 جولائی 1951ء کی شام کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سفید ململ کا کرتا اور علی گڑھ کٹ پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ اس وقت میرے لئے یہ لباس خصوصاً علی گڑھ کٹ تنگ پائنچوں کی وجہ سے نیا تھا۔ اس کے چند روز بعد انہیں اپنی کلاس چھٹی میں دیکھا جب وہ ہمیں انگریزی پڑھانے آئے۔ اس وقت وہ بے داغ سفید قمیض، سفید پتلون اور نیوی بلیو ٹائی میں ملبوس تھے۔ ان کے کلاس میں داخل ہوتے ہوئے جس چیز کو ہم نے نوٹ کیا وہ انکی غیر معمولی لباسی نفاست تھی۔ گرمیوں میں مستقل طور پر انکا یہی لباس ہوتا تھا۔ صرف ٹائیاں بدلتی رہتی تھیں۔ ٹائیوں میں بھی ڈارک براؤن اور ڈارک بلیو رنگ کی دو ٹائیاں انکی پسندیدہ تھیں۔ دونوں پر زرد رنگ کے ستارے بنے ہوئے تھے۔ کرنل رفیق نے جب اپنے زمانہ میں کالج ٹائی رائج کی تو وہ بھی ڈارک بلیو ٹائی جس پر ایم سی کا مونو گرام بنا ہوا تھا مستقل طور پر پہننے لگے۔ جولائی 1951ء سے تقریباً 36 برس کے بعد 20 اپریل 1987ء کو جب میں بریگیڈیئر عثمان کمانڈنٹ ملٹری کالج سے ملاقات کے لئے گیا تو ان کے دفتر کے شیشہ سے میں نے یہ حیرت افزا اور قابل فخر نظارہ دیکھا کہ راشد صاحب گرمیوں کے اسی لباس، سفید قمیض اور سفید پتلون میں اسی طرح پیریڈ شروع ہونے سے ایک منٹ پہلے آ کر کھڑے ہوئے اور گھنٹی بجنے پر اسی تیزی سے کلاس روم کی طرف بڑھے۔ مجھے یقین ہے کلاس میں داخل ہوتے اسی طرح اپنے مخصوص اسٹائل سے سلام کا جواب دیا ہوگا۔ اور اسی طرح بے حد شائستگی سے سٹ ڈاؤن پلیز کہا ہوگا۔

میں چونکہ چند لمحوں تک باہر کا یہ نظارہ دیکھنے میں محو ہو گیا تھا۔ تو بریگیڈیئر عثمان نے مجھ سے پوچھا کہ باہر کیا ہے تو میں نے بتایا کہ یہ بات ہے۔ انہوں نے کہا میں بھی جب سے آیا ہوں میں نے بھی پروفیسر راشد کو لباس کے اور وقت کے بارے میں بہت ہی meticulous پایا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی عمر کے باوجود وہ بہت agile ہیں۔ سڑک پر بہت تیز اور اپ رائٹ چلتے ہیں۔

جاڑوں میں راشد صاحب سوٹ پہنتے تھے۔ شروع شروع میں یعنی 50 کے عشرہ کے اوائل میں پک

اینڈ پک کا ڈارک براؤن، گیرڈین کا سلیٹی رنگ کا اور رات کو دھاری دار نیوی بلیو سوٹ پہنتے تھے۔ رفیق صاحب نے 1955ء میں سارے اسٹاف کے لئے سٹیل گرے رنگ کا سوٹ مقرر کیا تو وہ کلاسز میں گرے سوٹ استعمال کرنے لگے۔ دوسرے سوٹوں کا استعمال دوسرے موقعوں پر کرتے تھے۔

کمیشن کے بعد اکثر میرا کالج جانا ہوا، ان کو ہمیشہ وہی پرانے سوٹ پہنے ہوئے دیکھا۔ اس دوران سوٹ کے ڈیزائن، پتلون کے پائنچوں کی چوڑائی میں کمی بیشی ہوتی رہی لیکن راشد صاحب وہی 17 انچ موری کی پتلونیں پہنتے رہے۔ 1983ء میں جب میں لاہور میں 4 کور کا اسٹاف افسر تھا تو ایک ملاقات کے موقع پر یوں ہی لباس کا ذکر چھڑ گیا۔ انکے گرم لباس کی یکسانیت کے بارے میں استفسار کیا تو بتایا ''کوئی معاشی مسئلہ نہ تھا۔ چھ سات سوٹ تھے اور نئے بھی بنا تا رہتا تھا۔ ٹائی تو ہر روز بدلتا تھا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ کلاس میں بورڈ پر کچھ لکھنے کے لئے میں نے رخ بدلا تو میں نے ایک لڑکے کو over-hear کیا کہ وہ ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ سر نے آج منگل کو اتوار والی لائٹ براؤن ٹائی باندھی ہے۔ اس روز سے میں نے کالج کی نیوی بلیو ٹائی کے ساتھ گیرڈین کا گرے سوٹ پہننا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ لڑکوں کی توجہ لباس پر مرکوز نہ رہے۔ شخصیت پر رہے۔ میرا خیال تھا اور ہے کہ صرف نفاست کافی ہے اور ضروری ہے۔'' راشد صاحب کو اس زمانہ میں ٹائی کی گرہ کو بار بار ایڈجسٹ کرنے کی عادت تھی غالبًا اب بھی ہوگی۔ ان کا بعض چیزوں جیسے punctuality اور لباس کی propriety پر اصرار اس وقت ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ شارٹ کٹ کے تو وہ دشمن تھے۔ ہمیشہ ٹوکتے تھے اور لمبا لیکچر پلاتے تھے۔ (جو سزا سے زیادہ تکلیف دہ لگتا تھا) آج یہ سب چیزیں ایک مقصد کے pattern میں فٹ ہوتی نظر آتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم بلندیوں کی طرف بڑھیں۔ ایک خاص طرح کا لائف اسٹائل اس مقصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ تھا اور اب انھوں نے اپنے تربیتی تصورات کی وضاحت اپنی کتاب Living With Leadership میں بڑی خوبصورتی سے کردی ہے۔ راشد صاحب methodical بھی بہت تھے۔ کسی مقابلہ کی تیاری saturation point تک کراتے تھے۔ مثلاً ہاؤس کی ٹیم کو انٹر ہاؤس تقریری مقابلہ میں حصہ لینا ہے تو وہ آخری دو چار ریہرسل اسی ہال میں لیجا کر، اسی روسٹرم پر کھڑا کرا کے کراتے تھے۔ وہ perfectionist تھے۔

اسکین ہاؤس کے ہاؤس پریفیکٹ کی حیثیت سے میں انکی رہائش کے بالکل متصل رہتا تھا۔ ایک تو یہ کہ انکے بچوں کے رونے کی آواز تو کبھی کبھار آجاتی تھی لیکن خود انکی اور انکی مسز کی آواز میں نے کبھی نہیں سنی۔ شاید میاں بیوی خاموشی سے ہی زندگی گزارتے تھے۔ البتہ انکی بیگم جن کا تذکرہ میں آگے چل کے

آنٹی کے نام سے کرونگا، خاص خاص ڈشز سے مجھے اکثر نوازتی رہتی تھیں۔ اتوار کے دن صبح کو وہ اکثر مجھے اور دوسرے سینئر لڑکوں کو اپنے مختصر ڈرائنگ روم میں جہاں کتابوں کے دوریکوں اور بڑے سائز کے مرفی ریڈیو کو نمایاں حیثیت حاصل تھی بلاتے تھے۔ یہ غیر رسمی اسٹڈی سرکل تھا۔ ریڈرز ڈائجسٹ، السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا، السٹریٹڈ ویکلی آف پاکستان، مرر، لیل ونہار اور نقوش سے تعارف انہوں نے کرایا۔ رسالے، میگزین اور شام کو اکثر کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے۔ بی بی سی کی خبریں سنواتے۔ یہیں تقریریں لکھواتے اور ریہرسل کرواتے ۔ لٹریری سرکل کا اجلاس بھی اسی کمرہ میں ہوتا تھا۔ لن بوٹانگ کی The Importance of Living اور آندرے موروا کی The Art of Living میں نے پہلے پہل انہیں کے پاس دیکھیں۔ ان مجلسوں میں ہم بے تکلفی سے اپنے مسائل اور کالج کے بارے میں گفتگو کرتے تھے لیکن ایک فاصلہ تھا جسے ہر وقت برقرار رکھا جاتا۔ جس کو liberty لینا کہتے ہیں وہ ممکن نہیں تھا۔ ان کے کردار اور calibre سے awe کا سا احساس ہوتا تھا۔ وہ بنیادی طور پر معلم اور مربی تھے۔ ان کے behaviour pattern کا اثر میری طرح انکے بے شمار شاگردوں نے قبول کیا ہوگا۔ بے شمار طلباء کو ان کے قریب ہونے کا احساس ہوا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا favorite کوئی بھی نہیں تھا۔ جس طرح ایک ماں ایک بچہ کے بعد دوسرے بچہ کی پرداخت میں لگ جاتی ہے۔ وہ سال بہ سال ایک انٹری سے دوسری انٹری کو وہی توجہ، وہی محبت، وہی خدمت دیتے رہے۔ I have a strong feeling کہ انکی پہلی محبت پاکستان سے تھی۔ اسی حوالے سے وہ سینتیس اڑتیس سال تک ملٹری کالج کی خدمت کرتے رہے۔ جو بچھڑ گیا اس کے پیچھے بھاگے نہیں۔ جو آ گیا اسے گلے لگانے میں دیر نہیں کی۔

میں نے کئی برس ان سے کلاس روم میں بھی پڑھا ہے۔ پڑھانے میں ان کا اپنا اسٹائل تھا۔ اپنا mannerism تھا۔ کلاس میں ترتیب ہو، کمرہ صاف ستھرا ہو، روشن دان دروازے کھڑکیاں کھلی ہوں۔ سارے ڈور اور ونڈ واسٹاپس لگے ہوئے ہوں۔ نوٹس بورڈ انگیٹھی پر سلیقہ سے رکھا ہو۔ بورڈ صاف ہو، لڑکے کرسیوں پر سیدھے بیٹھے ہوں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ چیزیں ہیں جو ان کے ساتھ لازم وملزوم تھیں۔ جس کو جواب نہ معلوم ہوتا اس سے سوال نہیں پوچھتے تھے اور اگر پوچھ بیٹھتے اور وہ اپنا سا منہ لے کر کھڑا ہو جاتا تو بار بار I'm sorry کہنا ان کا مخصوص انداز تھا۔ روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر کبھی نہیں پڑھایا۔ درمیان، میں کھڑے ہوتے یا دائیں سے بائیں مسلسل گردش کرتے رہتے۔ ایک طرف جملہ شروع کرتے دوسری طرف جا کر ختم کرتے۔ مقصد یہ تھا کہ سب پر توجہ رہے، سب سنیں۔

کلاس میں داخل ہوتے تو فوراً شروع ہو جاتے جیسے کوئی ایمرجنسی ہے۔ کبھی کبھار اگر پڑھنے کو دل نہیں

چاہتا تھا تو انکو ادھر ادھر کی باتوں میں لگانا مشکل تھا۔انہوں نے کلاس میں کالج کی یا ہاؤس کی کیا،اپنے گھر اور بچوں کی بات بھی نہیں کی۔ان کی یکا یک خاموشی کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بات ان کو ناگوار گزری ہے۔ڈیسک پر کہنیاں رکھ کر یا چہرہ ہاتھ میں لے کر کوئی انکی کلاس میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔کلاس میں چاک کے ان ٹکڑوں سے لکھتے تھے جو دوسرے استاد نیچے پڑے چھوڑ جاتے۔کہتے یہ ٹکڑا بھی پاکستان کا ہے۔کہتے میں نے اس سکول میں پڑھا ہے جہاں گھر گھر سے مٹھی مٹھی بھر آٹا جمع کر کے بلیک بورڈ کیلئے کھریا یا ڈیسکوں کیلئے روشنائی خریدی جاتی تھی۔آج پاکستان کے طفیل ہم کھریا کے بجائے چاک استعمال کر رہے ہیں۔اس طرح فالتو پنکھوں اور بجلی کے بلبوں کو اپنے ہاتھ سے بند کرتے رہتے تھے۔ان کا یہ جملہ کہ قائداعظم نے فرمایا ہے کہ اپنی چیز کو ضائع کرنا بے وقوفی اور قومی چیز کو ضائع کرنا جرم ہے۔میری طرح ملٹری کالج کی کئی نسلوں نے ان سے بار ہا سنا ہوگا۔patriotism یا وطن دوستی انکی مستقل تھیم تھی۔اس زمانہ میں ایک سے ایک بڑھ کر استاد تھا لیکن پاکستانیت کے حوالے سے خاص طور سے وہی پڑھاتے اور تربیت کرتے تھے۔

ان کی کلاس میں نرمی سے firm ہونے کی مثالیں میں دے چکا ہوں۔اب میں ان کے fair ہونے کی دو مثالیں دونگا۔کرنل رفیق کے دور میں آنر سسٹم رائج تھا۔اسکین ہاؤس میں بھی دوسرے ہاؤسوں کی طرح آنر شاپ تھی۔جس میں خورد برد کرنے اور ہاؤس میں دوسری چھوٹی موٹی چوریاں کرنے میں ایک ایسا لڑکا ماخوذ ہوا جو اس دور کے سرخ فیتوں سے بہت قریبی طور پر منسلک تھا۔راشد صاحب نے اسے ایک دو وارننگ دے کر اسکی رپورٹ کر دی اور پھر اسے نکلوا کر چھوڑا۔وہ کہا کرتے تھے بے جا رعایت آخر کار کسی نہ کسی پر ظلم ہوتا ہے۔انکی اصول پسندی اور fairness کا شکار ایک بار میں خود ہوا۔کالج ہیڈ بوائے بننے سے پہلے جن دنوں میں اسکین ہاؤس میں ان کا ہاؤس پریفیکٹ تھا اور ان کے گھر کے ملحقہ کمرہ میں رہتا تھا۔خود میرے چھوٹے بھائی نے کالج میں داخلہ کا امتحان دیا لیکن چونکہ میں انکو جانتا تھا اس لئے اس کا ذکر ان سے نہیں کیا۔امتحان کا نتیجہ نکلا اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔میں پھر بھی خاموش رہا۔چند روز بعد خود ہی کہا ''رب نواز! مجھے افسوس ہے کہ تمہارا بھائی چند نمبروں سے رہ گیا۔تیاری پوری نہیں تھی۔اب کے چھٹیوں میں جاؤ تو اسے تیاری کرانا۔تھوڑی سی کسر باقی ہے۔'' میں سن کر حیران ہوا۔سچ پوچھیئے کہ کچھ افسوس ہوا۔میری حیرانی دیکھ کر پوچھا کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے اس کا علم نہ تھا۔میں نے جواباً عرض کیا۔سر،میرا تو یہی خیال تھا۔بولے،نہیں مارک کرتے وقت مجھے خوب معلوم تھا کہ یہ تمھارے بھائی کا پرچہ ہے،میرا دل تو چاہتا تھا کہ تمہارا بھائی پاس ہو جائے لیکن میں مجبور تھا۔یاد رکھو عموماً ایک کے ساتھ کی ہوئی رعایت دوسرے کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔مقابلے کے امتحانات میں تو ایسا کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ عدل تہذیبی زندگی کی پہلی

شرط ہے۔ اگر چھٹیوں میں تم اسے یہاں بھیج دو تو میں کچھ دن پڑھا دوں گا۔

مسٹر راشد کی پابندیِ وقت legendary تھی۔ میں اسکیمن ہاؤس میں تھا تو وہ پانچ بج کر بیس منٹ پر ٹہلنے کے لئے گھر سے نکلتے تھے۔ اور چھ بج کر پانچ منٹ پر واپس آتے تھے۔ مجال ہے کہ اس میں ایک آدھ منٹ بھی ادھر ادھر ہو جائے۔ کنٹین کنٹریکٹر نے مجھ سے کہا میں راشد صاحب کے آنے جانے سے گھڑی ملا لیتا ہوں۔ ہم بھی اپنے پروگرام کا تعین ان کے آنے جانے سے کرتے تھے۔ یہی حال کلاس روم کا تھا۔ پیریڈ شروع ہونے سے ایک دو منٹ پہلے آ کر برآمدہ کے باہر کھڑے ہو جاتے تھے خواہ موسم کیسا ہی شدید ہو۔ گھنٹی کی ٹن کے ساتھ اندر داخل ہوتے تھے۔ مشہور تھا اور میں اس کا شاہد ہوں کہ پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجنے کے بعد جملہ کیا لفظ بھی پورا نہیں کرتے تھے۔ ایک بار میں نے انھیں واقعتاً بھاگتے دیکھا کہ کہیں کلاس میں دیر نہ ہو جائے۔

وقت کے معاملہ میں اتنے precision سے زندگی اور کام کے بارے میں ان کا رویہ (attitude) ظاہر ہوتا ہے۔ جو ایک منٹ کیا ایک سیکنڈ ادھر ادھر ہونے کا روادار نہ ہو، وہ کام کس لگن سے کرتا ہوگا، اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔

ان کی لگن devotion کی بات آئی ہے تو میں انکی سولہ کتابوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے چند جیسے ''تذکرہ شہداء''، ''جرأتوں کے نشان''، ''کردار ساز'' اور ''داستان علم و عمل'' (جلد اول) کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں وہ جن مرحلوں سے گزرے اس کا تھوڑا بہت مجھے ذاتی طور پر اندازہ ہے۔ (My God, it was superhuman)۔ اسے Moral Passion یا جنون جو بھی کہا جائے کم ہے۔ انہوں نے ان کتابوں کا مواد کتنی مشکل سے، کتنی تگ و دو کے بعد لوگوں کی کتنی بے رحم عدم دلچسپی کے باوجود حاصل کیا۔ وہ بجائے خود ایک ولولہ انگیز داستان ہے۔ شہیدوں پر تین کتابیں، غازیوں پر چھ سو صفحے کی کتاب، بریگیڈیئر رفیق پر چھ سو صفحے کی کتاب، اب کالج کی تاریخ کی دو جلدیں، یہ سارا کام ایک ادارہ کا ہے۔ جو انہوں نے پچھلے آٹھ دس سال میں تنہا کیا ہے۔ اقبال پر ''تذکرہ اقبال''، ''مکالمات اقبال''، قائداعظم پر ''حیات قائداعظم'' اور ''گفتار و کردار قائداعظم''، لیڈرشپ پر Living with Leadership, Learnign to Lead ''کردار کی کرنیں''، ''شاد باد منزل مراد''، ایجوکیشن پر In Search of Light اور Ripeness is All اس پر مستزاد ہیں۔ اس میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر راشد نے ملٹری کالج کو ان کتابوں کے حوالے سے امر کر دیا ہے۔ غالباً پورے ملک میں کسی فوجی یا سول ادارہ پر کسی نے اتنا کام نہیں کیا ہے۔ اور کچھ نہیں تو یہی کام انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ کالج کی

موجودہ اور آئندہ نسلیں انکی ہمیشہ ممنون احسان رہیں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ان کتابوں کی داستان بھی سنائے، وہ بھی کم ولولہ انگیز اور inspiring نہیں ہے۔ 85-1984ء میں جب انکی بیگم سی ایم ایچ راولپنڈی میں ایس آئی اور ڈی آئی لسٹ پر تھیں انکی عیادت کے لئے اولڈ بوائز کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ پرنم آنکھوں سے ان کی علالت کی تفصیلات بتاتے (ان کے دونوں گردے مکمل طور پر بیکار ہو گئے تھے) پھر کچھ دیر کے بعد وہ بریگیڈیئر رفیق پر آنے والوں کے تاثرات نوٹ کرنا شروع کر دیتے۔ ان کی قوت برداشت باعث حیرت تھی۔ جیسا کہ انھوں نے ''کردار ساز'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے، انھوں نے ایک تہائی کتاب اپنی بیگم کے اس شدید علالت کے زمانہ میں ٹرانزٹ کیمپ پنڈی میں، جہاں وہ کرنل ولی کے مہمان تھے، بیٹھ کر لکھی۔ میں نے ایک بار گلہ کیا کہ آپ کو آنٹی کی علالت کے زمانہ میں یہ کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بولے اسی کی وجہ سے تو وہ ''کوما'' سے ہوش میں آ گئی تھیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ آنٹی بھی ان کی اس بات سے مطمئن بلکہ خوش تھیں۔ 1983ء کے اواخر میں جب میں انھیں دیکھنے گیا، راشد صاحب وہاں موجود نہ تھے۔ وہ اس وقت کالج نمبر 1551 بریگیڈیئر مشتاق کو انٹرویو کرنے ان کے گھر گئے ہوئے تھے جو انہی دنوں انگلینڈ سے بائی پاس کرا کے لوٹے تھے۔ آنٹی نے بڑی pride سے بتایا کہ راشد صاحب انٹرویو کرنے گئے ہوئے ہیں۔

تو اس کتاب سے زیادہ اس امر کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے کن حالات میں اسے لکھا۔ ہمارے ہاں اچھے آدمیوں کی کمی نہیں، آرمی میں بھی ایک سے ایک اونچا آدمی رہا ہے۔ لیکن ان پر کسی نے لکھا نہیں، وہ خاک میں ملے تو ان کا نام اور کام بھی مٹنے لگا۔ رفیق صاحب کو راشد صاحب ایسا قلمکار disciple مل گیا۔ ''کردار ساز'' اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس نے رفیق صاحب کو امر کر دیا ہے اور آرمی آفیسر کی بھی ایک نئی امیج سامنے آئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہماری فوج کے جو مسلمہ ہیروز ہیں ان پر راشد صاحب سے لکھوانا چاہیے۔

میں یہ امر ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ خود بریگیڈیئر رفیق مرحوم مسٹر راشد کو بہت محبت، شفقت اور عزت سے یاد کرتے تھے۔ 1981ء میں ان کا انتقال ہوا۔ آخری چند سالوں میں جب وہ لاہور کے 98 سینٹ جیمز پارک میں رہ رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار بتایا کہ 1966ء میں مسٹر راشد کا تقرر پی ایم اے کے شعبہ انگریزی میں ہو گیا تھا۔ لیکن انھوں نے کالج میں جونیئر ماسٹر رہنے کو ترجیح دی۔

انکے آخری الفاظ یہ تھے:

"He is a great man, May God bless him."

اور یہ الفاظ ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلے تھے۔

اپنے فرض کی بجا آوری میں بڑی کوتاہی ہوگی اگر میں یہاں مسٹر راشد کی مرحومہ بیگم کا ذکر نہ کروں۔ بحثیت استاد، بحثیت ہاؤس ماسٹر، اور بحثیت مصنف کے ان کامیابیوں کا آدھا کریڈٹ بیگم راشد کو جاتا ہے۔ مرحومہ خود ایک غیر معمولی کردار کی خاتون تھیں۔ مسٹر راشد ایسے passionately committed آدمی کے ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہوتا ہے۔ انھوں نے گھر کو، اپنے بچوں کو، ہاؤس کے کیڈٹس کو اور خود راشد صاحب کو سنبھالا۔ گلہ تو کیا، وہ انکے کام میں دل و جان سے بغیر کسی ذہنی تحفظ (mental reservation) شریک رہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ از خود انکے کام کو آگے بڑھایا۔ خصوصاً شیر شاہ ہاؤس کی ہاؤس ماسٹری میں۔ میں حیران ہوتا تھا کہ مسٹر راشد کو کبھی گھر کی کسی پرابلم کا تذکرہ کرتے نہیں سنا۔ انکی تین بیٹیاں ڈاکٹر ہیں، ایک بیٹا امریکہ میں انجینئر ہے، دوسرا استاد ہے۔ راشد صاحب کے لباس میں بھی شکن نہیں دیکھی۔ ان سب باتوں کا کریڈٹ مرحومہ کو جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ وہ راشد صاحب کے ہاں تقریباً ہر روز آنے والے دو ایک اولڈ بوائز اور انکے خاندانوں کو بھی لک آفٹر look after کرتی تھیں۔ ان کی میز بانی بھی مشہور تھی۔ میری تجویز ہے کہ جب کبھی مسٹر راشد کی کوئی یادگار قائم کی جائے اور کسی طرح بھی انہیں یاد کیا جائے تو انکی مرحومہ بیگم کو بھی انکے نام کے ساتھ جگہ دی جائے۔ اگر آنٹی ان کی ہم قدم نہ ہوتیں تو اکیلے راشد صاحب ان منزلوں کو سر نہ کر سکتے جو انہوں نے کیں۔ وہ لفظی اور مجازی معنوں میں Alma Mater مادر درسگاہ تھیں۔

محمد اعظم خاں

(کالج نمبر 2118، زمانہ تعلیم 1959-1952ء)

پہلے تو آپ یہ دیکھیں کہ یہاں کی صورت حال کیا تھی۔ پانچویں، چھٹی میں بیشتر دور دراز کے دیہات کے بچے دس گیارہ سال کی چھوٹی عمر میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کو والدین کی محبت کی بھی ضرورت تھی اور روشنی کی بھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ راشد صاحب نے بیک وقت یہ دونوں ضرورتیں پوری کیں۔ مجھے تو کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ کو ان سے ملٹری کالج کے ذریعہ پاکستان کی بہت بڑی خدمت کروانا تھی۔ تبھی اس ذات کریمی نے 1950ء کے عشرہ میں ایسے ایسے گوہر شب چراغ جمع کر دیئے۔ راشد صاحب ان میں سے ایک تھے۔ اور جیسے قضا و قدر نے انہیں یہاں ایک خاص مشن دے کر بھیجا تھا۔ ''تذکرہ شہداء''، ''علوی نامہ''، ''کردار ساز'' اور کون لکھتا۔ میری زندگی میں راشد صاحب کی حیثیت ایک

guiding angel کی سی ہے۔ 1952ء میں آزاد کشمیر کے گاؤں سہنی کے ایک معمولی اسکول میں پڑھتا ہوا آیا تھا اور وہاں بھی ایک عام سا طالب علم تھا۔ میرے ماموں راجہ محمد طفیل خان کی ہمت تھی کہ انھوں نے مجھے تیار کرا کے ملٹری کالج میں داخل کروا دیا۔ پھر یہ راشد صاحب کا کمال تھا کہ مجھ جیسے پینڈو کو سال بھر میں اس قابل بنا دیا کہ پانچویں میں اول آ سکوں۔ اس طرح تیس چالیس سال کے طویل عرصے میں انھوں نے کتنوں کو کندن بنایا ہوگا۔ اللہ ہی جانتا ہے۔

اللہ جل شانہ نے ان کی زبان میں تاثیر اور نظر میں گہرائی دی ہے۔

1956ء میں جب اسکین ہاؤس جونیئر ہاؤس کی تنظیم نو ہوئی تو جن تین سینئر لڑکوں کو اس ہاؤس کی لیڈر شپ کے لئے چنا گیا ان میں سے ایک میں تھا۔ دوسرے دو، (2092) رب نواز دسویں میں اور اسسٹنٹ ہاؤس پریفیکٹ (2133) نذر نویں میں تھے۔ ماشاء اللہ اب دونوں سینئر افسر ہیں۔ راشد صاحب نے اسکین ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر کی حیثیت سے ہم پریفیکٹس پر اتنی سخت نظر رکھی اور اتنی گہرائی میں جا کر تربیت کی کہ کندن بنا دیا۔ لیڈر بنانا تو خود اچھا لیڈر ہونے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ میں چونکہ ان دونوں سے جونیئر اور آئندہ کا متوقع پریفیکٹ تھا اس لئے وہ مجھ پر خاص توجہ دیتے تھے۔ اکثر لیکچر دیتے رہتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے ان چھوٹے لڑکوں کو تم ہر لحاظ سے چھوٹا نہ سمجھنا۔ ان کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں۔ یہ بچے تمہارے کنڈکٹ میں کوئی جھول دیکھ کر تمہاری اتنی رعایت ایک روز یا ایک بار بھی نہیں کریں گے جتنی میں ہر روز کرتا ہوں۔ یہ تو ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ نوجوان بھی انتہا پسند اور idealist ہوتے ہیں۔ وہ تمہیں قبول کریں گے یا رد کریں گے۔ وہ بھی بظاہر بہت چھوٹی سی بات پر۔ وہ تمہیں کھانا کھاتے، کھیلتے، چلتے پھرتے، بات کرتے ہر جگہ ہر پر موقع پر عقابی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ تم نے ایک لمحہ بھر اپنے آپ کو ذرا سی ڈھیل دی، کھانے کی میز پر حلوہ کا ایک چمچہ بھی زیادہ لے لیا، کھیل میں قصداً ایک فاؤل بھی کر لیا، کہیں ایک منٹ بھی لیٹ ہو گئے، جیب میں ایک بار بھی ہاتھ ڈال لیا، تمہاری قمیض کا ایک بٹن بھی ٹوٹا ہوا کسی کو نظر آ گیا یا کسی کے ساتھ ایک بار بھی favoritism کر لیا تو سمجھو کہ تم ہمیشہ کے لئے مارے گئے۔ یاد رکھو اصل اتھارٹی moral ہوتی ہے۔ جو سینئر، سپریئر (superior) نہیں، اس کی قانونی سینارٹی کبھی مؤثر نہیں ہو سکتی۔

اس طرح کے لیکچر وہ اکثر دیا کرتے تھے۔ یہ لیکچرز اب 'Learning to Lead' میں شامل ہیں۔ یہ باتیں جو میں نے اوپر نقل کی ہیں اب اس کتاب میں Image Buildings کے عنوان سے

شامل ہیں۔اس لیکچر کے آخر میں انھوں نے مجھ سے کہا جن کو لیڈ(lead) کرنا ہوتا ہے ان کو جاننا بھی چاہیے۔تم ان بچوں کو غور سے اس وقت واچ کیا کرو جب وہ آف گارڈ ہوں، آن پریڈ نہ ہوں، اس وقت ان کا true self سامنے آتا ہے۔ پھر ہنس کر کہا میں خود یہ نسخہ تم پریفکٹس پر آزماتا ہوں۔ ایک روز انھوں نے مجھے اپنی آبزرویشن بک دکھائی جس میں تقریباً سب لڑکوں پر انکے مشاہدات اشاروں کی شکل میں نوٹ تھے۔ پھر کہا یہ انسپکٹر پولیس کی ڈائری نہیں، یہ ایک ڈاکٹر سرجن کے کیس اسٹڈی نوٹس ہیں۔میرا مقصد کسی کو پکڑنا نہیں۔ان کی روشنی میں رہبری اور راہنمائی کرنا ہے۔اور اس میں شک نہیں کہ جس دردمندی سے وہ counselling کرتے تھے، اس سے بے شمار لڑکوں نے فائدہ اٹھایا۔خصوصاً ان کے پریفکٹس نے۔وہ اپنے پریفکٹس پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ان کی خاطر تواضع بھی بہت کرتے تھے۔لیکن باز پرس اس سے بھی زیادہ۔

میں لکھ چکا ہوں کہ اپنے پریفکٹس پر وہ شیر کی نظر رکھتے تھے۔انھوں نے کسی موقع پر مجھے(2244) اسحاق سے بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھا ہوگا، ایک روز بلا کر نصیحت کی کہ جونیئر سے غیر ضروری طور پر بے تکلف نہیں ہوتے۔انہوں نے chummy کا لفظ استعمال کیا تھا ان کا واضح اشارہ اسحاق کی طرف تھا ۔میں نے وضاحت کی ''سر اسحاق میرا رشتہ دار ہے۔'' پھر تو اور بھی زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔جس طرح مجھے یہ معلوم نہ تھا اسی طرح ہاؤس کے ساٹھ لڑکوں کے علم میں بھی یہ رشتہ نہ ہوگا اور اگر ہو بھی تو یہ رشتہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔رشتے داری ہاؤس سے باہر ہے، اندر نہیں۔اندر کی رشتہ داری نہ اس کے حق میں اچھی ہے نہ تمہارے حق میں۔ یاد رکھو لیڈر شپ کی بنیاد اعتماد پر ہوتی ہے، اس faith پر کہ سینئر یا لیڈر integrity رکھتا ہے اس لئے ہر صورت میں fair رہے گا۔اسی اعتماد سے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں گے۔سینئر جس کی integrity اور fair-play سے اعتماد اٹھ جائے یا اس میں دراڑ پڑ جائے۔اس کی لیڈر شپ میں اسی نسبت سے جونیئر ز secure یا محفوظ محسوس نہیں کرتے۔ایک روز بتایا:

''انسان کی نفسیاتی ضرورتیں تین ہیں۔adventure, security اور recognition۔تمہارا کام ان جونیئرز کو sense of security دینا ہے اور یہ احساس وہی دے سکتا ہے جو مستقل طور پر fair اور firm ہو۔یاد رکھو جو fair ہوگا اس کی firmness یا سختی کبھی بری نہیں لگے گی''۔ایک روز ایک اور نکتہ کی وضاحت کی فرمایا: ''بعض بہت اچھے سٹاف آفیسرز بحیثیت کمانڈر مکمل طور پر ناکام ہو جاتے ہیں۔اس کی وجہ عموماً یہ ہوتی ہے۔ان کی لیڈر شپ کمزور ہوتی ہے۔وہ کام کر سکتے ہیں کروا نہیں سکتے۔'' ان کی یہ باتیں Living with Leadership میں Kinds of Character کے عنوان سے

تفصیل سے درج ہیں۔ جن لوگوں نے ان کی کتابیں پڑھی ہیں انھوں نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ فلیپ پر انکے تعارف میں ایک سطر یہ بھی ہے: ''مشن: پاکستانیت کا فروغ''۔ اس طرح اپنے مشن کا اعلان کسی نے نہ کیا ہوگا۔ یہ وہی کرسکتا ہے جسے اپنی ذات اور اپنے مشن پر اعتماد ہو۔

اس مشن کی تکمیل میں انکی ساری زندگی گزری۔ یہ وہ قیمتی میراث ہے جو اب ان کے شاگردوں کے حصے میں آئی ہے۔

آخر میں میں ایک اور بات کہنا چاہوں گا کہ اچھے استاد بھی تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو معلومات دیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو علم دیتے ہیں۔ تیسرے وہ جو زندگی کا شعور بلکہ تجربہ دیتے ہیں۔ تیسری قسم کے استاد کبھی پرانے نہیں ہوتے بلکہ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ راشد صاحب کا تعلق اس تیسری قسم سے ہے۔ جو کچھ انہوں نے کلاس میں پڑھایا تھا وہ تو کبھی کا irrelevant ہو چکا لیکن جیسے پڑھایا تھا اور جو سکھایا تھا، زندگی کا جو تجربہ دیا اور جو شعور جگایا، وہ باقی ہے۔

بریگیڈیئر امتیاز احمد (ستارہ جرأت)

(کالج نمبر 2124، زمانہ تعلیم 1952-1960ء)

بعض کاموں کے لئے اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو خاص طور سے پیدا کرتا ہے۔ مسٹر راشد کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا ہی معلّمی اور ہاؤس ماسٹری کے لئے کیا ہے، وہ بھی ملٹری کالج میں۔ وہ مدرس، معلم اور مرشد سبھی کچھ تھے اور انکی تیسری حیثیت سب پر فائق تھی۔ یہی انکی امتیازی خصوصیت تھی۔ انھوں نے اپنے لائف اسٹائل سے بے شمار طلبہ کے لائف اسٹائل کو متاثر کیا اور ان کو total education دی۔ انکی نظر امتحان ہی پر نہیں، کیریئر ہی پر نہیں، پوری زندگی پر ہوتی تھی۔

بڑے سخت disciplinarian تھے لیکن ڈسپلن نافذ کرنے کا اسٹائل بڑا fine اور sophisticated تھا۔ مثلاً کلاس روم یا ہاؤس میں چھوٹی موٹی غلطیوں کو نوٹ کر کے معنی خیز انداز میں مسکرا دینا، تنبیہ کرنے کا خاص انداز تھا۔

شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ انھوں نے cub master کا کورس کیا ہوا تھا۔ 1954ء میں کالج کے اسکاؤٹس پہلی بار گھوڑا گلی میں پنجاب بوائے اسکاؤٹس کے کیمپنگ پروگرام میں حصہ لینے گئے تھے۔ کبز کے

گروپ میں میں بھی شامل تھا اور مسٹر راشد ہمارے کب ماسٹر تھے۔

1965ء کی جنگ میں زخمی ہو کر جب میں سی ایم ایچ راولپنڈی داخل ہوا تو ان کے حوصلہ افزائی کے خطوط مجھے مسلسل آتے رہتے تھے۔ جب میرے ستارہ جرأت کا اعلان ہوا تو استادوں میں سب سے پہلے مبارکباد دینے والے وہی تھے۔ کالج کے جنگی اعزاز یافتہ اولڈ بوائز پر انکی مشہور اور مقبول کتاب ''جراتوں کے نشان''، ان کی کالج سے، اولڈ بوائز سے، فوج سے اور ملک سے محبت کی زندہ نشانی ہے۔ چونکہ اس میں میرا تذکرہ بھی ہے اور پنڈی میں پوسٹ ہونے کی وجہ سے مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ یہ کتاب مرتب کرتے ہوئے جس کو کسی نے sponsor نہیں کیا تھا ان کو کن مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ ان میں frustrate نہ ہونے کا جو حیرت انگیز مادہ تھا وہ بغیر مشن کے اور شدید احساس کے ممکن نہیں۔ وہ مسلسل اپنے شاگردوں کو کسی نہ کسی پہلو سے انسپائر کرتے رہے اور یہ سلسلہ ان کی وفات تک قائم رہا۔

ماشاءاللہ! اور سبحان اللہ۔

لیفٹیننٹ جنرل نذر حسین

(کالج نمبر 2133، زمانہ تعلیم 1952-1956ء)

50 کے عشرہ کے اوائل میں خود میں نے راشد صاحب سے پڑھا۔ پھر 1980ء کے عشرہ میں میرا بیٹا رضوان ان کا شاگرد رہا۔ رضوان 1980ء میں ان کی جو باتیں کرتا وہ وہی تھیں جو میں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نوٹ کی تھیں۔ یعنی لباس کی نفاست، وقت کی بے انتہا پابندی، شارٹ کٹ نہ لینا نہ لینے دینا، meticulousness، ڈھونڈ ڈھونڈ کے چاک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے لکھنا، بے ضرورت پنکھے اور بلب آف کرنا، manners پر زور، سوری اور تھینک یو کہنا۔ علیحدہ علیحدہ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں لیکن جب یہ چیزیں تواتر سے ایک شخصیت کے حوالے سے سامنے آتی ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے۔ یہ باتیں نئی نہیں ہیں، انکو کرنے کی تلقین بچہ ہوش سنبھالتے ہی سننے لگتا ہے لیکن اس تلقین میں تاثیر کسی سچی اور کھری شخصیت کے حوالے سے ہی آتی ہے اور پھر یہ باتیں اس طرح لاشعوری طور پر شخصیت کا جز بن جاتی ہیں کہ زندگی میں آگے چل کر وہ شخصیت بار بار یاد آتی ہے جس نے یہ روشنی بہت محبت اور شوق سے ہمارے ساتھ کی تھی۔

ایک اور بات جو اس وقت 1950ء میں بھی ہم نے نوٹ کی اور پھر 1980ء میں میرے بیٹے رضوان نے بھی کہ خود ان کی اپنی زندگی بہت منظّم اور مربوط تھی۔ اپنے وقت کے بارے میں بہت محتاط تھے۔

کلاس، ہاؤس اور گھر اس کے سوا کہیں نظر نہیں آتے تھے۔ کیڈٹس میس میں ہفتے میں ایک بار تو لازمی طور پر ان کی ڈیوٹی ہوتی تھی لیکن میں نے کبھی انھیں میس میں پورا کھانا کھاتے نہیں دیکھا۔ دعوت کے موقع پر بھی نہیں، یہی رضوان نے مجھے بتایا۔ ایک بار میں نے غذا کے بارے میں پوچھا تو بتایا کہ میں نے کیلوریز کا حساب رکھا ہوا ہے۔ صبح کو دودھ میں پکا دلیہ، ایک انڈہ، ایک چمچہ شہد، دو بادام، دو کھجوریں، دو ٹوسٹ، چائے ایک کپ جس میں آدھا دودھ۔ دوپہر کے کھانے میں سبزی اور دہی کا رائتہ، خاص طور پر پھلوں میں امرود پسندیدہ پھل ہے۔ انگور کے موسم میں انگور، رات کو ایک گلاس دودھ، اور غالبًا اسی disciplined اور purposeful زندگی کا نتیجہ تھا کہ وہ پڑھانے، ہاؤس ماسٹری کرنے کے ساتھ ساتھ اتنی کتابیں لکھ سکے۔ ہاں ان کو ایک advantage ضرور تھا۔ جیسا کہ میری مسز نے مجھے بتایا کہ ان کی بیگم نے سارے گھر کو اور بچوں کی تعلیم کو سنبھالا ہوا تھا۔

سید زمان خان

(کالج نمبر 2139، زمانہ تعلیم 1960-1952ء)

یہ واقعہ اسکین ہاؤس کا ہے جو جونیئر ز ہاؤس تھا۔ زیادہ تر دس گیارہ برس کی عمر کے بچے پانچویں چھٹی کے تھے۔ انھوں نے نوٹ کیا کہ کسی کسی ڈارم dorm میں مونگ پھلی، چلغوزوں کے چھلکے پڑے ہوتے ہیں۔ انہی دنوں سٹرڈے ایوننگ (Saturday evening) کے فنکشن میں انھوں نے ایک عنوان دیا 'میری زندگی کا یادگار واقعہ'۔ سب لڑکوں نے اپنے اپنے واقعات سنائے۔ فنکشن کے آخر میں بحیثیت ہاؤس ماسٹر انھوں نے فنکشن پر تبصرہ کیا اور آخر میں کہا میں بھی اپنی زندگی کا ایک یادگار واقعہ سناتا ہوں۔ ''1949ء کے اواخر میں عید کی چھٹیوں کے بعد ریل سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی واپس جا رہا تھا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبہ میں سامنے کی سیٹ پر دو ہندو بچے اپنی ماں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ جب بھی کوئی اسٹیشن آتا اور خوانچہ والے پلیٹ فارم سے مونگ پھلی کی آواز لگاتے تو بچے ماتا جی ماتا جی کہہ کر مونگ پھلی کے لئے ضد کرتے۔ آخرکار ماتا جی نے مراد آباد اسٹیشن پر بچوں کو دو پیسے کی مونگ پھلیاں خرید دیں۔ بچے مونگ پھلیوں کا دونا لے کر بہت خوش ہوئے لیکن دونا لئے بیٹھے رہے۔ مونگ پھلیاں کھانی شروع نہیں کیں۔ میرے علاوہ دوسرے مسافروں کو تجسس ہوا کہ بچے مونگ پھلیوں کے لئے اتنی ضد کر رہے تھے اب کھاتے کیوں نہیں۔ ایک لالہ جی نے ان سے پوچھ ہی لیا۔ ''پتر کھاتے کیوں نہیں''۔ بڑی بچی نے جو بمشکل پانچ برس کی ہوگی جواب

دیا''مونگ پھلیاں کھائیں تو چھلکے کہاں رکھیں''؟ یہ سن کر سب کو خوشگوار حیرت ہوئی ایک صاحب جو دہلی کا ''تیج'' اخبار پڑھ رہے تھے، انہوں نے وہ اخبار دیا اور کہا اس پر رکھ لو تو ان بچوں نے مونگ پھلیاں کھانی شروع کیں''اور کہا یہ واقعہ مجھے اکثر یاد آتا ہے۔ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا طریقہ تربیت تھا۔

منظور حسین ایڈووکیٹ

(کالج نمبر 2149، زمانہ تعلیم 1956-1952ء)

سفید رنگ راشد صاحب کا پسندیدہ رنگ تھا۔ لیکن وہ لفظ سفید کو ہمیشہ سپید بولتے تھے اور سکین ہاؤس کو الف کے ساتھ اسکین۔ یہ واقعہ 1953ء کا ہے کہ کالج میں ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس کا عنوان تھا 'تن میلا تو من میلا' (میرا خیال ہے کہ یہ عنوان انہی کا تجویز کردہ ہوگا) اس کی تیاری کے لئے میں اور (2257) خالد علی ان کے ہاں گئے۔ دروازہ پر دستک دی، چونکہ میں دوپہر کے ریسٹ سے اٹھ کر گیا تھا۔ میرے سر کے بال کچھ بکھرے ہوئے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ 'تن میلا تو من میلا'۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ ساری کہہ کر واپس آیا۔ آئینہ میں دیکھا، کپڑے تو ٹھیک مگر بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے جلدی جلدی واش کیا اور کنگھا کر کے دوبارہ حاضر ہوا۔ دیکھ کر کھل اٹھے۔ خوشی سے ان کے چہرے کی چمک میں نہیں بھول سکتا۔ ان کی تنبیہہ اور نصیحت اشاروں میں ہوتی تھی۔ چھوٹی غلطی ہوتی تو دیکھ کر مسکراتے اور اگر ایک بار غور سے دیکھ کر خاموش ہو جائیں تو اس کا صریحاً مطلب یہ تھا کہ کوئی چیز انھیں بہت زیادہ ناگوار گزری ہے۔ ہاں تو میں اس تقریر کی تیاری کی بات کر رہا تھا۔ اس روز انھوں نے mental hygiene کی بات بھی کی تھی۔ جس کے معنی مجھے بہت بعد میں سمجھ آئے۔ اسی طرح صفائی اور طہارت میں جو فرق ہے اس کی وضاحت بھی کی تھی۔ اس زمانہ میں اسٹیشنری اسٹور سے جو کتابیں ملتیں، وہ سال بھر کے بعد اسٹور کو واپس کرنا ہوتی تھیں۔ راشد صاحب کا اصرار ہوتا کہ ان پر صرف مقررہ جگہ پر نام لکھا جائے اور کتابوں پر کوئی نشان یا لکیر نہ کھینچی جائے۔ بار بار کہتے کہ آپ کی حب الوطنی یہی ہے کہ آپ قومی وسائل کو احتیاط سے استعمال کریں۔ بعض لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ جگہ جگہ اپنا نام کھودتے رہتے ہیں۔ ایک ڈیسک پر تازہ، کھدا ہوا نام دیکھا تو بہت ناراض ہوئے۔ ''یہ لکیریں تم نے پاکستان کے چہرے پر بنائی ہیں''، اسکین ہاؤس میں انکے گھر کے پہلو میں پھولوں کی جو لمبی کیاری تھی صبح وشام وہ اس میں خود پانی

دیتے تھے۔ ہاؤس میں کیڈٹس سے انھوں نے ایک خاص ڈیزائین کی پھولوں کی کیاریاں بنوائی تھیں۔ چنبیلی کے پھولوں اور چاندنی کے پودوں کا شوق مجھے ان ہی سے ورثے میں ملا ہے۔

میجر جنرل عبدالرزاق (تمغہ امتیاز)

(کالج نمبر 2186، زمانہ تعلیم 1953-1963ء)

میں آئی ایس ایس بی کے لئے کوہاٹ جانے والا تھا۔ سر راشد نے مجھے گھر بلایا کہ میں ان سے کرنٹ افیرز ڈسکس کرلوں۔ میں گیا تو ڈسکشن کے دوران چائے سے میری تواضع کی۔ چائے پینے کے دوران میں نے چائے کی پیالی صوفے کے بازو پر رکھ دی۔ یہ دیکھ کر انھوں نے معذرت کی کہ تپائی میرے قریب نہیں رکھی گئی۔ میں سمجھ گیا کہ خود معذرت کر کے وہ مجھے کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔

کرنل سلطان حیدر

(کالج نمبر 2196، زمانہ تعلیم 1953-1961ء)

1960ء میں پی اے ایف اکیڈمی رسالپور میں انٹر کالجیٹ انگریزی کا جو مباحثہ ہوا تھا اس میں کالج کی نمائندگی میں نے اور (2180) افتخار شہید نے کی تھی۔ ڈیبیٹ کا عنوان تھا:

We are happier than our forefathers

حزب اتفاق اور اختلاف دونوں کی تقریریں راشد صاحب نے لکھی تھیں اور انہی نے تیار کرائیں۔ انگریزی تقریروں کا شعبہ انھوں نے سنبھال رکھا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے مطابق تیاری اتنی مکمل کراتے تھے کہ جیتنا یقینی ہو جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم دونوں اس تقریری مقابلہ کے لئے جمع ہوئے تو انھوں نے پہلا جملہ یہ کہا "ہر کام سب سے پہلے انسان کے کردار کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ مقابلہ تم دونوں کی تقریری صلاحیت سے زیادہ تمہاری will to win کا امتحان ہے۔ یاد رکھو پاکستان بھر کے کالجوں سے ایک سے ایک talented لڑکا وہاں آئے گا لیکن جیتے گا وہی جس کی تیاری زیادہ ہوگی"۔ ان کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا۔ کردار سازی ان کی پہلی ترجیح رہی۔

میجر غلام احمد

(کالج نمبر 2197، زمانہ تعلیم 1953-1958ء)

یہ واقعہ 1953ء کا ہے۔ سکین ہاؤس کا انفارمیشن روم راشد صاحب کے کوارٹر کے ساتھ کے سیکشن

میں تھا اور اس کے انچارج بھی وہی تھے۔ ایک روز کھانے سے پہلے میں انفارمیشن روم میں گیا۔ ایک لمبی میز پر اخبار اور رسالے بڑے سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک رسالہ اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ پسند نہ آیا۔ اس وجہ سے یا اس وجہ سے کہ میس کو دیر ہو رہی تھی۔ میں نے رسالہ میز پر پھینکا اور باہر جانے کے لئے مڑا۔ ٹھیک اس وقت راشد صاحب کا ہاتھ مجھے اپنی پشت پر محسوس ہوا۔ (اس سے پہلے میں نے انھیں نہیں دیکھا تھا) ''no, that's not the way'' اخبار، رسالہ کو اس طرح نہیں پھینکتے''۔ پھر انھوں نے رسالہ اٹھایا اور بڑے اہتمام سے سیدھا کر کے رکھ دیا۔ اور مجھ سے کہا تم جا سکتے ہو، میرے جاتے جاتے انھوں نے دو ایک اور اخبار بھی ٹھیک کئے۔ اس واقعہ کو تیس برس سے اوپر ہو چکے ہیں لیکن اس کی باریک سے باریک جزئیات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ وہ رسالہ ہفتہ وار 'قندیل' تھا جس کی پیشانی پر قندیل کی تصویر بنی تھی۔ وہ کیا لمحہ تھا یا ان کے انداز میں کیا جادو تھا کہ اس دن سے کسی چیز میں بھی بے ترتیبی اور الجھاؤ میں برداشت نہیں کر سکتا۔

لیفٹیننٹ کرنل سردار محمد

(کالج نمبر 2214، زمانہ تعلیم 1956-1954ء)

جنوری 1954ء میں کالج کو پبلک اسکول طرز پر چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں یہاں خاکی وردی اتری، پریڈ ختم ہوئی اور کیمپنگ اور اسکاؤٹنگ کا آغاز ہوا۔ کیمپنگ 12 برس تک کے جونیئر اسکاؤٹس کے لئے ہوتی ہے۔ چونکہ اس زمانہ میں داخلہ پانچویں درجے میں ہوتا تھا۔ اس لئے کیمپنگ بھی شروع کی گئی ۔ یادش بخیر۔ راشد صاحب ہمارے پہلے کب ماسٹر تھے۔ 1955ء کی گرمیوں میں ، کبز (cubs) کا جو گروپ گھوڑا گلی گیا تھا اس میں میں شامل تھا اور راشد صاحب ہمارے انچارج تھے۔ ان کا خیمہ ہمارے کیمپ کے کنارے پر تھا۔ لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ ہمیں شرارت سوجھی تو، ان کے خیمے کی تلاشی لی اور جو کچھ کھانے پینے کا سامان، بسکٹ کے ڈبے، ڈرائی فروٹ وغیرہ تھا، صاف کر گئے۔ جب وہ خیمہ میں آئے تو ہم چند سرغنہ حاضر ہوئے اور دست بستہ عرض کیا کہ ''سر، چونکہ کب کبھی جھوٹ نہیں بولتا....'' انھوں نے جملہ پورا کیا ''اور چرا کر بسکٹ بھی نہیں کھاتا''۔ ہم خاموش ہو گئے۔ انھوں نے کہا میں اس بات سے تو خوش ہوں کہ تمھیں خود اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہم نے بیک وقت ''ویری ساری سر''، کہا انھوں نے excuse کیا اور بات ختم ہوئی۔ اسی شام کو وہ ہمیں مری لے گئے اور انھوں نے ہماری خوب خاطر تواضع کی۔

میں 1954ء سے 1957ء تک ان کے اسکین ہاؤس میں رہا ہوں۔ ان کی دو عادتوں کا میں عینی

شاہد ہوں۔ایک تو کہ وہ صبح سویرے جب ہم پی ٹی کے لئے جا رہے ہوتے تو وہ اپنے گھر کے اندر سے پانی کی بالٹی لا کر اس سے ہاؤس کی اس کیاری کو پانی دیتے تھے، جو ان کے گھر کے دروازے کے سامنے تھی۔ جس میں انھوں نے موتیا اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔دوسرے وہ ہر روز جاڑوں میں چار بج کر بیس منٹ پر اور گرمیوں میں پانچ بج کر بیس منٹ پر پی ٹی شوز میں سیر کو نکلتے تھے اور غالباً نہر کے کنارے کے پہلے پل سے ہو کر ٹھیک چالیس منٹ بعد واپس آ جاتے تھے۔اتنا تیز چلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔اس معمول میں برسوں کوئی فرق نہیں آیا۔ان کے اپنے گھر سے نکلنے اور واپس آنے پر گھڑی ملائی جا سکتی تھی۔

پڑھانا اپنی جگہ لیکن اپنی زندگی سے جو کچھ انھوں نے سکھایا، میں اصل اہمیت اسے دیتا ہوں چونکہ اس کا اثر آج بھی باقی ہے اور اس کی قدر و قیمت کا احساس بڑھتا جاتا ہے۔ میں اپنے بچوں کو اکثر بتایا کرتا ہوں کہ یہ سب کس سے سیکھا۔

لیفٹیننٹ کرنل محمد سلیم

(کالج نمبر 2242 زمانہ تعلیم 1961-1954ء)

کرنل رفیق کا زمانہ تھا good manners کے سلسلہ میں تھینک یو، ایکسکیوزمی ویک منایا جا رہا تھا۔سر راشد پانچویں جماعت کے کچھ لڑکوں کو ڈائریکٹ میتھڈ سے تھینک یو کہنا سکھا رہے تھے ایک ایک لڑکے کو ٹافی دے کر کہتے ''کہو تھینک یو'' تو وہ کہتا 'تھینک یو' لیکن کوئی کوئی صرف تھینک یو کہنے کے بجائے ''کہو تھینک یو'' کہہ دیتا، سب ہنستے لیکن وہ اسے ایک اور ٹافی دے کر کہتے اب مجھے دو۔ جب وہ دیتا تو کہتے ''تھینک یو''۔اس طرح کافی دیر وہ لگے رہے۔ان میں بے انتہا patience تھی۔ان کے تحمل اور درگزر کی ایک اور مثال یاد آئی۔ہم سینئر کلاسز میں تھے کہ ایک لڑکے نے شوخی کی اور ان کے سوٹ پر پیچھے سے روشنائی چھڑکی۔یقیناً انہوں نے دیکھ لیا تھا۔لیکن اس وقت خاموش رہے اور بڑے اطمینان سے پڑھاتے رہے۔کچھ دنوں کے بعد برسبیل تذکرہ erratic behaviour پر اس طرح بحث کی جس سے ہم سمجھ گئے کہ ان کا مدعاء کیا ہے۔اصلاح وہ اسی طرح اشاروں کنایوں سے کرتے تھے۔ میں یہاں یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ وہ لڑکا اس واقعہ کے بعد اتنا شرمندہ ہوا کہ حد نہیں اور تا زندگی ان کا معتقد رہا۔سر راشد نے بھی اس سے رابطہ رکھا اور اسکی حادثاتی موت کے بعد اسکے گاؤں جا کر اس کے جنازے میں بھی شریک ہوئے۔ اسطرح کے واقعات انکے ساتھ کم ہی ہوئے ہونگے۔...وہ کہتے تھے کہ اپنے responses کو دوسرے کے responses سے مشروط نہیں رکھا کرتے۔ہم نے ان سے کلاس میں جو کچھ پڑھا تھا وہ

تو کلاس میں رہ گیا لیکن جو کچھ ان سے سیکھا وہ آج بھی ہمارے ساتھ ہے اور اسکی قدر و قیمت کا احساس ہر روز بڑھتا جاتا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل منیر افضل پراچہ، (امتیازی سند)
(کالج نمبر 2262، زمانہ تعلیم 1960-1954ء)

1955ء کے اواخر میں جب کالج کے ہفتہ وار گزٹ 'نیوز اینڈ ویوز' کا اردو حصہ ''اخبار وافکار'' کے نام سے نکلنا شروع ہوا تو راشد صاحب نے مجھے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ وہ خود اس کے نگران تھے۔ اس زمانہ میں اردو ٹائپ رائٹر ایجاد نہیں ہوا تھا۔ 'اخبار وافکار' کے آٹھ صفحوں کا سٹینسل کاٹنا پڑتا تھا۔ یہ کام میرے ذمہ تھا لیکن وہ مسلسل میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ 23 مارچ 1956ء کو ہم نے 'اخبار وافکار' کا خصوصی نمبر نکالا۔ اس کا سرورق راشد صاحب نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس میں حسن صاحب کی نظم 'پاس ہوا اپنا دستور' بھی شائع ہوئی تھی۔ decorum کے وہ بڑے قائل تھے۔ یاد ہے غالباً 1962ء میں وہ میری انگریزی گرائمر کی ایک ایکسٹرا کلاس لیتے تھے۔ یہ کلاس اس زمانہ میں سہ پہر کو رابرٹس ہاؤس کی ایک ڈارمیٹری میں ہوتی تھی۔ انکی رہائش ہاؤس سے ملحق گھر میں تھی۔ وہ دیئے ہوئے وقت پر پورا سوٹ پہن کر آتے تھے۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی تب بھی اسی اہتمام سے آئے اور چھتری لگائے برآمدہ میں کھڑے رہے۔ عین وقت پر کلاس میں داخل ہوئے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے '' Peculiarities in English'' سے '' had, better'' اور '' would rather'' کا استعمال سکھایا تھا۔

صوبیدار ملازم حسین
(کالج نمبر 2271، زمانہ تعلیم 1963-1955ء)

1955ء میں کرنل رفیق نے آکر اسٹاف کے لئے کلاسز میں یکساں لباس (سفید پتلون قمیض کالج کی ٹائی کے ساتھ گرمیوں میں اور سٹیل گرے ڈبل بریسٹ سوٹ کالج کی ٹائی کے ساتھ جاڑوں میں) شروع کیا تھا، اس سے پہلے سویلین اساتذہ اپنی مرضی کے کپڑے پہنتے تھے۔ آفیسرز وردی میں ہوتے تھے۔ اس زمانہ میں ہم دنوں کا حساب راشد صاحب کے سوٹ اور ٹائی سے رکھتے تھے۔ جمعہ کے دن وہ سفید شیروانی اور سفید تنگ موری کے پائجامے میں ملبوس ہوتے۔ حد یہ کہ جوتا اور موزے بھی سفید ہوتے۔ لیکن مانگ بزرگانہ انداز میں سیدھی نکالتے تھے۔

تقریباً تیس برس بعد میرا بیٹا شاہد کالج میں داخل ہوا تو راشد صاحب سے پھر ملاقات ہوئی۔ چہرے پر عمر کا اثر ضرور تھا لیکن لباس کی نفاست اسی طرح تھی اور چلتے دیکھا تو دل خوش ہوا کہ چال اسی طرح جیسے کڑی کمان کا تیر۔

میجر محمد اسحاق

(کالج نمبر 2275،زمانہ تعلیم 1955-1963ء)

''کس سکول سے آئے ہو؟''

''......سے''

''یہ کہاں ہے''؟

''سر،......میں۔

کورس کی کتاب کے علاوہ بھی کوئی کتاب پڑھی ہے؟

''جی نہیں''۔

''کوئی رسالہ؟''

''جی نہیں''

''اخبار؟''

''جی نہیں''

''کبھی ریڈیو پر بچوں کا پروگرام سنا؟''

''جی نہیں''

''کوئی بات نہیں۔کل اتوار ہے تم صبح میرے ہاں نو بجے آنا۔تمھیں پروگرام سنوائیں گے''۔

دوسرے دن نو بجے میں نے ان کے دروازہ پر دستک دی تو آنٹی نے دروازہ کھولا اور کہا اندر آؤ۔ تمہارے سر کسی کام سے کالج گئے ہیں تم بیٹھو اور پروگرام سنو۔تھوڑی دیر بعد دو تین لڑکے اور بھی آ گئے اور ہم نے پہلی بار لاہور سے موہنی حمید کا کمپیئر کیا ہوا پروگرام سنا۔ پروگرام کے ختم ہونے تک سر راشد بھی آ گئے۔ انھوں نے ہمیں ''تعلیم و تربیت''،''ہدایت''اور''نونہال'' کے پرانے پرچے پڑھنے کو دیئے۔

پھر یہ سلسلہ مہینوں چلا۔ انھوں نے مجھے ہاؤس فنکشن میں بھی ڈالا۔ میں آج تک حیران ہوں کہ سر راشد نے مجھ پر اتنی توجہ کیوں دی۔ مجھ میں کوئی ایسی امتیازی، ذاتی یا اضافی چمک نہیں تھی جو کسی

کی توجہ کو میری طرف کھینچے لیکن غالباً اسی وجہ سے انھوں نے مجھے اپنایا اور میری طرح کے اور بہتوں کو بھی۔

مختصر یہ کہ میں کم از کم انکی نظروں میں وی آئی پی ہو کر آہستہ آہستہ آگے قدم بڑھاتا رہا۔اس سال پانچویں میں وہ ہمارے فارم ماسٹر بھی تھے۔اس زمانے میں دستور تھا کہ کتابیں جیومیٹری بکس وغیرہ سال کے آخر میں اسٹورز کو فارم ماسٹر کے توسط سے واپس کرنا پڑتا تھا۔ راشد صاحب کتابیں اور اسٹیشنری ایشو کرتے تھے اور وصول کرنے میں بہت محتاط تھے۔ یہ سارا مال پاکستان کا ہے۔ وہ یہ بتاتے نہیں تھکتے تھے۔اب اس واقعہ کی طرف آتا ہوں جس کا نقش آج بھی میرے دل میں تازہ ہے۔ ہوا یہ کہ میرے جیومیٹری کا چھوٹا 6 انچ کا پیمانہ کہیں گم ہو گیا۔ میں نے کیا یہ کہ ایک فٹ رولر لیا جو آخری طرف سے ٹوٹا ہوا تھا لیکن شروع کے 6 انچ سلامت تھے۔ میں نے اسے آدھا کاٹ کر جیومیٹری بکس میں رکھ دیا۔ راشد صاحب نے حسب عادت جیومیٹری کھول کر اسے چیک کیا اور چالا کی پکڑ لی۔جیومیٹری بند کرتے ہوئے صرف اتنا کہا۔''اسحاق مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی''۔ یہ الفاظ اسحاق مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔ مجھے آج بھی ہانٹ (haunt) کرتے ہیں۔خصوصاً ان کے لب ولہجہ کا دکھ۔انکے چہرے کا کرب۔ یا اللہ یہ کیسا استاد تھا کہ غلطی ہم کرتے تھے اور دکھ اس کو ہوتا تھا۔ایک عرصہ کے بعد جب میں کھاریاں میں پوسٹ ہوا تو انکے سلام کو حاضر ہوا۔اس وقت وہ سی آئی کے دفتر کے سامنے ایک اور اولڈ بوائے میجر ظفر سے باتیں کر رہے تھے۔ظفر کے ساتھ ایک اور آفیسر بھی تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ سر راشد مجھے کپتانی کی وردی میں دیکھا تو کھل اٹھے۔ بار بار کہتے تھے۔''اسحاق مجھے تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ بہت خوشی ہوئی ہے''۔ جب انھوں نے بے اختیار تیسری بار یہ کہا مجھے بہت خوشی ہوئی ہے تو ظفر سے رہا نہ گیا۔''سر اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ہمیں دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی''۔ بولے''ظفر نہیں، یہ بات نہیں تمہاری خوشی اور قسم کی ہے، اس کی اور قسم کی۔ جب تمہاری اپنی اولاد ہو گی تو اس فرق کو سمجھ سکو گے۔''

ایک رشتہ انسانیت کا بھی ہوتا ہے اور شاید باقی تمام رشتوں سے افضل تر۔ان دو حقیقتوں کو میں نے سر راشد کے حوالے سے سمجھا ہے۔

سلیم اختر کیانی

(کالج نمبر 2319، زمانہ تعلیم 1964-1956ء)

میں 1956ء میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔کالج کے سالانہ تقریری مقابلوں کا موقع تھا۔راشد

صاحب نے مجھے تقریر میں حصہ لینے کو کہا۔ کچھ بہانہ، کچھ ڈر، کچھ بیماری، میں جا کر کالج ہاسپٹل میں داخل ہو گیا۔ ایک دن تو خیریت سے گزر گیا۔ دوسرے روز شام کو راشد صاحب ہاسپٹل آ گئے۔ میری مزاج پرسی کی اور انگریزی کے چند رسالے چھوڑ کر چلے گئے۔ میں خوش ہوا کہ بلا ٹل گئی۔ خوشی خوشی رسالے دیکھنے لگا کہ ایک رسالے میں سے راشد صاحب کی لکھی ہوئی ایک تقریر برآمد ہوئی۔ سخت ندامت محسوس ہوئی اور میں نے اس تقریر کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ اگلے روز ہی جب راشد صاحب آئے تو میں نے کہا کہ سر آپ مجھ سے تقریر سن لیں۔ راشد صاحب نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا ''بھئی کونسی تقریر؟ میں تو آپ کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔''

پھر وہ ہر روز ہسپتال میں مجھے ریہرسل کروانے آتے۔ ہسپتال ہی سے میں نے ڈیبیٹ میں حصہ لیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یوں راشد صاحب نے تقریر جیسی دولت مجھے عطا کی اور اب تک یہ دولت میں بے دریغ خرچ کر رہا ہوں۔ اس قصہ میں لطف کی بات یہ ہے کہ جب اوائل 1987ء میں میں نے انھیں یہ واقعہ یاد دلایا تو انہیں کچھ یاد نہ تھا۔ نیکی کر دریا میں ڈال شاید اسی کو کہتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کا اہتمام، راشد صاحب جیسے اساتذہ شعوری اور لاشعوری، دونوں انداز میں کرتے رہتے ہیں مشن کی پرسوز لگن ان سے یہ کام سرانجام دلاتی ہے۔ ایک طرح سے یہ لوگ possessed ہوتے ہیں۔ ایک ماورائی روح کے تابع، ایک جنون کے تابع، یہ اپنی دھن میں، تپتی دھوپ میں، آندھی جھکڑ میں، اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح جیسے

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

راشد صاحب نے دوسروں کے مقابلے میں کم تنخواہ پر برس ہا برس کام کیا۔ ایک ملٹری ادارے میں جہاں آرمی افسروں کی ریل پیل ہو اور status بھی ان ہی کا زیادہ ہوتا ہو، راشد صاحب نے اپنے دل میں میل نہیں آنے دیا اور اپنے کام سے کام رکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ صوفیاء کے کس سلسلہ میں بیعت ہیں۔ یا بیعت ہیں بھی یا نہیں۔ لیکن انکے رویے ضرور درویشانہ ہیں۔

میں نے مباحثہ سے بات شروع کی تھی راشد صاحب نے صرف مجھے نہیں (2433) ممتاز اختر، (2413) باز، (2471) احمد، (2393) شاہد پرویز وغیرہ اور سکین ہاؤس کے بے شمار جونیئر لڑکوں کو بولنا سکھایا۔ اور ان پر اتنی محنت کی کہ نہ صرف جونیئر ہاؤس بلکہ آکنلک ہاؤس اور رابرٹس ہاؤس سینئر ہاؤس کو بھی ڈیبیٹ میں ہرایا۔

شاید یہ بات زیادہ لوگوں کو معلوم نہ ہو کہ راشد صاحب کو ڈراما لکھنے اور پروڈیوس کرنے کا بھی شوق رہا

ہے۔اس زمانہ میں کرنل رفیق کے ایماء پر ہر کلاس ہر سیکشن سال میں ایک بار ایک اسٹیج شو پیش کرتی تھی جس میں سیکشن کے ہر لڑکے کا حصہ لینا لازمی تھا۔راشد صاحب اپنی (VII-C) کے علاوہ مسٹر مظہر، مسٹر بلگرامی اور مسٹر حمید کے سیکشنوں کے ڈرامے بھی تیار کراتے اور پیش کرتے تھے۔ان ڈراموں کی پیشکش میں ان کا اپنا نظریہ اور اسٹائل تھا کہ پارٹ چھوٹے چھوٹے ہوں تا کہ زیادہ سے زیادہ لڑکے اسٹیج پر آئیں، ڈرامے کم سے کم کاسٹیوم کے ساتھ اور بغیر میک اپ کے پیش کئے جائیں۔زنانہ کردار یا تو بالکل نہ ہوں یا پھر مردانہ قسم کے لڑکوں کو دیئے جائیں۔اسٹیج پر عموماً talented قسم کے لڑکوں کو آگے لایا جاتا ہے۔راشد صاحب کے ہاں اصلاح عام کی صورت تھی۔ وہ کردار لڑکے کی نفسیاتی ضرورت کے مطابق دیتے تھے اس کی اپنی موزونیت کے اعتبار سے نہیں۔ان کا خیال تھا کہ بیشک ڈراما فلاپ ہو جائے لڑکا فلاپ نہ ہو۔اکثر کہا کرتے اسکول پلے عام اسٹیج کے مقابلہ میں بنیادی طور پر تربیت کے لئے ہوتا ہے۔تفریح ثانوی چیز ہے۔لیکن وہ تفریح کی ضرورت سے غافل بھی نہیں تھے۔خود میں نے ایک بار ان کے ایک پر تفریح ڈرامے میں مرکزی مزاحیہ کردار ادا کیا۔اس اسکٹ کا نام چاندنی تھا۔

راشد صاحب نے یقیناً اپنے روایتی انکسار کے تحت، حیدری صاحب اور علوی صاحب کے احترام میں اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور تحریر و تقریر کے ذریعہ کردار سازی اور ذہنی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔

کرنل اخلاق احمد

(کالج نمبر 2345، زمانہ تعلیم 1964-1956ء)

راشد صاحب ہمیں یوں پڑھاتے تھے جیسے انھیں ہمارے اندر پاکستان نظر آتا ہو اور غالباً انہیں یہ یقین بھی تھا کہ ہم سب پاکستان کو بہتر بنانے میں ایک دن مؤثر کردار ادا کریں گے۔چنانچہ ہم ان کی نظر میں ایک عام طالب علم نہیں تھے۔ وی آئی پی طالب علم تھے۔اسی لئے وہ ہماری تعلیم و تربیت دونوں میں غیر معمولی اہتمام کرتے تھے۔ان کا فلسفہ یہ تھا کہ کسی کو اہم سمجھو گے تو وہ اہم بننے کی کوشش کرے گا۔انھوں نے ہمیں اہمیت دے کر ہمیں اہم بننے کی ترغیب دی۔ان کا کلاس میں آنا جانا بڑا پر تکلف تھا۔کلاس میں آتے ہی بالکل قائداعظم کے اسٹائل میں پیشانی کی طرف ہاتھ لے جا کر سلام کرتے اور جاتے وقت تھینک یو جنٹلمین کہنا نہ بھولتے۔ایک روز خود ہی وضاحت کی کہ ''مولوی عبدالحق نے مولانا حالی کے خاکہ میں لکھا ہے کہ زمانہ طالب علمی میں میں اور سہیل احمد خاں ایک آدھ بار ان سے ملنے گئے تو سروقد کھڑے ہو کر انھوں نے تعظیم دی۔ہم شرمندہ ہوئے تو کہا۔اس قوم کو اب آپ ہی لوگوں نے سنبھالنا ہے۔آپ کی تعظیم نہ کروں

تو کس کی تعظیم کروں''۔ راشد صاحب کا یہی رویہ ہمارے ساتھ تھا۔ بحیثیت مجموعی میرا خیال ہے کہ ان کا اعتماد رائیگاں نہیں گیا۔

راشد صاحب انسپکشن پر، کلاس روم میں، کاپی دیکھنے میں، جو اتنی باریک بینی سے کام لیتے تھے تو اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہمارے اندر meticulousness کا رویہ پیدا ہو۔ خاص طور پر جونیئر بچوں سے ان کا رویہ پدرانہ اور مادرانہ تھا۔ کلاس میں کسی کا بٹن ٹوٹا ہوا ہے تو اسے اپنے گھر بھیجنا کہ ٹنکوا کر آؤ۔ کاپی یا کتاب پر کور نہیں ہے تو اسے چٹ لکھ کر دینا کہ آنٹی سے کور لے کر آؤ۔ (گھر پر ڈرائینگ روم کی میز پر خاکی کورنگ پیپر کے ٹکڑے کاٹ کر رکھے ہوئے تھے) ادھر غالباً اپنی بیگم سے یہ انڈرسٹینڈنگ تھی کہ کوئی بچہ آئے تو اسے کس طرح وی آئی پی ٹریٹ منٹ دینا ہے۔ ان کی تربیت کی باریکیوں اور شفقتوں کو وسیع تر پس منظر میں دیکھا جائے تو ان کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کاش کوئی ان کے فلسفہ تعلیم، طریق تربیت اور تخلیقی کاوشوں پر ریسرچ تھیسس لکھ سکتا۔

راشد صاحب اس زمانہ میں زیادہ تر ایسی کتابیں پڑھنے کو دیتے جو اکثر و بیشتر ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتی تھیں مثلاً مجھے یاد ہے کہ جب (وہ اسکین ہاؤس میں تھے غالباً 1958ء میں) تو انھوں نے مجھے آندرے مورواکی کتاب 'The Art of Living' پڑھنے کو دی۔ اس طرح ان کے پاس لن یوتانگ کی The Importance of Living بھی تھی۔ نیوی بلیو رنگ کی جلد تھی۔ پڑھی تو نہیں لیکن الٹ پلٹ کر ضرور دیکھی۔ ان کتابوں میں جو کچھ ہوگا وہ ہوگا۔ ان کا اپنا طرز زندگی Life style خود ایک بولتی ہوئی کتاب تھا۔ جس کسی نے انکے ڈرائینگ روم کو دیکھا ہے اسے یاد ہوگا کہ وہ ڈرائینگ روم کم آرٹ گیلری اور لائبریری زیادہ تھا۔ لیل ونہار، ریڈرز ڈائجسٹ، لائف اور نقوش وغیرہ کی کاپیاں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور سب کتابوں اور رسالوں پر خاکی کور چڑھے ہوتے تھے۔ دیواروں پر مونالیزا، ہوپ، 'The age of innocence' چغتائی اور زین العابدین کی تصویریں جلوہ دکھاتی تھیں۔ کلاس میں کلاس ڈیکورم اور پوسچرز تک کا خیال رکھنا، کاپی میں حاشیہ کی صحیح چوڑائی پر اصرار کرنا ایسی چیزیں تھیں جنھوں نے ہماری طرز زندگی کو بہت متاثر کیا۔ انکی اپنی زندگی ایک ضابطے کے مطابق گزر رہی تھی۔ وہ اپنے وقت اور توانائی کے بارے میں بے حد محتاط تھے۔ شاید اسی وجہ سے عمر کے ساتھ ساتھ ان کے کام کی کوالٹی اور کوانٹیٹی دونوں میں اضافہ ہوا۔

ایک اور بات یہ کہ میں نے انہیں کسی لڑکے کو بالکل condemn کرتے نہیں دیکھا۔ نالائق سے نالائق میں بھی کوئی نہ کوئی قابل تعریف پہلو نکال ہی لیتے تھے۔ یہ اپروچ صوفیاء کی ہے جو وہ ہاؤس میں اور

کلاس روم میں استعمال کر رہے تھے۔

نثار کیانی

(کالج نمبر 2353، زمانہ تعلیم 1962-1956ء)

راشد صاحب سکین ہاؤس میں ڈریس انسپکشن کر رہے تھے۔ جوتوں کی پالش چیک کرنے پر آئے تو سب لڑکوں کو آباؤٹ ٹرن کروایا اور خود بیٹھ بیٹھ کر چیک کیا کہ جوتوں کے پیچھے ایڑی کو بھی پالش سے چمکایا گیا ہے یا نہیں، پھر موزے اتروا کر سونگھ کر دیکھے کہ ان میں بو تو نہیں آ رہی۔ اسکے بعد پیروں کے ناخن دیکھے کہ بڑھے ہوئے تو نہیں۔

میرے چھوٹے بھائی مشتاق کیانی کالج نمبر 2759 نے 1971ء کی جنگ میں جام شہادت نوش کیا تھا۔ 1978ء میں راشد صاحب نے 'تذکرہ شہداء' مرتب کرنا شروع کی تو انھوں نے مشتاق کی شہادت کے کوائف اور سوانحی حالات جمع کرنے میں جس جانفشانی سے کام لیا اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ اسی طرح دوسرے شہیدوں پر لکھنے کیلئے انہوں نے جو جتن کئے وہ ایک الگ داستان ہے جس کا اجر انہیں اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ یہ بات شاید بہتوں کو معلوم نہ ہو کہ کالج کے شہیدوں پر تین کتابیں اور غازیوں پر 'جرأتوں کے نشان' انھوں نے از خود فی سبیل اللہ لکھیں اور انکی رائلٹی نہیں رکھی تا کہ کتابیں زیادہ سے زیادہ چھپیں اور پڑھی جائیں۔

لیفٹیننٹ کرنل وکیل خان آفریدی

(کالج نمبر 2381، زمانہ تعلیم 1963-1956ء)

یہ واقعہ 1956ء کا ہے۔ دسمبر کی چھٹیاں ہو چکی تھیں لیکن میں کسی وجہ سے گھر نہیں جا سکا تھا۔ رابرٹس ہاؤس کا ایک اور لڑکا بھی ایک رات کے لئے ٹھہرا ہوا تھا۔ شام کو ہم راشد صاحب سے اسکین ہاؤس میں ملنے گئے۔ اصل میں خیال ان سے ملنے سے زیادہ ان کی مشہور اورنج پیکو چائے پینے کا تھا۔ رہنے سہنے کھانے پینے اور پہننے کا ان کا اپنا ایک معیار تھا۔ بہر حال اس شام انھوں نے خود ہی کہا۔ آج کافی پیتے ہیں۔ اندر سے کافی کے لوازمات منگوائے اور بڑے اہتمام سے خود اپنے ہاتھوں سے کافی بنائی۔ اتنے میں اندر سے آنٹی آ گئیں۔ وہ ان کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے بیٹھنے پر بیٹھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا میں کافی سرو کروں۔ میں نے کافی کی پیالی جب پہلے ان کو پیش کرنا چاہی تو انہوں نے اشارہ سے کہا لیڈی فرسٹ، اس عرصے میں آنٹی ہم دونوں کی خیر خیریت دریافت کرتی رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے کافی محض اس لئے پی اور بنائی کہ ہم

کافی بنانے کے طریقے اور سرو کرنے کے آداب سے واقف ہو جائیں۔ اس شام ہوم سک نس کی جو لہر مجھ پر آئی ہوئی تھی وہ آنٹی کے دو مادرانہ بولوں سے اتر گئی۔ اب مجھے یقین ہے کہ سر نے آنٹی کے آنے کو بھی پلین کیا ہو گا اور آنے کے وقت کو ٹائم کیا ہو گا۔ کوئی موقع ہو ان کی نظر ہماری تربیت پر رہتی تھی۔

کالج چھوڑنے کے بعد بھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ جب میں شادی کے بعد پہلی بار اپنی مسز کے ساتھ انکے ہاں گیا تو سر نے اور آنٹی نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ آنٹی نے میری مسز کو میری بہو کہہ کر گلے لگایا اور روایتی طریقے سے ان کے خس کا عطر لگایا اور ان کا منہ میٹھا کروایا۔ چلتے چلتے میری مسز سے سرگوشی کے انداز میں کہا بیٹی تم کینرڈ کالج سے ایم اے سائیکالوجی تو ضرور ہو لیکن میرے پٹھان بیٹے کی بیوی بھی ہو، نفسیات ہی نہیں، مردوں کی نفسیات وہ بھی آفریدی مردوں کی نفسیات کو بھی ملحوظ رکھنا۔

راشد صاحب نے ہمیں شادی کے تحفے کے طور پر مجھے 'Living with Leadership' اور مسز کو 'Ripness is All' دی۔ جسے انہوں نے بہت دلچسپی سے پڑھا۔

مئی 1985ء میں جب مجھے آنٹی کے انتقال کی خبر ملی تو میں سول سروس اکیڈمی میں کورس کر رہا تھا۔ ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا اور تادیر ان کی باتیں کرتے رہے۔ ان دونوں کی انڈر اسٹینڈنگ ہمارے لئے انسپریشن تھی۔ میں ان بے شمار اولڈ بوائز میں سے ایک ہوں جنھیں راشد صاحب اپنے خاندان کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ یہاں لاہور میں انکی ڈاکٹر بیٹی گل اکثر ہمارے ہاں آتی رہتی تھی۔ میرے بچے اس سے بہت مانوس تھے۔ یہی حال انکے بیٹے مسعود کا تھا، وہ بھی آتا رہتا تھا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ راشد صاحب سے تعلق اب دوسری نسل تک پھیل چکا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل اقبال شاہین

(کالج نمبر 2367، زمانہ تعلیم 1964-1956ء)

میں 1956ء میں کالج میں پانچویں جماعت میں داخل ہوا تھا۔ وہ کالج کی آخری پانچویں تھی۔ اگلے سال چھٹی سے داخلہ شروع ہونا تھا۔ اگلی چھٹی میں پہنچے تو وہ بھی ختم۔ تیسرے سال ساتویں بھی ختم، مطلب یہ کہ ان تین سالوں میں کسی سال فیل ہوتے تو پکی چھٹی ہو جاتی۔ مجھے ایوب صاحب نے چند سال پہلے بتایا کہ 1958ء میں یہ مرحلہ آ گیا تھا۔ انگریزی میں نمبر کم آنے پر جب میرا کیس اسٹاف کانفرنس میں ڈسکس ہو رہا تھا تو عمومی رائے یہ تھی کہ لڑکا شروع سے کمزور چلا آ رہا ہے۔ اب پھر کم نمبر آئے ہیں۔ آگے

چل نہیں سکتا۔اس وقت راشد صاحب نے اپنا معروف جملہ کہا کہ اس میں spark ہے۔کمانڈانٹ کرنل رفیق نے پوچھا۔آپ ذمہ داری لیتے ہیں اس سپارک کو چمکانے کی تو انہوں نے حامی بھر لی۔کسی نے پوائنٹ آؤٹ کیا کہ آپ تو اردو پڑھاتے ہیں یہ فیل انگریزی میں ہے۔''انگریزی کی ایکسٹرا کوچنگ میں کروں گا۔''اس طرح راشد صاحب کی ضمانت پر مجھے تین ماہ کا گریس پیریڈ ملا اور جان بچ گئی۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس مرحلہ پر انھوں نے میرے والد جو ان دنوں جہلم ایس ایس ڈی میں پوسٹ تھے، سے بھی رابطہ قائم کیا اور ہفتہ اتوار دو دن مجھے انگریزی پڑھاتے۔جب میں پہلی شام کو سکین ہاؤس گیا تو وہاں کلاس کا سماں تھا۔کچھ لڑکے تقریریں یاد کر رہے تھے۔کچھ اخبار سے خبریں نوٹ کر رہے تھے۔مجھے بھی حکم ہوا کہ ہر روز کھیلوں پر جانے سے پہلے اس روز کی ایک خبر انگریزی اخبار سے نوٹ کر کے دکھایا کروں۔جب میں نے سڑکوں کے حادثات اور قتل کے واقعات کی خبروں کی تکرار کی تو انھوں نے وضاحت کی جو خبر پہلے صفحہ پر شہ سرخی بنتی ہے عموماً اس دن کی سب سے اہم خبر وہ ہوتی ہے۔گو انگریزی اردو اخباروں کی شہ سرخیوں میں بھی فرق ہوتا ہے۔چونکہ ان کے پڑھنے والے مختلف ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔اسی طرح انھوں نے اردو اخبار کے تیسرے صفحہ کے اداریے اور اور مضامین پڑھنے کی تلقین کی۔

راشد صاحب کی توجہ سے میں آٹھویں میں تو صاف صاف پاس ہو گیا لیکن ایف ایس سی کے بورڈ کے امتحان میں انگریزی میں پھر بریک لگ گئی۔چونکہ نتیجہ آنے سے پہلے آئی ایس ایس بی کلیر کر چکا تھا۔اس لئے اس ناکامی سے مجھے بہت مایوسی ہوئی۔گھر والوں نے بظاہر تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کی مایوسی اور مجھ پر کچھ عدم اعتماد، ان کی افسردہ خاموشی سے عیاں تھی۔میں نے ایک بار پھر راشد صاحب کا دامن پکڑا۔میں پشاور سے انگریزی کے پرچے حل کر کے بھیجتا وہ انکی تصحیح کر کے واپس بھیجتے۔اس طرح ضمنی امتحان تک پارسلوں کے آنے جانے کا یہ سلسلہ چلا۔آخر کار میں سرخرو ہوا۔اور کیریر کی marathan race میں شامل ہو گیا۔دس پندرہ برس کے بعد ایک منزل پر ذرا ٹھہرا تو پھر وہ چراغ یاد آیا جس کی اجلی روشنی میں، میں نے یہ سفر شروع کیا تھا۔چنانچہ حاضر خدمت ہوا۔بڑی شدت سے جی چاہا کہ انکے قدموں میں بیٹھوں، ان ہاتھوں کو چوموں اور آنکھوں سے لگاؤں۔جنھوں نے میرے کیریر کو ہی نہیں بنایا بلکہ مجھے بھی بنایا۔آدمی سے انسان!

ضمیر حسین

(کالج نمبر 2380،زمانہ تعلیم 1956-1963ء)

1958ء میں میجر جنرل نوازش علی نے بحیثیت مہمان خصوصی انعامات تقسیم کرنے کے بعد کہا تھا:

I am sure you are not concentrating only on the

narrow functional aim of the College, which is to produce as many officers for the armed forces as possible, but aim at a broad spectrum development of the human potential, The society in general is woefully short of well-rounded individuals with a sound character and broad vision."

راشد صاحب نے بطور تبصرہ کہا کہ ''یہ فقرہ بہت اہم ہے۔ پھر اس کے بعد کیریکٹر کے ساتھ a broad spectrum development بھی کہنا بڑی گہری بات ہے۔ اس میں سارا فلسفہ تعلیم سمٹ آیا ہے۔'' جب میں چلنے لگا تو کہا ''ضمیر اس خطبہ کے یہ الفاظ نوٹ کر لو۔ کبھی کام آئیں گے۔''

میں جب کالج میں تھا تو راشد صاحب کے لٹریری سرکل کا بڑا پر جوش ممبر تھا۔ یا یوں کہہ لیجئے تک بندی کرنے کا جنون تھا۔ راشد صاحب نے مجھے سمجھایا بلکہ حکم دیا سائنس لو بے شک شعر بھی کہتے رہو۔

راشد صاحب خود broad vision پر ہماری تربیت کر رہے تھے۔ اور انکی کوشش تھی کہ کردار کے ساتھ ساتھ ہم broad vision سے بھی بہرہ مند ہوں۔

محمد ایوب خان

(کالج نمبر 2404، زمانہ تعلیم 1961-1957ء)

کسی کو یقین آئے گا کہ 1959ء میں جب دسویں کا طالب علم تھا تو راشد صاحب نے مجھے Hardy کا ناول Tess پڑھنے کو دیا جو میں نے لفظ بہ لفظ چھٹیوں میں پڑھا۔ اسی سال انھوں نے شوکت صدیقی کا اردو ناول 'خدا کی بستی' بھی مجھ سے پڑھوایا۔ قرۃ العین حیدر کا مشہور تاثراتی ناول 'آگ کا دریا' بھی میں نے انہی کے ایماء پر پڑھا۔ یہی نہیں پھر لٹریری سرکل کی میٹنگوں میں جس کا اجلاس اکثر ان کی اپنی اسٹڈی روم میں ہوتا تھا، ان ناولوں پر میں نے تبصرہ بھی کیا۔ راشد صاحب کے اصرار پر میں نے تاثراتی انداز میں کالج کے میگزین 60-1959ء کے لئے ایک انشائیہ ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' لکھا۔ جس صورت میں یہ چھپا ہے اس میں راشد صاحب کی کافی اصلاح بھی شامل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون میں نے انہی کی تحریک پر تحریر کیا تھا۔ بعد میں جب میں نے کیمبلپور کالج سے انگلش لٹریچر کے ساتھ بی اے کیا تو ملٹری کالج کی ادبی تربیت کی وجہ سے مجھے کچھ دشواری پیش نہ آئی۔ راشد صاحب نے لٹریری سرکل کے تحت اس زمانہ میں کئی مذاکرے کالج کے اسٹیج پر کروائے تھے۔ ایک کا موضوع تھا کہ ذریعہ تعلیم اردو ہونا چاہیے۔ اس کا سکرپٹ راشد صاحب نے لکھا تھا۔ میں اردو کی حمایت میں بولا اور وہ دلائل آج بھی مجھے

لفظ بہ لفظ یاد ہیں۔ان مذاکروں، بحثوں اور سب سے بڑھ کر اس فضا سے جو اس وقت ملٹری کالج میں تھی ہمارے اندر پاکستانی قومیت کا جذبہ بیدار رہوا۔خود راشد صاحب پاکستانیت کے بہت پر جوش علم بردار تھے۔ حسن ریاض صاحب کی کتاب ''پاکستان ناگزیر تھا'' تو اب شائع ہوئی ہے تحریک پاکستان کی ناگزیریت کا احساس سب سے پہلے انھوں نے ہمیں کرایا تھا۔

راشد صاحب کا اصلاح کرنے کا اپنا ایک طریقہ تھا۔1960ء میں میں نیا نیا کالج ہیڈ بوائے بنا تھا۔ایک روز کالج کنٹین کے پاس مل گئے۔ مجھے غور سے دیکھا اور کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی غلطی ہوئی ہے۔ڈنر کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا ہیڈ بوائے کا ظاہر بھی ایک نمونہ ہونا چاہیے۔اس دن سے لباس کے معاملہ میں بے حد محتاط ہو گیا اور یہ وطیرہ آج تک قائم ہے۔

میں جب کالج میں داخل ہوا تو عام مشہور تھا کہ راشد صاحب چیک بہت کرتے ہیں لیکن سزا کبھی نہیں دیتے۔ایک روز میں نے اس سلسلہ میں استفسار کیا تو بولے''سزا اور جزا دونوں میں میرا ایمان ہے۔سزا جزا کا ہر آدمی کا اپنا اسٹائل ہوتا ہے۔اصل میں سزا مقصود بالذات نہیں۔مقصود بالذات تو اصلاح ہوتی ہے۔سزا یا تنبیہہ اس کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔سزا بھی دی جا سکتی ہے لیکن اس سے پہلے محبت کی جوت جگانی پڑے گی۔ میں خوف کی فضا کے سخت خلاف ہوں۔خوف سے ذہنی اور قلبی صلاحیتیں دب کر ہی نہیں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہیں،اصل میں تو بچہ کے دل میں گھر کرنا ہوتا ہے۔اس کے بعد جتنی چاہیں سختی کر لیں''۔

غالب نے کیا خوب کہا ہے:

قہر ہو بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم میرے لئے ہوتے

مجھے نہیں معلوم کہ راشد صاحب صوفیاء کے کسی سلسلہ میں بیعت ہیں یا نہیں لیکن ان کا عمل سراسر صوفیانہ ہے۔محبت کرنا اور کرتے رہنا اور مایوس نہ ہونا میں نے انہی سے سیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر فاروق احمد

(کالج نمبر2413،زمانہ تعلیم 1959-1957ء)

18 اپریل 1959ء کا واقعہ ہے۔میں کالج سے ڈسچارج ہو کر اسٹور پر کٹ جمع کرا رہا تھا،کوئی 5 بجے شام کا وقت ہوگا کہ راشد صاحب ادھر سے گزرے بیڈمنٹن کا ریکٹ ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہو گئے ''فاروق! اب کیا سوچا ہے''۔ناکامی کی شام بہت بھاری ہوتی ہے، میرے منہ سے نکلا''اب جو قسمت

میں ہو۔فرسٹ ڈویژن میٹرک ہوں شاید کہیں کلرکی مل جائے''۔میری مایوسی میرے لب ولہجہ سے ظاہر تھی۔ ''No, Farooq, that's not on'' آپ جواں ہو،فوجی کے بیٹے ہو،ملٹری کالج میں پڑھتے ہو، آگے دنیا پڑی ہے۔ہمت کرو، وہ شعر یاد نہیں۔

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

جس طرح مایوسی میرے الفاظ سے زیادہ میرے لب ولہجہ میں تھی۔اسی طرح ان کی ہمدردی انکے الفاظ سے زیادہ لب ولہجہ میں تھی۔جس نے مایوسی کے جالوں کو کاٹ دیا۔اور میں پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

محمد رفیق

(کالج نمبر2414،زمانہ تعلیم1957-1964ء)

1962ء میں راشد صاحب دسویں کو انگریزی پڑھاتے تھے۔گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں۔چوتھے پیریڈ سے پڑھنا بند کر رکھا تھا۔جو استاد آتا اسے باتوں میں لگا لیتے وہ بھی اس خیال سے کہ بچے ہیں چھٹی کی خوشی میں پڑھنے کا موڈ نہیں،گپ شپ کر کے چلے جاتے۔راشد صاحب کا آخری گھنٹہ تھا۔ہم نے وہی حربہ اختیار کیا۔سر آج کتاب پڑھنے کا قطعاً موڈ نہیں۔انھوں نے کہا۔نہیں ہے تو نہ سہی،کتاب ڈیسک میں رکھ دیجئے۔آج چھٹی کے فلسفہ پر بات کروں گا۔چنانچہ وہ شروع ہو گئے۔چھٹی کی غرض وغایت سے لے کر چھٹی سے صحیح فائدہ اٹھانے کے طریقوں تک پر تفصیل سے گفتگو کی۔چھٹیوں میں پڑھنے کے لئے کتابوں کے نام بھی لکھوائے اور اصرار سے کہا۔'' گھر جا رہے ہیں۔خالی ہاتھ نہ جائیں ،چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے چھوٹے موٹے تحفے لے کر جائیں''۔پھر یہ مشورہ دیا کہ اگر ہو سکے تو اپنے اپنے علاقے میں سول اور فوج کی اہم شخصیتوں سے انٹرویو کریں کہ ان کی زندگی کے تجربہ کا لب لباب کیا ہے۔یہ سلسلہ جاری تھا کہ گھنٹی بج گئی۔اور وہ ''I wish you happy holidays خدا حافظ'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔میرے ایک دوست نے کہا۔''یار مارے گئے،اس سے بہتر تھا کہ کتاب ہی پڑھ لیتے۔ انھوں نے تو اتنا لمبا پروگرام بنا دیا ہے اور اوپر سے کہہ رہے ہیں کہ I wish you happy holidays۔اس پروگرام میں کہیں happy ہونے کی گنجائش ہے؟''

محمد یونس

(کالج نمبر2415،زمانہ تعلیم1957-1962ء)

میں 1957ء میں اسکین ہاؤس میں داخل ہوا تو اسکے دوسرے دن راشد صاحب نے انٹرویو کے لئے بلالیا۔اس سے پہلے کہ گفتگو شروع ہو، انہوں نے مجھ سے کہا یونس، ذرا وقت تو دیکھ کر آ ؤ،اس زمانہ میں اسکین ہاؤس میں ایک بڑی گول دیواری گھڑی کاریڈور کے قریب لگی ہوتی تھی۔ میں باہر چلا تو آیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک مجھے گھڑی دیکھنی نہیں آتی تھی۔ عجیب الجھن میں پڑ گیا۔کس سے پوچھوں یا کیا کروں۔ بہر حال میں نے فیصلہ یہ کیا جو بات ہے وہ انکو بتا دوں۔ میں نے واپس جا کر انکو بتا دیا کہ سر مجھے گھڑی دیکھنی نہیں آتی۔ کہنے لگے کوئی بات نہیں،شروع میں مجھے بھی نہیں آتی تھی۔ پھر خود اٹھ کر گئے اور وقت دیکھ کر آئے۔ جو بات میرے دل پر نقش ہے یہ ہے کہ میری لاعلمی کو انھوں نے بالکل نارمل طریقہ سے بلکہ پیار سے لیا اور دوسرے یہ کہ جب میں وقت نہ بتا سکا تو بجائے کہ باہر کھڑے کسی اور لڑکے کو وقت دیکھنے کے لئے بھیجتے۔ میرا بھرم رکھنے کے لئے خود اٹھ کر گئے جیسے کسی اور کام سے جا رہے ہیں۔اسی روز کے بعد سے خاموشی سے مجھ پر زیادہ توجہ دینے لگے۔ یہاں تک کہ سال ختم ہوتے ہوتے انہوں نے مجھے کالج اسٹیج پر انٹر ہاؤس تقریری مقابلے میں دھواں دھار طریقے سے حصہ لینے کے قابل بنا دیا۔

لیفٹیننٹ کرنل شمیم احمد جاوید

(کالج نمبر 2421،زمانہ تعلیم 1957-1964ء)

1958ء میں ہمارے سیکشن ساتویں اے نے اپنا علیحدہ ڈراما شو کالج اسٹیج پر پیش کیا جبکہ دوسری کلاسوں کے تینوں سیکشنوں نے مل کر ڈراما پیش کیا۔اس وجہ سے ہمارے سیکشن کے ہر لڑکے کو اسٹیج پر آنے کا موقع ملا۔اس ڈارمہ کا نام 'بلبل' (The Nightingale) تھا اس میں بادشاہ نفسیاتی انتشار کا شکار ہو کر ہنستا نہیں جس نے رفتہ رفتہ ایک مرض کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس ڈراما میں میرا کردار درباری مسخرہ (Court Jester) کا تھا۔آخر کار بلبل دروازہ پر آتی ہے اور گاتی ہے۔اس کی آواز سن کر بادشاہ کی اداسی دور ہو جاتی ہے۔ یہاں میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ اس سیکشن ڈراما شو کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نہ کوئی شاندار کاسٹیوم استعمال کی گئی تھی نہ غیر معمولی میک اپ کیا گیا۔کوئی زنانہ کردار بھی نہ تھا۔props علامتی تھیں۔ بادشاہ کے سر پر گتے کا تاج تھا اور شاہی لباس کی جگہ بستر کی چادر لپیٹی تھی۔اس پر لکھا تھا کنگ۔ راشد صاحب نے ڈراما کی سیٹنگ وغیرہ کا سارا کام لڑکوں سے کروایا اور پروڈیوسر ڈائریکٹر بھی لڑکے بنائے اور ڈراما کے شروع میں پروڈیوسر نے حاضرین کو بتایا بھی کہ یہ اسکول ڈراما ہے۔تھیٹر کا ڈراما نہیں۔اس کا مقصد لڑکوں کو مکالمے بولنا اور ایکٹ کرنا سکھانا ہے تا کہ ان میں خود اعتمادی

پیدا ہوا اور تقریر کی تربیت ہو۔ راشد صاحب کا ڈراما کے بارے میں اپنا نظریہ تھا۔

ایک بار میں بیمار ہوا اور کالج اسپتال میں داخل ہونا پڑا راشد صاحب حسب معمول اسپتال میں مجھے دیکھنے آئے۔ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی پوچھا کہ گھر خط تو نہیں لکھ دیا۔ معمولی بخار ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ گھر خط لکھو گے تو گھر والوں کو فکر ہو جائے گی۔ اس عرصے میں تم ٹھیک بھی ہو چکے ہو گے۔

اس زمانے میں کتابیں اسٹیشنری اسٹور کو امتحان کے بعد واپس کرنا ہوتی تھیں۔ وہ بحیثیت فارم ماسٹر ہمیں سال بھر یاد دلاتے رہے کہ کتابوں کو خراب نہیں کرنا۔ یہ نئی کلاس کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اسی طرح وہ اصرار کرتے کہ ہم کاپی پر نمبر لگائیں۔ تاکہ صفحے ضائع نہ ہوں۔ اس طرح انھوں نے ہمیں سماجی ذمہ داری سکھانے اور قومی احساس کو اجاگر کرنے کی جوش و خروش سے مسلسل کوشش کی۔ میرا خیال ہے کہ ان کا کوئی شاگرد ایسا نہ ہوگا جس نے ان سے پاکستانی قوم پرستی کا جذبہ catch نہ کیا ہو۔ ایک مرتبہ میں نے کاپی کا آدھا صفحہ خالی چھوڑ کر اگلے صفحہ پر دوسری مشق کر دی۔ انھوں نے مجھے بلا کر بطور خاص میری توجہ کاغذ کے ضیاع کی طرف دلائی۔ انھوں نے اس وقت wasteful-attitude کا لفظ استعمال کیا تھا۔ جس کا صحیح مفہوم مجھے ایک عرصے کے بعد معلوم ہوا۔ لیکن اس وقت اتنا ضرور سمجھ گیا کہ چیزوں کا ضیاع یعنی ضائع کرنا بالآخر پاکستان کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔

میری طرح ان کے بے شمار شاگردوں نے ان سے حسن کاری کا رویہ بھی سیکھا ہوگا۔ اردو لکھنے میں حروف کی نشست اور دائروں کی ساخت پر بہت زور دیتے تھے۔ ہمیشہ اصرار کرتے کہ کلاس میں ہوا اور روشنی کا گزر زیادہ سے زیادہ ہو۔ روشندان تک کھلواتے۔ ریڈرز ڈائجسٹ کی شائع کردہ مشہور کتاب 'Living with life' تو میں نے بہت دنوں کے بعد پڑھی لیکن اس کی theme کی consciousness '' کہ زندگی گزارنا سب سے بڑا آرٹ ہے'' انھوں نے بہت پہلے ہمارے اندر پیدا کر دی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید

(کالج نمبر 2424، زمانہ تعلیم 1957-1963ء)

اپریل 1957ء میں جب میں ملٹری کالج مین گیٹ پر پہنچا تو پہلی چیز جس نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچا وہ گیٹ کے اوپر سبز رنگ کی محراب تھی۔ جس پر سفید رنگ کے بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔ 'Go out to serve your country and fellow men' یہی پیغام بہت واضح طور پر راشد صاحب نے دیا۔ ان سے میرا رابطہ پہلے ہی دن اسکین ہاؤس میں ہوا۔ میں شدید

homesickness کا شکار ہاؤس کے کورٹ یارڈ کے اس کنارے پر کھڑا تھا جوان کے گھر کے عین سامنے تھا۔انھوں نے مجھے یوں اکیلے اداس کھڑے دیکھا تو میرے پاس آئے اور بولے'' گھر یاد آ رہا ہے نا؟ کوئی نئی بات نہیں، سب کو اسی طرح پہلی بار گھر سے نکلنے پر گھر یاد آ تا ہے۔ادھر تمہاری امی تمہیں یاد کر رہی ہوں گی۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلے گا۔ پھر دل لگ جائے گا۔ آخر کار ایک دن تم یہاں سے افسر بن کر نکلو گے اور آج کے دن کو ہنس ہنس کر یاد کرو گے جب تم بچوں کی طرح رو رہے ہو۔آؤ میرے ساتھ اپنی آنٹی سے ملو۔ وہ کھڑکی سے تمہیں دیکھ رہی تھیں۔انھوں نے مجھے تمہیں بلانے بھیجا ہے۔''

اس شام میں سونے سے پہلے سوچ رہا تھا کہ میرے ابا نے ضرور کوئی بڑی سفارش ڈالی ہے۔ جبھی تو دونوں مجھ پر اتنی توجہ دے رہے ہیں۔شاید اس وقت ہاؤس کے اور بہت سے نئے بچے بھی یہی سوچ رہے تھے صرف ان پر توجہ ہے۔میرا تو خیال ہے کہ اگر ہاؤس کی کیاریوں کے ان پودوں سے پوچھا جاتا جن کو وہ صبح سویرے پانی دیتے تھے تو سب سے زیادہ دعویٰ وہ کرتے۔اصل میں وہ سب کے تھے۔

انھوں نے بہت جلد ہمیں خود سیکھنے کے رستہ پر ڈال دیا۔اخبار رسالے پہلے تو زبردستی پڑھواتے تھے۔ پھر عادت پڑ گئی۔ان کے ڈرائنگ روم میں انگیٹھی کے پاس جو ایک بڑے سائز کا مرفی ریڈیو رکھا تھا اس پر بی بی سی کی خبریں زبردستی سنیں۔اس وقت یہ قطعاً تصور نہ تھا کہ یہ بی بی سی کیا ہے۔ وہ لت بھی ایسی پڑی کہ اب بھی دو تین سروسز سے خبریں سنے بغیر چین نہیں آ تا۔تحریر و تقریر کی طرف بھی وہ گھیر گھار کے بہت لائے۔ ایک روز یوں ہی اتفاقاً ڈھولک پر میرا ہاتھ پڑ گیا۔انھوں نے تعریفوں کے وہ پل باندھے کہ میں واقعی دل لگا کر ڈھولک بجانے لگا اور کالج فنکشن کا ضروری جز ہو گیا۔(اور ڈھولکی نک نیم پایا)۔ یہ سب راشد صاحب کی پلاننگ تھی کہ کسی طرح اپنے خول سے باہر آؤں۔

چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

راشد صاحب کو میں مرشد مانتا ہوں۔ انھوں نے میری سوچ کی بہت رہنمائی کی۔ میں اور (2280) تاج جمعہ کو شیر شاہ ہاؤس میں انکے ہاں اکثر حاضر ہوتے تھے اور جب تک وہ جانے کا حکم نہ دیتے تھے ہم ٹلتے نہ تھے۔ان کا اصرار ہوتا کہ ہم لنچ پر لیٹ نہ ہوں اس لئے گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کا وقت نہ ملتا۔اس شام کو جس کے دوسرے دن ہمیں کالج سے فارغ ہونا تھا میں اور تاج ان سے ملنے شیر شاہ ہاؤس گئے۔ واپسی میں اس زمانے کے سربراہ جو اپنی مخصوص افتادِ طبع کے لئے مشہور تھے، نے دھر لیا۔'' کہاں سے آ رہے ہو''؟ ان کا خوف ایسا طاری ہوا کہ میرے منہ سے نکل گیا۔''سی ایچ سے'' وہ بھی بڑی چیز تھے۔ہم دونوں کو لے کر سی ایچ پہنچے اور سک رپورٹ کی تصدیق چاہی۔غلط بیانی ثابت ہوئی اور پھر

انھوں نے بے رحمی سے جس کے لئے وہ نیک نام تھے، ہم دونوں کی تواضع کی۔ دوسرے دن جاتے جاتے راشد صاحب کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس عرصے میں یقیناً انھیں ہماری خاطر تواضع کا پتہ چل چکا تھا۔ بے حد اظہار افسوس کیا اور اس سے زیادہ اداس ہوئے۔ اس حد تک کہ وہ آخری ملاقات ایک گھمبیر اداسی میں، خاموشی سے گزر گئی اور آج تک دل پر نقش ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر وہاں دو چار ایسے استاد اور ہوتے جیسے وہ تھے تو کیا ہم میں سے بہتوں کی زندگی وہ ہوتی جو ہے؟

بریگیڈیئر مقصود الحسن

(کالج نمبر 2428، زمانہ تعلیم 1957-1964ء)

راشد صاحب کی جو پہلی یاد میرے ذہن میں بڑی اچھی طرح محفوظ ہے وہ چھٹے درجہ کی ہے جب وہ ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ اسماعیل میرٹھی کی نظم 'بارش کا پہلا قطرہ'

گھنگور گھٹا تلی کھڑی تھی پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

انھوں نے ہمیں اس جوش سے اور اس گہرائی میں جا کر پڑھائی کہ دس گیارہ برس کی اس چھوٹی سی عمر میں بھی کم از کم مجھے یہ مبہم سا احساس ضرور ہو گیا کہ ہر شخص اہم ہوتا ہے۔ میں بھی اہم ہوں۔ صرف حوصلہ چاہیے۔ آگے بڑھنے اور پہل کرنے کی جرأت چاہیے۔ اس نظم میں اجتماعی بھلائی کے لئے جرأت سے initative لینے کا جو سبق ہے اس کو انھوں نے بے شمار مثالوں سے واضح کیا۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے بلیک بورڈ پر ایک نقطہ کے گرد دائرہ بنا کر کہا۔ ایک فرد اس طرح شروع شروع میں اپنی ذات کے حصار میں گھرا ہوتا ہے۔ پھر انھوں نے اس ایک دائرہ کے گرد کئی اوور دائرے بنا کر دکھایا کہ اس طرح انسان اپنی ذات سے باہر سفر کرتا ہے۔ یہ آدمی سے انسان بننے کا سفر ہے۔

قائداعظم کا یہ قول وہ اکثر دہراتے تھے کہ اپنی چیز کو ضائع کرنا بیوقوفی اور قومی چیز کو ضائع کرنا جرم ہے۔ اگر وہ یہ قول صرف دہراتے ہی تو وہ اثر نہ ہوتا لیکن جب ہم نے انکو بارہا فالتو بتیاں بجھاتے، بے ضرورت چلتے پنکھے بند کرتے اور چاک کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے سے لکھتے دیکھا تو از خود قومی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا۔ پاکستانی قومیت کا احساس جسے وہ پاکستانیت کہتے تھے ان کی مستقل theme تھی۔ وہ پاکستان کے عاشقوں میں سے تھے۔ بلکہ یہ جذبہ ان کے ہاں جنون کی حد تک موجود تھا۔ ایک روز کہنے لگے کہ اگر پاکستانی جھنڈے کا کفن پاکستان کے شہیدوں کے لئے مخصوص نہ ہوتا تو میں وصیت کرتا کہ مجھے پاکستانی جھنڈے میں لپیٹ کر دفن کیا جائے اور میری قبر پر مینار پاکستان کی شبیہ ہو اور کتبہ پر

صرف یہ عبارت ''تعمیر پاکستان کا ایک ادنیٰ مزدور'' ان کی تدریس، ان کی تقریر، ان کی تحریر غرض ہر تخلیقی کاوش کا محرک اور مرکز پاکستان رہا ہے۔ قائداعظم اور اقبال پر دو دو کتابیں اور 'شاد باد منزل مراد'۔ یہ پانچ کتابیں تو براہ راست پاکستان کے حوالے سے ہیں۔ باقی بارہ تیرہ کتابیں 'تذکرہ شہداء' ہو یا 'جرأتوں کے نشان'۔ ''اکرم شہید نشان حیدر'' ہو یا 'حق نواز کیانی شہید' Learning to Lead یا Living with Leadership یا 'کردار ساز'، گھوم پھر کے سب کی تان پاکستانیت پر ٹوٹتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تدریس، تربیت اور تحریر کے ذریعے پاکستانیت کے شعور کو عام کرنے اور پروان چڑھانے کا جو ٹھوس کام انھوں نے کیا ہے۔ وہ ان کی سب سے قیمتی خدمت ہے۔

طالب علم دیر سویر استاد کی پڑھائی ہوئی کتابوں سے آگے نکل جاتا ہے لیکن اس کی قدریں اور اس کے رویے ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ راشد صاحب کو ایک ادارہ کی حیثیت اسی پاکستانیت کے حوالے سے حاصل ہوئی۔ یہی ان کی پہچان رہے گی۔

میں نے سلسلہ گفتگو چھٹی جماعت کے ایک سبق کے حوالے سے شروع کیا تھا۔ اب جو تجزیہ کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ان کی teaching بنیادی طور پر conceptual اور deductive ہوتی تھی یعنی وہ ہمیں تصورات سے روشناس کراتے تھے اور پیچیدہ تصورات کی وضاحت situations کے حوالے سے کرتے تھے۔ 'بارش کا پہلا قطرہ' نظم سے انھوں نے اجتماعی مفاد کے لئے جرأت مندانہ خود اقدامی initiative کا concept نچوڑا اور بتایا کہ کس طرح قومی مفاد میں انسان کو از خود جرأت مندانہ قدم اٹھانا چاہیے اور ایسا فرد قوم کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے۔

اب میں کلاس ہی کے ایک اور تجربہ کا ذکر کروں گا جس نے اس وقت سے لے کر اب تک مسلسل مجھے متاثر رکھا ہے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر روز وہ کوئی نہ کوئی ایسی بات، شعر یا واقعہ ضرور سناتے تھے، جس سے ہماری عمومی آگہی general awareness میں اضافہ ہو۔ ایک روز کلاس میں آئے، آتے ہی بلیک بورڈ پر انگریزی میں ایک فقرہ: The way of least resistance is also the way of least advantage لکھا اور مثال یہ دی کہ سب سے زیادہ resistance تیزی سے بھاگنے میں ہوتا ہے۔ اس سے کم چلنے میں، اس سے کم بیٹھنے میں اور سب سے کم لیٹنے میں۔ بلکہ لیٹنے میں کوئی exertion ہے ہی نہیں، لیکن افادیت کے معیار سے دیکھا جائے تو منزل کی طرف دوڑنا جس میں تگ و دو زیادہ ہے، زیادہ سودمند ثابت ہوتا ہے۔

دوسری مثال انھوں نے پڑھنے سے دی۔ اگر کسی لفظ کے معنی معلوم نہ ہوں تو کسی سے پوچھ لینا یا

کہیں سے نقل کر لینا نسبتاً آسان ہے۔لیکن ڈکشنری کھول کرخود اس لفظ کے معنی کو تلاش کرنا زیادہ مشکل ضرور ہے لیکن مفید تر بھی ہے۔کسی ٹیسٹ پیپر سے جوابات رٹنا آسان تر ہوتا ہے لیکن خود کتاب پڑھنے اور اپنے نوٹس بنانے کے مقابلہ میں کم مفید بھی ہوتا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔انھوں نے اتنی مثالیں دیں کہ کم از کم مجھے یقین آ گیا کہ مشکل کام میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔آخر کار یہی بہتر ہوتا ہے۔اس طرح کی باتیں ہر روز ہوتی رہتی تھیں۔ ایک روز کہا Always look beyond the hill پھر اس کی وضاحت کی۔vision کو وسیع کرنے کی تدبیریں روز کا معمول تھیں۔

ٹیپو ہاؤس میں وہ ہمارے ہاؤس ماسٹر تھے۔وہ اس حیثیت میں رسمی اور غیر رسمی انداز سے لڑکوں کی جو تعلیمی اور نفسیاتی راہنمائی کرتے وہ بھی قابل ذکر ہے۔اسکے علاوہ وہ ڈسکشن گروپ بھی لیتے تھے لیکن کبھی انھوں نے اپنی رائے اور خیالات ہم پر نہیں ٹھونسے بلکہ ہمیں اپنی رائے قائم کرنے کے قابل بنانے کی کوشش کی۔لڑکوں سے جو رابطہ، جہاں بھی ہوتا وہ پڑھنے پر زور دیتے اور پڑھنے سے ان کی مراد غیر نصابی کتابیں ہوتی تھیں۔وہ اکثر اپنی کتابیں پڑھنے کو دیتے۔اسکا ایک بار ایک لطیفہ بھی ہوا۔انھوں نے چارلس لیمب کی کتاب Stories from Shakespeare ایک لڑکے کو پڑھنے کے لئے دی۔وہ اسے پریپ میں پڑھ رہا تھا کہ ایک اور افسر نے چیک کر لیا۔"کم بخت اسٹوری بک پڑھ رہا ہے" اور کتاب چھین لی۔اس نے لاکھ فریاد کی لیکن انھوں نے ایک نہ سنی۔راشد صاحب کی کتاب بھی گئی۔اخبار، میگزین، کتابیں پڑھنے پر جس طرح انھوں نے ہر قدم پر زور دیا اور راہنمائی کی، اس سے بہت سوں نے فائدہ اٹھایا۔برس ہا برس کے بعد 1984-85ء میں مجھے شیر شاہ ہاؤس کے آفس میں انکی قائم کردہ لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔چاروں پانچوں الماریوں کے پٹ کھلے ہوئے تھے اور لڑکے شہد کی مکھیوں کی طرح کتابوں سے چپکے ہوئے تھے۔ ذاتی لائبریری سے بھی کتابیں دیتے رہتے تھے اور یہ سلسلہ انہوں نے تا دمِ مرگ قائم رکھا۔ میں بھی ان کی اس فیاضی سے استفادہ کرتا رہا۔"آواز دوست"، "سفر نصیب"، "درس زندگی"، "فکر محکم"، "مدارج المکوک" اور خلیل جبران کی Foam and Sand اور بہت سی کتب میں نے ان ہی سے لے کر پڑھیں۔کالج میں مطالعہ کے ذوق کو پھیلانے میں بھی راشد صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔

ان کی ایک خصوصیت انکی وضع داری بھی تھی۔میں نے ان سے پڑھا لیکن تعلقات ان کی وفات تک قائم رہے۔اسی طرح بے شمار اولڈ بوائز سے انکا برس ہا برس تک رابطہ رہا۔میں اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔وہ جس ذوق وشوق سے اولڈ بوائز کو اپنا سمجھتے تھے اس سے انسانی رشتوں کا ایک نیا perspective میرے ذہن میں ابھرا ہے کہ قرب خونی اور بعد خونی بے معنی ہے۔اصل تعلق انسانی اور

اخلاقی تعلق ہے۔

ایک اور خصوصیت جس کے گواہ ان کے تمام نئے و پرانے شاگرد ہیں یہ ہے کہ ان کی زندگی مشن orientated رہی۔ ان کی اپنی زندگی میں جو نفاست، ترتیب و تنظیم اور سب سے بڑھ کر جو مقصدیت تھی اس سے سب عالمگیریز نے انسپائریشن لیا ہے۔ 'کردار ساز' اور ''داستان علم و عمل'' کا مواد جن حالات میں اور جس طرح جمع کیا اور پھر اسکو کتاب کی شکل دی۔ اس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ ('کردار ساز' میں جو میرا انٹرویو شامل ہے وہ اگست 1983ء میں پنڈی کے ٹرانزٹ کیمپ کے کمرہ نمبر 4 میں سوا نو بجے رات انہوں نے ریکارڈ کیا تھا اور اس وقت آنٹی سی۔ ایم۔ ایچ راولپنڈی کے آئی۔ ٹی۔ سی میں ''کوما'' کی حالت میں بے ہوش پڑی تھیں)۔ اس طرح کا کام، مشن کے جنون کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ مشکل ترین حالات میں ان کی dedication کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا بڑے دوررس اثرات رکھتا ہے۔

ان کی کتابیں چونکہ صرف ایک حوالہ سے لکھی گئی ہیں اس لئے شاید فوج سے باہر ان کی شہرت کم ہو۔ لیکن فوج کے دائرہ میں کتابوں کے حوالے سے اور ملٹری کالج میں طویل استادی اور ہاؤس ماسٹری کے حوالہ سے انہیں جو مقام حاصل ہے اس نے سال بہ سال ان کی humility میں اضافہ کیا ہے۔ قبلہ علوی صاحب کے انتقال کے بعد وہ جس طرح دن رات 'علوی نامہ' مرتب کرنے میں مصروف رہے، وہ تگ و دو میرے سامنے کی بات ہے۔ کسی colleague کے لئے اتنا کرنا بڑی قابل قدر بات ہے۔ اس قسم کا ایک فقرہ ایک دن میرے منہ سے نکلا تو انہوں نے کہا ''یہ علوی صاحب کی سوانح حیات نہیں۔ اس میں انکی ذات کو نہیں صفات کو سامنے لایا گیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے معلم کے ذہن و کردار کا مطالعہ ہے یہ واضح کرنے کے لئے کہ صحیح معلم ایسا ہوتا ہے۔ ملٹری کالج کو اور ملک کو ایسے ہی ''علویوں'' کی ضرورت ہوگی۔ ''علوی نامہ' ملٹری کالج کی تاریخ اور ملک کی تعلیمی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ علوی صاحب جن علمی، ذہنی اور کرداری قدروں کی علامت تھے انہی حوالوں سے انکی اہمیت ہے، یہ میری privilege ہے کہ میرے قلم سے یہ کام ہوسکا''۔

22 جنوری 88ء کو انکی ریٹائرمنٹ کے دو دن بعد جب میں نے ان سے پوچھا کہ اب آپ کیا محسوس کر رہے ہیں تو کہنے لگے اب ساری ambition اور aspiration کالج کی تاریخ کو مکمل کرنے کی ہے۔ اگر زندگی چاہیے تو اسلئے کہ اس کام سے سرخ رو ہوسکوں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ پھر رک کے اور کہا: ''مقصود! مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے۔ بجنوری کہا کرتا ہے Sir! you are a favoured child of God لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں اور مجھے اسکا بھی شدت سے احساس ہے کہ ہر کام، ہر انعام، ہر محبت، ہر عقیدت ایک آزمائش اور ایک چیلنج اور ایک توقع بھی ہوتی ہے۔ دعا کرو کہ لاسٹ اوور میں بھی کچھ

اسکور کرسکوں''۔ راشد صاحب کی زندگی میں کچھ سخت مقام بھی آئے ہیں۔ (سوائے ایک بار کے اور وہ بھی پتہ نہیں کس وجہ سے) مگر میں نے انکو پریشان کبھی نہیں دیکھا۔ یہ فقرہ ''جو ہے وہ بہت ہے اور جو نہیں ہے وہ کم ہے''۔ میں نے ان سے بار بار سنا۔ ''آواز دوست'' انکی پسندیدہ کتاب ہے۔ ''آواز دوست'' کے ایک فقرہ کوانہوں نے اپنی پنسل سے انڈر لائن کیا ہوا تھا ''زندگی ایک عطیہ ہے جسکا کم از کم حق ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ دوستوں کو اس میں حصہ دار بنایا جائے۔ اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسرے کے لئے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لئے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے۔''

ایک اور نشست کی ایک بہت دلچسپ اور فکر انگیز بات یاد آئی۔ ایک روز دوران گفتگو انہوں نے ایک چینی مفکر کو Quote کیا کہ ایک اچھی کتاب کو بچپن میں پڑھنا ایسا ہے جیسے چودھویں کے چاند کا نظارہ کمرہ کے دریچے سے کیا جائے، اس کتاب کو جوانی میں پڑھنا ایسا ہے جیسے چاند کو گھر کے آنگن سے دیکھا جائے اور پختہ عمر میں اس کتاب کو پڑھنا ایسا ہے کہ جیسے چودھویں کے چاند کو کھلے میدان میں دریا کنارے دیکھا جائے''۔ میرا خیال ہے کہ اچھے استاد پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ جوں جوں perspective بدلتا جاتا ہے اور vision بڑھتا جاتا ہے اسکے appreciation میں گہرائی اور وسعت آتی جاتی ہے۔ بشرطیکہ وہ واقعی چودھویں کا چاند۔ ورنہ الٹا process بھی شروع ہو جاتا ہے۔

راشد صاحب کو اب جو کھلے میدان میں دیکھ رہا ہوں تو اسکی بات ہی کچھ اور ہے۔

نصیر احمد پراچہ (انجینئر)

(کالج نمبر 2439، زمانہ تعلیم 1957-1963ء)

یہ واقعہ 1958ء کا ہے۔ ایک روز میں صبح سویرے قمیض پہننے لگا تو دیکھا گلے کا تیسرا بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔ چونکہ مجھے ٹائی باندھنی تھی اس لئے میں نے بٹن ٹانکنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اسے چھپا سکنا ہی کافی سمجھا۔ اتفاق سے پہلا پیریڈ راشد صاحب کا تھا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ انھوں نے مجھ پر نظر ڈالی ہے اور انکے چہرے کا رنگ تھوڑا سا بدلا ہے۔ دل نے کہا پتہ نہیں کیا بات ہے۔ یہ خیال کہ انہوں نے بٹن چیک کیا ہوگا ذہن میں نہ آیا کیونکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چونکہ میرے دفاعی انتظامات مکمل تھے۔ بہر حال ہوا یہ کہ انہوں نے بورڈ پر کچھ لکھا جو ہمیں نقل کرنا تھا۔ خاموشی سے میرے پاس آئے اور صرف اتنا کہا کہ بٹن ٹانکنے کی کوئی پرابلم ہو تو گھر آ کر آنٹی سے ٹنکوا لینا اور آگے گزر گئے۔ پھر نارمل پڑھائی

شروع کردی۔ برس ہا برس حیران رہا کہ انھیں پتہ کیسے چلا کہ ایک بٹن ٹوٹا ہوا ہے۔ دوسرے یہ کہ اتنی چھوٹی سی بات کو نوٹ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ ایک عرصے کے بعد جب کچھ پڑھا اور سوچا تو سمجھ آیا کہ انسانی تعلقات میں اور بزنس میں بھی involment ہی کھل جا سم سم ہے۔ انھیں ٹائی کے نیچے چھپے ہوئے بٹن کا پتہ اس لئے چل گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ، پوری کلاس کے ساتھ involved تھے اور یہ کام ان کا passion تھا۔ اور میں یہ سمجھ گیا کہ ایک بڑے فلسفہ کہ کسی کام میں، کسی مشین میں، کسی پروسیس میں کوئی مرحلہ غیر اہم نہیں ہوتا، بٹن کا چیک کرنا ان کا ایک اظہار تھا۔ آج میں اپنی زندگی میں اور اپنے کاروبار میں ان دو اصولوں کی روشنی میں کامیابی سے سفر طے کر رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کو جن سے میرا کوئی سماجی یا کاروباری تعلق ہو خصوصاً ساتھی اور ماتحت، میں ان کو involve ہو کر انتہائی گہرائیوں تک جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا کام انتہائی حساس مشینوں سے متعلق ہے۔ ان کے متعلق بھی میرا یہی رویہ ہے۔ پھر راشد صاحب نے جس خوبصورتی سے مجھے ٹوکا تھا، تنبیہہ کی تھی، وہ سٹائل بھی ایک روشن راہنما اصول ہے۔

ممتاز اختر

(کالج نمبر 2433، زمانہ تعلیم 1957-1963ء)

ضمیر نے راشد صاحب سے جس ملاقات کا اپنے تاثرات میں ذکر کیا ہے اس دن میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ جنرل نوازش کے خطاب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے مجھے مخاطب ہو کے کہا ممتاز دیکھو، جنرل نوازش نے کامیاب طلباء کو کامیابی پر مبارکباد دینے کے بعد دوسرے طلباء سے کتنی حوصلہ افزا اور معنی خیز بات کہی ہے۔

The future belongs to you all, This is just the biginning. It is not to feel sort of being left behind. In life there is no such thing as being left out permanently.

یہی مستقل theme سر راشد کے لیکچرز کی تھی جو وہ ہمیں دیتے رہتے تھے۔ ان کے مزاج میں اور اپروچ میں یہ جو انسان دوستی تھی یہ جو گرے پڑے ہوؤں کو اٹھانے اور ساتھ لے کر چلنے کا عزم تھا۔ میرے دل میں اس کی یاد بہت تازہ اور تابندہ ہے۔ What a man!

علی احمد جان

(کالج نمبر 2441،زمانہ تعلیم 1963-1957ء)

میرے زمانے میں ملٹری کالج میں پاکستان کے گوشے گوشے کے طلبا تھے۔سلہٹ اور چٹا گانگ سے جسیم الدین، شمس الحق مولا وغیرہ آئے تھے تو گلگت ہنزہ کی نمائندگی ادیب انور کالج نمبر 2455 پی ایم اے کا پہلا عالمگیرین سورڈ آف آنر، شاہ بہرام ،نصیر احمد خان کر رہے تھے۔ان کا ایک مسئلہ اردو تھی۔ یہ راشد صاحب کی ہمت تھی کہ انھوں نے جسیم الدین، شمس الحق اور نصیر احمد جان کو جو اردو میں بہت ہی کمزور بلکہ صفر تھے اپنے وقت میں عموماً سہ پہر کو آرام کے وقت اردو پڑھائی اور اس قابل کر دیا کہ وہ ضروری امتحانات پاس کرسکیں۔نصیر احمد جان سے چونکہ میرے کئی رشتے تھے اس لئے میں خود جانتا ہوں کہ نصیر احمد پر راشد صاحب نے کتنی محنت کی اور اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔اسی طرح (کالج نمبر 2374) ایس ایچ مولا ٹھیٹھ بنگالی تھا۔اس کو بھی راشد صاحب ہی نے سنبھالا۔ایک عرصہ کے بعد سنا کہ وہ کسی امریکی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پروفیسر ہے۔ یہ سب پودے راشد صاحب ہی کے لگائے ہوئے ہیں۔

ملٹری کالج کے اساتذہ سے میں نے انسان اور پاکستان کے رشتہ کو پہچانا جو بہت بڑا اور سب رشتوں سے زیادہ قیمتی اور ضروری رشتہ ہے۔میرے دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے ایک خاموش دعا ہر دم اٹھتی رہتی ہے۔

کمانڈر عبدالسلام قدوس

(کالج نمبر C-6،زمانہ تعلیم 1962-1957ء)

راشد صاحب سے میرا پہلا تعارف بہت کم عمری میں اور عجب اتفاق سے ہوا۔ یہ 51-1950ء کی بات ہے۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ ابھی سکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔چونکہ میرے والد مرحوم عبدالقدوس صاحب کالج کے اکاؤنٹنٹ تھے،ہم اسٹاف کوارٹرز کے ایک گھر میں رہا کرتے تھے۔انگریزی کے حرف ای کے شکل کے یہ کوارٹرز کیمسٹری لیب کے پیچھے واقع تھے)۔اس زمانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی ری ٹریٹ کے وقت فلیگ اتارنے کی رسم کا نظارہ تھی۔ وہ جگہ جہاں اب یادگار شہداء ہے یہاں انگریزوں کے وقت کا سنگ مرمر کا گول سیڑھیوں کا ایک وارمیموریل تھا۔جس کے اوپر وسط میں ایک سوفٹ اونچے لکڑی کے ستون پر پاکستانی پرچم لہرایا کرتا تھا۔ری ٹریٹ کا بگل بجتے ہی ایک خاص ڈرل کے مطابق کالج کے کیڈٹس کی خاکی وردی میں ملبوس ایک سیکشن پرچم کو آہستہ آہستہ نیچے اتارتی تھی۔ پرچم اتارنے کی رسم ری ٹریٹ کے بگل کی پہلی آواز پر سیلیوٹ کے بعد شروع ہوتی تھی اور بگل کی آخری آواز پر ختم ہوتی۔

میری کوشش ہوتی تھی کہ ریٹریٹ کا بگل شروع ہونے سے پہلے فلیگ اسٹاف کے سامنے پہنچ جاؤں۔اس لئے کہ ری ٹریٹ شروع ہوتے ہی جو بھی جہاں ہوتا اسے فوراً وہاں احتراماً ساکت کھڑا ہونا ہوتا تھا۔

اتنی لمبی تمہید کے بعد اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔اکثر ایسا بھی ہوا کہ ری ٹریٹ کا منظر دیکھنے کے لئے میں اپنے بھائی مقدس کے ساتھ باہر نکلا اور ری ٹریٹ بجنا شروع ہوئی۔راشد صاحب کو جنھوں نے اسٹاف کوارٹرز میں ہمارے پڑوس میں آکر رہنا شروع کیا تھا،سفید قمیض پتلون،سفید پی ٹی شوز میں بیڈمنٹن کا ریکٹ ہاتھ میں لئے ٹھیک اس جگہ ساکت کھڑے دیکھا جہاں سے اسٹاف کوارٹرز کی طرف راستہ مڑتا ہے۔ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا۔جوں ہی ری ٹریٹ بجنا شروع ہوئی وہ ٹھیک اس موڑ پر ہوتے۔یوں جیسے انھیں دیکھ کر ری ٹریٹ بجائی جاتی ہو۔انکو اس طرح بار بار وہاں کھڑے دیکھ کر میں نے گھر جا کر پوچھا تھا یہ انکل راشد وہاں ہر وقت کیوں کھڑے رہتے ہیں۔یہ بھی punctuality تھی۔گویا ان کے قدم بھی وقت کے لمحوں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔

برس ہا برس کے بعد جب میں نے ان سے کلاس میں پڑھنا شروع کیا تو اسی طرح گھنٹی کی ٹن کے ساتھ کلاس میں قدم رکھتے اور ٹن کی آواز سن کر منہ کا جملہ کیا،لفظ بھی پورا کئے بغیر تھینک یو جنٹلمین کہہ کر اور قائداعظم کی طرح ہاتھ اٹھا کر سلام کر کے کلاس سے باہر چلے جاتے۔وہ اس زمانہ میں دھان پان تھے۔لیکن پڑھاتے اس جوش وخروش سے جیسے آج اسی گھنٹے میں اپنی ساری انرجی ختم کر دینی ہے۔سڑک پر اتنا تیز چلتے جیسے کہیں آگ لگی ہو۔بچپن کے اس تعارف کے تقریباً پینتیس برس کے بعد 1985ء میں آئی ایس ایس بی کا ڈپٹی پریزیڈنٹ لگنے پر جب میں نے human behaviour کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو مجھے راشد صاحب کا خیال آیا کہ ری ٹریٹ کے وقت وہ کیوں ایک موڑ پر نظر آتے تھے۔گھنٹی کی ایک ٹن کے ساتھ کیوں اندر آتے اور دوسری ٹن کے ساتھ کیوں جملہ یا لفظ پورا کئے بغیر باہر نکل جاتے تھے۔ایک ایک لمحہ کا حساب انھوں نے کیوں رکھا ہوا تھا۔کلاس میں اتنے پر جوش کیوں نظر آتے تھے۔ایک ایک لفظ کی بال کی کھال کیوں اتارتے تھے۔

جب 1980ء سے ان کی تحقیقی کتابوں کا تانتا بندھا تو سمجھ میں آیا کہ 50s, 60s اور 70s میں وہ کیوں تھے جو وہ تھے! اب سمجھ میں آیا ان کی وہ باتیں جو اس وقت انکی idiosyncrasies نظر آتی تھیں،(مثلاً کتابوں کا پیوں کو کور کرنے،ڈیسکوں کرسیوں کو سیدھا رکھنے،بورڈ کو بار بار صاف کرانے،چاک کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے سے لکھتے،غیر ضروری پنکھا بتیاں بند کرنے پر اصرار) My God! وہ سب باتیں تو تربیت کے grand design کا ایک حصہ تھیں۔وہ symbolic exercises

تھیں بلکہ خاص خاص values اور attitudes کو inculcate کرنے کی سعی تھی۔

راشد صاحب کی تربیت کے اثر کو ہم نے اپنے تعلیمی سفر میں، اپنے کیریر میں، اپنے گھر میں غرض زندگی کی مختلف منزلوں اور مقامات پر محسوس کیا ہے۔ مقام شکر ہے کہ ایسا ''معمار'' ہمیں میسر آیا۔ فبای آلاء ربکما تکذبان۔

بریگیڈیئر ذوالفقار علی شاہ بخاری

(کالج نمبر 2469، زمانہ تعلیم 1963-1958ء)

ایک بار مجھ سے ایک سینئر اولڈ بوائے نے کہا۔ ''راشد صاحب نے اس بچپن میں ہمارا جتنا احترام ملحوظ رکھا اس کی وجہ سے اب میں اپنے بچوں کو اونچی آواز سے بلا بھی نہیں سکتا۔ سفید رنگ میرا پسندیدہ رنگ اور چنبیلی کا پھول میرا پسندیدہ پھول بن گیا ہے۔ جب کام بروقت اور صحیح طریقے سے نہ ہو پائے تو مجھے الجھن ہونے لگتی ہے۔ شارٹ کٹ نہیں کر سکتا۔ پاکستان کی چیز کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ خبریں سننے اور اخبار پڑھنے کے بغیر چین نہیں آتا۔'' ان عادتوں اور رویوں کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو بات راشد صاحب تک پہنچے گی۔

لیفٹیننٹ کرنل اعجاز رفیع

(کالج نمبر 2474، زمانہ تعلیم 1964-1958ء)

یہ واقعہ 1958ء کا ہے۔ میں اسکین ہاؤس میں تھا۔ میرے ابا اور امی دونوں مجھ سے ملنے آئے۔ اتفاق سے اس وقت میں ہاؤس میں موجود نہ تھا۔ اس وقت تک میرے والد گرامی جناب کیپٹن عجائب کا راشد صاحب سے براہ راست تعارف نہ تھا۔ صرف ان کے یہ بتانے پر کہ میں اعجاز کا والد ہوں۔ وہ دونوں کو اپنے گھر لے گئے۔ بہت عزت سے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میری والدہ کی تواضع آنٹی (بیگم راشد) نے کی۔ غالباً وہ مجھے اسٹیج پر دیکھ چکی تھیں۔ وہ میری کارکردگی کی تعریفیں کرتی رہیں۔ راشد صاحب نے والد صاحب کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور مجھے اتنی تفصیل سے discuss کیا کہ والد صاحب بہت امپریس ہوئے۔

میرے والدین اس دن کی پذیرائی کو آج تک نہیں بھولے۔ راشد صاحب اور ان کی بیگم کا یہ کردار کہ صرف طلبا ہی نہیں انکے والدین کا بھی خیال رکھا جائے بلکہ ان سے زیادہ مراسم استوار کئے جائیں تا کہ طلباء

کی تعلیم وتربیت بہتر طور پر ہو سکے ملٹری کالج کی تاریخ میں ایک ایسی روشن روایت ہے جس کی نظیر ان سے پہلے تو کیا شاید انکے بعد بھی آسانی سے نہ مل سکے۔

اس روایت میں انکی شیر شاہ ہاؤس، آٹھویں درجہ کے لئے مخصوص جونیئر ہاؤس، کی ہاؤس ماسٹری کے زمانہ میں مزید اضافہ ہوا بلکہ انھوں نے والدین سے مسلسل اور قریبی رابطے کے تجربہ کو اور آگے بڑھایا۔ 1967ء سے اتوار کو اور 1977ء سے جمعہ کو شیر شاہ ہاؤس والدین کے انسپکشن کے لئے کھلا رہتا تھا۔ خواتین آنٹی سے انکے گھر میں اور مرد حضرات راشد صاحب سے ہاؤس کے آفس میں ملتے تھے۔ وہ ہر بچہ کے بارے میں اسکے والدین سے تفصیلی گفتگو کرتے تھے۔ مائیں اپنی آنکھوں سے اس جگہ کو دیکھتی تھیں جہاں انکے جگر گوشے رہتے سہتے تھے اور انکے foster parents (ہاؤس ماسٹر اور انکی مسز) سے مل کر انکو یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ ان کا بیٹا کن ہاتھوں میں پروان چڑھ رہا ہے۔ میں نے بے شمار والدین کو کہتے سنا ہے کہ ہمارا بیٹا راشد صاحب کے ہاؤس میں ہے اب ہمیں بچے کی طرف سے کوئی فکر نہیں۔ یہ اطمینان دلانے میں آنٹی کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ ہاؤس میں آتی جاتی رہتی تھیں اور صحیح معنوں میں آنٹی بنی ہوئی تھیں۔ 1973ء سے شیر شاہ ہاؤس میں ہر سال یوم والدین منایا جانے لگا۔ یہ ایک انوکھا، دلچسپ اور بہت ہی مفید تجربہ تھا جو شاید کسی اور پبلک اسکول میں نہ دیکھا گیا ہو۔ چونکہ شیر شاہ ہاؤس آٹھویں درجہ کی نئی انٹری کے لئے مخصوص تھا۔ شروع دن سے ان کا ہمہ گیر تربیتی پروگرام شروع ہو جاتا جس میں اسٹیج پر تقریر اور ڈراما کرنے کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ یہ ہفتہ میں دو بار، دو گھنٹہ کا تعلیمی وتفریحی پروگرام ہوتا تھا۔ سال بھر کے بعد فروری کے اواخر میں تمام والدین کے لئے پانچ گھنٹے کا ایک ورائٹی پروگرام ترتیب دیا جاتا تھا۔ پونے دس بجے صبح آرٹ وڈرائنگ اور ہینڈی کرافٹ کی نمائش کے بعد دس بجے مہمان خصوصی کے روبرو انگریزی اردو تقریروں، مذاکروں، ترانوں کا سلسلہ شروع ہوتا۔ تمام والدین کے سامنے بغیر استثنا کے ہاؤس کے تمام بچے حصہ لیتے۔ والدین حیرت سے اپنے بچوں کو دیکھتے کہ سال بھر سے بھی کم عرصے میں بچے کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ ایک بجے لنچ بریک ہوتا جس میں تمام والدین اور بچے شریک ہوتے۔ ڈھائی بجے اردو انگریزی ڈراموں، خاکوں، نغموں، کورسوں کا پروگرام شروع ہوتا جس میں پھر ہاؤس کے آدھے لڑکے حصہ لیتے۔ کمپیئرنگ بھی لڑکے ہی کرتے۔ دو گھنٹے کے اس بہت ہی دلچسپ رنگا رنگ پروگرام کے آخر میں تقسیم انعامات کی تقریب ہوتی۔ یہ سلسلہ 1979ء تک چلا۔ شیر شاہ ہاؤس میں جو کام راشد صاحب اور ان کی بیگم بلکہ ان کے پورے خاندان نے کیا، وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیر شاہ ہاؤس کے حوالے سے راشد صاحب نے جو خدمت انجام دی اس کی قومی اہمیت ہے۔ اس لئے کہ اس زمانہ کے شیر شاہ ہاؤس کا

طالب علم اپنی سوچ اور لائف اسٹائل سے الگ پہچانا جاتا ہے۔شیر شاہ ہاؤس میں جو تجربہ انھوں نے کیا اس کی وجہ سے آج آرمی کے بے شمار گھرانوں میں راشد صاحب کا نام ایک ہاؤس ہولڈ نام ہے۔عقیدت و محبت کی انتہا ہے کہ بعض والدین نے اپنے بچوں یا پوتوں،نواسوں کے نام بھی ان کے نام پر رکھے ہیں۔یہ عزت آسانی سے نہیں ملتی۔اس کے لئے برسوں خون جگر جلانا پڑتا ہے۔

راشد صاحب نے کالج کے شہیدوں اوراس کے بعد عسکری اعزاز یافتگان کے تذکرے مرتب کرنے میں پانچ برس تک جو مسلسل تگ ودو کی وہ بجائے خود ایک قابلِ فخر داستان ہے۔میں نے جب ایک موقع پر اس عظیم خدمت کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا''اعجاز!اتنا بڑا کام کرسکنا ہی میرے لئے سب سے بڑا اعزاز ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ کوہ کنی کرنے کی توفیق دی۔پاکستان ہمارا ملجاو ماوئی،ہمارا مربی و محسن سب ہی کچھ ہے۔اس کی تعمیر واستحکام کے لئے جتنا کچھ بھی کیا جائے،کم ہے۔''

بریگیڈیئر غلام علی

(کالج نمبر2476،زمانہ تعلیم1962-1958ء)

اسکین ہاؤس میں ڈریس انسپکشن ہورہا تھا۔راشد صاحب حسب معمول بڑی باریک بینی سے انسپکشن کررہے تھے۔میرے دائیں طرف ایک لڑکے کے شوز بالکل بغیر پالش کے تھے۔اس سے صرف اتنا کہا''کیوں خیریت تو ہے۔کیا بلیک پالش ختم ہوگئی ہے؟''ایک دوسرے لڑکے کے شوز سامنے سے جگمگ جگمگ کررہے تھے لیکن حسب عادت جب انھوں نے اس کو اباؤٹ ٹرن کر کے اس کے شوز کی دونوں ایڑیوں کو چیک کیا تو میلا پایا۔انھوں نے یہ فرق فوری طور پر نوٹ کیا اور اسے ایک لمبا لیکچر پلایا۔''سامنے کچھ پیچھے کچھ،یہ دھوکا تم کس کو دے رہے ہو؟ dodging اپنے ساتھ،اپنے مستقبل کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہے''وغیرہ وغیرہ۔

میں اب بھی کسی حد تک intovert ہی ہوں۔خاموش،تنہائی پسند۔اس وقت غالباً دیہاتی ماحول سے آنے کی وجہ سے کچھ زیادہ shy اور docile نظر آتا ہوں گا۔ایک روز راشد صاحب سے انٹرویو کے لئے ہماری ڈارم کی باری تھی۔ہم لوگ کمرہ سے باہر کھڑے کچھ اندر کی بھی سن گن لے رہے تھے۔مجھ سے پہلے جو لڑکا تھا اسے لڑنے جھگڑنے اور ہنگامہ کھڑا کرتے رہنے پر خاصی جھاڑ پڑی۔اس سے کہا بائبل میں ہے۔'the meek shall inherit the earth'ضبط کرنا سیکھو۔ہر وقت کی اکڑ اچھی نہیں ہوتی۔جب میری باری آئی تو کہا''تم ضرورت سے زیادہ شریف ہو،محض اللہ میاں کی گائے بنے رہنے سے

کام نہ چلے گا۔ کچھ assert بھی کیا کرو۔ میں تمہیں ایک ہفتہ دیتا ہوں، ایک تو اگلے ہاؤس فنکشن میں، میں تمہاری آواز سننا چاہتا ہوں اور دوسرے یہ کہ میں تمہاری یہ شکایت سننا چاہتا ہوں آج غلام علی نے ہنگامہ کیا ہے۔ یوں ہی معمولی سا، زیادہ نہیں لیکن کچھ ہو جائے۔ تجربے کے طور پر!''

بلاشبہ ان دو واقعات سے ان کے فلسفۂ تربیت اور شخصیت دونوں کی عکاسی ہوتی ہے۔

بریگیڈیئر یعسوب علی ڈوگر

(کالج نمبر 2479، زمانہ تعلیم 1964-1958ء)

1960-1950ء کے عشرہ میں کالج میں علی گڑھ کے اساتذہ کی خاصی تعداد تھی۔ علوی صاحب، راشد صاحب، بلگرامی صاحب، حسن صاحب، مظہر صاحب، ایوب صاحب یہ سب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروردہ تھے۔ ان کو واضح طور پر تمیز کیا جا سکتا تھا۔ علی گڑھ اسپرٹ ان کی پہچان تھی اور علی گڑھ اسپرٹ کے دو خاص اجزائے ترکیبی تھے۔ ایک علم کی وسیع تر سرحدوں کا شعور اور دوسرے مسلم یا پاکستانی قومیت کا گہرا احساس۔ 1875ء میں علی گڑھ کی بنیاد ہی سرسید نے اس شعور و یقین کے نتیجہ میں رکھی تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور انکو من حیث القوم اپنے لئے ایک علیحدہ تعلیمی ادارہ کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ پاکستان بننے تک علی گڑھ تنہا مسلم تعلیمی ادارہ تھا۔ جہاں برصغیر کے گوشہ گوشہ کے مسلمان طلبہ صرف اپنے مسلمان ہونے کے حوالے سے شیر و شکر ہو کر اقامتی ادارے کے روایتی نظم و ضبط کے ساتھ یکجا رہتے تھے۔ اس طرح ان میں شعوری اور لاشعوری طور پر مسلم قومیت کا احساس پروان چڑھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہاں مسلم قومیت کی فضا قائم ہو گئی تھی اور علی گڑھ ایک منی پاکستان بنا ہوا تھا۔ علی گڑھ کے جو فارغ التحصیل اساتذہ یہاں پڑھاتے تھے ان سب میں مسلم قومیت کے احساس کے ساتھ ساتھ کیریکٹر بلڈنگ کا جذبہ موجود تھا۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک اقامتی ادارہ ہونے کی وجہ سے پراکٹوریل سسٹم موجود تھا اور وہاں کے اساتذہ علم و فضل میں ممتاز ہونے کے علاوہ قومی جذبہ سے بھی سرشار تھے۔ کالج کے ان علیگی اساتذہ میں سے بھی دو، جناب علوی مرحوم اور جناب راشد میں (غالباً چونکہ یہ براہ راست تحریک پاکستان کے دنوں کے ساختہ پرداختہ تھے) یہ جذبہ اور بھی زیادہ شدید تھا۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس دور کے مشہور کمانڈنٹ کرنل رفیق گو علی گڑھ کے تو نہیں تھے لیکن ان کی قومی ''عصبیت''، علیگیوں سے کم شدید نہ تھی۔

راشد صاحب میں تو یہ commitment ایک جنون کی حد تک تھا۔ کیریکٹر بلڈنگ اور قومی اسپرٹ کو ابھارنے میں انکی گہری جذباتی دلچسپی کو کوئی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خود ان کی اپنی زندگی

میں یہ دونوں رویے جھلکتے تھے۔ چاک کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے لکھنا، غیر ضروری پنکھوں اور بلبوں کو بند کرتے رہنا، گھاس کو بھی نہ روندنا، پاکستان کے قومی پرچم اور قومی ترانہ کا بے حد احترام وغیرہ ایسی ٹھوس علامتیں تھیں جن سے ہم سب بہت متاثر ہوتے تھے۔ میں نے راشد صاحب سے انگریزی بھی پڑھی ہے اور اردو بھی۔ وہ پڑھاتے بھی کریکٹر بلڈنگ کوملحوظ رکھ کر تھے۔ یوں بیٹھو، یوں لکھو، کتابوں، کاپیوں کو اس طرح رکھو، کاپی کے ہر ورق کونمبر دو، صرف ایک طرف حاشیہ چھوڑو، امتحان میں bluff کبھی نہ کرو، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے کردار سازی ہی مطلوب ہوتی تھی۔ ٹیکسٹ کو اکثر بیشتر خصوصاً نظموں کو ان کے قومی orientation کے لحاظ سے پڑھاتے تھے۔ کوئی مجھ سے پوچھے تمہارا کیریکٹر بلڈ کرنے میں سب سے زیادہ contribution کس کا ہے تو میں بغیر کسی شک وشبہ کے فوراً ان کا نام لوں گا لیکن اچھے سے اچھا آدمی نہ تو لافانی ہوتا ہے اور نہ ناقابل بدل۔ کسی ادارہ کو کوئی بھی فرد ہمیشہ سرنہیں کرسکتا۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ خدمت کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ کردار سازی اور پاکستانی قومیت کے جذبہ کی پرداخت کی روایتوں کو زندہ رکھا جائے۔

میں اور میرے بھائی، میجر شعیب علی ڈوگر، ایوب علی ڈوگر ہم تینوں کالج میں 1958ء سے 1964ء تک زیر تعلیم رہے۔ اس عرصے میں نہ صرف ہم راشد صاحب سے پڑھے اور اسکین ہاؤس میں انکے زیر تربیت رہے بلکہ زیر فیض رہے۔ ہمیں یاد ہے کہ اسکین ہاؤس میں لائٹس آؤٹ سے پہلے قومی ترانہ پڑھا جاتا تھا۔ راشد صاحب ہاؤس فالن سے چند لمحے پہلے اپنے گھر سے نکلتے اور بڑے اہتمام سے ہمارے ساتھ ترانے میں شریک ہوتے۔

اکیڈیمک بلاک کی بیرونی دیواروں پر قائداعظم کے جو اقوال کرنل رفیق نے لکھوائے تھے انھیں ہمارے دلوں میں راشد صاحب نے اتارا۔ جونیئر اکیڈیمک بلاک کی دیوار پر جو ایک کوٹیشن لکھی تھی:

> The safety, honour and welfare of your country, comes first, always and every time, The honour, welfare and comfort of the men you command, come next. Your own ease, comfort and safety come last, always and every time.

وہ بھی انہی نے ہم سے ڈسکس کی اور یہ بھی بتایا کہ یہ جنرل چیٹ وڈ کا فقرہ ہے جو انھوں نے 1932ء میں انڈین ملٹری اکیڈیمی کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا۔

راشد صاحب نے شعوری طور پر قومیت کے جذبے کو فروغ دیا۔ علی گڑھ اسپرٹ کو کالج میں روشناس

کروایا۔ عالمگیریز میں جو قومیت سے لگاؤ ہے، جو قومی آؤٹ لک ہے اس کو پروان چڑھانے میں منجملہ دوسرے اساتذہ کے راشد صاحب کا خاص حصہ ہے اور کردار سازی ان کی پہچان ہے۔

ہماری یہ feeling ہے کہ راشد صاحب نے اپنے آپ کو اور اپنے قلم کو کالج تک محدود کر کے قوم کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ تخلیقی تعلیم کے داعی تھے۔ ان کے طریق تعلیم اور طرز تربیت پر کالج سے باہر لوگوں کا بھی حق بنتا ہے۔ اب ان کے بعد یہ عالمگیریز کا فرض ہے کہ وہ اس mission کو آگے بڑھائیں۔

محمد رشید

(کالج نمبر 2482، زمانہ تعلیم 1958-1962ء)

فینسی ڈریس شو ہو رہا تھا۔ اس وقت چونکہ میرا چہرہ بھرا بھرا تھا اور جو عینک استعمال کرتا تھا وہ بھی اتفاق سے گول شیشوں کے فریم کی تھی۔ اس لئے میں نے لیاقت علی خان کا روپ دھارنے کی حامی بھر لی۔ اب ڈریس کی تلاش شروع ہوئی۔ چونکہ اسٹاف میں اس وقت راشد صاحب (تواتر سے جمعہ کو) شیروانی پہنتے تھے اس لئے اسکین ہاؤس میں میں نے ان کے گھر پر دستک دی، وہ باہر آئے۔ ''خیریت؟'' میں نے عرض مدعا کیا تو وہ فوراً اپنی دونوں سفید اور سیاہ شیروانیاں اٹھا لائے ان میں سے جو پسند آئے لے جاؤ۔ پائجامہ بھی لے لینا لیکن ہوا یہ کہ ان کی کوئی شیروانی بھی میرے فٹ نہیں آئی۔ پھر خود ہی کہا۔ ''تم وکیل یا پروفیسر بن جاؤ۔ میرے پاس کئی سوٹ ہیں ان میں سے جونسا چاہو استعمال کر لینا۔''

ونگ کمانڈر اشتیاق حسین

(کالج نمبر 2488، زمانہ تعلیم 1958-1965ء)

1957ء میں راشد صاحب نے لٹریری سرکل شروع کیا تو اس میں زیادہ تر فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ائیر کے لڑکے تھے۔ آٹھویں میں سے صرف میں شریک ہوا۔ کلاس بھی چھوٹی، قد بھی چھوٹا، لیکن راشد صاحب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور سرکل کا ممبر بنا لیا۔ سرکل کا اجلاس سکین ہاؤس میں راشد صاحب کی اسٹڈی میں ہوتا تھا۔ اس میں زیادہ تر کتابوں پر گفتگو ہوتی تھی۔ پہلے ہی اجلاس میں انہوں نے مجھے دو کتابیں پڑھنے کو دیں انگریزی کی 'Treasure Island' اور اردو میں فضل حق کی ''زندگی''۔ ان دو کتابوں سے میرے غیر نصابی مطالعہ کا آغاز ہوا۔ لٹریری سرکل میں کچھ لکھ کر سنا تو نہ سکا لیکن مطالعہ کرنے کی بیش قیمت عادت ضرور پڑ گئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے ان کے ہاں السٹر یٹیڈ ویکلی آف پاکستان ''مرر'' ریڈرز ڈائجسٹ، قندیل، لیل و

نہار، نقوش وغیرہ بہت سے رسالے اور میگزین آتے تھے۔ جو ہم پڑھنے کے لئے بھی لے جاتے تھے۔ لٹریری سرکل کا ماٹو تھا۔''Sweetness & Light'' خود ان کی ذات میں یہ دونوں چیزیں مرتکز ہو گئی تھیں۔

لیفٹیننٹ کرنل اقتدار علی

(کالج نمبر 2510، زمانہ تعلیم 1959-1965ء)

راشد صاحب 64-1963ء میں محمود غزنوی ہاؤس میں ہفتہ کی شام ڈنر کے بعد ہمارا ٹوٹوریل گروپ لیتے تھے۔ کلاس روم میں تو وہ بہت reserved رہتے تھے لیکن گروپ ڈسکشن بڑا informal ہوتا تھا۔ ہم لوگ چارپائیوں پر بیٹھ جاتے، صرف انکے لئے بیچ میں کرسی ڈال دی جاتی۔ گفتگو کے لئے کوئی موضوع دے دیا جاتا۔ جس کی وہ کمپیئرنگ کرتے۔ اپنی رائے بہت کم دیتے ۔ ہم اصرار کرتے کہ سر آپ بھی تو کچھ کہیئے تو وہ خلیل جبران کا یہ قول اکثر دہراتے۔''بچوں کو اپنی توجہ دو تخیل نہیں'' پھر کہتے۔ ''میرا کام تمہاری اپنی قوت استدلال اور قوت اظہار کو آگے بڑھانا ہے۔ اپنی رائے دے کر میں تم لوگوں کو inhabit نہیں کرنا چاہتا۔ تمھاری اپنی رائے جو تم نے سوچ سمجھ کر قائم کی ہو وہ اگر غلط بھی ہو تو ایک لحاظ سے اس صحیح سے بہت بہتر ہے جو تمہارے ذہن میں باہر سے ٹھونس دیا جائے۔ میرے بچو دوسروں کے تجربے سے بیشک فائدہ اٹھاؤ لیکن اپنا راستہ خود نکالو۔ اپنے ذہن کو کام میں لاؤ کہ تعلیم کا حاصل یہی ہے۔''

ہم یعنی میں، ذوالفقار ارشد، جاوید اختر ان کے یہاں اکثر چھٹی کے دن اتوار کو صبح ناشتے کے بعد جایا کرتے تھے اور ان کی مہمان نوازی کے علاوہ ان کی تربیت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ یہاں میں مرحومہ آنٹی کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ ہمارا خیر مقدم وہی کرتی تھیں۔ انھوں نے ہمیں ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح سمجھا۔ اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ان کے گھر سے بغیر کچھ کھائے پیئے آئے ہوں۔ جاڑوں کی ایک صبح کا ذکر ہے کہ آنٹی باہر صحن میں بیٹھی اخروٹ توڑ رہی تھیں کہ انھوں نے جھاڑی کی طرف رخ کر کے چیکو چیکو دوبار پکارا تو گلہری کا چھوٹا سا بچہ سنتھے کی باڑ سے نکل کر ان کے پاس آ گیا جسے اٹھا کر انہوں نے اپنی گود میں رکھ لیا اور اوپر سے ساری کا پلو ڈال دیا۔ ہم حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ بولیں گلہری کا یہ بچہ ایک روز پیڑ سے گر کر زخمی ہو گیا تھا۔ اس کو دو تین دن میں نے اپنے پاس رکھا اب یہ مجھ سے مانوس ہو گیا ہے۔ میں اس وقت ہر روز اخروٹ سے اسکی تواضع کرتی ہوں۔ پھر ہنس کر کہا'' دیکھو کیسا موٹا ہوا ہے۔ اس کا نام چیکو ہے۔

اپریل 1985ء میں جب میں گلگت پوسٹنگ پر جا رہا تھا تو انکی عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ آنٹی کو

دیکھ کے دل دھک سے رہ گیا۔ بجھتے چراغ کا سا سماں تھا۔ پہلے تو میں نے اس اونی سیٹ کا شکریہ ادا کیا جو انھوں نے میری چھوٹی بیٹی کی پیدائش پر 1982ء میں کراچی بھجوایا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کی حالت دیکھ کر اپنی تشویش ان پر ظاہر کروں۔ چنانچہ ان کو cheer-up کرنے کے لئے کہا۔ ''آنٹی آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے گلہری کا بچہ چیکو پالا تھا''۔ ایک لمحہ کے لئے ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور بولیں۔ ''ہاں بیٹے۔ سب چیکو بڑے ہو گئے۔ سارے پنچھی اڑ گئے۔ خدا تمھیں بھی اور ان سب کو شاد و آباد رکھے۔'' ایک دم چپ ہو گئیں۔ جیسے ماضی کی یادوں میں کھو گئی ہیں۔ پھر پوچھا ''تمہارے ساتھ ایک لڑکا کرم الٰہی آیا کرتا تھا۔ طارق ترین تھا۔ جاوید اختر تھا، ذوالفقار کا تو خط آیا تھا، ان کی خیر خبر نہیں۔'' اللہ اکبر! یہ تھیں ہماری آنٹی۔ اس وقت وہ مرض الموت میں مبتلا تھیں۔ دونوں گردے جواب دے چکے تھے۔ dialysis پر زندہ تھیں۔ لیکن نام سب بچوں کے یاد تھے۔ سب کو یاد کر رہی تھیں۔ دعائیں دے رہی تھیں جو بیس برس پہلے آیا کرتے تھے۔ راشد صاحب کا کوئی ذکر آنٹی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے ان کا منصبی ذمہ داریوں میں بھی بھرپور ساتھ دیا۔ راشد صاحب فنافی الکالج تھے۔ ان کو لاجسٹک سپورٹ یہ دے رہی تھیں اور سال ہا سال تک دیتی رہیں۔ راشد صاحب 1950ء سے 1987ء تک مسلسل 37 برس تک اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر یا ہاؤس ماسٹر رہے۔ یہ ریکارڈ ٹائم ہے۔ اس تمام عرصے میں آنٹی دل و جان سے ان کے ساتھ رہیں اور عملاً ان کا ہاتھ بھی بٹایا۔ میں نے خود دیکھا کہ آخری زمانہ میں 'کردار ساز' کی تصنیف میں بھی ان کی معاونت کی۔ انہوں نے نہ صرف کیڈٹس کو گھر کی ٹھنڈک دی بلکہ انکے یہاں سے جانے کے بعد بھی برس ہا برس ان سے شفقت کا تعلق رکھا۔ حد یہ کہ ان کی بیویوں کو بیٹی کہا اور سمجھا اور ان کے بچوں کی پیدائش پر اونی اور سوتی کپڑوں کے سیٹ دیئے۔ جس طرح میری بچی کی پیدائش پر انھوں نے کراچی اونی سیٹ بھیجا اس طرح پتہ نہیں اور کتنے اولڈ بوائز کے بچوں کو بھی اپنی محبت سے نوازا ہوگا۔ یہ سب کچھ بالواسطہ طور پر سر راشد کے مشن کی توسیع اور آبیاری تھی۔ ملٹری کالج کی تاریخ میں غالباً وہ تنہا استاد ہیں جنھوں نے ملٹری کالج پر اتنا لکھا ہے۔ اتنا تحقیقی سرمایہ چھوڑا ہے۔ یہ سب غالباً ممکن نہ ہوتا اگر ہماری بے مثال آنٹی راشد صاحب کی ہم نفس اور ہم قدم نہ ہوتیں۔ اس لئے میں اولڈ بوائز سے کہوں گا کہ ان کے لئے دعائے خیر ضرور کیا کریں اور ساتھ ہی یہ بھی دعا کریں کہ کالج کو راشد صاحب ہی نہیں آنٹی بھی نسل در نسل میسر آتی رہیں۔

کیپٹن مشتاق فرید کیانی

(کالج نمبر 2522، زمانہ تعلیم 1965-1959ء)

میرا مرحوم بھائی اشتیاق فرید جہاں تک مجھے معلوم ہے پڑھائی میں خاصا کمزور تھا۔ میری طرح مجلسی بھی نہ تھا۔ ڈراما، تقریر، اسٹیج یا کلاس کی کسی سرگرمی میں ممتاز نہ تھا۔ لیکن نہ معلوم کیوں راشد صاحب کی اس پر خاص توجہ تھی۔ (نہ معلوم کیوں، تو میں قلم کی روانی میں لکھ گیا ہوں ورنہ مجھے معلوم ہے کہ جن پر کوئی توجہ نہ دے، جو از خود توجہ حاصل نہ کر سکتے ہوں ان پر راشد صاحب ضرور توجہ دیتے تھے۔ اور یہ ان کی ایسی خصوصیت تھی جس میں ان کا کوئی ہمسر اور شریک نہ تھا) میرا بھائی اشتیاق راشد صاحب کا بڑا فین تھا۔ محبت کی خاموش آواز سننے میں خاموش طبع بچے بہت حساس ہوتے ہیں۔ جب اس کی گردہ کی تکلیف بہت بڑھی تو اس نے بار بار کہا ''سر کو بلائیں میں ان کو دیکھنا چاہتا ہوں''۔ امی ایک روز اس کے سرہانے بیٹھی خشک آنسوؤں سے رو رہی تھیں تو انھوں نے مجھ سے کہا تم راشد صاحب کو اطلاع تو کرو۔ چنانچہ میں نے انھیں صورت حال سے آگاہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اگلے اتوار کو آتے اشتیاق کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ امی اشتیاق کے حوالے سے راشد صاحب کا ذکر اکثر کرتی ہیں۔ کہا کرتا تھا کہ میرے راشد صاحب نے یہ کہا، میرے راشد صاحب نے یہ بتایا۔ اللہ نے یہ زندگی بھی خوب بنائی ہے۔ کیسی کیسی حقیقتیں خواب و خیال ہو جاتی ہیں۔ آخر میں صرف یادیں رہ جاتی ہیں۔ میری ماں اب بھی راشد صاحب کو جھولی بھر بھر کے دعائیں دیتی ہیں کہ یہ وہ اجنبی شخص تھا جس نے کبھی میرے بچے کا ہاتھ پکڑا تھا۔

یہاں تک لکھ کر میں خط ختم کر چکا تھا کہ مجھے خیال آیا کہ اشتیاق مرحوم پر اتنی شفقت کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید راشد صاحب کے علم میں یہ بات آ گئی ہو کہ اشتیاق کالج کی پہلی انٹری کے ایک اولڈ بوائے (میرے والد) میجر غلام فرید (کالج نمبر 24، نک نیم 'ٹائیگر' پاکستان آرٹلری کے پہلے افسر جو 1948ء میں شہید ہوئے) کا بڑا بیٹا ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ رشتہ راشد صاحب کی کمزوری تھی۔ وہ اولڈ بوائز کو اور ان کے بچوں کو اپنے بچوں سے زیادہ چاہتے تھے۔

عابد حسین

(کالج نمبر 2533، زمانہ تعلیم 1964-1959ء)

یہ واقعہ 1962ء میں ٹیپو سلطان ہاؤس کا ہے۔ ڈارمیٹریز میں صبح کی انسپکشن شروع ہو رہی تھی اور لڑکوں میں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ کس طرح سے ڈارمز کو جلدی جلدی سیٹ کیا جائے۔ خاص مسئلہ بستر کی چادروں کا تھا۔ کسی کے پاس چادر تھی کسی کے پاس نہیں۔ آخر کار وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ انسپکشن شروع ہوئی اور راشد صاحب ایک بستر کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس چادر میں کتنی سلوٹیں

پڑی ہوئی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ جو چادر رات کو اوڑھتے ہیں اسی کو صبح بیڈ کور کے طور پر بچھا دیتے ہیں۔ آپ لوگ ایک صاف دھلی ہوئی اور کلف لگی چادر بیڈ کور کے طور پر استعمال کرنے کے لئے الگ رکھ چھوڑ یئے تاکہ آپ کا بستر بھی آپ کی طرح اسمارٹ نظر آئے۔ اگر نفسیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو لباس کی سلوٹیں ذہن یا کردار کی سلوٹوں کی غمازی کرتی ہیں۔"

انسپکشن کے بعد لڑکے ناشتہ کے لئے میس کی طرف جا رہے تھے۔ ایک دو لڑکے جو ذرا لیٹ ہو رہے تھے انھوں نے ہیج کو پھلانگ کر شارٹ کٹ مارا۔ راشد صاحب میس کے برآمدہ میں کھڑے دیکھ رہے تھے کہ لڑکے میس کے اندر داخل کس طرح ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان شارٹ کٹ والے لڑکوں کو بلا کر کہا۔" میاں! شارٹ کٹ لینا ایک غلط ذہنی رویہ ہے اور ایک بہت بری عادت کی ابتدا بھی۔ بہتر ہوتا کہ آپ دو منٹ پہلے آ جاتے یا پھر ناشتہ مس کر دیتے۔ ناشتہ نہ کرنے یا بھاگ کر آنے سے جسم کو تکلیف تو ہوتی لیکن کردار بے داغ رہتا اور ایک خطرناک عادت کی ابتدا نہ ہوتی"۔

میس میں جب بھی وہ کھانا چیک کرنے کے لئے آتے تھے تو بار بار ٹوکتے کہ چمچوں کی آواز نہ آئے۔ کھانے کی پہلی helping بہت زیادہ نہ ہو۔ بہتر ہے کہ کھانا تین بار میں لیا جائے تاکہ ندیدے پن کا اظہار نہ ہو۔ وہ خود تو برائے نام کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران سمجھاتے رہتے کہ آدمی بقول حضرت عمرؓ کھانے پر، سفر میں اور لین دین میں پہچانا جاتا ہے۔ پبلک سکول ایجوکیشن کا مدعا ہی ضبط ذات (self-restraint) کی تربیت ہے۔ دوسرا مقصد خود اقدامی (initiative) اور ذمہ داری سکھانا ہے۔

کلاس میں داخل ہونے سے پہلے وہ اکثر کپڑے کے ایک ٹکڑے سے اپنے جوتے صاف کر لیتے اور ہم سے بھی کہتے کہ پتلون کی جیب میں دو ایک ٹشو پیپر یا کپڑے کے ٹکڑے رکھا کیجئے تاکہ کلاس میں آپ کے جوتوں پر گرد نہ ہو۔ ظاہری نفاست سے ذہنی نفاست کی عکاسی ہوتی ہے۔ تن میلا تو من میلا۔ پھر چاک کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے سے لکھنا شروع کرتے جو بلیک بورڈ کے نیچے پڑا ہوتا۔ کسی نے بلا ضرورت پنکھا چلا رکھا ہوتا تو کہتے اس وقت پنکھے کی گرمی نہیں۔ بلا ضرورت بجلی ضائع نہ کیجئے اور یہ بلب بھی آف کیجئے۔ قائداعظم کا یہ قول یاد رکھئے کہ "اپنی چیز کو ضائع کرنا بے وقوفی اور قومی چیز کو ضائع کرنا جرم ہے۔"

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس وقت بہت عجیب لگتی تھیں۔ آج جبکہ میں خود پندرہ برس پڑھا کر سول سروس میں داخل ہو رہا ہوں، مجھے ان باتوں کی "حکمت" کا کچھ کچھ اندازہ ہو رہا ہے۔ ایک چینی فلسفی کا قول ہے کہ جوانی میں کسی اچھی کتاب کا مطالعہ ایسا ہے کہ جیسے کسی دریچہ سے چودھویں کے چاند کا نظارہ کیا جائے۔ ادھیڑ عمر میں اس کتاب کا مطالعہ ایسا ہے جیسے پونم کے چاند کو اپنے گھر کے آنگن سے دیکھا جائے اور جب بال

سفید ہو جائیں یا ہونے لگیں تو اسی کتاب کا مطالعہ ایسا ہے جیسے چاند کو کھلے آسمان کے نیچے کسی ریگزار میں کسی چشمے کے کنارے کھڑے ہو کر دیکھا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جوں جوں زندگی کا شعور اور تجربہ بڑھتا جائے چیزوں کی معنویت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس analogy پر میں یہ کہوں گا کہ اس وقت راشد صاحب کی تربیتی باریکیاں سمجھ میں نہیں آتی تھیں اس لئے بیکار معلوم ہوتی تھیں۔ جب عمر کا کارواں ذرا آگے بڑھا تو کچھ کچھ سمجھ آئی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے پیچھے کوئی گہرا مقصد بھی تھا۔ اب جبکہ چالیس کا ہوا چاہتا ہوں تو ان باتوں کے پیچھے جو حکمتیں تھیں وہ بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہیں۔ کچھ کچھ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابھی کھلے میدان سے چاند کا نظارہ کرنا باقی ہے۔

1962ء میں دسویں میں راشد صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ پڑھانا اپنی جگہ، کتابوں کاپیوں کی نفاست، خط کی درستی کا خیال اس سے زیادہ تھا۔ انھوں نے اپنے گھر پر براؤن کورنگ پیپر کے کاپی کے سائز کے ٹکڑے رکھوائے ہوئے تھے۔ جس کی کاپی کا کور میلا ہوتا یا نہ ہوتا اسے حکم ہوتا کہ میرے گھر جا کر کور چڑھالو۔ جوں ہی کوئی لڑکا ان کے گھر جا کر گھنٹی بجاتا تو انکی بیگم مسکرا کر پوچھتیں "کور لینے آئے ہو"، اگر کسی کے پاس کاپی ہوتی تو وہ اسے کور چڑھانے میں مدد بھی دیتیں اور پھر خود قینچی سے کور کے کونے کاٹ کر دیتیں۔ انکی بیگم بھی بہت مہربان خاتون تھیں۔

انھوں نے کلاس لائبریری کا سلسلہ شروع کروایا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب کتابیں استعمال ہوں گی تو تھوڑی بہت ضائع بھی ہوں گی۔ جب سال بھر کے بعد کتابوں کی اسٹاک ٹیکنگ ہوئی تو چند کتابیں کم نکلیں۔ کچھ خراب ہوگئی تھیں۔ جب اس معاملہ میں دفتر میں ان سے باز پرس کی جارہی تھی تو اتفاق سے میں دفتر کے باہر کھڑا تھا۔ انھوں نے صاف کہا "جو کتابیں کھوگئی ہیں یا خراب ہوگئی ہیں میں ان کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں"۔ لیکن جس لب ولہجہ میں اقتدار کی میز کے اس پار سے گفتگو کی گئی اس کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔ ہمارے بیشتر ارباب اختیار پتھروں اور ہیروں میں تمیز نہیں کرسکتے اور وہ صرف اپنے اونچے رینک کی وجہ سے اپنے آپ کو عقلِ کل سمجھنے لگتے ہیں۔ میں اس کو بھی راشد صاحب کی بڑائی سمجھتا ہوں کہ حالات خواہ مساعد رہے یا نا مساعد، انھوں نے ہر حال میں اپنا کام جاری رکھا۔ قدرداں اور نا قدرداں سب کے ساتھ نباہ گئے۔

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

اصل میں commitment کی اپنی قوت ہوتی ہے۔ committed آدمی حالات یا افراد کے رحم و

کرم پر نہیں ہوتا۔

ٹیپو ہاؤس میں راشد صاحب ہاؤس کی ہم نصابی سرگرمیوں کے انچارج تھے۔ بہت پابندی سے فنکشن کراتے اور انکی کوشش یہ ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو اسٹیج پر لائیں۔ کہا کرتے تھے ''ہمیں فنی معیار نہیں چاہیے، اعتماد چاہیے''۔ ان فنکشنز کی تیاری وہ گھر پر بھی کراتے تھے اور بے انتہا ریہرسل کراتے۔ کبھی کبھی تو لڑکے عاجز آ جاتے۔ وہ کہا کرتے ''اسٹیج پر آ ؤ حاضرین کو فیس کرو۔ منہ کھول کر بات کرو، یہی بات اہم ہے''۔ اسپورٹس، گیمز، ایکسٹرا ایکٹیویٹز غرض ٹریننگ کا کوئی میدان ہو ان کی پالیسی یہ تھی کہ لڑکا وہ چیز سیکھے جو اسے نہیں آتی، جس میں وہ کمزور ہے اور یہ کہ سرگرمی وہ اچھی ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لڑکے حصہ لیں اور وہ لڑکے حصہ لیں جو اس میں پیچھے ہیں خواہ ہاؤس جیتے یا ہارے، اس لئے کہ لڑکے ہاؤس کے لئے نہیں، ہاؤس لڑکوں کے لئے ہے۔ کرنل رفیق نے کلاس رومز کی بیرونی دیواروں پر کچھ ملفوظات لکھوائے تھے۔ راشد صاحب نے ان میں سے دو اکثر quote کرتے تھے۔ ایک تو یہ

> The safety , honour and welfare of your country comes first, always and every time. The honour, welfare and comfort of the men you command comes next. Your own ease, comfort and safety comes last, always and every time.

انہی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جنرل چیٹ وڈ Gen Cheet Wood... کمانڈر ان چیف نے آئی ایم اے کا افتتاح کرتے ہوئے یہ الفاظ کہے تھے۔ دوسرے قائداعظم کا یہ قول:

> God has given us a grand opportunity to be the architects of a new nation. Let it not be said that we did not prove equal to the task.

آخر میں ایک اور بات یاد آئی۔ 1962ء میں انٹر سروسز پبلک اسکول ٹیموں کے ٹورنامنٹ ہمارے یہاں منعقد ہوئے۔ ظاہر ہے کہ مہمان ٹیموں کو بک اپ کرنے کے لئے ان کے اپنے لڑکے کم تھے۔ راشد صاحب نے ہم سے کہا آپ میں سے کچھ لوگ حریف مہمان ٹیموں کو بک اپ کریں اور کالج کی طرف سے وہ نعرے نہ لگائیں جو آپ کے تہذیبی معیار سے کم ہوں۔ یا جن سے کسی ٹیم کی دل آزاری ہو۔ یہ فقرہ کہ آپ لوگ کالج کے اندر اور باہر کالج کے سفیر ہوتے ہیں۔ پہلے پہل میں نے انہی سے سنا تھا۔

چیف وارنٹ آفیسر فضل کریم

(کالج نمبر 2537، زمانہ تعلیم 1959-1962ء)

اپریل 1959ء میں جب میں ملٹری کالج سرائے عالمگیر پہنچا تو میرے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ چند دن تو والدین کی جدائی سے بے حال رہا۔ اس بحران سے نکلا تو انگریزی کے مسئلہ بلکہ پہاڑ نے چکرا دیا۔ میں ایک اردو میڈیم دیہاتی سکول (جسے پنجابی یا ہندکو میڈیم کہنا زیادہ موزوں ہوگا، ضلع اٹک کے ایک دورافتادہ گاؤں میں اردو کا گزر کہاں) سے آیا تھا۔ یہاں سراسر انگلش میڈیم اور کلاس سے باہر بھی انگلش۔ میری انگلش یہاں کے لحاظ سے واجبی تھی، اوپر سے خط اتنا خراب کہ خود بھی تیزی سے پڑھنا چاہوں تو پڑھ نہ سکوں۔ انگریزی بولنے کی استعداد اور مشق تو نہ ہونے کے برابر تھی۔ راشد صاحب ہمیں انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور ہاؤس میں Tutorial Group لیتے تھے۔ ایک روز سپورٹس گراؤنڈ سے آتے ہوئے ٹیپو ہاؤس کی نچلی منزل کی سیڑھیوں کے قریب وہ مجھے ملے اور کہا۔ ''فضل کریم، میں دیکھ رہا ہوں کہ جان تو تم بہت مار رہے ہو لیکن بات بن نہیں رہی۔ گرائمر کے حصے تو میں کلاس میں سنبھال لوں گا تم ایل ای ایس Living English structure گرائمر کے لئے (سر راشد کی پسندیدہ کتاب) کی اضافی مشقیں کرلیا کرنا۔ تمہاری انگریزی بول چال اور ہینڈ رائیٹنگ کے مسئلہ کا ایک حل میں نے سوچا ہے۔ کل سے تم مغرب کی نماز کے لئے مسجد جاتے ہوئے میرے گھر سے ہوتے ہوئے جایا کرو۔ صرف دس منٹ پہلے یہاں سے نکلا کرو۔''

چنانچہ دوسرے دن سے میرے لئے یہ ڈرل ٹھہری کہ میں وقت مقررہ پر (ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد) ان کے گھر جاتا اور وہ میرے ساتھ مسجد جاتے ہوئے مجھ سے انگریزی میں سوال جواب کرتے جاتے۔ ہفتے اتوار کو چونکہ کھیل نہیں ہوتے تھے، ان دو دنوں میں ذرا پہلے جانا پڑتا تھا۔ گرائمر کی کتاب ایل ای ایس کی ایک آدھ ایکسرسائز بھی چیک کرالیتا اور انگریزی conversation بھی چلتی۔

میرا انگریزی کا خط درست کرانے کے لئے انھوں نے مجھے چار لائن کی کاپی منگوا کر دی۔ مجھے یاد ہے کس طرح انھوں نے سنہرے رنگ کی ایک جی نب منگوائی اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر اسکو تھوڑا سا دبا کر دیکھا کہ اس کا دباؤ ٹھیک ہے یا نہیں۔ اس جی نب سے میں تیس سطریں ہر روز لکھتا تھا۔

چار چھ ہفتے بعد میں جب انگریزی میں کچھ چل نکلا اور خط بھی بہتر ہونے لگا تو انھوں نے خود ہی کہا ''اب تمہیں اس ڈرل کی ضرورت نہیں۔ اب تم ایک قدم آگے بڑھاؤ اور ہاؤس کے فنکشن میں حصہ لیا کرو۔ اور Tutorial Group میں بھی شریک ہوا کرو''۔ پھر پوچھا ''تمھیں پودوں کی قلم لگانے کا تجربہ ہے؟'' میں نے جواب دیا ''سر کیوں نہیں، میں گلاب کی قلمیں لگاتا رہا ہوں''۔ فرمایا ''ٹھیک ہے پھر تو تم جانتے ہو

گے کہ جب قلم کی آنکھ پھوٹ آئے یعنی پہلا گلاب نکل آئے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قلم لگ گئی ہے۔ تو بس اب تمہاری قلم بھی لگ گئی ہے۔ پانی دیتے رہو۔ آگے اللہ مالک ہے''۔

1962ء میں جب میں فرسٹ ائر میں تھا تو مجھے میڈیکل وجوہ کی بنا پر بادل نخواستہ کالج چھوڑنا پڑا۔ راشد صاحب نے کہا مجھے اپنے والد صاحب سے ملانا۔ چنانچہ والد صاحب اور میں کالج کے حساب کتاب سے فارغ ہوئے تو ان سے الوداعی ملاقات کے لئے گئے۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا ''اپنے دوسرے استادوں سے مل چکے ہو؟'' میں نے کہا ''ابھی نہیں''، انھوں نے حکم دیا ''جاؤ، پہلے ان سے مل کر آؤ''۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میرے پیچھے کوئی آدھ گھنٹے میں راشد صاحب نے والد صاحب سے کیا باتیں کیں۔ لیکن جب ہم واپس جانے لگے تو میں نے والد کے رویے میں خاصی تبدیلی محسوس کی۔ کہاں وہ آدھ گھنٹہ پہلے میرے میڈیکلی ان فٹ ہونے اور فوج میں جانے کے امکانات بظاہر ختم ہو جانے پر دل شکستہ اور میرے مستقبل کی طرف سے مایوس سے تھے۔ اب انھوں نے بڑے اطمینان سے کہا ''فضل کریم! رزق اور عزت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم افسر نہ بن سکے نہ سہی، میں نے ابھی راشد صاحب کے ہاں سے اٹھتے اٹھتے فیصلہ کیا ہے کہ تم بھی ان کی طرح استاد بنو۔ اور روشنی پھیلاؤ۔ تمام ملک اور خاص طور پر ہمارا علاقہ ابھی تک جاگیرداری نظام میں جکڑا ہوا ہے ان زنجیروں کو کوئی تو توڑے گا''۔ یہ ان کا خیال تھا لیکن سچی بات ہے کہ میں convince نہ تھا۔ چنانچہ انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد میں نے اپنے طور پر اے ایس آئی کی آسامی کے لئے درخواست دے دی اور چپکے سے انٹرویو بھی دے آیا۔ جب سلیکشن کا رجسٹرڈ لیٹر آیا تو میری عدم موجودگی میں وہ والد صاحب نے وصول کیا جب میں گھر آیا تو پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ ایم اے کر کے استاد بننا ہے۔ یہ تم نے کیا چکر چلایا ہے۔ مختصر یہ کہ میں ایک دن پولیس ٹریننگ کالج جوائن بھی کر آیا۔ لیکن پھر انھوں نے نہ جانے دیا۔ وہ اس حد تک میرے استاد بننے پر مصر تھے کہ آخر میں انھوں نے الٹی میٹم دے دیا ''فضل کریم! اگر تم ٹریننگ کے لئے گئے تو تمہارا راستہ اور ہے میرا راستہ اور'' ظاہر ہے میں اپنے والدین کو کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ پھر چند سال ایک سکول میں پڑھاتا رہا۔ 1971ء میں جب میں نے پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کرنا چاہی تو انھوں نے اس شرط پر اجازت دی کہ میں فضائیہ کی ایجوکیشن برانچ میں جاؤں۔ میں نے لبیک کہا۔ چونکہ اس عرصہ میں، میں بھی والد صاحب کا ہم خیال ہو چکا تھا۔ اب آگے میں فضائیہ میں اپنی کارکردگی کے بارے میں کیا کہوں۔ یہ ملٹری کالج کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ میں فضائیہ کی ایک نہایت اہم آپریشنل بیس کا تقریباً دو سال تک ایجوٹنینٹ رہا۔ یہ پوسٹ خالصتاً ایک افسر کے لئے مخصوص تھی۔ اس منصب پر ایک ایجوکیشن جے سی او کا اتنے عرصے تک متعین رہنا فضائیہ کی تاریخ میں شاید ایک منفرد مثال ہے۔ اسی تربیت کی بدولت میں پچھلے تین سال

سے ایک نہایت اہم اڈہ پر بطور ایجوکیشن انسٹرکٹر خدمات انجام دے رہا ہوں۔ کوشش تو کرتا ہوں کہ راشد صاحب کے نقش قدم پر چلوں بہر حال وہ کہاں اور میں کہاں۔ اب میں اس لمحہ کو دعا دیتا ہوں جب والد صاحب نے راشد صاحب سے مل کر میرے لئے تعلیم و تعلم کی راہ منتخب کی تھی۔

آخر میں مزید دو چار بہت قیمتی یادوں کو ریکارڈ پر لانا چاہوں گا۔ کہ اب یہ یادیں ہی انکی میراث ہیں۔

راشد صاحب اردو انگریزی کی کاپیوں پر بڑے حوصلہ افزا اور فکر خیز تبصرے لکھتے تھے۔ مثلاً ''God bless you''، ماشااللہ، ''ترقی کروگے انشااللہ''۔ کبھی کبھی وارننگ بھی ہوتی جیسے ''خطرہ نظر آتا ہے''۔ ''توضیحات ٹھیک کرو''۔''Wake-up, before it is too late''۔ جس کسی میں ادبی ذوق کی رمق نظر آتی اسے ادبی مشوروں سے نوازتے۔ ''حالی کا مقدمہ پڑھا ہے؟ 'آب حیات' بھی دیکھ لینا، خطوط غالب پر مضمون لکھنے سے پہلے خورشید الاسلام کی تنقید پڑھ لینا۔ اقبال پر 'نئے اور پرانے چراغ'، میں آل احمد سرور کا مضمون قابل توجہ ہے۔''

انگریزی میں apostrophe اور دوسرے punctuation marks کی placing چھوٹے بڑے حروف لکھنے کے بارے میں بڑے fastidious تھے۔ کہتے تھے زبان کی غلطیوں کے مقابلے میں casualness جو ایک کرداری خامی ہے، زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

ایک اور خصوصیت جس کو ان کے سارے شاگردوں نے نوٹ کیا ہوگا یہ تھی کہ ان کی توجہ کا دائرہ صرف اپنے ہاؤس اپنی کلاس یا اپنے مضمون تک محدود نہ تھا۔ اسپتال جاتے تو سب ہاؤسوں کے لڑکوں کو پوچھتے کوئی اچھی تقریر کرتا یا اچھا کھیلتا، یا کوئی امتیازی کام کرتا تو خواہ وہ کسی ہاؤس کا ہو وہ اسکی فراخدلی سے حوصلہ افزائی کرتے۔ برس ہا برس بعد مئی 1988ء میں جب میں اپنے بیٹے فیصل کے داخلے کے لئے کالج میں گیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے ان سے اس نکتہ پر گفتگو کی۔ فرمایا میں humanism میں believe کرتا ہوں۔ توحید کا عقیدہ انسان کو ہر قسم کی bias سے بلند کر دیتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سب اپنے ہی ہوتے ہیں۔ شخصیت جتنی expand ہوتی ہے اتنی زیادہ پھولتی پھلتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو جتنا زیادہ محدود کرتا جاتا ہے۔ اتنا اپنے لئے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل پیدا کرتا جاتا ہے۔ آفاقیت اور انسانیت لازم و ملزوم ہیں۔ اسلامیت بھی یہی ہے۔

میجر محمد سلیم

(کالج نمبر 2539، زمانہ تعلیم 1962-1959ء)

اپریل 1959ء میں اسکین ہاوس میں میرے نانا مجھے چھوڑ کر گئے ہی تھے کہ مجھے شدید بخار آ گیا اور سی ایم ایچ میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔ ایک تو جگہ بالکل اجنبی دوسرے اتفاق سے وہاں کوئی دوسرا مریض نہ تھا۔ سخت دل گھبرایا۔ تھوڑی دیر بعد جو سب سے پہلے مجھے ملنے آیا وہ راشد صاحب تھے۔ پوچھا کیسے ہو؟ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا کوئی نہیں ہے (میرا مطلب تھا کہ یہاں کوئی نہیں)۔ میری آنکھوں میں تو نہیں لیکن لہجہ میں آنسو ضرور تھے۔ انہوں نے برجستہ کہا ''کوئی نہیں تو میں ہوں'' یہ الفاظ انہوں سے اس خلوص سے کہے تھے کہ ان کی گرمی آج بھی میں محسوس کر رہا ہوں۔

بریگیڈئیر محمد خالد مسعود

(کالج نمبر 2542 زمانہ تعلیم 1964-1959ء)

ملٹری کالج کا زمانہ ایک خوبصورت دور تھا جس میں ہم نے شعوری اور لاشعوری طور پر بہت سیکھا۔ ہم نے اپنے آپ کو دریافت کیا اور اندر سے سنوارے گئے۔ وہ تمام سبق، باتیں اور تجربہ ہماری زندگی ہے۔ پاکستانیت، کریکٹر، self control, self restrain، ہمارے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا گیا۔

ہمارے تمام اساتذہ اپنے اپنے طور پر یکتا تھے اور ہر ایک special خصوصیت کا حامل تھا، علوی صاحب، حیدری صاحب، شفیق صاحب، حمید صاحب، ایوب صاحب، کیپٹن رشید صاحب اس وقت کیپٹن آئی آر صدیقی صاحب، کیپٹن نور محمد خالد صاحب، کیپٹن غفور صاحب، کیپٹن عبدالرحمان، کیپٹن نسیم غنی وغیرہ۔ ان سب پر الگ الگ کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ ہم نے اور خصوصاً میں نے ان سے زندگی کو سمجھا اور اس میں رہنا سیکھا۔ علوی صاحب نے debates میں ماہر کیا، حیدری صاحب photography کے بھی ماہر تھے ان کے طفیل میں لڑکپن میں ہی ایک ماہر professional فوٹوگرافر بن گیا۔ خودی کی پہچان duty first, self awareness Pakistan first, ذات کے باہر کی دنیا یہ سب باتیں اور اندر کا نقصان جگانے میں جو کمال اور ملک راشد صاحب کو حاصل تھا شائد ہی کسی اور میں ہو۔ علم میں تو شائد دنیا میں اور لوگ بھی بہت اچھے ہوں گے لیکن جو لگن، جو جذبہ، جو خلوص، جو نیت، جو تڑپ اور وہ بھی مسلسل اتنی لمبی زندگی میں' یہ میرے خیال میں صرف اور صرف راشد صاحب ہی تھے۔ 50 سال سے

اوپر ہو گئے لیکن وہ کبھی ہماری زندگی ، ہماری سوچ اور ہمارے طرز زندگی کے کسی بھی لمحہ ہم سے جدا نہیں ہوئے۔

ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ جو عموماً ہماری کلاس 8th میں پیش آتا تھا۔ راشد صاحب ڈسپلن، رکھ رکھاؤ اور کلاس decorum میں کوئی کوتاہی یا compromise برداشت نہیں کرتے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی سعید (اللہ ان کے جنت فردوس میں درجات بلند کرے وہ 1971 کی جنگ میں شہید ہو گئے ہیں) تھوڑا لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ کلاس میں بیٹھنے میں ذرا causal تھا اور کبھی ایک ٹانگ باہر کو نکالی ہوتی تھی کبھی ایک کہنی پر تھوڑی رکھے بیٹھے ہوتے۔ راشد صاحب جونہی پڑھانا شروع کرتے سعید ایک طرف لڑھک جاتے، راشد صاحب اس کو دیکھتے ہی پہلے اس کے ارد گرد چکر لگاتے۔ وہ اپنے حال میں مگن کچھ سوچ رہا ہوتا اور راشد صاحب کا چکر لگانا اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ پھر راشد صاحب راسٹرم پر واپس آتے اور اسے دیکھتے ہوئے ہلکا سا کھانستے تا کہ سعید کی توجہ ان کی طرف ہو جائے وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ جب سب حربے ناکام ہو جاتے تو راشد صاحب اس کو براہ راست مخاطب کر کے کہتے 'ارے بھائی سعید please' اور ہاتھ کے اشارے سے بڑی نفاست سے سیدھا بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ سعید ان کو دیکھتے ہی سیدھا ہو جاتا اور راشد صاحب دوبارہ پڑھانا شروع کر دیتے۔ صرف چند منٹ گزرنے کے بعد سعید ٹانگ دوسری طرف نکال دیتا یا کہنی پر پھر جھکجاتا۔ راشد صاحب اسے فوراً دیکھتے، ذرا مسکراتے اور پھر پڑھانا شروع کر دیتے۔ ہم پوری کلاس یہ واقعہ تقریباً روزانہ دیکھتے اور راشد صاحب سے concern اور commitment، پیار، رکھ رکھاؤ اور وضع داری کو enjoy کرتے۔

راشد صاحب عام دنیاداری والے تھے ہی نہیں۔ انہیں صرف ہمیں آدمی سے انسان بنانے کی لگن تھی جس میں وہ ہمہ وقت ہمہ دم مگن اور ڈوبے رہتے تھے۔ یہ ان کا passion اور commitment تھی۔ ان کو کسی اور چیز میں دلچسپی نہ تھی۔ محبت تھی تو صرف پاکستان کے ساتھ، بانی پاکستان کے ساتھ، مفکر پاکستان کے ساتھ، اور ہمارے ساتھ، ان کے اندر صرف اور صرف محبت، رواداری، وضع داری اور پاکستانیت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی۔ ذاتی مفاد، ذاتی آرام، ذاتی عناد، ذاتی نمود و نمائش، کہیں نام کو بھی نہ تھا، وہ ذات کی ایک complete نفی تھے اور self negation کی عمدہ تصویر تھے۔

ہمارے زمانے میں وہ کافی کم تنخواہ پانے والوں میں سے ہوں گے۔ راشد صاحب کے بچے بھی سبھی پڑھ رہے تھے۔ ان کے اخراجات گھر کے اخراجات، پھر اپنے آپ کو اتنا emaculately maintained اور weldressed رکھنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ ان سب اخراجات اور ضروریات

کے ہوتے ہوئے بھی ہماری کاپیوں پر براؤن پیپر چڑھا کر واپس کرتے تھے تاکہ ہمیں صاف رہنے کی عادت پڑجائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں اور موقع ملتے ہی ہمارے گھر والوں کو ہمیشہ entertain کرتے۔

کالج سے نکلنے کے کافی سال بعد میں نے انہیں ایک خط لکھا۔ شاید جلدی میں لکھا تھا۔ کچھ دنوں بعد وہی خط سرخ سیاہی میں correct کیا ہوا اور ساتھ ہی سرخ سیاہی ہی میں instructions کے ساتھ کافی لمبا خط مجھے واپس موصول ہوا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میرا دل کتنا خوش ہوا، ان کا ٹوکنا، سمجھانا ہمارے لئے باعث فخر تھا۔ یہ concern یہ لگاؤ یہ محبت صرف راشد صاحب ہی کر سکتے تھے یہ خط میں نے تبرکن اپنے پاس کئی سال محفوظ رکھا۔

ایک دفعہ بتانے لگے کہ ان کے گھر کے برآمدہ میں ایک نیولہ آ گیا۔ فرمانے لگے کہ ہم نے سوچا گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہم اس سے بیر تو لے نہیں سکتے چلو اس سے دوستی کر لیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم ایک کٹوری میں دودھ ڈال کر دروازے کے باہر رکھ دیتے۔ روزانہ نیولہ آتا دودھ پیتا اور چلا جاتا۔ سبحان اللہ یہ رواداری یہ حوصلہ یہ درگزر اور دشمنوں کو دوست بنا لینے کا یہ انداز صرف اور صرف راشد صاحب کی ہو سکتا ہے۔

راشد صاحب جب ملٹری کالج سے retirement کے بعد پہلے جہلم پھر منگلا سکول میں متعین تھے۔ ہر جگہ زیادہ تر فوجی افسران کے شاگرد تھے۔ منگلا میں ان کی بہت عزت تھی۔ گھر گاڑی اور دیگر تمام سہولیات موجود تھیں۔ راشد صاحب کے سامنے ہمیشہ ایک بڑا مقصد ہی ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے راولپنڈی شفٹ ہونے کا پروگرام بنا لیا۔ راشد صاحب کبھی زندگی میں دنیاداری میں نہیں پڑے تھے۔ میرے خیال میں سودا سلف لانا، روزمرہ کے امور میں پڑنا اور گھر کے کام کاج ان کی طبیعت اور جبلت میں تھے ہی نہیں۔ ان کو جانتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ آپ کیوں ایسی اچھی اور پُرسکون جگہ کو چھوڑ کر راولپنڈی آنا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب تھا ''منگلا میں رہنا میرے فوائد میں ہے مقاصد میں نہیں''

راولپنڈی چکلالہ میں انہیں پہلے ایک پلاٹ دلوایا گیا بعد میں ہمارے ہی ایک ساتھی نے اُس پر مکان بنانے کی حامی بھری اور گھر بنوا دیا۔ میں چونکہ چکلالہ III میں ہی رہتا تھا اس لئے بعد میں گھر کی دیکھ بھال میں نے اپنے ذمہ لے لی۔ میں نے گھر میں بہت خامیاں پائیں۔ میٹریل کافی ناقص لگا ہوا تھا۔ بناتے وقت بھی کوئی خاص احتیاط نہیں برتی گئی تھی۔ گھر اردگرد کے مکانوں سے بہت نیچے بنا ہوا تھا۔ ایک رات بہت زور کی بارش ہوئی اور تمام اردگرد کا پانی گھر کے اندر گھس گیا۔ کرایہ دار ایک فوجی افسر تھے ان کا سامان پانی میں تیر رہا تھا۔ آدھی رات کو بارش میں انہوں نے مجھے بلوایا۔ ہم نے پچھلی دیوار توڑ کر پانی نکالا۔

بہرحال ان کا کافی نقصان ہوا۔ میں یہ سب باتیں بڑے کرب اور دکھ کے ساتھ راشد صاحب سے کہتا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ راشد صاحب کے پاس وسائل تو تھے ہی نہیں اور ساری عمر کی جمع پونجی اسی پر لگ چکی تھی اور یہ گھر ان کا واحد اثاثہ تھا۔ میرے بڑے اصرار پر وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ صرف یہ کہتے ''ارے بھائی ہوگی اس کی کوئی مجبوری'' انہوں نے کبھی اپنے شاگردوں پر بداعتمادی نہیں کی۔ جنہوں نے انہیں نقصان پہنچایا انہیں بھی دعا دی۔ یہ ہوتا ہے ایک عظیم آدمی، یہ ہوتا ہے ایک سچا استاد۔ ہمارے حساب سے ظاہراً ان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ غارت گیا لیکن ان کے حساب سے کچھ نہ بگڑا تھا۔ راشد صاحب ہمیشہ کہتے تھے کہ استاد کا کام ہوتا ہے دینا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی بھی ان کے ہاں گیا ہوں اور خالی ہاتھ واپس آیا ہوں۔ کچھ نہ کچھ ضرور عطا کر دیتے چاہے کوئی پمفلٹ ہی کیوں نہ ہو۔ راشد صاحب کے بیٹے مسعود کی شادی تھی سب کو بلوایا ہوا تھا۔ invitation card ہی بڑا خاص اور لٹریچر کا ایک پیس تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے تو راشد صاحب خود reception پر موجود تھے اور دینے کے لئے (نوٹ کریں لینے کے لئے نہیں) کتابیں، کھلونے، پنسلیں اور چھوٹی چھوٹی چیزیں اور ایک ٹوکرے میں گلاب کے پھول رکھے ہوئے تھے۔ راشد صاحب آنے والے ہر فرد کو اس میں سے کچھ اٹھا کر دے رہے تھے۔ کچھ نہیں تو گلاب کا پھول ضرور پیش کرتے۔

ان کی وفات کے بعد (میں ان کی وفات پر باہر تھا) ان کے گھر گیا۔ جب میں اٹھنے لگا تو آصف اٹھا اور ''دانائی کی تلاش'' مجھے یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ یہ کتاب ابا آخری وقت میں لکھ رہے تھے۔ سبحان اللہ اُن کے دنیا سے کنارہ کر جانے کے بعد بھی دستور نہیں بدلا۔

شادی کے بعد میں اپنی بیوی کو لے کر ان کو سلام کرنے گیا۔ آؤ بھگت تو اس گھرانے کا پکہ دستور تھا ہی کچھ دیر بعد میری بیوی کے قریب بیٹھ گئے اور میرے متعلق اچھی اچھی باتیں اس سے کرتے رہے پھر کہنے لگے ''بیٹی تم بڑی خوش قسمت ہو جو اس سے بیاہی گئی ہو یہ بڑے کمال کا اور بڑے ہنر والا آدمی ہے'' ان کو ہماری ساری زندگی پر نہ صرف نظر رہتی تھی بلکہ وہ اتنے concerned تھے کہ ہمیشہ ensure کرتے تھے کہ ہم ہر محاذ پر اور ہر جگہ کامیاب و کامران رہیں۔

راشد صاحب جیسے استاد، مربی و مرشد، اللہ کی ایک خاص نعمت ہوتے ہیں اور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ صرف نصیبوں والوں کو ہی ملتے ہیں اور ہم ان خوش قسمت لوگوں میں شامل ہیں۔

(شکر الحمدللہ)

ڈاکٹر مقصود الحسن نوری

(کالج نمبر D.S.21 ،زمانہ تعلیم 1959-1964ء)

انٹرمیڈیٹ میں لازمی انگریزی کے علاوہ ایڈوانس انگلش ایک اختیاری مضمون کے طور پر تھی۔اس نصاب میں ہارڈی کا ناول Far From the Maddening Crowd شامل تھا۔اس کے دو کردار جبرئیل اوک اور باتھ شیبا صبح کے ستاروں کے طرح میرے شعور کے افق پر جھلملاتے رہتے ہیں اور زندگی کے سفر میں کبھی روشنی، کبھی ٹھنڈک اور کبھی حوصلہ دیتے ہیں۔ جبرئیل ایک بوڑھا کسان تھا جو دردمند دل رکھتا تھا۔جس کے دل کے دروازے ہر اجنبی کے لئے کھلے تھے۔جس کی نظر زندگی کے حسن پر، اسکی روشنیوں پر، اس کے امکانات پر رہتی تھی۔ جبرئیل اوک میرے لئے ایک افسانوی کردار نہیں ایک زندہ حقیقت ہے۔ ایسا دانشور جس کا humanism جس کا optimism میری اپنی زندگی کی awareness میں جذب ہو گیا ہے۔ایسا کیوں کر ممکن ہو سکا؟ یہ راشد صاحب کی ٹیچنگ کا اعجاز تھا۔ انھوں نے اس کردار کے پرسنیلٹی پیٹرن، اس کی قدروں، اسکے رویوں کو اتنا involve ہو کر ڈسکس کیا کہ جبرئیل ناول کے اوراق سے نکل کر سامنے آن کھڑا ہوا۔اسی طرح انھوں نے باتھ شیبا کے کردار کا اس گہرائی میں جا کر تجزیہ اور اس کو ڈسکس کیا کہ لطف آ گیا۔عورت کے جو روپ (facets) ہیں، اختر جمال کی گلدانی، فلابیر کی مادام بواری، ہارڈی کی ٹیس، اناطول فرانس کی تائیس، عورت کے بے شمار روپ سامنے آئے۔شیکسپئر کی حسین مگر ذہین اور پروقار پورشیا(Portia) کا ذکر بھی آیا اور کالی داس کی شکنتلا کا حوالہ بھی دیا۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

کی بات بھی ہوئی اور یہ گلہ بھی کیا کہ اقبالؒ نے عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وجودِ زن سے کائنات میں رنگ ہی نہیں اور بہت کچھ بھی ہے۔ میں نے یہ تاثر اخذ کیا کہ باتھ شیبا کی دلنواز سادگی اور پروقار مادریت خود انکے دل میں اتر گئی ہے۔ پھر ہوا یہ کہ باتھ شیبا کا جمالِ صورت اور حسنِ سیرت خود ہمارے لئے بھی ایک حوالہ بن گیا۔ یہ ٹیچنگ کا اوج کمال ہے۔

صرف ہمدردی ہی نہیں دردمندی کس طرح انکی شخصیت کا غالب عنصر تھی، اس کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ 1960ء میں ہمارے کالج سے لڑکوں کا ایک گروپ لاہور ہارس اینڈ کیٹل شو دیکھنے کے لئے گیا۔ وہاں ٹرک کے ایک حادثہ میں ہمارا ایک کلاس فیلو اظہر لطیف جاں بحق ہوا اور ایک ساتھی (اقتدار علی) شدید زخمی ہوا۔اس حادثہ کا سب کو بے حد افسوس ہوا۔ یہ المناک خبر یہاں ہفتہ کی دوپہر کو پہنچی

تھی۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ اس دن بھی اس حادثہ کی تفصیلات آتی رہیں ان پر باتیں ہوتی رہیں۔ پیر کے دن کالج میں معمول کے مطابق زندگی رواں دواں ہوگئی۔ (اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا) راشد صاحب کا ہماری کلاس دسویں (اے) میں دوسرا پیریڈ تھا۔ وہ بھی اپنے روایتی اسٹائل میں گھنٹی بجنے سے ایک منٹ پہلے کلاس سے باہر برآمدہ میں آ کھڑے ہوئے اور گھنٹی کی ٹن کی آواز آتے ہی اندر داخل ہوئے۔ کلاس پریفیکٹ نے کلاس اسٹینڈ اپ کیا اور کلاس کھڑی ہوگئی۔ لیکن انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے سلام کیا اور اشارہ سے ہی بیٹھنے کو کہا۔ وہ بے حد افسردہ نظر آ رہے تھے۔ ایک لمحہ خاموش رہے۔ پھر کہا۔ یہ بہت المناک موقع ہے۔ ان کے اصل الفاظ یہ تھے۔ ''It's a sombre occasion'' (اس وقت یہ لفظ میرے لئے بالکل نیا تھا) پھر انہوں نے بہت دلگیر انداز میں حادثہ کے بارے میں مزید تفصیلات بتائیں اور آخر میں کہا۔ اب ہم اپنے پیارے ساتھی کے سوگ میں ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہیں گے۔ مجھے کچھ یاد پڑتا ہے کہ موت کے فلسفہ پر بھی انھوں نے کچھ باتیں کی تھیں لیکن یہ تفصیلات کہ وہ کس طرح آئے۔ کس طرح تعزیتی باتیں کیں۔ کس طرح ہم سوگ میں کھڑے ہوئے۔ یہ سب تفصیلات میرے ذہن کے پردہ پر نقش ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اس واقعہ پر انھیں افسوس ہی نہیں دکھ ہوا ہے۔ ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ تنہا استاد تھے جنھوں نے کلاس میں اس طرح اپنے دکھ کا برملا اظہار کیا۔ یہ دردمندی ان کی شخصیت کی جزوِ عظیم تھی اور ہزار طرح معرضِ اظہار میں آتی رہتی تھی۔ میں نے ان کی اسکالرشپ سے بھی بہت استفادہ کیا لیکن ان کی شخصیت سے اس سے بھی زیادہ متاثر ہوا اور یہ وہ متاع ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔

چونکہ میں نے ایف اے میں ایڈوانس انگلش لے رکھی تھی اس لئے ان سے لائبریری میں یا انکے گھر پر نیاز حاصل ہوتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی میرے ساتھ میرے ایک دوساتھی (رانا وغیرہ) بھی ہوتے تھے۔ اس وقت میری منزل فوج تھی۔ (اور فوج میں کمیشن لیا بھی) ان دنوں میرے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بالآخر ریسرچ یا تحقیق میرا پروفیشن ہوگی۔ لیکن انھوں نے اس وقت بھی تدریسی معیار کو اتنا بلند رکھا جیسے ان کی نظر ان امکانات پر تھی جن سے میں اس وقت بے خبر تھا۔ ان کا ڈرائنگ روم اصل میں اسٹڈی روم ہے جس میں دیوار کے ساتھ تین طرف کتابوں کے ریک لگے ہوئے ہیں۔ اتنی بڑی ذاتی لائبریری میں نے وہاں کسی اور استاد کے پاس نہیں دیکھی۔ اس لائبریری سے وہ مجھے کتابیں پڑھنے کو دیتے رہتے تھے۔ ای سی ایم جوڈ کی کتاب An Introduction to Modern Thought پہلے انھوں نے ہی پڑھنے کو دی تھی۔ برناڈ شا کی کتاب ' An Intelligent Womans Guide to Socialism and Capitalism اور برٹرنڈ رسل کی Sceptical Essays ٹریلویلین کی English

Social Historyاور ہارڈی کی'Tess' وغیرہ ایسی کتابیں میں ان سے لاتا رہتا تھا۔ کچھ پڑھتا تھا کچھ ورق گردانی کر کے واپس کر دیتا تھا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں اس وقت میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن اس Intellectual exposure سے اتنا ضرور ہوا کہ میں نصاب کے کنوئیں سے نکلا اور باہر کی فضا کی پنہائیوں کا کچھ احساس ہوا۔ یہی احساس بالآخر مجھے ریسرچ کی طرف لے گیا۔

راشد صاحب سے میں نے ایک اور چیز بھی سیکھی، وہ انکی سخت کوشی ہے۔ 1976ء میں فوج سے فارغ ہو کر ملٹن کے الفاظ میں، میں نئے سبزہ زاروں کی تلاش میں تھا کہ راشد صاحب سے ملنے گیا۔ اواخر جون کا موسم، سخت گرمی سوا چار بجے کا وقت۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آرام کر رہے ہوں گے۔ اس وقت ڈسٹرب کرنا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔ اس گومگو کی حالت میں رنگ دی تو ان کا چھوٹا بیٹا باہر آیا۔ آصف سے معلوم ہوا کہ ہاؤس میں ہیں۔ وہاں گیا تو دیکھا کہ ایک لڑکے سے انٹرویو لے رہے ہیں اور دو باہر بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ لڑکوں سے کہا آپ جائیں پھر بلاؤں گا۔ میں نے پوچھا سر یہ کیا سلسلہ ہے۔ بولے کل چھٹیاں ہو رہی ہیں الوداعی انٹرویو لے رہا ہوں، یوں بھی یہ فرسٹ پریپ کا وقت ہے۔ اسے میں خود سپروائز کرتا ہوں۔ رات کو دوسرے آفیسرز ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ میں گرمی سے بے حال ہو رہا تھا۔ میں نے رکے ہوئے پنکھے کو غور سے دیکھا۔ اس پر انھوں نے ساری کہا اور اٹھ کر سوئچ آن کیا۔ پھر خود ہی وضاحت کی کہ کبھی کبھی میں خود پنکھا آف کر دیتا ہوں تاکہ گرمی میں بھی کام کرنے کی عادت رہے اور جو سہولت میسر ہے اس کی قدر ہو، یہ لڑکا جس سے میں انٹرویو کر رہا تھا اے وی پی (اسسٹنٹ وائس کیپٹن) ہے۔ اس کو میں یہ بتا رہا تھا کہ کبھی کبھی گرمی میں بھی ہوم ورک کیا کرو اور مہینہ میں ایک آدھ بار فرش پر بھی سویا کرو۔ پھر فرمایا ''وہ جو ایڈیسن کا فقرہ ہے نا کہ جینئیس ایک حصہ Inspiration اور ننانوے حصے perspiration ہے۔ بالکل صحیح ہے۔ تم نے نپولین کے بارے میں پڑھا ہوگا کہ وہ کتنی کم نیند سے کام چلا لیتا تھا۔ یہی حال اکبر اعظم کا تھا۔ جینئس میں انتھک کام کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ میں خود حال ہی میں لاہور میوزیم میں صادقین سے ملا۔ وہ سورہ رحمٰن کو پینٹ کر رہے تھے اور انکی دنیا میں دن رات کا فرق مٹ چکا تھا۔ جو لوگ جینئس نہیں انہیں بھی اپنی قوت کار بڑھاتے رہنا چاہیئے''۔ ان کے گہرے commitment اور سخت کوشی کی عادت، ان دو چیزوں سے انکے بے شمار شاگردوں نے انسپائریشن لیا ہوگا۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔

مجھے کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ ان کی صلاحیت کے آدمی کو کسی بڑی یونیورسٹی میں ہونا چاہیے تھا۔ ایجوکیشن کے اسرار و رموز پر جتنی ان کی نظر تھی اس لحاظ سے ان کا مقام یہ نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا ہے

کہ انھیں جو عزت اور شہرت ملی اس سے بہت زیادہ ان کا صلہ بنتا تھا۔ 15 جولائی 1987ء کو جب وہ ایوی ایشن میس میں کالج کی ہسٹری کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے اور میں بھی حاضر خدمت تھا۔ تو میں نے اور شاہد سہیل نے اس احساس کا اظہار کیا۔ انھوں نے جواباً کہا مجھے کوئی regret کوئی frustration نہیں۔ یونیورسٹی کا اپنا مقام ہے، اپنا رول ہے لیکن ملٹری کالج ایسا ادارہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ یہاں آپ کو ان نوجوانوں کی ذہنی اور اقداری تربیت کا براہ راست موقعہ ملتا ہے۔ جو ملک کے لئے کچھ اہمیت رکھتے ہیں۔ ''Good Bye Mr Chips'' میں کیتھرین برجز، چپس سے کہتی ہے۔ 'It's so important to be influencing those who are going to matter to the world.' اب رہی بات شہرت اور عزت کی تو یہاں بھی کوانٹیٹی اور کوالٹی کی بات ہے۔ پھر جو ملا ہے وہ بہت ہے۔ مجھے کسی اور جگہ ہونے کی کبھی حسرت نہیں رہی۔ اس لئے کہ میرا پختہ یقین ہے۔

What matters is the performance not the position

یہ پوزیشن اور پرفارمنس کا فلسفہ کچھ Existentialism کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ بہر حال ان کا ingrained faith یہی تھا۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈاکٹر مسعود الحسن نوری

(کالج نمبر D.S-22، زمانہ تعلیم 1959-1964ء)

اوائل 60 میں راشد صاحب سے انگریزی پڑھنے سے جو گہرا تاثر میں نے لاشعوری طور پر قبول کیا وہ انکے بہت گہرے humanism کا تھا جو انکے رویوں میں جاری و ساری تھا۔ چھوٹوں کی عزت کرتے میں نے انہی کو دیکھا اور کمزور اور نالائق سے نالائق طالب علم پر توجہ دینا اور اس کی خودی کو ٹھیس نہ لگنے دینا۔ یہ وصف بھی نمایاں طور پر ان میں تھا۔

اگر میں یہ کہوں کہ امراض قلب کے معالج کی حیثیت سے میں ان کے humanism کو اختیار کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہوں تو غلط نہ ہوگا۔ قلب کے امراض میں خاص طور سے مریض کی ذہنی اور جذباتی فضا اس کی صحت یابی اور صحت مندی میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ فضا مریض معالج کی سائیکی کی فضا سے لاشعوری طور پر جذب کر لیتا ہے۔ اگر میں اپنے مریضوں کو یہ روشنی دینے میں تھوڑا بہت بھی کامیاب ہو سکا ہوں تو یقیناً یہ بڑی حد تک اس فضا کا اثر ہے جو راشد صاحب کی کلاس میں ہوتی تھی۔

دوسری چیز جو واضح طور پر میں نے ملٹری کالج اور خاص طور سے راشد صاحب سے سیکھی وہ انکی انسان دوستی اور پاکستان دوستی ہے۔ میں اپنے آپ کو سب سے پہلے پاکستانی سمجھتا ہوں۔ اس کے بعد کچھ اور۔ کوئی

مریض کہیں سے آئے۔ کچھ ہو۔ میرے لئے سب سے پہلے انسان اور پاکستانی ہوتا ہے۔ میری نظر میں راشد صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی عصبیت سے بلند تھے۔ حد یہ کہ ذہانت کی بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔ صرف انسانیت کا لحاظ کرتے تھے۔ انکی کسی کتاب میں سلیم اختر کیانی نے لکھا ہے کہ ان کا نام ہی انکی پہچان ہے۔ تو غلط نہیں لکھا۔

پروفیسر اجمل الرحمان

(کالج نمبر 2554، زمانہ تعلیم 1960-1966ء)

آٹھویں میں راشد صاحب اردو پڑھاتے تھے۔ جس کسی نے ان سے ایک دن بھی پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ وہ ڈسپلن کے معاملہ میں نرمی کے ساتھ کتنے سخت تھے۔ گرفت کرنے کا انکا اپنا طریقہ تھا۔ teens میں انسان کچھ کرنا تو چاہتا ہے لیکن سیدھا چل کر کچھ نہیں کر پاتا تو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی لاشعوری خواہش کا اظہار ٹیڑھا چلنے میں ہی کرنے لگتا ہے۔ اپنی خودی کی تلاش کے اس مرحلہ میں اگر کوئی صاحب نظر نہ ملے تو بات بگڑ بھی سکتی ہے۔ (اور اکثر بگڑ بھی جاتی ہے) یہ تمہید اس بات کی ہے کہ میں اپنی قمیض کا اوپر کا بٹن جان بوجھ کر توڑ کر رکھتا تھا۔ یوں ہی کچھ کھڑپینچ بننے کا شوق تھا۔ (اپنی انا کی تلاش کا مرحلہ) راشد صاحب نے ایک بار غور سے دیکھا اور چلے گئے۔ یہ اس امر کا پہلا اشارہ تھا کہ بٹن لگا لو۔ دوسرے دن انھوں نے پھر غور سے دیکھا۔ کچھ دیر رکے اور بڑھ گئے اور پڑھانا جاری رکھا۔ یہ دوسرا سگنل تھا کہ انھوں نے نوٹس لیا ہے۔ لیکن میری تو نفسیاتی کیفیت ہی اور تھی۔ تیسرے دن بھی انھوں نے نوٹ کیا لیکن کلاس میں کچھ نہیں کہا۔ پیریڈ ختم ہوا تو انٹرول تھا۔ انھوں نے باہر بلایا اور آہستہ سے کہا میرے گھر جاؤ اور آنٹی سے بٹن ٹانکوالو۔

میں تو کالج کا نامی کھلنڈرا تھا۔ غیر سنجیدہ۔ لیکن انھوں نے ہم ایسوں کو جو دورافتادہ دیہات سے آئے تھے اور کلچرل بیک لاگ کا شکار تھے، انھوں نے interpersonal relationship کی ایسی ایسی نزاکتوں سے آشنا کیا کہ اب جبکہ میں خود انگریزی کا لیکچرر ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اس عمر میں انھوں نے ہمیں کن subtleties سے آشنا کر دیا۔ مثلاً غلطی ہم کرتے تھے اور کرب کے آثار ان کے چہرے پر ظاہر ہوتے تھے۔ کچھ حد ہے اس دردمندی کی، میں آپ کو بتاؤں راشد صاحب کے سب سے بڑے فین وہی اولڈ بوائز ہیں جن کو وہاں کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ چونکہ راشد صاحب نے ان کی تمام تر کوتاہیوں کے باوجود انہیں reject نہیں کیا تھا۔ کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ کچھ زیادتیاں بھی کیں، ان کے پھلوں کے باغ کو لوٹا۔ ان کی مرغیوں کو نکال کے لے گئے، ان کے علم میں ان شیطانوں کے نام تھے بھی لیکن یہ حرکتیں وہ

شوخیاں سمجھ کر ٹالتے رہے۔ برداشت اور درگزر کا جتنا مادہ ان میں تھا اتنا میں نے کسی اور میں نہیں دیکھا۔ وہ صرف معلم نہیں مرشد تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل نثار احمد

(کالج نمبر 2558، زمانہ تعلیم 1965-1960ء)

جنوری 1987ء میں کالج میں اے اے اینڈ کیو ایم جی ہو کر آیا تو یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ گو ماہ وسال کا اثر ان کے چہرے مہرے خصوصاً سر کے بالوں کی کمی اور ان میں بکھری سفیدی میں تو نمایاں تھا لیکن رکھ رکھاؤ میں کمی نہیں آئی تھی۔ لباس کی نفاست اسی طرح تھی اور تیز قدمی میں بھی فرق نہ آیا تھا۔ لیکن مجھے اصل خوشی اس وقت ہوئی جب مجھے شیر شاہ ہاؤس کے کسی کام کے لئے ان کی پہلی چٹ ملی۔ اس چٹ کو میں دیر تک دیکھتا رہا۔ یہ چٹ ڈی او پیپر کی تھی، اوپر ان کا نام پروفیسر سعید راشد چھپا ہوا تھا۔ نیچے اردو میں وہ کام اور اسکے نیچے انکے خوبصورت دستخط۔ دل بہت خوش ہوا کہ ابھی تک راشد صاحب نے اپنی روایتی نفاست پسندی کو برقرار رکھا ہوا ہے جو برسوں سے ہمارے لئے نمونہ رہی ہے۔ کم از کم میں نے اپنی زندگی میں انکی نفاست، سلیقہ، باریک بینی، اور نرم خوئی سے بہت گہرا اثر قبول کیا ہے۔ میں بات کر رہا تھا ان کی پہلی چٹ کی۔ دوسرے دن ان کی دوسری چٹ ملی جس میں وہ کام مکمل ہو جانے کی اطلاع اور ساتھ ہی شکریہ لکھا تھا۔ پی۔ ایس کے طور پر یہ فقرہ بھی کہ ان کارندوں کا شکریہ بھی ادا کر دیا جائے جنھوں نے اپنے ہاتھوں سے یہ کام کیا۔ یہ دوسری چٹ پا کر فخر سے میرا سر اونچا ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا کہ دیکھو کیا معیار ہے۔ استاد کی efficiency اور شائستگی کا۔ راشد صاحب کی یہ مستقل عادت تھی کہ جس سے جو سرکاری کام ہوتا اسے لکھ کر دیتے اور لکھ کر شکریہ ادا کرتے اور آ کر بھی۔ زبانی بھی۔ یہ باتیں کتابوں میں تو ملتی ہیں لیکن انسانوں میں شائد ہی نظر آتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر علوی صاحب نے اس ادارہ کو intellectualise کیا تو راشد صاحب نے humanise کیا۔ یہ دونوں پہلو اپنی اپنی جگہ اہم تھے جو ان دو بڑے استادوں نے کالج کو دیئے۔ ایک امتیاز جو صرف راشد صاحب کے حصہ میں آیا یہ ہے کہ انھوں نے کالج کے شہیدوں اور اعزاز یافتگان پر کتابیں لکھیں۔ اس سے کالج سے باہر کے لوگوں کو بھی معلوم ہوا کہ اکرم نشان حیدر، حق نواز کیانی ستارہ جرأت جیسے جاں باز ملٹری کالج کے سپوت ہیں۔ ان کتابوں سے کالج کے نام کو جو چار چاند لگے ہیں اس کا کچھ اندازہ مجھے یہاں آنے سے پہلے ہوا تھا۔ بریگیڈیئر رفیق پر ان کی کتاب ''کردار ساز'' نہ صرف کالج

کے لئے باعث عزت ہے کہ اس کردار کا آدمی کالج کا کمانڈانٹ رہ چکا ہے بلکہ اس سے فوج کی امیج کو تقویت ملی ہے۔تعلیم وتربیت کے حوالہ سے بھی اس کتاب کی اہمیت ہے۔اپنے کام سے لگن، یہ وہ قیمتی میراث ہے جوہم اولڈ بوائز کوان سے ملی ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقارراشد

(کالج نمبر2563،زمانہ تعلیم1960-1965ء)

مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہورہا ہے کہ میرے عہد کے بہت سے دوسرے اولڈ بوائز کی طرح میری زندگی میں بھی نفاست، ترتیب، تنظیم اور تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے کی awareness اور پھر urge راشد صاحب ہی کی نگاہ کیمیا کے اثر سے پیدا ہوئی۔

میں نے ان سے کلاس روم میں بھی پڑھا لیکن ان سے اصل استفادہ لیٹریری سرکل کی مجلسوں میں کیا۔ افسانہ نگاری کی کونپلیں وہیں پھوٹیں، کچھ انشائیے بھی لکھے۔اگر اسے تخلیقی چنگاری کہا جائے تو اب وہ راکھ ہو چکی ہے۔لیکن اسکو دہکایا راشد صاحب ہی نے تھا۔

راشد صاحب یوں تو اپنے بے شمار شاگردوں کو وہ مختصر لیکن خوبصورت خط لکھتے رہتے تھے جواب انکی پہچان بن چکے ہیں۔لیکن مجھے یہ امتیاز حاصل ہے کہ کم ازکم 1978ء سے میں ان کے خطوط کی فائل رکھ رہا ہوں۔ ہوا یوں کہ 1978ء کے اوائل میں مجھے خیال آیا کہ راشد صاحب کے خط سنبھال کر رکھنے چاہئیں شاید کبھی ضرورت پڑے۔کتنا اچھا خیال آیا۔گو دیر سے آیا۔

خطوں کے اقتباس نقل کرتا ہوں جن میں انکی شخصیت کا جلوہ دیکھا جاسکتا ہے۔میں نے کراچی سے انہیں پارکر پن کا سیٹ بھیجا تو جواب آیا۔

> ”17 جنوری کی صبح
>
> میاں ارشد
>
> قلم تمہارا بالکل ٹھپ، اس سے تو سات روپے کا یہ کن سن جس سے لکھ رہا ہوں بہتر ہے۔میں چاہتا تھا کہ قلم قلوپطرہ کی زبان کی طرح ہو، گر چلے تو رکے نہیں۔گھسنے کی ضرورت پیش نہ آئے، کچھ مزہ نہیں آیا۔پیسے تمہارے ڈوب گئے۔ویسے تمہاری نیت کا ثواب اپنی جگہ“۔

اپریل 79ء کا ایک خط

''میاں ذوالفقار

انشا جی کا مجموعہ کلام' اس بستی کے اک کوچہ میں' تم نے دیکھا ؟ اور یوسفی کی ''زرگزشت'' بھی پڑھنے کی چیز ہے۔لیکن اس سے پہلے ''چراغ تلے'' ضرور پڑھ لینا۔

''فلک پیماء'' کے بعد اتنا subtle humour اب دیکھنے میں آیا ہے۔

راشد

طبیعت نیم شگفتہ نیم اداس''

ایک خط میں مَیں نے اپنے خراب ہینڈ رائیٹنگ پر کچھ پریشانی کا اظہار کیا تھا۔اسکے جواب میں لکھا:

''جمعہ۔اپریل کی چودھویں صبح

میاں ارشد

Living With Leadership کے مسودہ کی دوخوبصورت کا پیاں ملیں۔ جی خوش ہو گیا۔سبحان اللہ! ایسے ہوتو ایسے ہو۔''خط'' کی چِنتا نہ کرو۔تمہارا خط جیسا بھی ہے اچھا ہے۔اسلئے کہ یہ تمہارا خط ہے۔خط سے self کا اظہار ہوتا ہے۔ جتنا بدلنا ہے ازخود بدل جائے گا۔تمہارے خط کے بگاڑ میں بھی ایک بناؤ ہے۔اسکی وضاحت Eric Burn کی کتاب Transcriptional Analysis میں ملے گی۔آخر مومن کا بھی تو شعر ہے''۔

نہ کچھ شوخی چلی باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

''گریباں چاک ہونے کی اپنی قیمت ہوتی ہے''۔

ایک بار میں نے خط نہ ملنے کا عذر کیا تو جواب آیا:

''میاں ذوالفقار

ڈاک کا انتظام اب اتنا خراب بھی نہیں ہے کہ واضح پتے پر ایک معتبر آدمی کو خط نہ ملے۔ بہرحال تمہاری مسلسل خاموشی نے مجھے بے چین کر رکھا ہے۔خدا کرے

سب خیریت ہو''۔

انہیں اپنے تمغہ بسالت کے بارے میں لکھا تو کچھ دنوں تک ان کا جواب نہ آنے پر میں نے گلہ کیا تو یہ خط موصول ہوا۔

''میاں ارشد

یہ ہوسکتا ہے کہ تمہارا خط آئے، وہ بھی اس نوعیت کا اور میں خاموش رہوں؟ میں نے اسی دن بلکہ اسی وقت تمہیں مبارکباد اور تہنیت کا خط لکھا تھا۔ میرے لئے تو یہ عید کا دن تھا۔ اس خط میں میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اس اعزاز کا پس منظر کیا ہے۔ یہ تمغہ کس امتیازی کارنامہ کی داد ہے۔ سبحان اللہ''۔

اپنے ایک خط میں انہوں نے 'تذکرہ شہداء' لکھنے کا رادہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے اختلاف کیا کہ اس میں رنگ آمیزی ہونے کا اندیشہ ہے۔ ان کا جواب آیا۔

''میاں ارشد

''تذکرہ شہدا'' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے صرف تذکرہ ہوگا اور وہ بھی کالج کے حاضر اور قدیم طلبہ کے لئے انسپائریشن اور کالج کی تاریخ کے ایک باب کے طور پر۔ کتنے دکھ کی بات ہے کہ کالج میں بھی ان شہیدوں کے بارے میں جن میں سے ایک نشان حیدر اور پانچ ستارہ جرأت ہیں، سوائے انکے ناموں کے کوئی ریکارڈ نہیں کہ یہ کون تھے؟ انہوں نے کیا کیا کارنامے انجام دئے۔ قومی ہیروز قومی pride کی علامت بن جاتے ہیں۔ مجھے ایک روز خواب میں القا ہوا تھا کہ یہ کتاب لکھوں۔ ان شہیدوں میں سے بیشتر میرے شاگرد ہیں۔ اگر میرا قلم میرے ان بچوں کے کام نہ آیا تو کس کام کا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ جوئے شیر میں نکال سکا تو کالج کی تاریخ میں ایک روشن باب کا اضافہ ہوگا۔ تم ان میں سے ایک دو جن کو بھی جانتے ہو انکے بارے میں اپنے مشاہدات لکھو۔ کار خیر ہے۔ نیتوں کا حال اللہ بہتر جانتا ہے۔ ان شہیدوں کو ناموری کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ان سے انسپائریشن لینے کی ضرورت ہے''۔

میرے تمغہ کے بارے میں انہوں نے اخبار میں پڑھا تو جواب میں لکھا۔

(قارئین نوٹ فرمائیں کس طرح ان کا پورا خاندان ایک سابق طالب علم کے ساتھ involved تھا۔)

''میاں ارشد

اخبار میں تمہارے تمغہ پانے کا ذکر تھا۔ میں نے، آنٹی نے، بچوں نے، سب نے باری باری پڑھا اور خوش ہوئے۔ ایک بار پھر مبارکباد! ایسے ہو، تو ایسے ہو! I'm proud of you میرا جنوں فارغ نہیں بیٹھا۔ الحمداللہ کہ 'تذکرہ شہدا' کا مسودہ پائیہ تکمیل کو پہنچا۔ حق نواز کیانی شہید، اور میجر اکرم نشان حیدر پر اتنا مواد جمع ہو گیا ہے کہ سوچ رہا ہوں کہ تھوڑی سی اور کاوش کر کے ان پر علیحدہ کتابیں ہی مرتب کر ڈالوں۔ زندگی کسی کام تو آئے۔ سر سید نے کہا تھا کہ روز حشر خدا پوچھے گا کہ دنیا میں کیا کیا، تو عرض کروں گا حالی سے مسدس لکھوائی تھی۔ میری جھولی میں تو یہی 'تذکرہ شہدا' ہے۔ میں اسی کو پیش کرونگا اور سنو چند دنوں سے ایک اور خیال بھی بار بار آ رہا ہے کہ کیا اچھا ہو کہ کالج کے 32/30 جرأت کے ستاروں پر بھی کچھ کام ہو جائے۔ ایک نام بھی ذہن میں آیا ہے۔ ''جرأتوں کے نشاں'' دعا کرو کہ اللہ جل شانہ اس کام کو بھی میرے ہاتھ سے کروا دے۔''

کچھ عرصے کے بعد میں نے ''جراتوں کے نشاں'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے لکھا:

''جولائی 79 کی ساتویں صبح

میاں ارشد

کتاب ابھی کہاں، یہ کام تو توقع سے بہت زیادہ مشکل نکلا۔ جن کے نام ہیں وہ بھی بے نیازی سے کام لے رہے ہیں۔ ہمارے یہاں تحقیق اور تاریخ کا ذوق نہیں۔ اہم شخصیتوں کے مطالعہ کا رواج نہیں۔ بہر حال تنکا تنکا جمع کر رہا ہوں اور یہ تنکے بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ ''تذکرہ شہدا'' کی طرح یہاں بھی میری کوشش یہی ہے کہ نام سے زیادہ کام کو ابھارا جائے۔ انشاء اللہ یہ کتاب بھی value orientated ہو گی۔ جرأت کے ستاروں کی پرداخت و پرورش میں والدین اور استادوں کا جو رول تھا اسکو ہائی لائٹ کرنا ہے۔''

20 دسمبر 79ء کے خط میں لکھتے ہیں:

''میں یک طرفہ تعلقات کا بھی قائل ہوں۔ اگر تمہارا خط نہ آتا اور مجھے یہ یقین ہوتا کہ میرا خط تمہیں مل جاتا ہے تو میں مستقل طور پر لکھتا رہتا۔ کالج کے شہیدوں اور غازیوں کے بعد ایک کتاب قائدِ اعظم پر ان کے کردار کے حوالے سے ''گفتار و کردار قائداعظم'' کے نام سے ترتیب دینا شروع کی ہے۔تم نے ایک بار لکھا تھا کہ اب کالج سے باہر بھی نکلئے۔ یہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ساتھ ہی اقبال پر ایک پاپولر کتاب ''مکالمات اقبال'' پر بھی کام شروع کر دیا ہے۔اس میں اقبال کی زندگی اور افکار کا تعارف انکے ملفوظات کے ذریعے سے ہوگا۔قائدِ اعظم اور اقبال پر دلچسپ اور مستند تعارفی کتابوں کی ضرورت بھی ہے۔ انشاءاللہ یہ کتابیں اس ضرورت کو پورا کریں گی۔''

اگست 82ء میں وہ ''کردار ساز'' اور کالج کی ہسٹری کے لئے مواد جمع کرنے کراچی گئے تھے۔ واپس آ کر لکھا۔

''کراچی میں جس والہانہ انداز سے میری پذیرائی ہوئی ۔جس بے پناہ خلوص و ارادات سے لوگ ملے، جو عزتیں دیں،اس نے مجھے اپنے کام میں اور سنجیدہ کر دیا ہے۔ ہر محبت ، ہر ارادت ایک چیلنج بھی ہوتی ہے۔ ہر انعام کو ایک آزمائش بھی سمجھنا چاہیے۔اب کسی طرح میں اس کام سے سرخ رو ہو سکوں تو بات بنے''۔

83ء سے آنٹی علیل تھیں اور سی۔ایم۔ایچ راولپنڈی میں زیرِ علاج۔

فروری 84ء میں انہوں نے لکھا ''تیس برس ان کی محبت اور خدمت کی چھاؤں میں گزارے،اب یہ آزمائش بھی اللہ کی طرف سے ہے۔گلہ کرتے شرم آتی ہے۔ دعا کرو کہ اس شب کی جلد سحر ہو۔ میں تمہارے معذور بھائی کے لئے بھی دعا کرتا رہتا ہوں۔ اللہ تعالٰی کرم فرمائے۔''

یکم ستمبر 84ء کو لکھا:

''ارشد

اسی طرح منجدھار میں ہوں میرے لئے دعا کریں۔ روحی dialysis پر زندہ ہیں۔ میرے معبود! کرم کر!''

مئی 85ء میں آنٹی کا انتقال ہوا۔ جون میں مجھے اطلاع ہوئی تو میرے تعزیت نامے کا جواب آیا۔''

''ارشد!

تنہا رہ گیا ہوں، دھوپ میں!''

لیکن اس دھوپ میں بھی انہوں نے اپنا تخلیقی سفر جاری رکھا۔''کردار ساز' اسی زمانہ میں شائع ہوئی اور 'داستان علم وعمل' کی تدوین کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔اللہ اکبر!

محمد وجاہت اللہ

(کالج نمبر 2571، زمانہ تعلیم 1965-1960ء)

راشد صاحب سے میرا پہلا واسطہ 1960ء میں پڑا۔ جب وہ ہماری آٹھویں اے کو اردو پڑھانے آئے تھے۔وہ تیسرا گھنٹہ شروع ہونے سے دو منٹ پہلے باہر برآمدہ میں آکر کھڑے ہو گئے تھے۔دوسروں کی طرح گردن نکال کر میں بھی دیکھ رہا تھا کہ دیکھیں اردو کے یہ نئے استاد کیسے ہیں۔میں چونکہ دروازے کے قریب بیٹھا تھا اس لئے میں انہیں تفصیل سے دیکھ سکتا تھا۔بے حد دبلے، ستا ہوا چہرہ، سانولا رنگ، بہت موٹے شیشوں کی عینک، چہرہ پر پر اسرار سنجیدگی۔ سچی بات یہ ہے کہ پہلی نظر میں انھوں نے مجھے قطعاً متاثر نہیں کیا۔اس زمانہ میں دستور تھا کہ پیریڈ شروع ہونے پر کلاس کمانڈر آگے آکر کلاس اسٹینڈ اپ کہتا تھا۔ جس پر ساری کلاس کھڑی ہو جاتی۔کلاس کمانڈر رپورٹ دیتا۔پھر استاد ہاتھ کے اشارہ سے یا زبانی بیٹھنے کو کہتا۔راشد صاحب کے اندر آنے پر یہی عمل دہرایا گیا۔پہلی غیر معمولی بات تو یہ ہوئی کہ انھوں نے ہاتھ کے اشارہ سے قائداعظم کے اسٹائل میں پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور رپورٹ کے بعد بہت ہی اپنائیت سے''تشریف رکھیئے'' کہا ہم ایک رسمی اور کسی حد تک کرخت سٹ ڈاؤن سے واقف تھے۔تشریف رکھئے وہ بھی اس لب ولہجہ میں ہمارے لئے نئی چیز تھی۔اس لمحہ میرا ان کی اندرونی شخصیت سے تعارف شروع ہوا۔ جس میں اگلے پانچ سال میں ہر روز کسی نہ کسی نئے پہلو کا اضافہ ہوتا رہا۔اس سے پہلے کہ میں ان کی دوسری خصوصیات کا ذکر کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ 18 اگست 1960ء کے اس پہلے تعارف کی روداد مکمل کروں۔تشریف رکھیئے کہنے کے بعد انھوں نے پہلے بے تکلفی سے اپنا تعارف کرایا۔میرا نام سعید راشد ہے۔ میں آپ کو اردو پڑھاؤں گا اور اس حوالے سے درس زندگی بھی دونگا۔ پھر انھوں نے دروازوں کھڑکیوں کے اسٹاپ لگوائے،انگیٹھی پر رکھے نوٹس بورڈ کے رخ کو خود جا کر درست کیا۔دروازہ کے پاس کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔اسے اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں ڈالا۔کلاس روم میں گھوم پھر کر ڈیسکوں کی قطاریں ٹھیک کروائیں۔ڈیسکوں کی ترتیب ایک پیٹرن کے مطابق کی یعنی ایک لائن میں پہلے دو دو پھر تین تین آخر میں پھر دو دو، اس طرح ڈیسک سیٹ کرانے کے بعد چاک کا ایک بہت ہی چھوٹا ٹکڑا اٹھا کر بورڈ پر

postures کا لفظ لکھا اور کہا آج میں آپ کو بیٹھنے، کھڑے ہونے، چلنے کے پوسچرز بتاتا ہوں۔انھوں نے ایک ڈیسک کرسی آگے کھنچوا کر عملی طور پر خود بیٹھ کر بتایا کہ بیٹھنے کے صحیح اور غلط پوسچرز کیا ہوتے ہیں۔ کرسی ڈیسک سے چار انچ کے فاصلہ پر رکھ کر سننے کے لئے پلس پوزیشن، کرسی ڈیسک سے بالکل ملا کر پڑھنے کی زیرو پوزیشن اور کرسی 3انچ اندر کر کے لکھنے کی مائنس پوزیشن اور ہر تین صورتوں میں پیٹھ کرسی کی بیک سے لگا کر سیدھا اپ رائٹ بیٹھنے کی ہدایت کی۔اسی طرح چلنے اور کھڑے ہونے کے صحیح اور غلط پوسچرز دکھائے۔آخر میں بستر پر لیٹنے کے صحیح اور غلط پوسچرز کے سلسلہ میں جب انھوں نے کلوز نائف پوسچر جس میں گھٹنے پیٹ سے لگ جاتے ہیں کر کے دکھایا تو کئی لڑکوں کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔لیکن وہ پوری سنجیدگی سے غلط اور صحیح پوسچرز کرتے رہے۔بیچ بیچ میں سٹ اپ رائٹ کی آواز بھی آتی رہی۔پھر انھوں نے یہ تینوں پوسچرز نوٹ کر لینے کو کہا۔اس تمام کارروائی میں تقریباً گھنٹہ ہو گیا۔وہ کسی نکتہ کی وضاحت کر رہے تھے کہ گھنٹی بجی۔ انھوں نے وہ جملہ بلکہ وہ لفظ ادھورا چھوڑا۔ لڑکے تعظیماً دوبارہ کھڑے ہوئے۔انھوں نے تھینک یو جنٹلمین کہا۔اور فوراً رخصت ہو گئے۔اس لمحہ جس تعلق کی ابتدا ہوئی وہ آج تک قائم ہے اور جوں جوں زندگی کے تجربے میں گہرائی آتی جاتی ہے انکے طرز تربیت اور رویوں کی قدر بڑھتی جاتی ہے۔ان کے طرز تدریس کے بارے میں صرف اتنا کہوں گا کہ وہ اس سطح پر جا کر پڑھاتے تھے کہ جس کا ادراک ہم میں سے بہتوں کی سمجھ سے باہر ہوتا۔بس مبہم سا یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ شعر میں یا مضمون میں اسکے لفظی معنوں یا خلاصہ سے بھی آگے بہت کچھ ہوتا ہے۔ایک بار انھوں نے مختلف پوسچرز کی نفسیات بتائی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ انھوں نے کہا کلوز نائف پوسچر ہے جس طرح بچہ ماں کے womb میں ہوتا ہے۔یہ پروسیجر وہ لوگ اپناتے ہیں جو خود کو insecure سمجھتے ہیں اور ماں کی آغوش کا سکون چاہتے ہیں۔ یہ نکتہ آفرینی مجھے عجب معلوم ہوئی تھی۔ بہر حال انکے پڑھانے کے اسلوب سے اس وقت بھی اتنا احساس ضرور ہو گیا تھا کہ علم بہت وسیع اور گہرا سمندر ہے۔دسویں اے میں مجھے ان سے اردو پڑھنے کا موقع ملا۔اردو کی کتاب میں ایک افسانہ (غالباً غلام عباس کا)' اوورکوٹ' تھا۔انھوں نے اس کی علامتی حیثیت کو بڑی تفصیل سے واضح کیا۔ یہ باریکیاں اس وقت دُور از کار معلوم ہوتی تھیں۔(چونکہ امتحان میں اس کا صرف خلاصہ آتا تھا) لیکن آج جب میں ملمع کاری، ریاکاری اور خود فریبی اور جہاں فریبی کا کوئی مظاہرہ دیکھتا ہوں تو میں کہا کرتا ہوں کہ یہ اسکا اوورکوٹ ہے۔لوگ پوچھتے ہیں کیا مطلب؟ تو پھر میں انہیں بتاتا ہوں کہ یہ علامت کہاں سے اور کب سے میرے ذہن میں پڑی ہے۔

ایک اور وصف جس میں انہیں ممتاز پایا یہ تھا کہ وہ ہر لڑکے کی انفرادیت (individuality) کا

احترام کرتے تھے۔ملٹری کالج ایسے پبلک اسکول طرز کےاداروں میں انفرادیت کوملحوظ رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ (اس لئے پبلک سکولوں میں انفرادیت کے حامل لڑکے خوش نہیں رہتے) لیکن راشد صاحب نہ صرف لڑکوں کی انفرادی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے بلکہ اپنی انفرادیت اور talent کی تلاش میں عام لڑکوں کی مدد کرتے۔انھوں نےلڑکوں کی respect کرکے جیسے''تشریف رکھئے''۔''تھینک یو جنٹلمین'' سے کیڈٹس کو خود اپنی تعظیم کرنے کی طرف لاشعوری طور پر مائل کیا۔ مجھے اس زمانہ میں انگریزی پڑھنے اور لکھنے کا شوق تھا۔راشد صاحب نے بڑے انہماک سے میری حوصلہ افزائی کی اور اس شوق کو پروان چڑھایا۔صرف میں ہی نہیں وہ ہرلڑکےکوجوان کے پاس کوئی مسئلہ لےکرجاتا تھایا کسی معاملہ میں رہنمائی چاہتا تھاوہ اسے اپنی مکمل توجہ دیتے تھے۔جس طرح ماں اپنے ہر بچہ کواپنی مکمل توجہ دیتی ہے۔اس احساس سے کہ کسی پر مکمل اعتماد کیاجاسکتاہے بہت بڑے تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔

اس وقت جوحضرت مسند اقتدار پر تھےان کی صورت یہ تھی کہ ناوک نے تیر نہ چھوڑا زمانہ میں۔انکی زد میں علوی صاحب، ایوب صاحب دوسرے اساتذہ کی طرح راشد صاحب بھی تھے۔لیکن اشارتہً یا کنایتہً انھوں نے اپنی پریشانیوں کا تذکرہ کلاس میں یا کلاس سے باہر نہیں کیا۔ بلکہ ہمیں کبھی اندازہ ہی نہیں ہوا کہ ان کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند اقتدار کی کرسی کے غیر ذمہ دارانہ اور erratic رویہ کی وجہ سے strain کا شکار رہے۔اس کے باوجود ان کا پرجوش (enthusiastic) اور پر امید (optimistic) انداز اسی طرح باقی رہا جس طرح آئیڈیل صورت حال میں ہوتا۔ یہ بھی بعد میں پتہ چلا کہ اپنی تمام قابلیتوں کے باوجود ان کا ملازمتی منصب صرف جونیئر ماسٹر کا تھا لیکن اس بے نیازی سے جان مار رہے تھے جیسے یہ مادی باتیں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتیں۔ جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں، یہ باتیں ناقابل یقین لگتی ہیں۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ انھوں نے ایک بار کلاس میں رشید احمد صدیقی کا قول نقل کیا تھا کہ انسان مال ہی میں نہیں کھال میں بھی مست رہ سکتا ہے۔انکو دیکھ کر اس قول کی صداقت پر یقین آتا تھا۔کھال میں مست رہنے کے لئے جذبہ ہی نہیں جنون چاہیے۔ خدمت کرنے کا یہ جنون ان میں تھا۔انھوں نے پڑھایا بھی بہت اچھا لیکن اس سے بڑھ کر اور بہت بڑھ کر ان کا اعزاز اور امتیاز یہ ہے کہ ان کے شاگرد آج بھی اپنی زندگی میں، اپنے شب و روز میں، اپنی سوچوں میں اور اپنے رویوں میں ان کو اپنے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔

آخر میں، میں ایک اور واقعہ بھی لکھنا چاہوں گا جوشاید کسی اور نے نہ لکھا ہو۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سنجیدہ صورت اور سنجیدہ مزاج انسان حسن ظرافت سے خالی نہ تھا۔ ہوا یہ کہ وہ دسویں (بی) میں انگریزی اور

دسویں (اے) یعنی ہماری کلاس کو اردو پڑھاتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دو دن ان کے پیریڈوں کی ترتیب یہ تھی کہ انگریزی کا تیسرا گھنٹہ (بی) میں لے کر فوراً ہمارے ہاں (اے) میں اردو کا پیریڈ لیتے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ اردو کی کتاب کھول کر انگریزی میں شروع ہو گئے۔ دو ایک منٹ کے بعد مسکرائے، ساری جنٹلمین کہا۔ ٹھیک اس وقت میرے منہ سے نکل پڑا ''سر، غلط سوئچ آن ہو گیا''۔ مزے کی بات یہ کہ ان کے منہ سے پھر نکلا yes, you are right اور پھر ''ساری'' کہا۔ لیکن میرے فقرہ پر خوش بہت ہوئے۔ برجستہ فقرہ کی داد دی اور سبق روک کر مزاح کی قسموں، بذلہ سنجی، طنز کی مثالیں غالب، اقبال اور رشید احمد صدیقی سے دیں۔ وضاحت کی کہ فنی اعتبار سے مزاح تین طرح پیدا کیا جاتا ہے۔ مضحکہ خیز صورت حال سے جیسے کوئی بارش میں بھیگتا جا رہا ہو اور چھتری بغل میں دبی ہو یا جیسے کسی بہت طویل القامت شوہر کے ساتھ اس کی بہت چھوٹے قد کی گول مٹول بیوی لڑھکتی جا رہی ہو۔ یوں جیسے 10 کا ہندسہ حرکت میں آ گیا ہو۔ دوسری قسم کا مزاح لفظوں کی الٹ پھیر سے پیدا کیا جاتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے اس کی مثال رشید صدیقی کے ایک مضمون 'کارواں' سے دی تھی کہ ایک بار علی گڑھ یونیورسٹی کے ڈاکٹر بٹ صاحب نے اپنی نو تعمیر شدہ کوٹھی کا نام تجویز کرنے کی فرمائش کی تو رشید صاحب نے فرمایا۔ ''بٹ صاحب آپ کے گھر کا نام تو بنا بنایا ہے۔ آپ فی الحال بٹ کدہ رکھ دیجئے۔ کچھ دنوں میں از خود بتکدہ ہو جائے گا''۔ راشد صاحب نے کہا یہ لفظی اور ذہنی مزاح اور طنز کی مثال ہے۔

''ذہنی کس طرح''

طنز اس میں یہ بھی ہے کہ بٹ صاحب کی قبول صورت بیٹیاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ رشید صاحب کے فقرہ میں یہی طنز ہے جس کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ یہ ذہنی مزاح ہے۔ بحث ختم ہوئی تو اس روز کے سبق میں جواب شکوہ کا یہ بند

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے، رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں
جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

شروع ہوا۔ یہ بھی مجھے اس لئے یاد رہ گیا ہے کہ انھوں نے تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ کے بارے میں کہا تھا کہ اسے ''کئی'' چند کے معنوں میں نہ پڑھا جائے۔ یہ قدیم ایران کے مشہور شاہی خاندان ''کے'' کی نسبت سے شان کئی ہے۔ معروف ایرانی بادشاہ خسرو اسی خاندان سے تھا۔ اس لئے کیخسرو کہلایا۔ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ پہلی نظر میں انھوں نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ لیکن جس لمحہ سے ان کی شخصیت سامنے آئی وہ میرے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں۔

ہارون رشید

(کالج نمبر 2581، زمانہ تعلیم 1965-1960ء)

لکھنا تو مجھے راشد صاحب پر ہے لیکن اس سے پہلے میں دو ایسے چراغوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو یہاں ملٹری کالج میں تو نہیں کہیں اور روشن تھے لیکن تھے چراغ ہی۔ دل نہیں مانتا کہ ان کو یاد کئے بغیر آگے بڑھوں۔ کسی کو یاد کرنا اصل میں تجدید وفا کی ایک صورت ہے۔

پہلی جماعت میں ایک استاد حنیف جان خاں تھے۔ بظاہر بڑے تند خو، لیکن اندر سے دل دردمند رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھے گلی میں روتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کیا ہوا۔ میں نے بتایا اس صورت شکل کا نوجون سائیکل سے ٹکر مار کر گیا ہے۔ انہوں نے فوراً اسکول کے سینئر لڑکوں سے تمام علاقے کی ناکہ بندی کرائی۔ اور اس شوریدہ سر نوجوان کو بمع سائیکل پکڑ والیا اور میرے سامنے اسکی اتنی ٹھکائی کروائی کہ مجھے بھی ترس آ گیا۔ بہرحال مجھے اس تجربہ سے سبق یہ ملا کہ استاد صرف سبق ہی نہیں پڑھاتا شاگرد کے ہر دکھ کا مداوا بھی اسکی ذمہ داری ہوتی ہے۔

اسلامیہ ہائی اسکول گجرات کے بٹ صاحب کو بھی میں اولیں چراغوں میں شمار کرتا ہوں۔ 1957ء میں ملٹری کالج میں داخلہ کی تیاری کے واسطے میرے لئے ایک ٹیوٹر کی تلاش شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ تریاق بٹ صاحب کے پاس ہے۔ بمشکل وہ ''بیٹھکی'' (ٹیوشن) پڑھانے کے لئے راضی ہوئے۔ عالم یہ تھا کہ اپنے کمرہ میں اسٹوو پر آلو کی بھجیا بگھارے جاتے اور سوال حل کراتے جاتے۔ وہاں کام کا حساب تھا وقت کا حساب نہ تھا۔ اس طرح گھنٹے لگ جاتے میں دل میں ڈرا کہ اسطرح تو ماسٹر صاحب کئی سو لیں گے۔ بہرحال جب ایک ماہ گزر گیا تو والد صاحب نے ایک لفافے میں پچاس روپے دیئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے وہ لفافہ بٹ صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے کھول کے دیکھا اور اسی لفافے میں 47 روپے واپس کر دئے اور کہا ''بیٹا میری فیس تین روپے ہے جو میں دوسرے بچوں سے لیتا ہوں۔ وہ ہی تم سے لوں گا۔ اور

ہاں کام پورا کر کے آنا۔ ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا''۔ایسے چراغ کو سلام کئے بغیر کیسے آگے بڑھوں؟

اب میں ملٹری کالج کی طرف آتا ہوں۔ یہاں راشد صاحب اور علوی صاحب کی حیثیت میرے مائی باپ کی تھی۔علوی صاحب کے بارے میں 'علوی نامہ' میں سمندر میں سے قطرہ بھر لکھ چکا ہوں۔ یوں تو کالج میں اک آدھ کو چھوڑ کر سب ہی اساتذہ نے میری ذہنی سرکشی کو برداشت کیا لیکن راشد صاحب نے اسکا احترام کیا اور بڑی ماہرانہ چابکدستی سے جس طرح چغتائی کی تصویروں میں باریک لکیریں ہوتی ہیں۔انہوں نے اسی باریک بینی سے میری جنوں خیزیوں کو راہ پر لگانے کی کوشش کی۔ یہ مرشد بھی پہنچے ہوئے تھے۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ مئے خوار دیکھ کر

کے مصداق انہوں نے ایک روز مجھے ہدایت کی۔

''ہارون، کبھی کبھار ایک آدھ گالی بھی دے لیا کرو''

جی ہاں۔ یہ حکم مجھے ملا۔ آپ متعجب نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ راشد صاحب زندگی کی انتہائی نازک نفسیاتی باریکیوں سے واقف اپنی ذات میں انجمن ایک ایسے شخص تھے جنکے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا دل سوچنے کی اور دماغ دھڑکنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتا تھا۔ ان کا حکم میں بجا بھی لایا۔ دوسرے دن صبح سویرے سویرے پی ٹی کے وقت بلاوجہ مشتاق خٹک سے الجھ پڑا اور اسے گالی دے ڈالی۔ وہ غریب سکتہ میں آ گیا۔اس روز کی حیرت افزا خبر یہ تھی سنو۔سنو۔آج ہارون نے گالی دی ہے۔(زور کس پر ہوا۔ہارون پر)

راشد صاحب نے اس تعلیمی ادارہ میں میرے پانچ برس قیام کے دوران پنجسالہ منصوبہ بندی کے تحت میری نوک پلک درست کی۔ مجھے اپنا مدعا بیان کرنا سکھایا۔میری ذہنی پرورش کی اور جب دیکھا کہ میرے پر ذرا مضبوط ہو گئے ہیں تو مجھے بڑے اعتماد سے اپنے مرشد علوی صاحب کے حوالے کر دیا۔ یہ کام بھی راشد صاحب ہی کر سکتے تھے ورنہ اپنے مرید کو کون کسی اور کے حوالے کرتا ہے۔

جب کالج سے جانے لگا اور اپنی آٹوگراف راشد صاحب کے سامنے پیش کی انہوں نے صرف دو لفظ لکھے:

''خوش رہو''۔

یہ ان کے اندر کی ماں کی آواز تھی۔غالباً ان کے لاشعوری اندیشوں نے پیش بندی کی تھی۔

ونگ کمانڈر ارشدنواز

(کالج نمبر 2589، زمانہ تعلیم 1960-1965ء)

استاد شاگرد کا رشتہ تو سنتے آئے تھے۔ استاد اور شاگردوں کے والدین کے رشتے کی روایت راشد صاحب نے قائم کی۔ میں نے راشد صاحب سے جو استفادہ کیا وہ تو کیا ہی، میرے والد صاحب بھی اسی زمانے سے انہیں جانتے تھے۔ جب 70ء میں میرا بھائی راشد نواز کالج میں داخل ہوا تو شروع میں اسکے ایڈجسٹمنٹ کے کچھ مسائل تھے۔ اس سلسلہ میں میرے والد کئی بار ان سے ملے اور ہر بار مطمئن لوٹے۔ آخرکار انہوں نے گھر میں اعلان کر دیا کہ راشد صاحب کے ہاؤس ماسٹر ہوتے ہوئے ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جس طرح راشد نواز کو سنبھال رہے ہیں اس سے بہتر پرداخت تو ہم والدین بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ عرصے کے بعد میرے بھائی شہباز محمود جو ریڈیو پاکستان میں انجینئر ہیں راشد صاحب سے مل کر آئے تو والد صاحب سے بھی زیادہ مطمئن تھے۔ جس طرح راشد صاحب نے انکی پذیرائی کی تھی وہ اس سے خاص طور سے impress تھے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں لوگ اپنے گھر والوں یا زیادہ سے زیادہ اپنے خاندان والوں کے سوا کسی کی پرواہ نہیں کرتے کسی کا استاد شاگرد کے رشتہ کو اتنا پھیلا دینا ایک خوشگوار حیرت کا باعث ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل حامد محمد علی

(کالج نمبر 2606، زمانہ تعلیم 1961-1965ء)

میں جب 1961ء میں نویں میں داخل ہوا تو سرسید کے خاندان سے ہونے کے باوجود میری اردو میں نالائقی کا یہ عالم تھا کہ اپنا نام بھی انگریزی کی طرح بائیں طرف سے لکھتا تھا۔ معیاری اردو تو کیا آسان اردو میں پاس ہونے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پہلا امتحان ہوا تو سو میں سے دو نمبر آئے۔ یہ دو بھی غالباً کسی غلطی سے دے دیئے گئے ہوں گے۔ گرتے کو اٹھانا راشد صاحب کی ہابی تھی۔ انھوں نے ہمیں پڑھانے کی بھی حامی بھری اور اپنے وقت میں ہم سے مغز ماری کرنے لگے۔ اس کلاس میں شاہد احمد خان، سجاد نور، شوکت نذیر سب مجھ سے بدرجہا بہتر تھے۔ اس لئے انکی توجہ کا زیادہ حصہ میرے حصہ میں آیا اور انہوں نے جیسے تیسے مجھے اس قابل کر دیا کہ میٹرک میں اردو کلیر کر سکا۔

آصف امام
(کالج نمبر 2624،زمانہ تعلیم 1966-1961ء)

مجھے نہیں معلوم کہ کسی اور نے راشد صاحب کے خط لکھنے کے اسٹائل کے بارے میں لکھا ہے یا نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ ہر خط کا فوری جواب دیتے۔ دوسرے یہ کہ خط مختصر ہوتا لیکن بے حد پرسنل، اپنائیت سے بھرپور مثلاً

میاں آصف امام،
خدا تمھیں خوش رکھے
نئے سال کا تہنیت نامہ ملا، ممنون ہوں۔ خدا تمہاری مرادیں برلائے۔
بچوں کو شادابی کی دعائیں۔

راشد

خطوط کے علاوہ ان کی دوسری تحریریں حتیٰ کہ انگریزی کی کتابیں بھی ایسی ہیں جیسے وہ سامنے بیٹھے سنجیدہ بے تکلفی سے باتیں کر رہے ہوں۔ ایک بار پڑھاتے ہوئے انھوں نے شیکسپئر کا ایک فقرہ Milk of human kindness کوٹ کیا تھا۔ آج جبکہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو خود ان کے لئے بار بار یہ فقرہ میرے ذہن میں آ رہا ہے۔

راشدی صاحب کی حیثیت ہمارے گھر میں ایک خاندانی بزرگ کی سی ہے۔ بچوں کی تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں تو ان کا نام اور حوالہ مسلسل آتا رہتا ہے۔ جیتے جی legend بن جانا کسی کسی کے حصہ میں آتا ہے۔ ہمارے راشد صاحب نے یہ مقام چالیس برس کی ریاضت کے بعد اپنی زندگی میں ہی حاصل کر لیا تھا۔ ایک اور بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں (شاید کسی اور نے بھی کہی ہو) کہ راشد صاحب کی شخصیت کے حوالے اور طرز تربیت سے ان کے بے شمار شاگردوں کو اچھا شوہر اور اچھا باپ بننے کی راہنمائی بھی ملی ...... بڑی بات ہے!

God bless him.

میجر شیخ حسین
(کالج نمبر 2639،زمانہ تعلیم 1966-1961ء)

میرا تعلق چونکہ ایسٹ پاکستان سے تھا۔ اس لئے گرمیوں کی لمبی تعطیل کے سوا میں دوسری چھٹیاں کالج ہی میں گزارتا تھا۔ اسی طرح 1962ء کی عید کی چھٹیاں بھی کالج میں گزار رہا تھا۔ ہر چند کہ میں راشد صاحب

کے ہاؤس میں نہیں تھا۔صرف کلاس میں پڑھتا تھا،انھوں نے عید کی شام کو کھانے کی دعوت دی۔دو ایک اور بنگالی لڑکوں جیسے شمس الحق مولا ،نسیم الحق کو بھی انھوں نے بلایا ہوا تھا۔میں نے کہا ''تھینک یوسر''،لیکن انداز ایسا تھا جیسے میں نہیں آسکوں گا۔انھوں نے فرمایا ''تھینک یوسر کا تو مطلب ہے کہ تم آ ؤ گے،دعوت تم نے قبول کر لی ہے''۔میں نے عرض کیا ''سر،میرا مطلب ہے میں نہیں آسکوں گا۔صرف بلانے کی عزت افزائی کا شکریہ ادا کرر ہاہوں''۔بولے ''تو اس صورت میں نو تھینک یوسر! کہو''

میرا نام ایسا ہے کہ جس سے بعض لوگوں کو میرے فقہی مسلک کے بارے میں شبہ ہو جاتا ہے۔جب لوگ مجھ سے اس بارے میں دوٹوک سوال کرتے ہیں تو میں الجھن میں پڑ جاتا ہوں کہ ہاں یا نہ جواب سے فقہ جعفریہ یا کسی دوسرے فقہ کے فرقہ کو تکلیف نہ ہو۔بہر حال اس مسئلہ کو راشد صاحب نے کیسے حل کیا وہ لکھتا ہوں۔بالکل شروع کی بات ہے کہ مجھ سے پوچھا کہ تمہارے کسی بھائی کا نام شیخ حسن بھی ہے۔میں نے کہا نہیں،پھر خود ہی بولے میرا خیال تھا تمہارے بڑے بھائی کا نام شیخ ابراہیم ہے۔تمہارا شیخ حسین تو شاید کوئی شیخ حسن بھی ہو۔اچھا نام ہے۔یوں بات بنائی۔زندگی کی نفاستیں اور نزاکتیں راشد صاحب سے سیکھنے کی تھیں۔

میجر شمیم احمد خان

(کالج نمبر 2679،زمانہ تعلیم 1967-1962ء)

یہ واقعہ 1966ء کا ہے۔ہم شیر شاہ ہاؤس میں انٹر کے امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔راشد صاحب کہتے امتحان کے ساتھ ساتھ آئی ایس ایس بی کی تیاری بھی کرو اور تقریباً زبردستی ہم سے تقریریں کرواتے۔ڈارم نمبر پانچ میں تین ٹرنک اوپر تلے رکھ کر ان پر سفید چادر ڈال دی جاتی گویا یہ روسٹرم تھا۔کرسیوں کی جگہ بیڈ لگا دیئے جاتے۔ہم ہی میں سے باری باری وائس پریذیڈنٹ اور سیکرٹری چنے جاتے۔راشد صاحب خود کرنٹ افیئر ز پر لیکچر دیتے۔

میجر محمد فاروق

(کالج نمبر 2707،زمانہ تعلیم 1967-1963ء)

ایک بار ہم اورنگ زیب ہاؤس کے چندلڑ کے چھٹی سے واپس آتے ہوئے شیر شاہ ہاؤس سے گزر رہے تھے۔راشد صاحب حسب عادت ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں کھڑے کوئی کام کرا رہے تھے۔انھوں نے ہمارا بڑے شوق سے خیر مقدم کیا۔ہم میں سے ایک نے ہینڈ شیک کو شاید ایک رسمی سی بات سمجھ کر بے دلی سے

ڈھیلے ڈھالے انداز سے ہاتھ ملایا۔انھوں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ہم سب کو مخاطب کرتے ہوئے ایک چھوٹا سا لیکچر دیا۔فرمایا جس طرح سلام کرنے اور سلام لینے کے انداز میں انسان کی پوری شخصیت ہوتی ہے اس سے زیادہ ہاتھ ملانے کے انداز سے اس کا رویہ، اس کے دل کی گرمی، اس کی نفسیاتی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ بریلی کالج میں میرے ایک استاد تھے مسٹر جوہری۔ میں ان کے سلام قبول کرنے کے انداز کو نہیں بھول سکتا۔ جب ہم آداب عرض کرتے وہ اس بھرپور انداز میں ہاتھ اٹھا کر جواب دیتے اور ان کے چہرے پر ایسی روشن مسکراہٹ نمودار ہوتی کہ دل خوش ہو جاتا۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے دل میں بھی شفقت کی چاندنی کھلی تھی۔اب ان کی پڑھائی ہوئی کتاب کا نام تک یاد نہیں لیکن ان کی شخصیت کا حسن جو انکے سلام کرنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا، دل پر نقش ہے اور اس حوالے سے میں انھیں اکثر یاد کرتا ہوں۔ جب آپ کسی سے ملیں تو آپ لوگ دل میں گرمی پیدا کریں، تا کہ ہاتھوں میں بھی گرمی آئے۔ماہرین نفسیات تو یہ کہتے ہیں کہ ہاتھ کے لمس میں سارا attitude ہوتا ہے، کہ دوسرا آپ کو کیا سمجھتا ہے اور اسکے دل میں آپ کے لئے کتنی جگہ ہے۔آنکھوں کی زبان تو مشہور ہے ہی، ہاتھوں کی زبان بھی ہوتی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انھوں نے اس ضمن میں A.H. Chapman MD کی کتاب Put Offs and Come Ons کا ذکر بھی کیا تھا۔

اظہر حسین

(کالج نمبر 2752، زمانہ تعلیم 1968-1963ء)

میرا بچپن پوٹھوار کے علاقہ میں ایک دور افتادہ گاؤں میں گزرا ہے۔جس کی پہچان اور شان تالاب کے کنارے برگد کا ایک پرانا درخت تھا۔جس کی مضبوط پھیلتی ہوئی شاخوں پر ہم اچھلتے کودتے اور پانی میں چھلانگیں لگاتے تھے۔جس کے گھنے سائے میں گاؤں کے بڑے اپنی بیٹھک لگاتے تھے۔اس برگد سے میرے بچپن کی چند خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔اب جبکہ میں 'چراغوں کی قطار' کے لئے راشد صاحب پر لکھنے بیٹھا ہوں تو پہلا خیال جو میرے ذہن میں آیا یہ تھا کہ ایک برگد کا درخت میرے بچپن کا ساتھی تھا دوسرا برگد کا درخت مجھے ملٹری کالج میں ملا۔جس کی مہربان چھاؤں اب سے بیس برس پہلے بھی میرے ساتھ تھی اور آج بھی میرے ساتھ ہے۔ جب کبھی زندگی کے سفر میں دھوپ تیز ہو جاتی ہے تو میں پھر اپنے برگد کی طرف بھاگتا ہوں اور کبھی مایوس نہیں لوٹتا۔

برگد کا دامن تو بہت وسیع ہوتا ہے۔ دنیا آتی ہے اور جاتی ہے اور اس کا سایہ سب کے لئے ہوتا ہے

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ برگد صرف میرے لئے تھا اور ہے۔ یہ سمجھانے سمجھنے کی بھی ایک بیک گراؤنڈ ہے۔ میں جب 1963ء میں کالج میں داخل ہوا تو اس انٹری میں میرٹ کے لحاظ سے میں آخری چار پانچ لڑکوں میں سے تھا۔ دسویں تک بہت زور لگایا تو 34 ویں پوزیشن تک پہنچا۔ فرسٹ ڈویژن بھی ایک نمبر سے رہ گئی تھی۔ فرسٹ ائر میں راشد صاحب نے اردو پڑھانی شروع کی۔ سہ ماہی کے امتحان میں مضمون نگاری کے لئے جو عنوانات دیئے ان میں ایک تھا ''میرے خوابوں کی دنیا'' اس کو بجائے کوئی رومانی ٹچ دینے کے میں نے اس میں ایک یوٹوپیا کا نقشہ کھینچا تھا۔ اس پر میری توقعات کے عین برخلاف، اپنی عادت کے خلاف بھی، انھوں نے مجھے جھولی بھر کر نمبر دیئے۔ (بلا کر شاباش دی اور کچھ اس انداز سے مجھے جگایا۔ ایک فقرہ مجھے اب بھی یاد آ رہا ہے۔' Look beyond the hill) دو برس کے بعد جب میں ایف ایس سی سے پاس آؤٹ ہوا تو نہ صرف فرسٹ ڈویژن آئی بلکہ کالج میں فرسٹ آنے پر کمانڈانٹ میڈل بھی میرے سینہ پر جگمگا رہا تھا۔ اسی بنیاد پر انجینئرنگ یونیورسٹی میں مجھے داخلہ ملا اور آج ایچ ایم سی میں سیلز منیجر ہوں۔ یہ مکتب کی کرامت نہیں کسی کا فیضان نظر تھا۔ مجھے یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ سر نے میری درخواست پر میرا رشتہ بھی تلاش کیا اور اتنا صحیح تلاش کیا کہ آج میں اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں۔

راشد صاحب کا کوئی ذکر آنٹی (انکی بیگم) کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ وہ گھر ہی میں نہیں ہاؤس میں بھی راشد صاحب کی ہمدم وہم نفس تھیں اور انکے مشن میں برابر کی شریک۔ میں اپنی شادی کے برس ہا برس بعد حتٰی کہ اپنے بڑے بیٹے عدیل کی پیدائش کے بعد بھی جب بھی ان کے ہاں حاضر ہوتا تو وہ ہمیشہ یہ پوچھتیں دلہن کیسی ہیں؟ یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ راشد صاحب پوچھتے تھے ہماری بیٹی کا کیا حال ہے؟ ان دونوں فقروں میں جو نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ راشد صاحب اور آنٹی کو کالج میں ایک تہذیبی ادارہ کی سی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جس کے تہذیبی اثرات محسوس سب نے کئے ہونگے۔ گو اس امر پر غور کہ اس روشنی کا منبع کہاں ہے شاید سب نے کیا ہو۔ اب یہ فرمائیں کہ میں نے شروع میں راشد صاحب کو جو برگد کا درخت کہا تو غلط تو نہیں کہا؟

لیفٹیننٹ کرنل محمد اقبال اکبر خان

(کالج نمبر 2775، زمانہ تعلیم 1968-1963ء)

1963ء کا واقعہ ہے۔ موسیٰ ہال میں ایک انٹر ہاؤس اردو تقریری مقابلہ میں تقریر کر کے باہر نکلا تو ہال کے کاریڈور میں راشد صاحب کھڑے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ''ویل ڈن، اقبال اکبر، ماشاءاللہ تم نے

بہت اچھی تقریر کی۔ آئندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھنا''۔ یہ میری پہلی تقریر تھی۔ میں اپنی کارکردگی سے مطمئن نہ تھا لیکن راشد صاحب کی بہت ہی genuine حوصلہ افزائی سے حوصلہ بڑھا۔ اور میں نے پھر اس سلسلہ کو واقعی جاری رکھا۔ یہاں اس امر کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت تک میں انکا براہ راست طالب علم نہ تھا اور انکے ٹیپو ہاؤس سے میرا تعلق نہ تھا۔ کالج کے ایک عام طالب علم کے ناطے سے انھوں نے مجھ پر جو کرم کیا اور پھر مسلسل اپنی نظر کرم سے نوازتے رہے، یہ راشد صاحب کی خصوصیت تھی۔ وہ سر پرستی کرنے اور تربیت کرنے میں اپنے اور دوسرے ہاؤس میں تمیز نہیں کرتے تھے۔ وہ جس حوصلے سے طلباء کی خدمت کر رہے تھے اس میں کلاس اور ہاؤس کا سوال بے معنی تھا۔ ہر قسم کی عصبیت سے بلند ہو کر خدمت کرنا وہ نہایت قیمتی سبق ہے جو میں نے اس وقت لاشعوری طور پر ان سے سیکھا اور شعوری طور پر اس کا اتباع کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

شیر شاہ ہاؤس میں انکے گھر کے دروازے سب پر کھلے تھے۔ میں بھی ان خوش نصیب طلباء میں سے تھا جو شیر شاہ ہاؤس کے cubicle میں (جو پہلے کبھی آر۔ ایس۔ ایم کا کمرہ ہوتا تھا) ان کی خدمت میں ان سے فیضیاب ہونے اکثر حاضر ہوتے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا۔''اقبال اکبر، کھیلوں کے بعد آنا ایک کام ہے''۔ میں کھیل ختم ہونے کے بعد گراؤنڈ سے سیدھا شیر شاہ ہاؤس گیا اور انکے دروازہ پر دستک دی۔ خلاف معمول انھیں باہر آنے میں کچھ دیر لگی۔ جب باہر آئے تو سفید کرتے شلوار میں ملبوس تھے۔ پاؤں میں سلیم شاہی تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ اہتمام سے باہر آئے تھے بولے''معاف کرنا آنے میں دیر ہوئی میرا خیال تھا تم ذرا دیر سے آؤ گے''۔ میرے ساتھ جاوید اختر بھی تھا۔ ہم دونوں چونکہ کھیل کے میدان سے براہ راست آئے تھے۔ پسینہ میں شرابور تھے۔ انھوں نے جس طرح ہمیں غور سے دیکھا میں سمجھ گیا کہ انھوں نے ہمارے ٹرن آؤٹ کو پسند نہیں کیا۔ پھر کہا،''بہتر ہے آپ لوگ بھی نہا دھو آئیں''۔ یہ راشد صاحب کا طریق تربیت تھا کہ براہ راست نصیحت بہت کم کرتے تھے۔

میٹرک کے امتحان کے لئے ہماری کلاس کو شیر شاہ ہاؤس میں اکھٹا کیا گیا تھا۔ کالج کی اصطلاح میں ہم کلاسز سے فری ہو گئے تھے۔ بعض لڑکے اس فری ہونے کی حدود کو مختلف سمتوں میں بڑھانے کے لئے کوشاں نظر آتے تھے۔ راشد صاحب نے اس فریڈم کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا، وہ بھی اپنے انداز سے۔ اس زمانہ میں رات کو مچھر دانی لگانے کا رواج بھی تھا، جس کو ہر روز لگانا خاصا جھنجٹ کا کام تھا۔ اس کا حل بعض نے یہ سوچا تھا کہ دن میں مچھر دانی کو اتارتے ہی نہیں تھے۔ اور کچھ رات کو بھی لگانے کو تکلف سمجھتے تھے ایک روز میں نے دیکھا کہ صبح راشد صاحب ایک پینچ (کالج کے بانکے یا خود ساختہ ہیرو کو پینچ کہتے تھے) سے

کہہ رہے تھے کہ آیئے میں یہ خیمہ اتارنے میں آپ کی مدد کروں۔ اس روز وہ ''پنچھ'' مجھ سے کہنے لگا یار اس شخص نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔

ایک شام دیکھا کہ راشد صاحب مغرب کے وقت ایک اور حضرت کا خیمہ کھڑا کرنے میں مدد دے رہے تھے۔ اس کو مچھر دانی لگانے کی ایک سلاخ نہیں مل رہی تھی۔ راشد صاحب نے اسٹور سے ایک سلاخ بھی منگوا کر دی۔ امتحان کی تیاری میں جو حضرات سنجیدہ نہیں تھے ان کو راشد صاحب نے لیکچر دینے شروع کئے۔ یہاں تک کہ تنگ آ کر انھوں نے بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ ایک ایسے عالم فاضل نے مجھ سے کہا، ''راشد صاحب کے ہر روز اتنے لمبے لیکچر سننے سے نجات ملنے کا واحد راستہ یہی تھا کہ پڑھنا شروع کر دوں''۔ راشد صاحب کی ایک تکنیک یہ بھی تھی کہ وہ ہمارے والدین سے بھی رابطہ قائم رکھتے تھے۔ جس سے بعض ''پنچھوں'' کی مہماتی سرگرمیوں میں رکاوٹ پڑنے کا قوی امکان رہتا تھا۔ اسلئے ایسے حضرات کوشش کرتے کہ ان کے والدین سے ان کا رابطہ نہ ہو۔ چونکہ راشد صاحب نے غالباً قسم کھا رکھی تھی کہ صبح سے شام تک اتوار کا دن بھی (اس زمانہ میں اتوار کو چھٹی ہوتی تھی) وہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں گزاریں گے۔ اس لئے ہم چھٹی کے دن کو بھی ہر چیز سے چھٹی کی طرح نہیں منا سکتے تھے۔ اتوار کے دن ان حضرات کے گھر سے کوئی آتا تو ظاہر ہے کہ وہ انکے استقبال سے محروم نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی مسلسل تگ و دو سے اتنا ضرور ہوا کہ امتحان میں ان حضرات کا بھی بیڑہ پار لگ گیا جس کو پار لگانے کی انکو خود کوئی خاص فکر نہیں تھی۔

1967ء کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان کی تیاری کے لئے ایک بار پھر ساری کلاس شیر شاہ ہاؤس میں فال اِن ہوئی۔ امتحان کی تیاری کے اس زمانہ میں بھی بعض شہزادے ''بنک'' مارنے سے باز نہیں آتے تھے۔ دوسرا شو دیکھنے اور پھر واپسی پر سرائے میں گریٹ ''زمیندارہ ہوٹل'' میں چائے پینے کے ایڈونچر شامل ہوتے تھے۔ اس گروپ میں زیادہ تر چھنے خاں ٹروپ کے معزز ارکان تھے جو پیشہ ور فنکار ہونے کا درجہ رکھتے تھے اور اکثر ارباب اقتدار و اختیار کے ہتھے بھی چڑھتے رہتے تھے۔ ضروری تواضع سے فیضیاب بھی ہوتے رہتے تھے۔ ''شیاطین'' کے ساتھ بے ضرر فرشتے بھی ہوتے ہیں۔ ہماری انٹری میں بھی ایسے شریف بچے، اللہ میاں کی گائے قسم کے کچھ لوگ تھے جن کے بارے میں شبہ تھا کہ یہ شاید پیدا بھی کتاب ہاتھ میں لئے یا نوٹس یاد کرتے ہوئے ہوں گے۔ بہر حال پروگرام یہ بنا کہ اس مرنجانِ مرنج بے ضرر مخلوق کو ورغلایا جائے۔ یہ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ چونکہ اس مخلوق کی ایڈونچر کی حس بڑی حد تک مر چکی تھی جب ان کو ورغلانے کے سارے حربے ناکام ہوئے تو آخری دلیل یہ دی گی کہ ''افسر بننا ہے یا نہیں'' بہر حال افسر بننے کے لئے guts کی ضرورت ہوتی ہے۔ آئی ایس ایس بی، میں سب سے زیادہ courage

confidence & initative ہی کو دیکھا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ یہ دلیل کامیاب رہی۔ اور دوسرے دن رات کو ایک ایسے معصوم کو سیکنڈ شو میں دھکیل دیا گیا۔ شیطانوں کی ٹولی پچھلے گیٹ تک انہیں خدا حافظ کہنے اور کامیابی کی دعائیں دینے گئی اور دعائیں بظاہر کارگر بھی ہوئیں کہ رات کے بارہ ایک بجے کے درمیان وہ معصوم کامیاب و کامران لوٹے۔ آتے ہی وہ بار بار پوچھتے تھے چیک تو نہیں ہوا؟ ''نہیں، ہرگز نہیں۔'' ہر ایک نے فرداً فرداً یقین دلایا۔ انکی کامیابی پر بلکہ شیطانی ٹولے کی کامیابی پر ایک چھوٹا سا جشن بھی منایا گیا۔ جس میں وہ مونگ پھلیاں بھی شامل تھیں جو وہ جہلم سے لائے تھے۔ دن خیریت سے گزرا۔ ان حضرات سمیت سب احباب نے چین کا سانس لیا۔ یہ طلسم اس وقت ٹوٹا جب کھانے کے بعد راشد صاحب کا پیغام ''ف'' کے نام آیا کہ دفتر میں آئیں۔ وہ صاحب حاضر ہوئے تو یہ مکالمہ ہوا۔

سر! آپ نے بلایا ہے۔

''جی ہاں۔''

(پھر طویل خاموشی کے بعد)

You too Brutus!

(پھر خاموشی)

''جایئے''

یہ صاحب جو ماشاءاللہ اب ریڈ ٹیپ ہو چکے ہیں، برسوں بعد ملے اور اس ایڈونچر کا ذکر آیا جو انھوں نے کیا تھا۔ تو بولے یار اس وقت تو میں سمجھا کہ سستے چھوٹے۔ لیکن جب You too Brutus کے معنی سمجھ میں آئے تو بہت شرمندہ ہوا۔ خصوصاً اس کرب کو دیکھ کر جو الفاظ کہتے وقت ان کے چہرہ پر نمایاں ہوا تھا۔ Really, he is great.۔ تربیت کا انکا اپنا منفرد اسٹائل تھا۔ جو انکی شخصیت کے ساتھ ہم آہنگ تھا۔ ان سے لیڈر شپ میں patience کا جو inspiration ملا اس کے دوررس اثرات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔

ان کے اسٹائل کی ایک اور مثال دوں گا۔ 1967ء میں انٹر میڈیٹ کلاس میں تھے اور mid teens سے آگے۔ اس کا اثر ہماری رگوں میں دوڑتے خون پر پڑنے لگا تھا۔ اس زمانے کا ایک مقبول ایڈونچر ٹیچرز سے شوخی کرنے کا بھی تھا۔ کسی نے شرط لگا دی کہ آج راشد صاحب کو غصہ دلانا ہے۔ چنانچہ ایک سرد صبح باجماعت فیصلہ کیا گیا کہ آج دھوپ میں بیٹھ کر پڑھنا ہے، یا پڑھنا ہی نہیں۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوتے ہی ساری کلاس موسیٰ ہال کے پیچھے غائب ہوگئی۔ صرف چند بیٹھے رہ گئے۔ جب وہ آئے ہوں گے تو اتنے

بہت سے لڑکوں کی غیر موجودگی کو محسوس ضرور کیا ہوگا۔ کلاس کمانڈر نے رپورٹ دیتے وقت کچھ وضاحت کی کوشش بھی کی لیکن انھوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی اور اپنے مخصوص انداز میں شروع ہو گئے۔ تقریباً پورا گھنٹہ گزر گیا لیکن انھوں نے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ ہم کچھ دیر تک تو انتظار کرتے رہے۔ انھوں نے جب react نہ کیا تو کچھ غصہ آیا، مایوسی ہوئی، جی چاہا کہ شور کریں، لیکن دل نہ مانا۔ آخر میں کچھ ''مے آئی کم ان سر''، کہہ کر آ بھی گئے۔ لیکن انہوں نے انکو بھی نظر انداز کیا۔ ایسا صرف ایک بار ہوا پھر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ ان سے لبرٹی لے۔ برس ہا برس کے بعد جب میں نے خود ایک یونٹ کی کمان سنبھالی تو اندازہ ہوا کہ قیادت میں صبر و تحمل کتنا ضروری عنصر ہے۔

ان دنوں ایران کے اشتراک سے ایک فلم بنی تھی۔ اس میں محمد علی کے ساتھ ایک نو خیز ایرانی فنکار شہپر بطور ہیروئن آئی تھیں۔ ان کے معاشقہ کے افسانے اخبارات میں آ رہے تھے۔ جو ظاہر ہے کہ لڑکوں کی دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ ایک روز لڑکوں کا موڈ پڑھنے کا نہ تھا۔ صلاح ہوئی کہ ملکی سیاست یا حالات حاضرہ، کونسا موضوع چھیڑا جائے کہ سر آج ذرا پٹڑی سے اتریں۔ فیصلہ ہوا کہ محمد علی اور شہپر پر بات کی جائے۔ امید تو نہیں تھی کہ وہ اس جال میں پھنسیں گے۔ لیکن بہرحال جب بات چھڑی تو خلاف توقع انھوں نے اس مصرعہ کو اٹھایا اور مسکرا کر کہا۔ ''چلئے آج اسی مسئلہ کو ڈسکس کر لیتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ محمد علی میں آپ اپنے آپ کو پرجیکٹ کر رہے ہیں۔ اس کو نفسیاتی اصطلاح میں identification کہتے ہیں۔ شہپر اصل میں آپ کی اپنی خیالی محبوبہ کی image ہے۔ پہلے تو love اور lust کے فرق پر غور کرنا چاہیے۔ lust at best, possessive, ہوتی ہے۔ creative اور love expansive ایک اپنے لئے، دوسری دوسرے کے لئے۔ ایک کا منشا procreation تو دوسری کا creative ہوتا ہے اور sustain کرتا ہے۔ محبت ایک عطیہ خداوندی ہے۔ انھوں نے فراق گورکھپوری کا یہ قول بھی سنایا کہ پائدار محبت کرنے کے لئے بڑا دل ہی نہیں بڑا دماغ بھی چاہیے۔ lust جسم سے اور love شخصیت سے ہوتی ہے۔ محبت نمو پذیر چیز ہے۔ اس کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے۔ آرٹ اور فن کی نمو محبت اور حسن کی تلاش کی وجہ سے ہوتی ہے''۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ جس محبت کی تہہ میں regard نہ ہو وہ پائیدار نہیں ہوتی۔ اسی گفتگو کے آخر میں انھوں نے کہا جنس کوئی شجر ممنوعہ نہیں۔ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور بہت بڑی قوت ہے۔ کسی نے پردہ کے بارے میں استفسار کیا تو فرمایا اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس نے پردہ کا حکم دیا اور لباس سے آشنا کیا۔ انھوں نے بڑی دلچسپ لیکن نفسیاتی بات بتائی کہ پردہ جنسی اعتبار سے اچھی چیز ہے۔ اس سے Erotogenic area بڑھتا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل علامہ یوسف

علی سے اقبال کی ایک گفتگو کا حوالہ بھی دیا جس میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ پردہ کے حق میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس سے جنسی کشش میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہی erotogenic area کا نفسیاتی تصور۔

مجھے یاد ہے کہ اس سلسلہ میں انھوں نے platoonic love افلاطونی محبت سے لے کر فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی Oedipus complex, psychoanalysis ابنارمل جذباتی حالتوں maschoism, sadism پر گفتگو کی۔ اسی دن انھوں نے ہارڈی کی ٹیس فلابیر کی مادام بواری، تھیکرے کے Vanity Fair کی بیکی شارپ، اناتول فرانس کی تائیس اور کیٹس کی محبوبہ فینی براؤن کا ذکر کیا۔ فرمایا یہ سب عورت کے روپ ہیں۔ آخر میں اس مسئلہ سے بحث کی کہ ایک کیریئر آفیسر کی زندگی میں اس کی نصف بہتر کا کیا رول ہوتا ہے۔ اب یہ نکات انکی کتاب Living with Leadership کے آرٹیکل The Role that Better Half Plays میں شامل ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے ایک طرح سے وارن کیا تھا کہ ایک آرمی افسر اپنے خاندان سے الگ دور دراز علاقوں میں اپنی بیوی کی رفاقت میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی نصف بہتر کو زندگی میں وہ رول پلے کرنا ہوتا ہے جو ورڈز ورتھ نے اپنی بہن ڈورتھی کے بارے میں لکھا Guide, philospher and friend۔ ایک آفیسر کو محبوبہ یا صرف بچوں کی ماں نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ چاہیے۔ She has to be many things in one اس لئے wants ہی پر نہیں needs پر بھی نظر رکھنا۔ اس دن ان کی تمام گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ وقت اور جسمانی توانائی دونوں expendable items ہیں۔ اس لئے ان سے اپنی تعمیر وترقی کے لئے بھر پور کام لینا چاہیے۔ اگر زندگی میں کچھ بن گئے تو ایک نہیں ہزار شہ پریں چراغ روئے زیبا لے کر تمھیں خود تلاش کر لیں گی۔

آخر میں ایک اور بات یاد آئی۔ آئی ایس ایس بی کی تیاری کے لئے ہم سے تقریریں کرواتے تھے۔ ہاؤس میں کوئی روسٹرم نہ تھا۔ پانچویں سیکشن کو جس نے بعد میں صاحب زادگل ڈارم کا نام پایا اس میں اوپر تلے تین بکس رکھ کر اور چادر سے ڈھانپ کر انھیں روسٹرم کی شکل دی گئی۔ اس طرح انھوں نے انکو بھی بولنا سکھا دیا جو تقریر کے نام سے بھاگتے تھے۔ اس ٹریننگ کی تفصیلات شمیم احمد خان، ضیا، قمر، ریاض اور رب نواز کو بھی یاد ہوں گی۔ وقت کا کارواں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ منزلیں ہیں کہ گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں۔ لیکن کالج کی زندگی کی لہروں کو جس طرح انھوں نے 'داستان علم وعمل' میں قلم بند کر لیا ہے وہ بجائے خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تاریخ کا بھی احساس انہی کو ہوا اور بروقت ہوا۔

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبین دہر پر ہونگے ضوفشاں ، ہم نہیں ہونگے
جئیں گے جو، وہ دیکھیں گے بہاریں زلف جاناں کی
سنوارے جائیں گے، گیسوئے دوراں، ہم نہیں ہونگے

میجر محمد عبید مرزا

(کالج نمبر 2865 زمانہ تعلیم 1964-1968ء)

دسویں کی اردو کی کتاب میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول،''توبۃ النصوح'' کا ایک ٹکڑا ''ٹوپی'' کے نام سے شامل تھا۔ پہلے تو انھوں نے اردو میں ناول کی مختصر تاریخ بیان کی۔ شوکت صدیقی کے ناول 'خدا کی بستی' کا ذکر بھی آیا۔ داستان اور ناول میں جو فرق ہے اس کی وضاحت کی۔ قصہ، کہانی، افسانہ کے فرق کی طرف بھی اشارے کئے۔ سید وقار عظیم کی کتاب 'داستان سے افسانہ تک' کا حوالہ بھی دیا۔ پریم چند کے ناولوں 'گئودان' اور 'چوگان ہستی' کے بارے میں بھی بتایا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ انھوں نے کہا تھا دنیا کے سب سے بڑے ناول روسی اور فرانسیسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ٹالسائی کے ناول "War and Peace" اور دوستوسکی کے ناول The Crime & Punishment اور ''برادرز کراموزف'' کا اور وکٹور ہیوگو کے ناول Les Misarables کا تعارف بھی کرایا۔ غالباً دوسرے ہفتے نذیر احمد کے ناولوں مراۃ العروس اور بنات النعش، فسانہ مبتلا، اور ابن الوقت پر گفتگو شروع کی۔ آخر میں تان اس زمانہ کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات پر ٹوٹی۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے پس منظر اور پیش منظر، جس میں یہ ناول 'توبتہ النصوح' لکھا گیا تھا پر بحث کی۔ سرسید کی تحریک دوقومی نظریہ اور پھر پاکستان زیر بحث آیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے کہا ادب اور خاص طور پر ناول فنی روپ میں اپنے دور کی معاشی و معاشرتی یا تمدنی تاریخ بھی ہوتا ہے۔ ''وہ کیسے؟'' کسی نے پوچھا۔ بولے ''اسی سبق ''ٹوپی'' ہی کو دیکھ لو۔ عام مسلمانوں کی معاشی حالت کیا تھی اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے اس میں جن غریب سپاہی پیشہ، خانصاب کا ذکر ہے' وہ ایک بنئے سے ادھار لے کر کھا رہے تھے۔ جب اس نے ان کے گھر کے تمام اثاثے کو نیلامی پر چڑھایا تو اسکی کل قیمت ساڑے چار روپے لگی۔ نصوح کا بیٹا علیم جب خانصاب کا مال چھڑانے کے لئے اپنی زردوزی کے کام کی ٹوپی بیچنے جاتا ہے تو وہ بھی ایک ہندو ساہوکار کے پاس جاتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد سیاسی ہی نہیں مسلمان اقتصادی اعتبار سے بھی تباہ ہو چکے تھے۔'' یہ تھا راشد صاحب کے پڑھانے کا انداز۔

اس زمانہ میں فکشن کی جن کتابوں کے نام انھوں نے لکھوائے تھے وہ میں اب تک ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتا رہتا ہوں۔ البتہ صادق حسین کی کتاب' بامی ، جو بقول ایک ہرن کے بچہ کی کہانی ہے مجھے ابھی تک نہیں مل سکی۔ راشد صاحب نے ہمیں زندگی میں qualitative improvement کا جو شعور دیا وہ ان کا سب سے قیمتی عطیہ ہے۔

میجر ساجد مجید بھٹی

(کالج نمبر 2901، زمانہ تعلیم 1965-1969ء)

1968ء کے اوائل میں جب ایف ایس سی فائنل میں تھا۔ جہلم کے پیراڈائیز سینما میں ایک فلم دیکھی۔' Angelic ' فلمیں اور بھی دیکھی تھیں اور انکی ہیروئین بھی کم حسین نہیں تھیں۔ لیکن Angelic کے روپ میں مچل مارسف نے مجھ پر سحر سا کر دیا۔ مچل Angelic کا رول بھی کر رہی تھی۔ اور خود بھی angelic تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر عورت Angelic ہو جائے اور میں گریباں چاک کر کے اپنی Angelic کی تلاش میں نکل کھڑا ہوں اور داستانوں کے روایتی شہزادے کی طرح ہفت خواں طے کر کے اپنی Angelic کو حاصل کروں۔ پیراڈائیز سینما سے نکلنے کے بعد میری حالت یہ تھی کہ میری آنکھیں کھلی تھیں اور بظاہر سب کچھ دیکھ بھی رہی تھیں لیکن میری mind's eye میں image مچل مارسف کی تھی۔ ہر طرف تو ہی تو کی کیفیت تھی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل کی ہر دھڑکن سے '' مچل'، مچل'' کی صدائیں آتی ہیں۔ انہی دنوں میرے اندر دوسری نفسیاتی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ کبھی جی چاہتا کہ شعر کہوں، افسانے لکھوں، پینٹ کروں، کبھی جی چاہتا کسی مہم پر نکل جاؤں۔ صحرا و دریا کو روند ڈالوں، کبھی جی چاہتا کہ جنگ چھڑ جائے تو کمانڈو ایکشن کروں۔ ایک دن خیالوں میں کھویا ہوا میں وار میموریل کے ایریا میں جا نکلا۔ پیپل کے پیڑ کے نیچے ایک زخمی چڑیا آ کے گری۔ کسی بچہ کی ائر گن سے زخمی ہوئی تھی۔ میں اسے اٹھا کر دیوانہ وار بھاگا کہ سی ایچ میں ڈریسنگ کرواؤں۔ مچل کے تصور میں کبھی دل میں ٹھنڈک محسوس ہوتی جیسے دامن کہسار میں صبح طلوع ہو رہی ہو، کبھی دل میں آگ لگتی محسوس ہوتی۔ میرے behaviour pattern کی تبدیلیوں کو سب نے محسوس کیا خاص طور سے ممتاز اور جاوید نے۔ میں نے ممتاز سے اپنی کیفیت ڈسکس کی کہ یار مجھے تو وہ'' Angelic '' کی مچل مارسف ہر وقت ہانٹ کرتی رہتی ہے۔ مختصر یہ طے یہ پایا کہ راشد صاحب سے رجوع کیا جائے۔ چنانچہ میں اور ممتاز علی چنگیزی (اب اے سی کسٹمز) راشد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت وہ ہاؤس کے اکرم شہید آڈیٹوریم میں کسی ہاؤس فنکشن

کی ریہرسل کرا رہے تھے۔

ریہرسل کے بعد میں نے ان سے یوں گفتگو شروع کی۔ ''سر، ریجنٹ میں وہ آپ نے '' Hunch back of Notre Dame'' دیکھی تھی۔ اب پیراڈائیز میں اس سے بڑھ کر مووی لگی ہے۔ 'Angelic' سر آپ ضرور دیکھئے گا''۔ ہر چند، کہ میں نے بات بہت بچا کر شروع کی تھی لیکن میرے لہجہ میں یا انداز میں ضرور کوئی ایسی بات تھی کہ وہ ذرا چونکے، غالباً اس لئے کہ اس سے پہلے میں نے کبھی ان سے اس قسم کی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ صرف ایک بار جب سارا کالج Hunch-back دیکھنے گیا تھا۔ تو یہ فلم اور وکٹر ہیوگو کا اسی نام کا ناول جس پر یہ فلم مبنی ہے زیر بحث آیا تھا۔ انھوں نے زندگی میں love کے رول پر کچھ باتیں کی تھیں۔ بہرحال جب میں نے ان سے یہ فلم دیکھنے پر اصرار کیا تو انھوں نے اپنی مخصوص زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا فلم دیکھوں یا Angelic کو دیکھوں؟ اب چونکہ بلی تھیلے سے باہر آ چکی تھی میں نے Angelic کے روپ میں مچل مارسف کی حشر سامانیوں اور فسوں خیزیوں کی داستان چھیڑ دی۔ کہنے لگے ایک شعر سنو،

سودا جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

میں نے کہا:

''سر، مچل مارسف نے Angelic کا رول ہی نہیں کیا وہ خود بھی angelic ہے۔ وہ فرشتہ ارضی ہے۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس پر نظمیں لکھتا۔ مصور ہوتا تو اسے پینٹ کرتا۔ اگر میں کسی داستان کا شہزادہ ہوتا تو اسے حاصل کرنے کے لئے ہفت خواں طے کرتا اگر......''

''بس، بس میں سمجھ گیا کہ صورت حال کیا ہے؟ مچل مارسف نے تمہارے احساسات اور تخیل کو کس طرح اور کس سطح پر جا کر متاثر کیا ہے۔! congratulations محبت کی پرچھائیں بھی کسی دل پر پڑ جائے تو وہ کندن ہو جاتا ہے۔ جنس کی حس ہر جاندار میں ہوتی ہے۔ لیکن ذوق جمال Aesthetic sense ہر کسی میں نہیں ہوتا کہ انسان میں فرشتہ نظر آئے اور اسے دیکھ کر خدا یاد آئے۔

تجھ کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

یہ تو منزل ہی اور ہے۔ اگر چہ فرائڈ نے جنس Eros اور Love میں فرق نہیں کیا ہے اور ہر تعلق کی بنیاد (Eros) جنس کو قرار دیا ہے۔ Oedipus complex کا نظریہ اسی مفروضہ پر مبنی ہے لیکن بعض دوسرے ماہرین نفسیات جیسے ولیم میکڈوگل اور فرائڈ ہی کے شاگرد تھیوڈر ریک نے فرائڈ سے اختلاف کیا ہے اور اپنی کتاب A Psychologist Looks at Love میں فرائڈ کے جنسی نظریے کی

محکم دلائل سے تردید کی ہے۔ وہ کہتا ہے محبت اور جنس انکی اصل کے اعتبار سے بالکل مختلف جذبے ہیں۔ جنس کا تعلق بدن کے انتخاب سے ہے۔ محبت کا تعلق شخصیت کے انتخاب سے ہے۔ جنس ایک عام اور محبت ایک خصوصی تجربہ ہے۔ جنس ایک حیاتیاتی Biological خواہش urge ہے۔ محبت تہذیب، کلچر، تخلیق کاری کا تقاضا۔ جنسی کشش کی symbols اور ہیں، محبت کی کشش کے sourcesیا حوالے دوسرے۔ جنسی کشش کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ محبت پختگی کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ فراق گورکھپوری نے کیا خوب کہا ہے کہ محبت کرنے اور کرتے رہنے کے لئے بڑا دل ہی نہیں بڑا دماغ بھی چاہیے۔ محبت نے بڑے بڑے انسانوں سے بڑے بڑے کام کرائے ہیں۔ مشہور اطالوی شاعر Dante کو Beatrice سے جو شدید محبت تھی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس کی مشہور کلاسیکی کتاب Divine Comedy کو بیٹرس ہی نے انسپائر کیا ہے۔ کیٹس کے خطوط Fanny Brown کے نام آج بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔

''خود اقبال نے، عطیہ فیضی کو جو خطوط لکھے ہیں اور اپنی حسین اور ذہین جرمن پروفیسروں فراواڑ ناست، فراو سینے شال کا ذکر اپنی تحریروں میں جس لگاؤ کے ساتھ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک تخلیقی فنکار کی زندگی میں حسن صورت اور جمال شخصیت ایک مستقل source of inspiration کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے بھی کہا ہے۔

تھی وہ ایک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

''ایک یونانی فلسفی پکار اٹھا تھا دنیا میں جہاں کہیں کوئی حسین عورت ہے وہ مجھے عزیز ہے۔ سبحان اللہ! جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ اگر پیغمبر نہ ہوتے تو خدا پر ایمان لانے کے لئے سحر کافی تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر پیغمبر نہ ہوتے تو عورت کا وجود خدا پر ایمان لانے کے لئے کافی تھا۔ عورت انسان کے لئے ایک عطیہ خداوندی ہے۔ اس کا حسن، اس کا جمال، اسکی محبت، اس کی مادریت، کس کس چیز کا شکر کیا جائے۔ **فبای الاء ربکما تکذبان**''

دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ کرے کرم
کن نعمتوں کو حکم دیا ہے جواز کا

آخر میں مجھ سے کہا۔''میں تمہارے ذوق جمال کی داد دیتا ہوں۔ حسن کا احساس انسان کی شخصیت کو نکھارتا ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک pragmatic مشورہ بھی دیتا ہوں۔ Angelic کو صرف سینما کے

اسکرین پر کیا دیکھنا۔اس کو زندگی میں تلاش کرو اور تلاش بھی کیا کرنا اگر تم نے اپنا کیریر بنالیا تو کوئی نہ کوئی مچل اپنا چراغ روئے زیبا لے کر.... خود تم کو تلاش کر لے گی۔تو جاؤ۔ بہت باتیں ہو چکیں۔ایف ایس سی اچھے مارکس میں پاس کرنے کی اور کمیشن لینے اور کیریر بنانے کی سنجیدگی سے تیاری کرو۔تمہارے سینہ میں چراغ آرزو جل ہی چکا ہے۔ تیشہ سنبھالو اور جوئے شیر نکالو۔شب بخیر‘‘۔

اتفاق سے انہی دنوں انٹر کالج جہلم میں ایک مباحثہ ہونا تھا۔اس کا عنوان تھا:

وجود زن سے ہے تصور کائنات میں رنگ

میں نے کلاس میں راشد صاحب سے کہا۔سر،اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالئے۔ وہ ہلکا سا مسکرائے جیسے کہہ رہے ہوں کہ ابھی مچل مارسف کی یاد تمہارے دل سے گئی نہیں۔

فرمایا یہ موضوع ضرب کلیم کی ایک نظم بعنوان ’عورت‘ کا پہلا مصرعہ ہے۔تین اشعار کی یہ نظم یا قطعہ یوں ہے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اس درج کا درمکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

پہلے مصرعہ:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

عورت کی جمالیاتی قدر(aesthetic value) کا ذکر ہے۔دوسرے مصرعہ

اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

میں بالواسطہ طور پر اس کی Creative value یعنی تخلیق کاری کا سرچشمہ ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرا شعر:

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف سے اسی درج کا در مکنوں

اس میں عورت کے اس شرف کا اظہار ہے جو اس کی مادریت کی وجہ سے اسے حاصل ہے۔

تیسرے شعر میں:

مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

اقبال نے عورت کی ذہنی صلاحیت سے انکار کیا لیکن جمالیاتی تاثیر کی تائید کی ہے۔

بدقسمتی سے عورت کے بارے میں اقبال کے خیالات کچھ قدامت پسندی (orthodoxy) کا رنگ لئے ہوئے تھے۔ وہ حجاب روکے بھی قائل تھے جس کے لئے کوئی نص موجود نہیں۔

ایک روز sublimation کا ذکر آیا۔ تاج کے استفسار پر کہا ''sublime عظیم بلند، سے sublimation بنا ہے۔ نفسیات میں اس پروسس کا نام ہے، جس سے کسی جذبہ کی ماہیت بدلے بغیر اس کے اظہار کے طریقوں یعنی mode of expression کو بدل دیا جائے یا بہتر بنایا جائے۔ مثلاً ایک ماں کے لئے اپنے بچہ کی محبت فطری ہے۔ لیکن اس محبت میں اگر وہ دوسرے بچوں کو شریک کرتی ہے اور اجنبی بچوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرتی ہے تو یہ sublimation ہے۔ تعلیم، تربیت کے بغیر موثر نہیں ہو سکتی۔ جب تک معلم کو اپنے متعلم سے محبت نہ ہو اور یہ محبت extension ہو گی فطری محبت کی۔ اسی طرح نفرت اور جارحیت بھی فطری جذبے ہیں۔ انکو ذاتی نفع نقصان کے دائرہ میں محدود رکھا جا سکتا ہے اور انکو اجتماعی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ مثلاً آپ ظلم سے، جہالت سے، بیماری سے نفرت کریں اور اس سے لڑیں۔ اپنے ملک کے دشمن سے لڑنا بھی sublimation کی ایک صورت ہے۔ تولید سے تحقیق کی طرف سفر بھی sublimation ہی ہوتا ہے۔ خون کی محبت اپنی جگہ، خیال کی محبت اور اسکے لئے جان دینا بھی sublimation کی صورت ہے۔ جس چیز کو برنارڈ شا نے moral passion کہا ہے۔ وہ بھی passion کی sublimation ہی ہے۔ آدمی سے انسان ہونے کے سفر کا نام sublimation ہے۔ میری کتاب ''شاد باد منزل مراد'' کا پہلا مضمون ہے۔ 'منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی'۔ اس کا فقرہ ہے ''آدمی پیدا ہوتا ہے انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے''۔ یہ تہذیبی عمل socialization نفسیاتی اصلاح میں sublimation کہلائے گا۔

میجر جاوید ضیا فاروقی

(کالج نمبر 2927، زمانہ تعلیم 1965-1970ء)

راشد صاحب ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ میر کا یہ شعر آیا:

کب تلک چاک قفس سے جھانکئے
برگ گل یاں بھی صبا کوئی تو لائے

تو فرمایا، یہ گل وبلبل کی روایتی شاعری نہیں، غزل کی زبان میں استحصال اور استبداد کے خلاف اس سے بہتر شاعرانہ احتجاج ممکن نہیں۔ اس شعر میں دنیا بھر کے مجبور ومحکوم استحصال کا شکار انسانوں کی آہ سمٹ کر بند ہوگئی ہے۔ یوں تو اس وقت دنیا میں تہذیب وترقی کا بڑا غلغلہ ہے۔ ٹیکنالوجی کی فتوحات کے شادیانے بجائے جارہے ہیں۔ انسانی حقوق (Human rights) کا چرچا بھی بہت ہے۔ لیکن تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں کے لئے کیا فرق پڑا؟ ان کی زندگی کی شب تاریک کی سحر کیوں نہیں ہوتی۔ اور تو اور خود پاکستان میں کروڑوں انسانوں کی زندگی جس ڈھب سے گزر رہی ہے کیا وہ یہ پوچھنے کا حق نہیں رکھتے۔''

کب تلک چاک قفس سے جھانکئے
برگ گل یاں بھی صبا کوئی تو لائے

پھر فرمایا:

''لیکن زندانی ہمیشہ چاک قفس سے جھانکتے ہی نہیں رہتے۔ ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ درِ زنداں توڑ بھی ڈالتے ہیں۔ اس لئے ''اہل جفا'' کو گھر کی بھی سدھ لینی چاہیے۔ میر کہہ گئے ہیں

سُدھ لے گھر کی بھی شعلہ آواز
دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

قمرالٰہی خان

(کالج نمبر 2946، زمانہ تعلیم 1970-1965ء)

اولیا اور صوفیا کے تذکرہ میں ایسے واقعات پڑھے ہیں کہ انکی توجہ کی نظر سے بڑے بڑے خطا کار سنبھل گئے اور ایسے سنبھلے کہ خود صاحب نظر ہوگئے۔ استاد یا رہبر کامل ہو تو غلطی کے حوالے سے بھی راستہ دکھا دیتا ہے۔ 1970ء میں ملٹری کالج میں میرے ساتھ اور میرے تین ساتھیوں کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ہمارے لئے ناقابل فراموش بن گیا اور جس نے ہماری زندگیوں کو بہت گہرائی میں جا کر متاثر کیا اور اب بھی جس کا اثر باقی ہے اور جس کی روشنی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔

میں ایف ایس سی کے فائنل ائر میں تھا۔ وہ عمر ہی ایڈونچر کے جنون کی ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اور

میرے تین اور مہم جو دوست نت نئے ایڈونچر سوچتے رہتے تھے۔ رات کو کالج کے عقب کے کھیتوں پر ''یلغار'' کرنا تو کوئی بہت بڑی بات ہی نہیں تھی۔ رات کو سرائے کا چکر لگانا اور چیلنج کر کے جانا کہ آج مالٹے بھی لائیں گے، ہماری چوکڑی کا معمول تھا۔ پکڑے بھی جاتے تھے۔ سزا بھی ملتی تھی لیکن باز نہیں آتے تھے۔ بلکہ ذوق گناہ سزا کے بعد اور بڑھتا تھا۔

اب ہوا یہ کہ ایک دن دوستوں سے شرط میں ایک مرغ ہار گئے۔ ظاہر ہے کہ جیب سے خرید کر مرغ کھلانا ہماری چوکڑی کے حوصلہ کی توہین تھی۔ اورنگزیب اور ٹیپو ہاؤس کے آس پاس کے کواٹروں کے مرغوں کے مالکان ہمارے ''شب خونوں'' سے پہلے ہی محتاط ہو گئے تھے۔ اب کیا کیا جائے۔ ایک شیطان صاحب نے یہ رائے دی کہ راشد صاحب کا مرغی خانہ چونکہ انکے گھر کے باہر بالکل exposed ہے، اس لئے اس سے استفادہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بڑی حیص بیص کے بعد کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ یہ رسک (risk) لیا جا سکتا ہے۔ اب زیادتی یہ ہوئی کہ بجائے ایک مرغی پر ہاتھ صاف کرنے کے پانچ مرغیوں کے پورے ڈربے کو خالی کر دیا۔ چھپایا کہاں؟ خانہ خدا میں، (اللہ معاف کرے) اس ویران مسجد میں جو ٹوٹی پھوٹی حالت میں کالج کے نئے گراؤنڈ میں کھڑی تھی اور غیر آباد تھی۔ کرنے کو تو ہم یہ ایڈونچر یا چوری کر گئے لیکن تھے بڑے پریشان کہ صبح سویرے راشد صاحب کو انگریزی کے پہلے پیریڈ میں کیسے فیس کریں گے۔ پھر سر کی سٹینڈنگ کے پیش نظر یہ بھی یقینی تھا کہ انھیں پتہ چل جائے گا۔ دوسرے دن کلاس انھوں نے معمول کے مطابق لی اور مرغیوں کی چوری کی کوئی بات نہ کی۔ شام تک ہماری انٹیلی جنس نے ہمیں بتا دیا کہ انھیں ہم چاروں کے ناموں کا پتہ چل چکا ہے اور ہمارے ہائڈ آؤٹ کا بھی، بہر حال اس طرح دن گزرتے گئے بالآخر ہم پاس آؤٹ بھی ہو گئے، ان سے الوداعی ملاقات بھی ہو گئی۔ جس میں برسبیل تذکرہ انھوں نے صرف اتنا کہا کہ طبیعت کی امنگوں اور جولانیوں سے صحیح کام لینا چاہیے اور اپنی صلاحیتوں سے انصاف کرنا اچھا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا اشارہ ہماری طرف تھا کہ کس طرح ہم اپنی صلاحیتوں کو بچگانہ حرکتوں میں ضائع کر رہے تھے اور اسے ایڈونچر کا نام دے کر خوش ہو رہے تھے۔

راشد صاحب نے جس صوفیانہ انداز سے یہ کیس ڈیل کیا وہ میری زندگی کا بڑا اہم تجربہ ہے۔ ان کا صبر، ان کا تحمل، ان کی شفقت ہمارے لئے مستقل طور پر انسپائریشن کا باعث رہے گی۔

ممتاز علی چنگیزی

(کالج نمبر 2947، زمانہ تعلیم 1970-1965ء)

میں جب 1970ء میں فوج میں کمیشن کے لئے آئی ایس ایس بی سے مسترد ہوا تو بہت دل برداشتہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اب آگے کچھ بھی نہیں رہا۔ کوہاٹ سے واپسی پر جب راشد صاحب سے ملا تو انھوں نے پوچھا کہ کیا نتیجہ رہا؟ میں نے کہا ''سر، میں reject ہو گیا ہوں۔'' وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ بولے ''یوں نہ کہو۔ یہ کہو کہ میں select نہیں ہو سکا ہوں۔ reject ہونا اور چیز ہے select ہونا نہ ہونا اور بات۔'' یہ باتیں کرتے ہوئے وہ مجھے شیر شاہ ہاؤس میں اپنے آفس میں لے آئے۔ کہا ''بیٹھو''۔ پھر کہا'' اگر تم select ہو جاتے تو مجھے تعجب ہوتا۔ تم چیز ہی اور ہو۔ فوج کی ضرورت اور ہے۔ اگر یہاں ہر کیڈٹ کے لئے کمیشن کی درخواست دینا لازمی نہ ہوتا تو میں تمھیں مشورہ دیتا کہ درخواست ہی نہ دو۔ تمہاری منزل تخلیقی کاوش اور فنکاری میں ہے۔ فارسی کا وہ فقرہ تم نے بھی سنا ہوگا۔ ''کہ ہر کسے بہر کارے ساختہ''۔ انہوں نے بہت سمجھایا حوصلہ بھی دیا۔ لیکن اس وقت میں اتنا depressed تھا کہ قائل نہ ہوا اور سر جھکائے خاموشی سے سنتا رہا۔ جب میں تھینک یو سر، کہہ کر اٹھ کر جانے لگا۔ تو بولے ''چرچل کا ایک مشہور فقرہ ہے۔ Life is a whole اور Luck is a whole غلط نہیں۔ زندگی کے طویل سفر میں تم تو پہلی منزل پر جی چھوڑ بیٹھے ہو۔ اور learn to labour and cheerup to wait جب انھوں نے دیکھا کہ میں سیدھے سبھاؤ قابو میں نہیں آ رہا تو میری غیرت کو للکارا۔ اپنے آپ کو چنگیزی لکھتے ہو۔ چغتائی شہسواروں سے رشتہ جوڑتے ہو اور حال یہ ہے۔ غالب کی رگوں میں بھی منگول خون تھا۔ وہ تو کہہ گیا ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

چند دنوں کے بعد میں کوئٹہ واپس چلا گیا اور خطوط کے ذریعہ ان سے رابطہ رکھا۔ ایک دن بہت مایوسی کے عالم میں میں نے انھیں خط لکھا اور جو کرب اور اذیت محسوس کر رہا تھا، وہ سارے احساسات ان کے سامنے رکھ دیئے۔ اس خط کا فوری جواب آیا۔ لیکن بہت مختصر۔ صرف ایک شعر

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار شجر سایہ دار راہ میں ہے

اور نیچے شیلے کی یہ لائن تھی: If winter comes, can spring be far behind

اس مختصر خط نے مجھے حیرت انگیز طور پر ایک نئی امنگ اور توانائی دی۔ انکی وہ باتیں جو انھوں نے شیر

شاہ ہاؤس کے آفس میں کی تھیں۔ میرے تحت الشعور کی دہلیز پر دستک دینے لگیں۔ وہ عجب قبولیت کا لمحہ تھا جب میں وہ خط پڑھ رہا تھا۔ مختصر یہ کہ جدو جہد کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ 1980ء میں جب کوئٹہ میں ٹی وی سے اپنی سیریل ''ماں'' پروڈیوس کر رہا تھا تو مجھے راشد صاحب کا وہ فقرہ تمہاری منزل تخلیقی کاوشوں میں ہے۔ بار بار یاد آیا۔ بہرحال جب ٹی وی میں بھی بات نہ بنی تو سول سروس کی طرف جھانکا۔ پہلے پی سی ایس میں طبع آزمائی کی۔ اس میں کامیابی کے بعد جی چاہا کہ سی ایس ایس پر بھی ہاتھ ڈالوں۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں بھی سرخ رو کیا۔ جب چھ ہزار امیدواروں میں بارھویں نمبر پر آیا تو سجدہ شکر کے بعد میرا پہلا کام یہ تھا کہ اپنے مربی اور محسن کو اطلاع دی۔ ان کا انتہائی مختصر یک سطری جواب آیا۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

ایک اور خط میں لکھا:

''تم اب تک اپنی پوزیشن کو بہتر بنانے کی جدو جہد میں مصروف رہے ہو۔ یہ بھی اچھی چیز ہے۔ اب اپنی پرفارمنس کو بہتر بنانے اور بناتے رہنے پر concentrate کرو۔ انسان کی پہچان کام ہے مقام نہیں۔''

میں اپنی زندگی کے ہر تاریک لمحہ میں راشد صاحب تک پہنچا ہوں۔ اور انکی ذہین مادریت (Intelligent Motherhood) سے فیضیاب ہوا ہوں۔ ان کا یہ قول کہ بعض انسانوں کی حیثیت عطیہ خداوندی کی سی ہوتی ہے، ان کی ذات کے حوالے سے بھی صحیح سمجھتا ہوں۔ میں زندگی میں ہر کامیابی کے لئے ان کا مقروض ہوں۔ خدا جانے انھوں نے کتنی زندگیوں میں کتنے چراغ روشن کئے ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ اپنے بیوی بچوں کو بھی انکی زیارت کرائی۔ دوران گفتگو فرمایا:۔

> ''ممتاز! زندگی کی ہر کامیابی اور سرفرازی جہاں خدا کا کرم ہوتی ہے۔ وہاں اس کی حیثیت ایک آزمائش اور چیلنج کی بھی ہوتی ہے۔ جب کسی کو بی ٹیم سے اے ٹیم میں پروموٹ کیا جائے، تو اس پروموشن میں بہتر کھیل کی توقع بھی مضمر ہوتی ہے۔ اسی طرح لوگوں کی محبت اور انکی دی ہوئی عزت اپنے ساتھ کچھ توقعات لاتی ہے۔ ہر عقیدت اور ہر محبت ایک نئی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ میں تمہارے لئے نہیں اپنے لئے کہہ رہا ہوں۔''

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

راشد صاحب سے میں نے انٹرمیڈیٹ میں اردو پڑھی۔ کلاس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی خاصی چلتی تھی۔ ایک روز آرنلڈ کی کتاب "Culture and Anarchy" کا حوالہ دیا۔ اسکی کلچر کی

تعریف sweetness & light نوٹ کروائی اور اپنی طرف سے اضافہ کیا کہ یہ نہ صرف کلچر کی تعریف ہے بلکہ ایجوکیشن کا مقصود ومنشا بھی ہے۔میتھیو آرنلڈ سے بات اس کے بیٹے ڈاکٹر آرنلڈ آف رگبی تک پہنچی اور پھر پبلک اسکول کے رول اور اس سسٹم کی limits and limitations پر بحث کی 'ایجوکیشن اینڈ سوشل آرڈر' میں برٹرنڈ رسل نے پبلک سکولوں پر جو سخت تنقید کی ہے اس کا حوالہ دیا۔ای،ایم ٹریولین نے A Social History of England میں برٹش ایمپائر بلڈ کرنے میں انکے کردار پر روشنی ڈالی ہے اس کا ذکر کیا۔پھر ای ایم فارسٹر کے فقرہ under-developed heart پر بحث کی اور کہا کہ creativity,imagination اور heart کو develop کرنا اس پس منظر میں مقصود ہی نہ تھا۔

راشد صاحب نے پڑھایا بھی بہت اچھا، بہت گہرائی میں جا کر۔لیکن میرے ذہن پر جو تاثر ہے وہ انکی ہمہ گیر تربیت کا ہے۔کم وبیش پانچ سال میں نے انھیں کالج میں دیکھا۔دوسال ان سے کلاس میں باقاعدہ پڑھا بھی۔لیکن اس عرصے میں کبھی انہیں زور سے بولتے،غصہ کرتے یا زور سے کھلکھلا کر ہنستے نہیں دیکھا۔یوں جیسے restraint کو انھوں نے عادت ثانیہ بنالیا تھا۔اب جب کبھی میرا چنگیزی خون جوش مارتا ہے تو ان کا پر restraint چہرہ سامنے آجاتا ہے۔ان کی گفتگو کے علاوہ انکے لباس کی نفاست بھی ہمارے لئے مستقل طور پر ایک قابل رشک نمونہ رہی ہے۔وہ ملٹری کالج میں وقار،تہذیب،شائستگی اور جمالیاتی ذوق کی ایک بہت بڑی علامت رہے ہیں۔شعوری طور پر قائداعظم کے وہ زبردست مداح رہے ہیں۔قائداعظم پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔مجھے یقین ہے کہ لاشعوری طور پر وہ انھیں کے نقش قدم پر چلتے رہے ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار علی

(کالج نمبر 2948،زمانہ تعلیم 1965-1967ء)

ستمبر 1966ء کی بات ہے راشد صاحب موسیٰ ہال کے دائیں ونگ کے آخری کمرہ میں ہمارا (ٹیٹوریل گروپ) tutorial group لے رہے تھے۔ستمبر 65ء کے شہیدوں کا ذکر آ گیا۔گروپ میں خورشید عالم بھی تھا۔

اس نے پوچھ لیا آپ افتخار جعفر شہید کو جانتے ہیں؟

''جانتے ہیں! یہ تم کیا پوچھ رہے ہو؟ افتخار کو میں نہیں جانوں گا تو کون جانے گا؟'' ''سر وہ میرے انکل تھے۔''، ''اچھا''، راشد صاحب ایک دم خاموش ہو گئے اور بے حد اداس، کچھ دیر کے لئے ہم سب

اداس ہوگئے۔ پھر وہ دیر تک افتخار شہید کی باتیں کرتے رہے۔مظہر حسین شہید،علم الدین شہید، کا ذکر بھی کیا۔ ظاہر تھا کہ ان اولڈ بوائز کا غم انہوں نے ذاتی طور پر محسوس کیا ہے۔ میرا خیال ہے یہی ذاتی Involvement تھی جس نے ان سے ''تذکرہ شہدا'' جیسی کتاب لکھوائی۔

میجر جاوید مجتبٰے

(کالج نمبر 2984، زمانہ تعلیم 1966-1969ء)

کالج سے جانے کے چند سال بعد جب میں اپنے والد صاحب کے ساتھ دوبارہ کالج آیا تو راشد صاحب شیر شاہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں بیٹھے تھے۔ وہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے راشد صاحب سے صرف چند ہفتے فرسٹ ائر میں پڑھا تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت اس بات پر ہوئی کہ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا ہیلو مجتبٰے اور اس سے پہلے کہ میں والد کا تعارف کراؤں انہوں نے انکی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ آپ کرنل مصطفٰے ہیں نا۔ والد صاحب اکثر اس ملاقات کا ذکر کرتے تھے۔

میں کہا کرتا ہوں کہ راشد صاحب سویلین کپڑوں میں فوجیوں کے فوجی ہیں۔ چلت پھرت، لباس، وقت کی پابندی، قاعدوں کی پابندی thoroughness میں انہوں نے وردی والوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سخت سردی میں بھی کبھی انہیں اوورکوٹ، مفلر، دستانے پہنے یا ہاتھ پتلون یا کوٹ کی جیب میں ڈالے نہیں دیکھا۔ چال ایسی جیسے کڑی کمان کا تیر۔ جیسے وہ 1967ء میں تھے ویسا ہی چاق و چوبند انہیں 1987ء میں پایا۔ شخصیت کا یہ ظاہری پہلو بھی ملٹری کالج ایسے ادارہ میں خاص طور سے اہمیت رکھتا ہے۔

خالد محمود

(کالج نمبر 3009، زمانہ تعلیم 1966-1968ء)

راشد صاحب نے ''بارش کا قطرہ'' عنوان سے نظم پڑھائی تھی۔ وہ معلوماتی سے زیادہ تصوراتی چیزوں کو شوق سے پڑھاتے تھے۔ یہ اسی قسم کی نظم تھی، اس میں initiative کا جو پہلو ہے اسی کو انہوں نے موضوع بنایا۔ پہلا قدم اٹھانا جرأت کردار کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ انہوں نے ہمارے ادبی ذوق اور تنقیدی شعور کو بھی چمکایا۔ پوچھا کہ اس میں دو اہم مصرعے کون سے ہیں جو اس نظم کی جان ہیں۔ جن میں نظم کی تفہیم ہے۔ جو زندگی کے دو مسلم اصول ہیں۔ کئی جوابات آئے۔ آخر میں انہوں نے یہ جواب نکلوایا کہ اس نظم کا سب سے قیمتی مصرعہ یہ ہے۔

اپنی سی کرو بنے جہاں تک

اور ایک مسلمہ مشاہدہ:

دشوار ہے جی پر کھیل جانا

لیکن جو جی پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ دو تین پیریڈز میں اس نظم پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے انگریزی کی ایک quotation سنائی اور لکھوائی Distance is nothing, it's the first step that matters پھر کنفیوشس کا قول لکھوایا۔ ''لمبے سے لمبے سفر کی ابتدا پہلے قدم سے ہوتی ہے''۔ پہلا قدم' بارش کا پہلا قطرہ' اپنی سی کرو بنے جہاں تک، اس کو نوٹ کروایا اور کہا اس میں یہ اضافہ بھی کرو کہ اپنی سی کرو بنے جہاں تک اور اس میں دیر نہ کرو۔ جرأت سے پہلا قدم اٹھاؤ۔ زندگی میں جرأت رندانہ چاہیے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کے خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اس وقت جب علامتی اشعار کیا سادے اشعار بھی پورے طور پر سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ وہ ایسے استعاراتی شعر سناتے جاتے تھے اور پھر تشریح بھی کرتے تھے۔ مثلاً اس شعر کے بارے میں کہا کہ اس کی تھیم وہی ہے جو بارش کے پہلے قطرہ کی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ کریج (courage) سوشل ہے یہ انفرادی، پھر کریج (courage) پر بات ہوئی۔ کریج کی تینوں قسموں physical، moral، intellectual کا فرق بتایا اور انکی اضافی قدر و قیمت پر بحث کی۔

ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ مضمون نگار یا شاعر کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا کرتے تھے اور اکثر متعلقہ کتاب یا مجموعہ کلام بھی لا کر دکھاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انہوں نے ''حیات اسمعیل'' اور ''کلیات اسمعیل'' لا کر دکھائی اور اسکی بعض نظموں کے ٹکڑے بھی پڑھ کر سنائے۔

میرا خدا میرے ساتھ ہے

ہے ہمیشہ مری خدا پر نظر — رات ہو، دن ہو، شام ہو کہ سحر
نہ اجالے میں ہے کسی کا ڈر — نہ اندھیرے میں کوئی خوف و خطر

کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

لشکروں کی جہاں چڑھائی ہو — شہ سواروں نے باگ اٹھائی ہو
اور گھمسان کی لڑائی ہو — واں بھی ہیبت نہ مجھ پر چھائی ہو

کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

نہ تم ہچکچاؤ نہ ہرگز ڈرو جہاں تک بنے کام پورا کرو
مشقت اٹھاؤ مصیبت بھرو طلب میں جیو، جستجو میں مرو

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

جو تم شیر دل ہو تو مارو شکار کہ خالی نہ جائے گا مردوں کا وار
مشقت میں باقی نہ رکھنا ادھار جو ہمت کرو گے تو بیڑا ہے پار

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

جو بازی میں سبقت نہ لے جاؤ تم خبردار ہرگز نہ گھبراؤ تم
نہ ٹھٹکو نہ جھجکو نہ پچھتاؤ تم ذرا صبر کرو کام فرماؤ تم

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

مقابل میں خم ٹھونک کر آ وہاں پچھڑنے سے ڈرتے نہیں پہلواں
کرو پاس تم صبر کا امتحاں نہ جائے گی محنت کبھی رائیگاں

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

زیاں میں بھی ہے فائدہ کچھ نہ کچھ تمہیں مل رہے گا صلہ کچھ نہ کچھ
ہر ایک درد کی ہے دوا کچھ نہ کچھ کبھی تو لگے گا نیا کچھ نہ کچھ

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

تردد کو آنے نہ دو اپنے پاس ہے بیہودہ خوف اور بیجا ہراس
رکھو دل کے مضبوط قائم حواس کبھی کامیابی کی چھوڑو نہ آس

کئے جاؤ کوشش میرے دوستو

اور ایک نظم تھی:

اچھا زمانہ آنے والا ہے

تنے گا مسرت کا اب شامیانہ بجے گا محبت کا نقار خانہ
حمایت کا گائیں گے مل کر ترانہ کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
نہ ہم روشنی دن کی دیکھیں گے لیکن چمک اپنی دکھلائیں گے اب بھلے دن

رکے گا نہ عالم ترقی کیے بن   کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ

اسی طرح پوری نظم پڑھ کر سنائی۔اور کہا یہ ترجمہ ہے انگریزی کی نظم

There's a good time coming, boys
A good time coming
We may not live to see the day
But earth shall glisten in the ray

آ گے چل کر دسویں میں انگریزی کے نصاب میں نظم پڑھی تھی تو اسمٰعیل میرٹھی کا ترجمہ بہت یاد آیا اور بہت لطف آیا۔

میری نوٹ بک میں صرف ایک ایک مصرعہ درج تھا۔میں نے ''کلیات اسمٰعیل'' سے یہ تفصیلات نقل کی ہیں۔ایک اور مصرعہ بھی ان سے بار بار سنا تھا:

اٹھو سونے والو سحر ہو گئی ہے

یہ مصرعہ مجھے باوجود تلاش کے نہیں ملا۔اس مصرعہ میں انہوں نے 'سونے والو' اور 'سحر ہو گئی ہے' کو نئے معنی دیئے۔یوں مصرعہ پڑھا جیسے سونے والے ہم ہیں۔سارے پاکستانی ہیں۔سحر ہونے سے مراد طلوع پاکستان ہے۔راشد صاحب الفاظ کو علامتوں اور symbols میں بدل دیتے تھے۔یہ بالکل نیا انداز تھا۔سحر ہو گئی ہے کا دامن طلوع پاکستان سے ملانا انہی کا کام تھا۔اس طرح نظم کو وہ اس نئے تخلیقی انداز سے پڑھا کر ذہن کے دریچے کھولتے تھے۔اس طرح provocative انداز میں پڑھاتے تھے کہ ذہن کتاب کے صفحات سے نکل کر زمان و مکان میں جست بھرنے لگتا تھا۔

حامد ملک

(کالج نمبر 3087،زمانہ تعلیم 1967-1972ء)

راشد صاحب کا نام آئے اور بات شیر شاہ ہاؤس سے شروع ہو تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔شیر شاہ ہاؤس میری انٹری سے 16 اگست 1967ء کو قائم ہوا تھا۔شروع میں نئی انٹری سے چالیس چھوٹے لڑکے چھانٹے گئے تھے اور نویں سے چار سینئر کیڈٹس ظفر اقبال، اشفاق، قمر زمان اور شوکت لئے گئے تھے۔یہ بنیادی طور پر مسٹر حیدری کا پراجیکٹ تھا جو کمانڈانٹ کرنل مرتضیٰ کی سرپرستی سے شروع ہوا۔جس سے کالج میں بلکہ پاکستان میں پبلک سکول کی تاریخ میں ایک نئے تجربہ کا آغاز ہوا۔یعنی ایک پورا ہاؤس صرف نئی انٹری کے جونیئرز کے لئے مخصوص کرنا اور پھر ان کو ایک کھلی فضا اور گھر کے سے ماحول میں زیادہ سے زیادہ

concentration کے ساتھ culturally, educationally اور leadership کے لحاظ سے expose اور develop کرنا۔ یہ بہت اچھا پراجیکٹ تھا۔ (اسکا ثواب حیدری صاحب اور مرتضیٰ صاحب کو ہمیشہ ملتا رہے گا۔) لیکن اس کو عملی طور چلایا راشد صاحب نے۔ دسمبر 67ء ہی میں انہوں نے بحیثیت ہاؤس ماسٹر چارج لے لیا تھا۔ اس سے پہلے چند ماہ اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر رہے تھے۔ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں پہلا لیکچر غالباً، 22 اگست 67ء کو لیفٹیننٹ کرنل حق نواز کیانی (ستارہ جرأت) نے دیا تھا اور 65ء کی جنگ میں کشمیر میں اپنے ستارہ جرأت کے کمانڈو ایکشن کی تفصیلات بتائی تھیں۔ ہاؤس کی وزیٹرز بک پر بھی پہلے دستخط انہی کے تھے، یہ بڑی اچھی ابتدا تھی۔ گویا ہاؤس کا افتتاح کالج کے ایک نامور اولڈ بوائے اور ملک کے نامور مجاہد نے کیا۔

چندسال پہلے الہٰ آباد کالونی ویسٹرج میں جب ہمارا مکان بن چکا تو میں نے اصرار کیا کہ پورچ کے ساتھ بوگن ویلیا کی بیل ضرور لگائی جائے۔ اسی طرح اپنے ڈرائینگ روم میں چنبیلی یا اس سے ملتے جلتے ڈیزی کے پھولوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ گلاب تو خیر ہر گھر میں ہوتا ہی ہے، لیکن پیازی گلاب، بوگن ویلیا اور چنبیلی کے پھول یہ شیر شاہ ہاوس کی یادیں ہیں۔

اس طرح بنک میں داخل ہوتے وقت میں شوز کی طرف ضرور دیکھتا ہوں کہ کہیں گرد تو نہیں۔ کسی نے پوائنٹ آؤٹ کیا تو مجھے یاد آیا کہ راشد صاحب کلاس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے شوز کو چیک کیا کرتے تھے۔ اگر ذراسی بھی گرد ہوتی تو فوراً جیب سے ٹشو پیپر نکال کر پہلے صاف کرتے پھر اندر آتے۔ اس زمانہ میں انکی اس عادت کو بے شمار شاگردوں نے نوٹ کیا ہوگا۔ ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔ ایک روز ہم چند اولڈ بوائز بیٹھے یہ ڈسکس کر رہے تھے کہ شیر شاہ ہاؤس کی کون کون سی بات کس کس نے اب تک اپنائی ہوئی ہے تو اختر نے کہا کہ مجھے تو سر راشد کی ایک بات بہت اچھی لگتی تھی کہ اپنی تمام مصروفیت کے باوجود وہ آنٹی کے ساتھ رات کے پریپ کے وقت کم از کم آدھ گھنٹہ ضرور ہاوس کے سامنے کے راستہ پر ٹہلتے تھے۔ ان کے ٹہلنے کے انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ دونوں میں شدید محبت ہے۔ میں شیر شاہ ہاوس کی ہر بات بھول بھال چکا ہوں۔ صرف یہ تاثر باقی ہے جس نے میری گھریلو زندگی میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔

مجھے والد صاحب کے کاغذات میں ایک کانفیڈینشل لیٹر ملا ہے جو راشد صاحب نے لڑکوں سے بالا بالا ان کے پہلی چھٹی پر گھر جانے کے بعد انکے والدین کو بھیجا تھا۔ میں اسکی فوٹو کاپی منسلک کر رہا ہوں تا کہ پبلک اسکول کی تاریخ میں سند رہے کہ کوئی ہاوس ماسٹر ایسا بھی تھا۔

Confidential /Personal

(To be sent to the House Master' Sher Shah house by name)

1. No_________
2. Name______________
3. Date of Admission______________
4. Age ______________
5. what was his reaction to the College and House in the first few weeks?
    a. Was he homesick? Degree of homesickness?
    b. Did he ever fuss over leaving for the College ?
    c. What was the nature of his complaints?
    d. Have you preserved any of his first letters?
    e. What were your own views of his reactions? How did his mother take his sob-tales, if at all?
    f. After how long did he stop writing frantic letters?
    g. What was the frequency of his letters in the beginning? (How many in one week)?
    h. How often does he write home now?
    j. How does he feel now?
    k. What do you think? have the causes of original complaints disappeared or has he learnt to live with them? or is it that he does not bother about them any more?
    l. What is the general tenor of his talk about the College / the House? Does he feel proud of it or ashamed of it or indifferent?
6.
    a. What are his main demands as soon as he reaches home? Does he want dishes of his choice, or more money? if so, what for? or does he dash out to meet his old friends/ relatives?
    b. What is he most interested in doing while at home? (idling, sleeping, T.V. cinema, visiting friends &

relatives, in some hobby etc)?

c. Does he get up on his own and at what time?

d. Does he say his morning prayers on his own?

e. Does he do any morning exercise?

f: Does he make his own bed after gettting up?

g. Does he shine his own footwear?

h. How often does he take a bath?

7.

a. Do you find him more or less responsible than he was before?

b. More co-operative or less co-operative?

c. More quarrelsome or less quarrelsome?

d. More obedient or as before?

8.

a. Does he study on his own or has he to be coaxed into studying?

b. Has he any active hobby?

c. Do you find him more confident?

d. Is he able to make a speech now? Or could he do it before too?

e. Does he read any newspaper regularly?

f. Has he a personal collection of books? Of what kind? and how many?

9. Does he realize that mostly the nation is paying for his education? Does he know its implications? Is he patriotic in his outlook?

10. What is your own feeling about him? Is he coming up? What is your own ambition about him?

11. Any other special observation?

Signature_________________

Name ___________________

Relationship _____________

Dated ____________

میجر احمد نواز ملک

(کالج نمبر 3206، زمانہ تعلیم 1968-1973ء)

باتیں تو بے شمار ہیں لیکن تبرک کے طور پر صرف ایک واقعہ لکھوں گا۔ راشد صاحب سے میرے والد مرحوم کی خاص یاد اللہ تھی۔ جب میرا میٹرک کا نتیجہ آیا تو انہوں نے میرے والد کو خط لکھا۔

رب نواز صاحب
احمد نواز کا اے گریڈ میں پاس ہونا مبارک ہو۔ لیکن یہ بھی ہے کہ سونا چاندی کے بھاؤ بک گیا۔'' اس ایک فقرے میں جو معنی خیز تبصرہ پنہاں ہے اس نے زندگی کے سفر میں میری مسلسل راہنمائی اور حوصلہ افزائی کی ہے۔

میجر وجاحت حسین

(کالج نمبر 3216، زمانہ تعلیم 1968-1973ء)

بس چھٹی ایک ایسی چیز تھی جس کے معاملے میں راشد صاحب ذرا سخت تھے۔ اور سب باتیں دھیمی مسکراہٹ سے ٹال دیتے تھے لیکن چھٹی کا نام آتے ہی ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کی ہلکی سی شکن دیکھی جا سکتی تھی۔ ایک بار میری والدہ آئیں اور انہوں نے خاندان میں کسی شادی کا ذکر کیا۔ میں مچل گیا کہ ضرور جاؤں گا۔ (واضح رہے کہ اس وقت آٹھویں درجہ میں داخل ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے اور غالباً چھٹی جانے کی نفسیاتی وجہ کچھ اور تھی) کون ماں اپنے بچے سے لاڈ نہیں کرتی جبکہ بچہ کسی چیز کے لئے مچل بھی رہا ہو۔ اتوار کا دن تھا۔ حسب معمول راشد صاحب ہاوس کے دفتر ہی میں بیٹھے تھے۔ وہ انکے پاس گئیں۔ وہ انکو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہا '' پہلے آپ میری بیگم سے ملئے''۔ ان کو لے کر اندر گئے، وہاں آنٹی سے تعارف کرایا۔ خوب خاطر تواضع ہوئی۔ اسکے ساتھ ساتھ میری تعریف بھی کرتے رہے۔ اچھا بچہ ہے، خوش مزاج ہے۔ دل لگ گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ (حالانکہ اندر کا حال میں ہی جانتا تھا) لیکن جب والدہ حرف مدعا زبان پر لائیں کہ خاندان میں ایک شادی ہے۔ وجاہت کو چھٹی ....، ابھی انہوں نے جملہ بھی پورا نہیں کیا تھا کہ راشد صاحب کا انداز یکسر بدل گیا۔ ترجیحات پر، بچہ کے مستقبل پر۔ بے جا لاڈ کرنے کے نقصانات پر، اتنا لمبا لیکچر دیا کہ وہ دم بخود رہ گئیں۔ منجملہ اور بہت سی باتوں کے ایک جملہ یہ تھا کہ ابھی تو پنیری اس نئی کیاری میں لگی ہے۔ آپ اسے جمنے کا موقع بھی دیں۔ آپ اس شادی کی بات کر رہی ہیں۔ ہم خود اسکو مستقبل میں شاد و آباد کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ چھٹی انہیں نہ دینا تھی نہ دی۔ اس وقت تو

والدہ بھی کچھ دل برداشتہ سی ہوئیں۔لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کا مشورہ صائب تھا کہ بچے کی needs اور wants (ضرورت اور خواہش) میں فرق ہوتا ہے۔ بچہ تو یہ فرق نہیں سمجھ سکتا، والدین کو تو سمجھنا چاہیے۔ جب میں گھر سے آیا تھا تو ایک بے حد شرمیلا تنہائی پسند لڑکا تھا۔ یہ راشد صاحب کی جوہر شناس نظر کا کرشمہ تھا کہ انہوں نے بہت جلد میرے اندر کے فنکار کو تلاش کر لیا اور ہاؤس فنکشنوں کے ذریعہ اسے اس طرح پروان چڑھایا کہ آئندہ چار سال میں کالج کے اسٹیج پر گلوکاری اور اداکاری کرتا رہا۔ دو بار بہترین اداکار کا انعام بھی ملا۔ یہ کرامت شیر شاہ ہاوس یعنی راشد صاحب کی تھی۔

ہماری ذہنی اور فنکارانہ آبیاری ہی نہیں کردار سازی بھی راشد صاحب کے شیر شاہ ہاوس نے کی۔ شیر شاہ ہاؤس کی آنر لائبریری اور آنر شاپ کے اثرات کو میں نے مدتوں بعد محسوس کیا۔

میجر پرویز خالد بابر

(کالج نمبر 3231، زمانہ تعلیم 1974-1969ء)

شیر شاہ ہاوس میں سر راشد کی نگہداشت ہمہ گیر تھی۔ انہوں نے 74- 1973ء میں میری ہاؤس پریفیکٹی کے اواخر میں صحت کے بارے میں لڑکوں کو ایک Precis دی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کس (calibre) کے ہاؤس ماسٹر تھے۔

کیپٹن سجاد اصغر

(کالج نمبر 3255، زمانہ تعلیم 1974-1969ء)

اپریل 1987ء میں جہلم گریژن میں راشد صاحب کو جہلم زون کے اولڈ بوائز کی ایک غیر رسمی میٹنگ میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ انہیں کالج کی تاریخ کے سلسلہ میں کچھ معلومات بھی حاصل کرنا تھیں۔ کرنل غلام علی نے مجھے ان کا کنڈکٹنگ آفیسر مقرر کیا۔ چنانچہ وقت مقررہ پر میں جیپ میں انکو لینے گیا۔ راشد صاحب گھر سے نیوی بلیو سوٹ لائٹ بلو ٹائی میں باہر آئے تو مجھ سے کہا ''اصغر صرف ایک منٹ!'' میں سمجھا کہ شاید کوئی چیز بھول آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے کیا یہ کہ پھولوں کی کیاری سے گلاب کی ایک چھوٹی سی کلی توڑی اور کوٹ کے لیپل میں لگا لی اور مسکرا کر کہا۔ ''نوجوانوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ کوئی چیز تو تازہ ہو۔''

میجر ظفر محمود طاہر

(کالج نمبر 3257، زمانہ تعلیم 1973-1969ء)

میں شیر شاہ ہاؤس کی دوسری انٹری میں تھا۔ اس وقت ڈارمز کے نام سپارکس ، ہیرالڈز، ایگلز اور ریڈئنٹس تھے۔ ایس ایچ ای آر، ان چار حروف سے لفظ شیر بنتا ہے۔ یہ نام شیر شاہ ہاؤس کے پہلے ہاؤس ماسٹر مسٹر حیدری نے رکھے تھے۔ انہوں نے شیر شاہ ہاؤس کا سانگ:

We are the boys of Sher Shah House:

Sher Shah House

Sher Shah House

We are the boys of Sher Shah House:

Great House! Great Boys!

لکھا تھا۔ جسکی دھن London Bridge is falling down, falling dowing پر بنائی گئی تھی۔ یہ سانگ ہم ہر روز لائٹس آؤٹ سے پہلے گاتے تھے۔ اس میں ہر ڈارم کے لئے ایک ایک بند تھا۔ اور صبح سویرے فجر کی نماز کے بعد

'خودی کا سرِ نہاں لا الہ الا اللہ' کورس میں گایا جاتا تھا۔

جاڑوں میں رضائیاں ٹرنک میں جمع رہتی تھیں۔ لائٹس آوٹ کے فوراً بعد چاروں ڈارمز فالن ہوتی تھیں۔ اندر ہر ڈارم کی رضائیاں علیحدہ علیحدہ رکھی ہوتی تھیں۔ شام جس ترتیب سے ڈارمز اپنی اپنی رضائیاں نکالتی تھیں، صبح کو اس سے الٹ ترتیب سے رکھی جاتی تھیں۔ رضائیاں رکھنے اور نکالنے کی دونوں drills کے وقت راشد صاحب اکثر خود موجود ہوتے تھے۔

دوسری بات جو اس وقت کی میرے ذہن میں اب تک تازہ ہے وہ گرمیوں میں سہ پہر کی پہلی پریپ ہمیشہ خود سر راشد سپروائز کرتے تھے۔ کبھی اپنے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کی ڈیوٹی نہیں لگائی کہ آپ چیک کریں۔ عموماً ساڑھے تین بجے پریپ شروع ہوتی تھی۔ تین بج کر 20 منٹ پر ہاؤس آفس میں جاتے تھے۔ 3 بج کر 25 منٹ پر ہاؤس کیپٹن ان سے آرڈرز لینے آتا تھا اور آنے سے پہلے گیٹ ریڈی فار پریپ کی وسل کر دیا کرتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی دونوں ونگ کیپٹن اپنے اپنے ڈارم کیپٹنز سے ''سب ٹھیک'' اور 'تیار' کی رپورٹ لیتے تھے۔ اس طرح ہر روز بروقت پریپ شروع ہو جاتا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ خود آتے تھے پھر اپنے ہاؤس کیپٹن کو بلاتے تھے۔ اسکے بعد ساری مشینری چل پڑتی تھی۔ کمانڈ اینڈ کنٹرول کا یہ بنیادی سبق ہم نے سیکھ لیا اور پتہ بھی نہیں چلا۔

ہاؤس کیپٹن کا کمرہ انکے دفتر اور لائبریری کے ساتھ ہی تھا۔ میں نے کبھی انہیں اسکے کمرہ کے سامنے سے گزرتے نہیں دیکھا۔ دھوپ اور بارش میں بھی صحن سے گزر کر آتے تھے۔ یہ اسکا regard تھا۔

دوسری طرف اس کو حکم تھا کہ ریسٹ کے وقت کے سوا ہمیشہ اپنا کمرہ کھلا رکھے۔ان کا اصول تربیت یہ تھا کہ پریفیکٹس اور کیپٹن کی بے انتہا عزت تھی،لیکن ان پر کڑی نظر رکھتے تھے۔

راشد صاحب کم وبیش ہر مہینے کسی نہ کسی مشہور معروف اولڈ بوائے سے ہماری ملاقات کرواتے تھے۔ اکتوبر 68ءکی ری یونین کے موقع پر اے.جی،میجر جنرل خدادادخاں بھی ہمارے ہاؤس میں آئے تھے۔

میجر عرفان الرشید

(کالج نمبر 3271،زمانہ تعلیم 1974-1969ء)

74 - 1973ء میں سیکنڈ ائیر میں راشد صاحب نے ہمیں انگریزی پڑھانی شروع کی۔ایک روز کسی سلسلہ میں ُBohemian ' کا لفظ آ گیا،اسکی تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ تخلیقی فنکاروں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ان کے اندر کی تخلیقی آگ انہیں روایتی پابندیوں سے آزاد رکھتی ہے۔اسی سلسلہ میں بتایا کہ ابھی پچھلے دنوں میں لاہور میوزیم میں صادقین سے نیاز حاصل کرنے گیا۔ان کے آگے کافی کی چار پانچ پیالیاں آدھی پونی بھری پڑی تھیں اور رنگ ان کے سامنے بکھرے ہوئے تھے وہ ان دنوں سورۃ رحمٰن کی خطاطی کر رہے تھے۔اتنے میں کسی گرلز کالج کی بے حجاب خواتین کا ایک ہجوم آیا۔وہ اس جھرمٹ میں ایسے کھوئے کہ مجھ غریب پر توجہ دینا ہی بھول گے۔''تو سر،ان پر پھر آپ کو بڑا رشک آیا ہوگا'۔وہ یہ سن کر سنجیدگی سے مسکرائے پھر خاموش ہو گئے۔ مجھے ایکدم احساس ہوا کہ مجھ سے گستاخی سرزد ہوگئی ہے۔لیکن ان کی زیادہ سے زیادہ تنبیہہ یہی تھی کہ وہ غور سے دیکھ کر خاموش ہوجاتے۔شرارتی یا کم حس لڑکے کس کلاس میں نہیں ہوتے۔کبھی کسی سے دانستہ یا نادانستہ کوئی ناروا بات ہوبھی گئی تو راشد صاحب نے ہمیشہ بڑے وقار سے اسے نظرانداز کیا۔اور تنبیہہ کی تو اپنی خاص خاموشی سے اور نظر بھر دیکھ کر۔جسکی تاب لانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ ان کا علم اپنی جگہ لیکن ہم نے انکی شخصیت سے جو کچھ سیکھا،وہ متاع بے انتہا ہے۔

شاہد سہیل

(کالج نمبر 3328،زمانہ تعلیم 1975-1970ء)

اپریل 1970ء میں، میں شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوا تھا تو کچھ زیادہ ہی ہوم سک (homesick) تھا۔روتے روتے پورا دن گزر گیا۔آنٹی میری ڈارم کیانی شہید ڈارم میں آئیں،انہوں نے بھی سمجھایا اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔کچھ کھلایا پلایا لیکن میں نے ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی کہ گھر جانا ہے۔راشد صاحب پہلے تو روٹین میں سمجھاتے رہے لیکن جب میں نہ مانا تو انہوں نے باقاعدہ دفتر میں بلا کر انٹرویو کے انداز میں

باتیں کیں۔انکی ایک دلیل مجھے اب بھی یاد ہے۔''دیکھو پنیری ایک جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگائیں اور اسے صبح شام نکال کر دیکھتے رہیں کہ جڑیں جمی یا نہیں، تو کیا ہوگا۔؟ پھر یہ عزت کا سوال بھی ہے۔دوسرے بچے کیا کہیں گے کہ یہ شاہد تو بالکل ہی دودھ پیتا بچہ ہے۔سب ہی اپنے اپنے گھروں سے اپنی اپنی ماؤں سے بچھڑ کر آئے ہیں۔لیکن کوئی اس طرح تو نہیں کر رہا''۔ یہ سن کے مجھے کچھ غیرت آئی۔میں نے اپنے آنسو روکے۔پھر انہوں نے پوچھا۔تو کوئی نظم سنا سکتے ہو؟ میں نے کہا''جی ہاں! 'بچہ کی دعا' سنا سکتا ہوں''۔کہنے لگے''رات کھانے کے بعد آج ہم 'ماں کا خواب' نظم پیش کر رہے ہیں تم اس میں بچہ کا کردار کرنا۔چنانچہ کچھ دیر بعد 'ماں کا خواب' کا ریہرسل شروع ہوا تو میں نے بچہ کا پارٹ:

رلاتی ہے تجھ کو جدائی میری	نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی میری
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے	ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

بڑے شوق سے ادا کیا۔فنکشن کے بعد انعام میں مجھے بھی بسکٹ کا ایک ڈبہ ملا۔سوتے سوتے میری ہوم سک نیس کے بادل چھٹ گئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔

میں نے راشد صاحب سے ایک سال اردو بھی پڑھی۔اس دوران بظاہر چھوٹا سا ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے عملی زندگی میں میری شعوری لاشعوری طریقے سے راہ نمائی کی ہے۔وہ واقعہ یوں ہے کہ وہ کلاس میں سرخ قلم سے کاپیاں دیکھ رہے تھے، جب میری کاپی کی باری آئی تو قلم کی سرخ روشنائی ختم ہونے لگی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ سرخ قلم تلاش کروں لیکن انہوں نے خاموشی سے اپنے کوٹ کی دوسری جیب سے ایک سرخ پنسل نکالی اور کاپی کو دیکھنا جاری رکھا۔میں نے قدرے تعجب کا اظہار کیا تو بولے ایمرجنسی کے لئے ہمیشہ تیار رہنا چاہیے۔اب یہ میری زندگی کا راہ نما اصول ہے گھر سے باہر نکلوں، کار پارک کروں یا دفتر کا کوئی کام ہو۔میں ایمرجنسی کو ہمیشہ ملحوظ رکھتا ہوں۔اسی طرح ایک بار جب کالج گرمیوں کی چھٹیوں کے لئے بند ہو رہا تھا تو انہوں نے مجھ سے بحیثیت کلاس کمانڈر کہا تھا''شاہد یہ چاک کا ڈبہ اور ڈسٹر اسٹیشنری اسٹور میں جمع کرا آؤ۔تا کہ ضائع نہ ہو اور ہاں آخری پریڈ کے بعد بلیک بورڈ کو صاف کر کے جانا''۔

سی ڈی اے میں بحیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر میرے کام کی نوعیت ایسی ہے کہ لاکھوں کروڑوں کی مشینری اور دوسرا سامان میرے دائرہ کار میں ہوتا ہے۔آپ یقین کریں راشد صاحب کے وہ الفاظ ''تا کہ ضائع نہ ہو'' میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ چھٹی کے بعد بلیک بورڈ صاف کر کے جانے کی نصیحت کرنے میں سلیقہ اور ذمہ داری کا جو aspect جو attitude ہے معلوم نہیں اس نے کلاس کے کتنے لڑکوں کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہوگا۔ایک عام استاد جس نے صرف تدریس کی ہو وہ بہت جلد

out-dateاور irrelevantہو جاتا ہے۔اس سے آگے وہ استاد ہوتا ہے جو معلم ہو۔ جو علم کی حدوں کو آگے بڑھائے لیکن ایک منزل اس سے بھی آگے کی ہے۔ وہ استاد جو مدرس، معلم کے ساتھ ساتھ مربی اور مرشد بھی ہوتا ہے جو قدروں، رویوں کی تشکیل اور تعمیر کرتا ہے۔ اصل کام یہ ہے۔ راشد صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اس خدمت کو بجالانے کی قابلیت اور توفیق دی۔ اس لحاظ سے وہ یقیناً خوش بخت انسان تھے۔

کیپٹن رب نواز

(کالج نمبر 3375، زمانہ تعلیم 1975-1970ء)

شیر شاہ ہاؤس میں آئے ہوئے چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ اے وی سی نے سیٹی بجائی کہ ہاؤس فال ان۔ ہاؤس فال ان ہو گیا تو پھر حکم ملا کہ کاپیاں پنسل لے کر آؤ۔ کاپیاں پنسل لے کر ہاؤس کے اکرم شہید نشاں حیدر آڈیٹوریم میں جمع ہوئے تو راشد صاحب نے سوالات لکھوانے شروع کئے۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ سوالات کس قسم کے ہونگے؟

’’G.K، کے‘‘؟

’’جی نہیں‘‘

’’اقبال کوئز کے؟‘‘

’’جی نہیں‘‘

’’تو پھر؟‘‘

سوالات کا عنوان تھا۔’’اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟

راشد صاحب نے کوئی پینتیس سوال لکھوائے۔ جن میں بجلی کا جھٹکا لگنے سے لے کر بس میں سفر کرتے ہوئے کسی اجنبی کے کوئی کھانے کی چیز آفر کرنے اور گھر کا پتہ پوچھنے تک ان تمام جسمانی اور نفسیاتی امکانی خطرات کا ذکر تھا۔ جن سے کوئی آٹھویں نویں کا لڑکا دوچار ہوسکتا ہے۔

اس فہرست میں بعض بے حد دلچسپ سوال تھے۔ جن پر عام طور پر بچوں کی راہ نمائی نہیں کی جاتی۔ سوالات لکھوانے کے بعد انہوں نے ان احتیاطوں پر لیکچر دیا جو ہاؤس میں، کلاس میں اور کالج سے گھر آتے جاتے اور ملتے جلتے کرنی چاہئیں۔ لیکچر کے آخر میں انہوں نے فیروزسنز کی چھپی ہوئی ایک کتاب ’’بچوں کے خطرے‘‘ دکھائی اور کہا اسکی تین کاپیاں ہاؤس کی لائبریری میں رکھ دی گئی ہیں۔ اسکو ضرور پڑھیں۔

ایک روز ہاؤس کی انسپکشن کر رہے تھے۔ انتہائی باریک بینی کے ساتھ۔ کہنے لگے یہ بھی ایک ایکسر

سائز ہے۔ ترتیب و تنظیم کا سبق سیکھنے کی۔ صاحب زادگل ڈارم میں لڑکوں نے ایک گلدان میں کچھ پھول ٹھونس رکھے تھے۔ انہوں نے پھولوں کی ترتیب بدلی اور کہا کلیاں اور پھول اس طرح باہمی ترتیب سے رکھئے۔ organize کرنے سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ کتابیں بھی ڈیسک پر رکھیں تو ایک ترتیب سے رکھیں۔ باہر کا حسن خود آپ کے اندر آ جائے گا اور اندر کا حسن باہر آ جائے گا۔

ناصر مقصود قاضی

(کالج نمبر 3374، زمانہ تعلیم 1970-1975ء)

''سویٹ ڈش کب کھاتے ہو۔ کھانے سے پہلے یا کھانے کے بعد''؟

''سر کھانے کے بعد''

ناشتہ میں کیا لیتے ہو''؟

''ٹوسٹ، مکھن، جام''

''جام سے پہلے کیا چاہیے؟''

''ٹوسٹ''

''اور آئس کریم سے پہلے''

''سر، کھانا''۔

''دال میں گھی کا تڑکا لگانے سے پہلے''

''دال''

''تو۔ میاں قاضی تم سمجھ گئے ہو گے کہ پہلے تمہیں امتحان پاس کرنا ہے پھر تقریر اور ڈراما کا تڑکا لگانا ہے۔ پہلے تعلیمی کمزوری دور کرنا ہے پھر فلم کی سویٹ ڈش اور پھر چھٹی کی آئس کریم چلے گی، سمجھ گئے؟''

''سر''

''میرا مطلب ہے میاں قاضی۔ آج سے فلم کی چھٹی...... یہاں دفتر میں آ کر میرے سامنے اسپیشل پریپ کیا کرو۔''

یہ وہ مکالمہ ہے جو 1970ء کے پہلے ٹرمینل امتحان میں انگریزی میں فیل ہونے پر میرے اور سر راشد کے درمیان ہوا۔ چنانچہ اس روز سے میں تعلیمی قیدی بنا دیا گیا۔ چونکہ میں فیل خود راشد صاحب کے مضمون انگریزی میں ہوا تھا۔ اس لئے اسکی ایکسڑا کوچنگ بھی انہوں نے اپنے ذمہ لی۔ شکر ہے کہ یہ قید، قید

تنہائی نہیں تھی۔ چند اور ساتھی بھی تھے۔ جنہیں دوسرے مضامین میں فیل ہونے پر یہ سزا سنائی گئی تھی۔ لیکن بیچ میں ایک آدھ بار فریاد بھی کی، خصوصاً جب دوسرے ساتھی سینما کی ''عیاشی'' کرنے جاتے تو اور بھی غصہ آتا۔ (اس وقت یہ خیال نہ آتا کہ وہ خود کو بھی ہماری خاطر اس عیاشی سے محروم رکھے ہوئے ہیں)۔ مختصر یہ کہ دل ہی دل میں کڑھتے اور بددعائیں دیتے دوسرا ٹرمینل امتحان آ پہنچا۔ جب رزلٹ آیا تو 42ویں پوزیشن سے گیارہویں پوزیشن پر آیا۔ باقی مضامین تو پہلے سے اچھے تھے۔ صرف انگریزی کا مسئلہ تھا۔ جس کو سر راشد نے زبردستی ٹھیک کرایا۔ اللہ اکبر!!

آٹھویں میں راشد صاحب نے ایک پیریڈ ڈرامے کا بھی رکھا ہوا تھا۔ ہم کلاس میں "the Red Jewel" کررہے تھے۔ اس میں ایک کردار باب (Bob) کا تھا۔ جو بھیس بدل کر ہیرا اٹھانے آتا ہے۔ باب کا پارٹ افتخار کررہا تھا۔ جب ڈراما کرتے کرتے کھڑکی سے باہر کودا تو تقریباً چیف انسٹرکٹر کرنل سلیمی پر جاگرا جو ادھر سے گزر رہے تھے۔ وہ بہت غصے میں اندر آئے کہ کیا ہورہا ہے۔ سر راشد نے قطعاً ان کا نوٹس نہ لیا۔ جب دیکھا کہ ڈراما ہورہا ہے (بورڈ پر لکھا ہوا بھی تھا) تو کچھ دیر پیچھے کھڑے ہوکر ڈرامے کو دیکھتے رہے۔ پھر Well done کہتے ہوئے چلے گئے۔

سر راشد کے سامنے کوئی لڑکا بڑی سے بڑی غلطی کرے وہ اسے اشارتۃً کنایتۃً بھی discourage نہیں کرتے تھے۔ اور نہ کرنے دیتے تھے۔ ایک بار طارق محمود (نک نیم ایتھلیٹا (Athleta) چونکہ وہ 200 میٹر اور 400 میٹر ریس میں مستقل فرسٹ آتا تھا) ایک تقریر کررہا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ تقریر اس سے کرائی جارہی تھی۔ (راشد صاحب ''جابر'' بھی تھے) تقریر میں ایک لفظ (huge) ہیوج آیا۔ وہ غریب گھبراہٹ میں ہجوج کہہ گیا۔ کچھ لڑکے بے اختیار ہنس پڑے، انکی طرف انہوں نے بڑی تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ اور خود بڑے سکون سے سنتے رہے۔ جب ریویو کرنے کھڑے ہوئے تو ایتھلیٹا کی تعریف بھی کی۔

اکثر کہا کرتے میری نظر تمہارے مستقبل پر ہے۔ اس وقت پر جب میں خود مٹی میں مل چکا ہوں گا۔ ان کے اس فلسفہ نے ہمارا ناک میں دم کررکھا تھا۔ مثلاً وہ اصرار کرتے کہ اتوار کی صبح کو بھی سلیپنگ ڈریس ہی میں دس منٹ کے لئے صحن میں یا اگر موسم اجازت نہ دے تو ڈارمیٹری ہی میں کچھ ایکسرسائز ضرور کی جائے۔ بے شک ذرا دیر سے لیکن ایکسرسائز کا روٹین نہ ٹوٹے۔ اسکا فائدہ آج نہیں تو آج سے پچاس سال بعد ضرور محسوس کروگے۔ ایک روز کلاس میں ایک کتاب دکھائی (Health & Longevity) ''صحت اور درازیِ عمر'' اور کہا موقع ملے تو اسے پڑھنا۔ وہ تو میں نہ پڑھ سکا اور نہ پھر وہ کتاب ملی۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا میں

اپنے انکل کے کمرہ میں پڑی امراضِ قلب پر ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا تو یہ پڑھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ فاضل مصنف نے تواتر سے اکسر سائز کرنے پر بڑا زور دیا تھا۔

ایک بار پھر سر راشد یاد آئے اور آنکھوں میں آنسو!

فلائٹ لیفٹیننٹ جاوید قمر
(کالج نمبر 3387، زمانہ تعلیم 1970-1975ء)

ہوم ورک ہو یا کوئی اور کام، راشد صاحب اس سلسلہ میں ایک فقرہ اکثر کہا کرتے تھے:

"What you do is of course important , but how you do it is still more important" چونکہ what یہیں کلاس میں رہ جائے گا لیکن how ایک attitude کے طور پر تمہارے ساتھ جائے گا۔ بلکہ زندگی بھر ساتھ چلے گا۔ ایک بار کلاس میں ایل۔ای۔ایس کی کوئی ایکسر سائز کرنے کو دی۔ میرے دو ایک جوابات غلط تھے۔ ان کو انھوں نے کراس کیا اور آخر میں گڈ لکھا۔ میں حیران ہوا تو کہا تمہارا 'واٹ' غلط ہے لیکن 'ہاؤ' ٹھیک ہے۔ تم نے جس نفاست سے سوالوں کے نمبر لکھے ہیں اور جس طرح جملوں کے آخر میں فل اسٹاپ لگائے ہیں یہ گڈ اس کا ہے۔ تمہارا مستقبل محفوظ ہے اور انشاءاللہ تمہارے ہاتھوں میں پاکستان کا مستقبل بھی محفوظ ہوگا۔ پھر انہوں نے ایک چٹ پر مجھے 25 پیسے کی ٹافیاں انعام میں لکھ کر دیں۔ یہ واقعہ 1972ء کا ہے۔ میرے پاس ندیم بیٹھا تھا۔ اس نے فٹ رولر رکھ کر کاپی سے سلیقے سے چٹ پھاڑ کر دی تھی۔ اس کو بھی سلیقے سے چٹ پھاڑنے کا انعام ملا۔

ایک روز میں ہاؤس لائبریری سے ''حاتم طائی کی بیٹی'' نامی کتاب لے کر نکلا تو انہوں نے کتاب میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے لیکن کسی دن یہ بھی دیکھ لینا (وہ کتاب جس کی طرف انھوں نے اشارہ کیا فیروز سنز کی چھاپی ہوئی کتاب ''بچوں کے خطرے'' تھی) وہ ہر لڑکے کا ہر ماہ انٹرویو لیتے تھے۔ اور اس میں یہ ضرور پوچھتے تھے اس عرصہ میں کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں۔ بعض لڑکوں نے ان کی پسندیدہ کتابوں جیسے ''بے تیغ سپاہی''، ''جہانِ دانش'' ''تاریخ کی کہانی''، بچوں کا قرآن، ''اے شارٹ ہسٹری آف پاکستان'' وغیرہ کے نام رٹ رکھے تھے۔

6 ستمبر 71ء کی صبح جو انڈین ہوائی جہازوں کی air strafing شروع ہوئی تو وہ خود اپنی سیکورٹی سے لاپرواہ سب لڑکوں کو محفوظ جگہوں پر چھپانے ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ اس حالت میں، مَیں نے انہیں پہلی بار دیکھا۔

ابھی حال ہی میں ایبٹ آباد زون کے عالمگیریز کی ایک gathering میں کسی جونیئر آفیسر نے کہا۔ سر راشد کے لئے یہ کتنی خوشی کی بات ہوگی کہ یہاں پی ایم اے میں چار پلاٹون کمانڈرز ان کے شاگرد ہیں۔ اسی طرح ان کے پڑھائے ہوئے فوج میں اور سول میں اونچے اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ یہ سن کر اس اجتماع کے سینئر موسٹ عالمگیرین نے کہا۔ ''ابھی تک تمام تھرڈ ورلڈ کنٹریز میں پرانا کولونیل (Colonial) attitude عام ہے کہ سرکاری عہدوں کو تو اہمیت دیتے ہیں لیکن اپنے intellectuals، رائٹرز اور استادوں کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھ پائے۔ میں آپ کو بتادوں کہ بڑے سے بڑا عہدہ دار روٹین کے کام کرتے کرتے ریٹائر ہونے کے بعد غیر مؤثر ہوجاتا ہے اور گمنامی کے پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ لیکن راشد صاحب نے تعلیم وتربیت کے علاوہ بحیثیت رائٹر اور مورخ کے جو کام کیا ہے وہ ان کے بعد بھی مؤثر رہے گا''۔ ایک بار امریکہ میں، مَیں ایک کورس کر رہا تھا تو وہاں ایک نامور پروفیسر نے مجھے بتایا کہ ابھی تک یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طالب علم نے کہاں سے ڈگری لی ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ اس نے کس پروفیسر سے پڑھا ہے۔ امریکہ میں ہارورڈ کا اور (MIT) کا جو مقام ہے وہ کسی اور یونیورسٹی کا نہیں۔ ملٹری کالج کی image بھی ہر کمانڈنٹ کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ مجھے کوئی اولڈ بوائے ملے تو میں یہ ضرور پوچھتا ہوں کس دور کے ہو؟ انگریزی کس سے پڑھی؟ اردو کس سے؟ اور اب یہ سوال بھی بار بار پوچھتا ہوں کہ راشد صاحب کے شیر شاہ ہاؤس میں رہے ہو؟ That makes all the difference

کیپٹن آصف مہدی

(کالج نمبر 3394، زمانہ تعلیم 1976-1971ء)

اپریل 1971ء میں جب میں شیر شاہ ہاوس میں داخل ہوا تو ایک سینئر بھائی جان نے از راہ ہمدردی وارن کیا کہ ذرا ہوشیار رہنا۔ سر راشد، بستر پر سلوٹ بھی ہو تو اس پر گھنٹہ بھر لیکچر پلاتے ہیں۔ ان صاحب کا تجربہ غلط نہ تھا۔ وہ واقعی بلبوں کے شیڈوں کی گرد تک کو نوٹ کرتے تھے۔ لیکن میرے زمانہ میں وہ گرد اور سلوٹ کی نفسیاتی توجیہہ بھی کیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا۔ ''آصف، جب ذہن میں سلوٹ ہو تو بستر پر بھی نظر آتی ہے''۔ ایک روز ڈارم کے ایک پنکھے کے پروں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے ''جس دن تم اس پنکھے کو پاکستان کے حوالے سے دیکھو گے تو تمہیں اسے گندا دیکھ کر تکلیف ہو گی۔ جوں جوں پاکستان تمہاری ذات میں سماتا جائے گا تمہارے لئے پاکستان کے لئے جینا اور مرنا

آسان ہو جائے گا''۔

میجر سجاد غنی

(کالج نمبر 3411، زمانہ تعلیم 1971-1976ء)

وہ اواخر اپریل 1971ء کی ایک گرم سہ پہر تھی جب شیر شاہ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں راشد صاحب نے ہاؤس کے 'I Can, I Will' ماٹو کا تعارف کرایا۔ وہ دن اور آج کا دن زندگی کے ہر چیلنج میں یہ آئی کین آئی ول میرے ساتھ رہا۔

نومبر 1975ء کی گولڈن جوبلی پر راشد صاحب نے ہاؤس کی وزیٹرز بک میرے حوالے کی کہ جو مہمانانِ گرامی آئیں تو ان کے دستخط لوں۔ غالباً اس بہانے سے وہ مجھے وی آئی پی اولڈ بوائز سے متعارف کرانا چاہتے تھے۔ بہرحال ہوا یہ کہ گولڈن جوبلی کی گہما گہمی میں وزیٹرز بک کہیں مس پلیس ہو گئی۔ شام کو جب ہاؤس میں وی آئی پیز آنے لگے تو انھوں نے کسی کو میری ڈارم میں بھیجا کہ سجاد غنی سے کہو کہ وزیٹرز بک لے آئے۔ میں حواس باختہ کتاب کو ادھر ادھر ڈھونڈ رہا تھا۔ جب دیر لگی تو وہ خود ڈارم میں آئے۔ ''کیا بات ہے؟ مہمان آ گئے ہیں''۔ میرے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے گھبرا کر کہا ''سر، وزیٹرز بک، وزیٹرز بک نہیں مل رہی۔'' میری پریشانی کسی طرح کم نہیں ہو پا رہی تھی۔ انھوں نے بہت آہستہ سے کہا۔ ''نہیں مل رہی نہ ملے۔ So what, heavens won't fall گھبراتے کیوں ہو؟ سادے کاغذ پر دستخط کرا لیتے ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ واپس چلے گئے اور مہمانوں کو رسیو کرنے لگے۔ چند لمحوں کے بعد جب میرے حواس ٹھکانے ہوئے تو میں نے یوں ہی ڈیسک کھولا تو بک سامنے پڑی تھی۔ میں اسے لے کر ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا: "Dont let any problem be bigger than yourself" ابھی کیا ہے، زندگی میں بڑے بڑے مرحلے آئیں گے اور تمہیں تو فوج میں سرو کرنا ہے۔'' زندگی کے بہت سے تاریک لمحوں میں یہ فقرہ مجھے یاد آتا ہے اور مجھے حوصلہ دیتا ہے۔ راشد صاحب سے جس نے بھی پڑھا ہے اور خاص طور پر وہ جو شیر شاہ ہاؤس میں انکے زیرِ تربیت رہا ہے، ان کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی ٹکڑا اپنے دل میں چھپائے پھرتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار

(کالج نمبر 3446، زمانہ تعلیم 1971-1976ء)

مجھے نہیں معلوم کہ کسی اور نے سر راشد کے تعلیمی و تربیتی فلسفہ کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے یا نہیں کہ انھوں نے اپنی تربیتی اور تعلیمی توجہ کو broad base کیا۔ پبلک اسکول سسٹم کا ایک بڑا نقص یہی ہے کہ وہ elitist ہوتا ہے اور bright boys کے ارد گرد گھومتا ہے۔ راشد صاحب کی (approach) یہ تھی کہ ہر طرح کی نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کے دروازے برائٹ، کم برائٹ، عام اور ڈل سب کے لئے کھول دیئے جائیں۔ ان کا کوئی فنکشن ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں تیس چالیس یعنی آدھے ہاؤس سے زیادہ لڑکے حصہ نہ لیں۔ خواہ ایک ایک جملہ بولیں لیکن سب اسٹیج پر آئیں ضرور confidence حاصل کریں۔ اس ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے خود مکالمے لکھے اور معلومات کو کوئز ٹائپ سوال و جواب کی شکل میں ڈھالا۔ مثلاً اگر سیرت النبی ﷺ، ماہ رمضان، اقبال یا قائداعظم پر کوئی فنکشن ہے تو اس میں سوال و جواب کا کوئی آیٹم ضرور ہوتا، تا کہ اس میں زیادہ سے زیادہ لڑکے حصہ لیں۔ انکی دو کتابیں ''گفتار و کردار قائداعظم'' اور ''مکالمات اقبال'' مکالمات ہی کی شکل میں ہیں۔ ان کے بہت سے مکالمے سب سے پہلے ہاؤس میں پیش کئے گئے تھے اور اسی ضرورت کے تحت لکھے گئے تھے۔

سب بچوں کو یکساں توجہ دینے اور مواقع دینے کی کوشش راشد صاحب کی شخصیت و کردار کا ایک ایسا پہلو ہے جس پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ وہ یقیناً ایسا اپنے خاص فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ تعلیم کے تحت کرتے ہوں گے۔ شیر شاہ ہاؤس کے تین سالانہ یوم والدین میں نے دیکھے ہیں۔ صبح دس بجے سے یہ پروگرام شروع ہو کر دو پہر کے ایک گھنٹے کے وقفے کے بعد شام چار ساڑھے چار بجے تک چلتا تھا۔ دس بجے سے ایک بجے تک نظمیں، تقریریں، مکالمے، مذاکرے ہوتے تھے۔ جن کے ذریعے کم از کم ایک بار ہر لڑکے کو اسٹیج پر تقریباً دو منٹ کے لئے آنے کا موقع ملتا تھا بلکہ دیا جاتا تھا۔ ڈھائی سے چار بجے تک انگریزی، اردو، ڈراموں کے سیشن میں بھی لڑکوں کی ایک کثیر تعداد حصہ لیتی تھی اور کچھ نہیں تو کمپیئرنگ ہی سہی۔ یہ طریق کار محض اتفاق یا کسی دشواری کے تحت نہ تھا۔ بلکہ شعوری طور پر ایک فلسفہ تعلیم کے تحت اختیار کیا گیا تھا۔ ان کی کتاب ''شاد باد منزلِ مراد''، میں ایک مذاکرہ ہے۔ ''مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی'' یہ انکے اپنے رویے کی پروجیکشن ہے۔

اسی طرح انھوں نے پبلک سکول سسٹم کی ایک اور خامی کا ازالہ بھی کیا۔ یہ سسٹم بیشتر competitiveness پر مبنی ہے۔ مقابلہ، مقابلہ، ہر جگہ مقابلہ اس میں will to win کو develop کرنے کا اہتمام بہت زیادہ ہے۔ یہ بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن ایک حد تک راشد صاحب نے عدل، احسان اور ایثار کی قدروں کو فروغ دینے کی کوشش کی اور صرف امتحانی کامیابی کو اہمیت نہیں دی۔ وہ

اکثر کہا کرتے تھے کہ کتابی کیڑا بننے میں ہمیشہ ایک خطرہ، تنگ نظر اور خود غرض ہو جانے کا رہتا ہے۔ Social sense وہ فقرہ تھا جسے وہ بار بار استعمال کرتے تھے۔

کیپٹن ڈاکٹر شاہد احمد نواز

(کالج نمبر 3462، زمانہ تعلیم 1978-1972ء)

شیر شاہ ہاؤس 74-1973ء کے یوم والدین کا جو اسکرپٹ سر راشد نے مہینوں کی کاوش کے بعد تیار کیا تھا۔ وہ بہت قیمتی دستاویز ہے۔ اس پروگرام میں سارے ہاؤس نے حصہ لیا تھا۔ اس کا سرسری تعارف کراتا ہوں تاکہ اندازہ ہو کہ سر راشد نئے دور کے پاکستانی مجاہد کن خطوط پر تیار کر رہے تھے۔ ناصر عباس کی تلاوت کے بعد ہاؤس کے ہیرو شیر شاہ سوری کی زندگی اور کردار پر ڈرامائی انداز میں ایک فیچر پیش کیا گیا۔ یہ پیشکش عبدالمنعم کی تھی۔ اسکے راوی شاہد احمد، مظہر سعید، عطاءاللہ اور ایاز حسین تھے اور کردار نعیم، جاوید کوثر، طارق محمود، عمران، نثار، خاقان، وحید، ندیم، فاروق ناصر، امیر سلطان، جہاں زیب، زمرد اور عبدالوحید تھے۔ اس فیچر میں شیر شاہ کی عدل گستری کے تین واقعات خاص طور پر موثر تھے۔ دوسرا آئیٹم 'نیا ترانہ' ایک کورس تھا۔ 'آیا نیا زمانہ گائیں نیا ترانہ' اس کا تعارف جاوید اختر نے کرایا تھا۔ اور اس کورس میں جاوید اختر سکندر اقبال، مسعود احمد خان، ارجمند شاہد، زاہد رسول، اشتیاق احمد نے حصہ لیا تھا۔ اس میں طبلہ کی سنگت نثار کی تھی اور ہارمونیم اختر نواز نے بجایا تھا۔ تیسرے نمبر پر 'قرآن حکیم اور ہماری زندگی' کے عنوان سے نوشاد حمید نے اپنی تقریر پیش کی۔ چوتھا آئیٹم حدیث کی چھ مستند کتابوں کا تعارف اور ان کی چیدہ چیدہ احادیث کا انتخاب تھا۔ جو ''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں'' کے عنوان سے سوال و جواب کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس آئیٹم کا تعارف محمد خالد نے کرایا۔ اور اس میں محمد شفیق، نصیر احمد، عبدالوحید، طارق محمود، محمد فاروق اور زمرد اقبال نے حصہ لیا۔ اس کے بعد 'درس زندگی' کے عنوان سے محمد خالد نے مختار مسعود کی کتاب ''آواز دوست'' کا ایک اقتباس پیش کیا جس کے ابتدائی فقرے یہ تھے۔ ''اہل شہادت اور اہل احسان میں فرق صرف اتنا ہے کہ شہید دوسروں کے لئے جان دیتا ہے اور محسن دوسروں کے لئے زندہ رہتا ہے۔ ایک کا صدقہ جان ہے اور دوسرے کا تحفہ زندگی۔ ایک سے ممکن وجود میں آتا ہے۔ اور دوسرے سے اس وجود کو توانائی ملتی ہے''۔ ساتواں آئیٹم سرسید اور پاکستان کے موضوع پر ایک مذاکرہ تھا۔ اس میں افضال، بلال اور ستار نے شرکت کی۔ اس کے بعد ارشادات قائداعظمؒ سنانے کا شرف ایاز نے حاصل کیا۔ دسویں نمبر پر ایاز اور شاہد نے اقبال کی مشہور نظم ''سلطان ٹیپو کی نصیحت''، ''تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول'' پیش کی۔ ان کے بعد مظہر

سعید اسٹیج پر آئے اور ''گمنام مجاہدوں کو سلام'' کے عنوان سے ایک پر جوش اور پر مغز تقریر کی۔ جو اس طرح شروع ہوئی: ''قائداعظم کے دست راست اور تحریک پاکستان کے ایک نامور کارکن اور خطیب نواب بہادر یار جنگ نے ایک بار کہا تھا۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہو جاتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر کی عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔ میں ایسے گمنام مجاہدوں کو سلام پیش کرتا ہوں''۔ اس تھیم کو عظیم آصف نے اپنی تقریر میں ابھارا جس کا پہلہ جملہ یہ تھا۔ ''میں اپنے وطن کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں'' اسکے بعد خالد کریم نے خطبہ حجۃ الوداع کا اقتباس پیش کیا۔ ''عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر، سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر تقوٰی کی بنا پر......'' معراج النبی ﷺ کی ایمانیت و اشاریت پر گفتگو مسعود احمد خان نے کی۔

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ بشریت کی زد میں ہے گردوں

'میرے خوابوں کی دنیا' تقریر میرے حصے میں آئی۔ اس میں عالم خواب میں سرسید، اقبالؒ اور قائداعظم سے ملاقات کے حوالے سے پاکستان کی سماجی اور معاشی صورت حال پر تبصرہ تھا۔ میرے بعد اختر نواز نے اپنی پر جوش تقریر ''باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم'' پیش کی۔ اس کے بعد اقبال بیت بازی کے تین دور ہوئے۔ جن میں محمد خالد، طاہر نواز، مسعود، عمر خطاب، صابر، طارق نعیم عطاءاللہ، طارق، جہانزیب، عبدالوحید، خاقان، محمد وحید، عظیم آصف، مظہر، جاوید کوثر، اشتیاق، نثار، بلال، افضال اور ساجد نے حصہ لیا۔ اگلا آئیٹم ایک دلچسپ کھیل ''شعراء کرام عدالت میں'' تھا۔ اس کے بعد انگریزی تقریروں کا پہلا دور رہوا عنوانات یہ تھے:

Day Schools VS Public Schools

P.T or NO P.T

Leaders are born, not made.

We are Happier than our forefathers.

Down with Preps

To Hell with Exams

ان عنوانات کے حق میں اور مخالفت میں عمران، عمر عبداللہ، اقتدار، بلال، طارق، عظیم آصف، مظہر سعید، وحید احمد خاں، امجد حسین، منعم، سکندر اقبال، طارق محمود رندھاوا اور نوشاد احمد نے حصہ لیا۔ ان تقریروں کے

بعد عمر عبداللہ نے ''تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا'' کے عنوان سے نئے طلبا کو ہاؤس کا پیغام، طارق نعیم نے ''Freedom and Discipline'' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ طارق حسین نے مزاحیہ انداز میں ایک خواب کا قصہ سنایا۔ قائداعظم کی شخصیت اور اقبال کی شاعری پر مذاکروں کے بعد 'انسان تقدیر کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہے' کے عنوان پر اردو میں ایک مباحثہ ہوا۔ نثار نے موافقت میں اور افضال نے مخالفت میں اپنے خیالات پیش کئے۔ 'سوہنی دھرتی' کورس میں وسیم ارشد، جاوید اختر، زاہد رسول، سکندر اقبال، محمد وحید اور جاوید قمر شامل تھے۔ اس کے بعد انگریزی تقریروں کا دوسرا دور ہوا۔ عنوان تھے۔

Discipline

Not Gold but only Men can Make a Country Great & Strong

Poverty is the Root cause of Evil

Great Men Make History

راشد صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اردو انگریزی تقریروں کا ایک ایک پیرا لڑکوں میں تقسیم کر دیتے تھے تا کہ زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو حصہ لینے کا موقع ملے، اس طرح ان چار تقریروں میں 11 لڑکوں، جاوید کوثر، نثار، افضال ساجد، صغیر اکبر، اختر نواز، جہاں زیب، ناصر عباس، خالد حسین، عمر خطاب، ارشد جیلانی نے شرکت کی۔ اس کے بعد ایک دلچسپ آئیٹم ''خاموش قوالی'' تھا۔ جس کو حاضرین نے بہت انجوائے کیا۔ خاموش گلوکاری اور اداکاری کے جوہر، خالد غزنی، طارق منیر، شاہد احمد، زاہد رسول، اور جاوید اختر نے دکھائے۔ اس کے بعد ایک اردو تقریر ہوئی۔ عنوان تھا۔ ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے''۔ اور پھر ایک اصل قوالی۔ ''پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے'' پیش کی گئی۔ گلوکار تھے جاوید اختر، سکندر اقبال، زاہد رسول، مسعود احمد خان، افضال احمد، اور ارجمند شاہد۔ طبلہ پر سنگت شاہد احمد نواز نے دی اور ہارمونیم طارق منیر نے بجایا۔ اس قوالی کے بعد غالبؔ کی غزل

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

مہمان فنکار جاوید صاحب تھے۔ انہوں نے ہارمونیم پر سنائی۔ ہاؤس سانگ:

We are the boys of Sher Shah House
Great House, Great Boys

کا انترہ سکندر اقبال اور میں نے اٹھایا۔ اقبال کی غزل ''زمانہ''

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اک حرف محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

میری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں
میں اپنی تسبیح روز شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

جاوید اختر نے پیش کی۔ مسجد قرطبہ کا یہ بند ''اے حرم قرطبہ عشق سے ترا وجود'' پیش کرنے کی سعادت میرے حصہ میں آئی۔ ''چاند میری زمین، پھول میرا وطن'' کورس کے بعد ایک اور قوالی

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی

جاوید اختر، سکندر اقبال، زاہد رسول، محمد وحید، امیر سلطان، جاوید کوثر نے پیش کی۔ اس پہلی مجلس کا آخری آئیٹم ہاؤس کے پانچ شہیدوں کے بارے میں تھا۔ عنوان تھا ''پانچ سچے موتی'' آواز احمد حسین کی تھی۔ اس طرح یہ کل پچاس آئیٹم بنتے ہیں جو ہاؤس کے تمام لڑکوں نے پیش کئے۔ دوسری مجلس میں انگریزی اردو کے ڈرامے، تمثیلچے پیش کئے گئے وہ علیحدہ، میں نے یہ روداد 74-1973ء کے اس فنکشن کی فائل سے لکھی ہے۔ میں چاہوں گا کہ یہ سارا اسکرپٹ اس کتاب کے ضمیمے کے طور پر شائع کیا جائے۔ تاکہ ریکارڈ رہے کہ جونئیر ہاؤس میں اقداری اور ذہنی تربیت کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور کبھی کسی نے اس ذمہ داری کو کس طرح انجام دیا تھا۔

ڈاکٹر امجد حسین

(کالج نمبر 3465، زمانہ تعلیم 1975-1972ء)

میں اپریل 1972ء میں شیر شاہ ہاؤس میں آٹھویں میں داخل ہوا اور یہیں سے اپریل 1975ء میں ہاؤس پریفیکٹ کی حیثیت سے کالج کو خیر باد کہا اور اس عرصے میں مجھے سر راشد کی مسلسل سرپرستی اور راہنمائی حاصل رہی۔ سرپرستی اس لئے کہ 71ء کی جنگ میں میرے والد لیفٹیننٹ کرنل غلام رسول ہلال جرأت شہید ہو گئے تھے۔ شاید اس حوالے سے بھی ان کی توجہ مجھ پر زیادہ تھی۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اس تین سال کے عرصے میں، میں نے نوٹ کیا کہ پاکستان انکی پہلی محبت ہے اور پاکستان کے شہیدوں سے انکی محبت اس حوالے سے ہے۔ میرے زمانے میں شیر شاہ ہاؤس میں کالج کے پانچ شہیدوں کے بارے میں ایک چھوٹی سی تقریر انہوں نے ''پانچ سچے موتی'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس میں میجر اکرم شہید نشان حیدر، حق نواز کیانی شہید ستارہ جرأت، افتخار شہید، علم الدین شہید، صاحب زاد گل شہید ستارہ جرأت کا تذکرہ تھا۔ یہی دو صفحے کی تقریر بعد میں کالج کے شہیدوں پر ان کی تین کتابوں کی بنیاد بنی۔ شیر شاہ ہاؤس میں لیڈر شپ کی تربیت کا جو نصاب سر راشد نے مرتب کیا تھا اس کے پیچھے from discovery to developement کا

فلسفہ تھا۔ discover اور develop کرنے کا ایک mechanism تھا۔ ایک اسٹریٹجی تھی۔ لیڈر شپ کی تربیت کے لئے انھوں نے ایک پروگرام ''Folio for Development'' کے نام سے تیار کیا تھا۔ جس کے عنوانات یہ تھے:

1. Guidance Card No. 1
2. Guidance Card No. 2
3. Some Dos & Don'ts
4. Self-assessment Questionnaire No. 1
5. Self-assessment Questionnaire No. 2
6. Self-assessment Questionnaire No. 3
7. General Reading
8. Adventure in Knowledge
9. Sports and Games
10. Health & Hygiene
11. Achievements and Failures
12. Leadership through House Appointments
13. Honour System
14. Syllabus for Development Tests & Promotion Tests

یہ ٹیسٹ تین grades میں تھے۔ اور ہر گریڈ کے تین حصے تھے۔ پہلا ٹیسٹ جونیئر کیپٹن کے لئے۔ دوسرا سینئر کیپٹن کے لئے۔ تیسرا ان کے لئے جو مزید بلند پروازی کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

کیپٹن ایاز حسین مرزا

(کالج نمبر 3477، زمانہ تعلیم 1972-1978ء)

شیر شاہ ہاؤس کے کاریڈور میں (وہ راستہ جو ہاؤس کو میس سے ملاتا تھا) دیواروں پر چار بورڈ لگے تھے۔ دائیں طرف کے بورڈوں پر ہر روز 'آج کا خیال'، 'آج کا شعر' لگتا تھا۔ بائیں طرف 'آج کی حدیث' اور 'آج کی آیت'، میرا کام یہ تھا کہ ہاؤس آفس میں پڑی فائلوں سے ایک ایک ورق لے کر صبح ناشتہ سے پہلے وہاں ڈرائنگ پن سے لگا دیا کروں۔ ان پر آتے جاتے سب کی نظریں پڑتی تھیں۔ دوسرے دن پورا سیٹ بدل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے چند مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ مثلاً آدمی کا ''شیطان'' آدمی ہے۔ اعتماد پربت کا پتھر ہے، اکھڑ جائے تو نیچے ہی آتا ہے۔ فرشتہ سے بڑھ کر ہے ''انسان'' بننا۔ بعض

لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آدمی مال ہی میں نہیں کھال میں بھی مست رہ سکتا ہے۔ علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔ جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ جو لوگ نئی بنیادیں بھرنا جانتے ہیں وہ یہ بھی سوچیں کہ پرانی کیوں بیٹھ گئیں۔

راشد صاحب کی بیشتر باتیں اور لیکچر، ہماری عمر اور تجربہ سے بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان دریچوں سے باہر کھلے آسمان کو دیکھ سکیں۔ اب وہ باتیں یاد آتی ہیں اور کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔ پوری طرح سمجھ میں آتے آتے تو شاید عمر بیت جائے۔ ہاؤس کا ماٹو تو 'آئی کین آئی ول' (I can I will) اقبال کا سارا فلسفہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح 'From Discovery to Development'، تعلیم و تربیت کی ایک نئی اپروچ کا حامل ہے۔

راشد صاحب ہر لڑکے سے چار پانچ کتابیں ضرور پڑھواتے تھے۔ 'آواز دوست'، 'درس زندگی'، 'قرآن حکیم اور ہماری زندگی'۔ روشنی، ''کمپنی کی حکومت''، تاریخ کی کہانی'، چوہدری فضل حق کی 'زندگی' اور نواب صدیق علی خان کے ''بے تیغ سپاہی'' خودنوشت اور احسان دانش کی آپ بیتی 'جہاں دانش'۔ اقبال کے پچاس شعر سب لڑکوں کو زبردستی یاد کرائے جاتے تھے۔ اردو کی دو تقریریں ''منزل ہے کہاں تیری اے لالہِ صحرائی'' اور ''اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا''۔ بھی سب کے لئے لازمی کر رکھی تھیں۔

مہینہ میں ایک بار انٹرویو کرتے تھے۔ جس کے آخر میں لڑکے کو بھی انٹرویو کرنے کا موقع دیتے تھے۔ شیر شاہ ہاؤس کا تربیتی پروگرام اتنا ambitious تھا جیسے وہ اس ہاؤس کے ذریعے پورے پاکستان کو بدلنے کا عزم کئے ہوئے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سے خواب آنکھوں میں بسائے ہوئے تھے۔ جو یوں دیوانہ وار جوئے شیر نکالنے میں مصروف تھے۔

اس زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس آٹھویں جماعت کا صرف ایک جونیئر ہاؤس ہی نہیں اپنے طور پر ایک منفرد اسکول اور ایک ممتاز ادارہ تھا۔ جس کا اپنا کری کیولم اور اپنی روایات تھیں۔ میں 74-1973ء میں شیر شاہ ہاؤس میں کوکری کیولر سرگرمیوں کا سیکریٹری تھا اور اس شعبے کے بیشتر پروگراموں سے میں متعلق رہا۔ ہاؤس کا کرانیکل لکھنے کا کام بھی میرے سپرد تھا۔ (میں چاہوں گا کہ وہ روزنامچہ کالج کی تاریخ کے ایک source کے طور پر محفوظ کر لیا جائے)

سر راشد کی پلاننگ بہت مضبوط ہوتی تھی۔ کوئی کام چانس پر نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ کوئی تربیتی پروگرام شروع کرانے سے پہلے وہ اس کا پیپر ورک مکمل کر لیتے تھے۔ پھر وہ کام، پروگرام وہ اپنے پریفکٹس کے سپرد

کر دیتے۔اور خود دُور سے اس کی نگرانی اور راہنمائی کرتے۔اور وہ Execution کی چھوٹی موٹی غلطی پر فوراً ٹوکتے تھے۔ بلکہ اپنے دفتر کے ''شیشہ گھر'' سے ہر چیز واچ کرتے اور مناسب وقت پر بہت موزوں طریقے سے تنبیہہ یا تعریف کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ لیڈر شپ میں inter-personal relationship کی جو لاشعوری تربیت انھوں نے کی، وہ ان کی سب سے قیمتی میراث ہے جو تا زندگی ہمارے ساتھ رہے گی۔

تمام سال کی ہم نصابی سرگرمیوں کا ایک راہنما خاکہ جو انہوں نے مرتب کیا تھا وہ یہ تھا۔

1 کیمپس کے پھولوں کا مشاہدہ ومطالعہ
2 کیمپس کے درختوں کا مطالعہ
3 سوشل سروس پروجیکٹ
4 اقبالیات،اقبال کی زندگی وکلام پر ایک کوئز پروگرام
5 اقبالیات۔اقبال کے اشعار پر مبنی بیت بازی
6 قائداعظمیات۔کوئز پروگرام
7 ارشادات قائداعظم
8 پاکستانیت۔کوئز پروگرام
9 کردار قائداعظم۔مکالمے
10 کردار اقبال۔مکالمے
11 میری پسندیدہ کتاب/ ٹی وی ڈراما/ کہانی/ ٹی وی پروگرام
12 مشاہیر کی دلچسپ باتیں
13 مشاہیر کے لطیفے
14 طبع زاد کہانی /نظم/مضمون/مزاحیہ خاکہ
15 آؤ ایکٹنگ سیکھیں
16 شکر نامہ لکھنا۔پرانے استادوں کو
17 دلچسپ مشغلہ کی باتیں
18 بچپن کی یادیں
19 آٹوگراف بک سے/ اسکریپ بک سے اقتباسات

20 میرے خواب میری امنگیں

21 مزاحیہ خاکے یا تقریریں

22 کچھ پالتو جانوروں کے بارے میں

23 دوستوں کی دلچسپ باتیں، عادتیں

24 مجھے کس دوست کی کیا بات پسند ہے

25 مجھے فخر ہے

26 میس کا مزاحیہ خاکہ

27 ملی ترانے

28 ساز کی موسیقی

29 آواز کی موسیقی

30 خود احتسابی۔ اپنی ترقی کا جائزہ

31 خبرنامہ سائنس

32 دس برس کے بعد میں کہاں ہوں گا۔

33 میری محسن شخصیت

34 ناقابل فراموش واقعات

35 برین ٹرسٹ

36 پاکستان سے محبت کی چند مثالیں

37 احسان وایثار کی چند مثالیں

38 طلبہ کی بلند کرداری کے چند واقعات

39 میری حماقتیں/ میرے پچھتاوے

40 اگر میں ہاؤس پریفکٹ/ ہاؤس ماسٹر/ کمانڈانٹ/ صدر ہوتا

41 میں ایک دن میں ایک لاکھ روپیہ کیسے صرف کرونگا۔

42 کسی مہمان کا انٹرویو

ہاؤس میں جو تقریریں اور مذاکرے ہوئے تھے ان کے مجوزہ عنوانات یہ تھے:

1 میرے گزشتہ اسکول کی چند خوشگوار یادیں

2 مجھے اب تک کس کس نے متاثر کیا اور کیوں؟

3 اگر مجھے اختیار دیا جائے تو مستقبل میں کیا بننا پسند کرونگا۔

4 سائنسدان، استاد، ڈاکٹر، فوجی افسر یا انجینئر۔ کون ملک کی زیادہ خدمت کرسکتا ہے؟

5 غریبی برائیوں کی جڑ ہے۔

6 غریبی برائیوں کی جڑ نہیں۔

7 عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔

8 ملکی ترقی کا انحصار عوام پر ہے لیڈروں پر نہیں۔

9 اقوام کی تقدیر لیڈروں کے ہاتھ میں۔

10 افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر۔

11 مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

12 ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

13 وہ کتابیں جنھوں نے مجھے متاثر کیا۔

14 ایک کہانی (طبع زاد) یا افسانہ

15 میں کبھی نہ بھول سکوں گا (چند نا قابلِ فراموش اشخاص)

16 ایک مزاحیہ کہانی یا کردار

17 تاریخ میں کونسا کردار آپ کا ہیرو ہے؟

18 میرے بچپن کی چند یادیں یا شرارتیں

19 برے آدمی دراصل بے وقوف ہوتے ہیں

20 کمزور کی سزا غلامی ہے

21 ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

مذاکروں کے عنوانات:

1 جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

2 علم را ہر تن زنی مارے بودے علم را بر دل زنے یار بود

3 زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں

4 ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے، آتے ہیں جو کام دوسروں کے

5 ہو جذب جو کامل تو کھنچ آئے گی منزل

6 سنیارٹی کیا ہے؟ سعی پیہم ہے ترازوِ کم و کیف حیات

7 شمع دن کو جلے تو شمع، رات کو جلے تو روشنی بنتی ہے

8 نہیں یہ شان خودداری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

9 دشواریاں کیا ہیں؟ اور زندگی میں کامیابی کیا ہے؟

10 اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

11 رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

12 جنگ انسانیت کیلئے تباہی کا سامان مہیا کرتی ہے

13 علم کی کمی خلوص سے پوری ہوسکتی ہے، مگر خلوص کی کمی کسی چیز سے بھی پوری نہیں ہوسکتی۔

14 موتِ تجدیدِ مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

15 انسان کا صحیح مذہب انسانیت ہونا چاہیے

16 زندگی موت سے ہے

17 تنقید کو برداشت کرنا ایک عظیم وصف انسانی ہے

18 کبھی آپ نے قائداعظم کے اس قول پر غور کیا ہے۔ ''کام''، کام اور کام''

ہاؤس میں ایک سلسلہ آج کے خیال، آج کے شعر، آج کی حدیث اور آج کی آیت کا بھی تھا۔ سافٹ بورڈ کے یہ بورڈ، ہاؤس کے کاریڈور میں لگے ہوتے تھے۔ جن پر ہر روز صبح سویرے ڈیوٹی کیڈٹ ایک نیا سیٹ پن کر دیتا تھا۔ اس کی بھی ایک فائل تھی۔ اس کا ایک ورق قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

1 زندگی انعام بھی ہے آزمائش بھی۔

2 محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

3 رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''سب مل کر کھاؤ اور علیحدہ ہو کر نہ کھاؤ''۔

4 رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عید الفطر اور عید الضحیٰ کو نہایا کرتے تھے۔

5 تم راحت میں خدا کو نہ بھولو۔ وہ تمہیں مصیبت میں نہ بھولے گا۔

6 انسان اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کیلئے بھی اسی چیز کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

7 **اهد نا الصراط المستقیم** ۔ اے اللہ تو ہم کو سیدھی راہ پر ثابت قدم رکھ۔

8 **و جاهدو فی سبیله لعلکم تفلحو ن** ۔ اور اس کے راستے میں جہاد کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

9 کوئی مصیبت سدا نہیں رہتی۔

10 محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے

11 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جو چاہتے ہو صرف کرو، جب تک کہ اس میں فضول خرچی اور تکبر شامل نہ ہوں۔

12 خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

13 نبی کریم ﷺ نے پانی میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

14 اعوذ باللہ ان اکون من الجٰھلین ۔ میں جہالت سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں۔

15 مومن کا چہرہ بشاش رہتا ہے اور دل غمگین۔

16 یہ فیضان نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

17 جب تم میں سے کوئی میدان میں نہائے تو اسے پردہ کر لینا چاہیے۔

18 سب سے اچھا شخص وہ ہے جو قرض خوشی سے ادا کرے۔ (بخاری شریف)

19 حالی نشاطِ نغمہ ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں ؟

20 چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (بخاری شریف)

21 خاک کے سوا کوئی اور چیز انسان کے پیٹ کو نہیں بھر سکتی۔ (بخاری شریف)

22 جو اپنے آپ سے ہار گیا وہ کس سے جیت سکے گا؟

23 جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(اقبالؒ)

24 قسم کھانے سے سامان تو بک جاتا ہے مگر اس میں برکت باقی نہیں رہتی۔(بخاری شریف)

25 وہ ہاتھ جو اوپر ہے اس سے بہتر ہے جو نیچے ہے۔اوپر والا ہاتھ دینے والا ہے اور نیچے اس شخص کا ہاتھ ہے جو مانگتا ہے۔(بخاری شریف)

26 صدقہ و خیرات میں ہر اچھا کام آ جاتا ہے۔(بخاری شریف)

27 کوشش زندگی اور تعطل موت ہے۔

28 دولت اور فراغت سے اشخاص بدلتے ہیں ، بے نقاب ہوتے ہیں۔(رشید احمد صدیقی)

29 علم کی کمی خلوص سے پوری ہو سکتی ہے۔خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔(رشید احمد صدیقی)

30 خلوص اور تندہی سے کئے ہوئے کام کارنامے بن جاتے ہیں۔(مختار مسعود)

31 اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں جو انسان اپنے ہاتھ کی مزدوری سے کھاتا ہے(بخاری شریف)

32 جو اپنے بھائی کے کام آتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے کام آتا ہے۔(مسلم شریف)

33 سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔(بخاری شریف)

34 بھوکے کو کھلاؤ، بیمار کی عیادت کے لئے جاؤ اور قیدی کو آزادی بخشو۔(بخاری شریف)

35 تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو قدروں کو پرکھنا سکھا دے(غلام السیدین)

36 بے شک ہم ضائع نہیں کرتے اجر اصلاح کرنے والوں کا۔

37 بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت جب تک کہ وہ خود نہ بدل دیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ (سورۃ رعد۔آیت 11)

38 اللہ کی لعنت جھوٹوں پر۔ (سورۃ آل عمران۔آیت 41)

39 انصاف کرو، کہ انصاف پرہیز گاری اور تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

40 اور نہ طعنے دو ایک دوسرے کو اور نہ ایک دوسرے کے نام دھرو۔ (سورۃ الحجرات آیت 11)

41 دین میں زبردستی نہیں۔(سورۃ البقرہ۔آیت 252)

42 اور پورا اجر دیا جائے گا ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی اور ان پر ذرا ظلم نہیں ہوگا۔(سورۃ آل عمران)

43 اور اللہ عدل اور انصاف اور احسان کا، قریبی رشتہ داروں کو دینے دلانے کا حکم دیتا ہے۔اور فحش اور نا پسندیدہ امور سے منع کرتا ہے۔(سورۃ الاعراف)

44 اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو۔(سورۃ النساء)

45 بے شک نیکیاں برائیوں کو روکتی ہیں۔(سورہ یونس آیت 32)

46 غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ و دو میں پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا (اقبال)

47 اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ اقبال)

48 قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان (اقبال)

49 نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی (اقبال)

50 شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا (اقبال)

51 خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں (اقبال)

52 چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں (اقبال)

53 ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاک کاشغر (اقبال)

54 اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن (اقبال)

55 اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے (اقبال)

مجھے امید ہے کہ یہ تجربات جو سر راشد نے شیر شاہ ہاؤس میں کئے ملک کے بہت سے اسکولوں کے کام آئیں گے اور ان کی روشنی میں اہل نظر فکر و فن کی نئی راہیں نکالیں گے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

میجر نوشاد حمید

(کالج نمبر 3493، زمانہ تعلیم 1972-1977ء)

سوچ تو ماحول کے تابع ہوتی ہے۔ میں نے چھٹی تک تعلیم اپنے گاؤں ڈومیلی میں حاصل کی۔

ایک آدھ سال جہلم میں لگایا تھا۔لیکن میری سوچ پر لامحالہ گاؤں کی چھاپ تھی اور ایک فوجی سکول کے استاد کا تصور رحیم شحیم ، بلند آواز اور قدرے کرخت استاد کا تھا۔لیکن جب ملٹری کالج کے صدر دروازہ سے اندر داخل ہونے کے بعد شیر شاہ ہاؤس میں وارد ہوا تو جس استاد نے میرا اور میرے والد کا بڑے تپاک سے خیر مقدم کیا وہ سر راشد تھے۔اپنے ظاہر اور باطن میں اس امیج سے بالکل مختلف جو میں یہاں لے کر آیا تھا۔میں جب یہاں آیا تو ایک کندہ نا تراش تھا۔علم وفن کی وسعتوں یا اپنی صلاحیتوں کا شعور کیا ہوتا ہے؟ میں نے تو یہ الفاظ بھی نہیں سنے تھے۔لیکن ہوا یہ کہ سعید راشد صاحب نے میری شخصیت اور صلاحیتوں کو اس طرح ابھارنا اور نکھارنا شروع کر دیا جیسے ایک ماہر فن مجسمہ ساز سنگ مرمر کی سل سے رفتہ رفتہ ایک خوبصورت مجسمہ تراش لیتا ہے۔لیکن یہ مجسمہ ساز بھی عجب کرشمہ ساز تھا۔کہ بیک وقت ستر اسی مجسمے تراش رہا تھا۔ ہر ایک کا قد بت علیحدہ اور ہر ایک کو chisel کرنے میں ہمہ تن مصروف۔

سعید راشد صاحب نے شخصیتوں کو کیسے چمکایا کیسے نکھارا کیسے انھیں قومی رخ دیا اس کی دو ایک مثالیں لکھتا ہوں۔ایک روز کسی انسپکشن کی تیاری ہو رہی تھی۔ وہ ہاؤس کا چکر لگاتے لگاتے ہماری ڈارم (علم الدین شہید ڈارم) میں آئے تو ہم اپنے اپنے حصے کے شیشے صاف کر رہے تھے۔انھوں نے کہا۔"دیکھیں! جب آپ اپنی ڈارمیٹری کے شیشوں کو چمکا رہے ہوں تو یہ سمجھا کریں کہ آپ پاکستان کے چہرے کو چمکا رہے ہیں"۔اس فقرہ کی گہرائی کو اس وقت تو کیا سمجھتے لیکن فقرہ ایسا تھا اور اس انداز سے کہا گیا تھا کہ ذہن کے کسی گوشہ میں جاگزیں رہ گیا۔جب زندگی کے سفر میں آگے بڑھا تو یہ فقرہ لاشعور سے شعور کے افق پر قطب ستارہ کی طرح ابھرا۔اور اب اسکی روشنی تیز سے تیز ہوتی جاتی ہے۔

ایک روز ہم اداس بیٹھے تھے چونکہ ایک ساتھی بورڈ آؤٹ ہو رہا تھا۔ راشد صاحب پہلے تو اسے دلاسے دیتے رہے پھر کہا۔" پرابلمز آتی رہتی ہیں پتے جھڑتے رہتے ہیں۔پیڑ سلامت رہے۔صرف اتنی سی بات ہے کہ تم آرمی کے لئے فٹ نہیں پائے گئے اور دنیا کے بے شمار کاموں کے لئے ماشاءاللہ فٹ ہو اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تمہارے لئے مستقبل میں کیا ہے۔1901ء میں علامہ اقبال ای اے سی کی آسامی کے لئے ان فٹ قرار دے دیئے گئے تھے۔(دائیں آنکھ کی بینائی میں نقص تھا) اب ہم سوچتے ہیں تو شکر کرتے ہیں کہ اچھا ہوا اقبال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر منتخب نہ ہو سکے تھے۔پھر سامنے بورڈ پر لکھا۔" Life is a whole. Luck is a whole چرچل کے یہ فقرے بہت بڑی حقیقت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔زندگی کے طویل سفر میں بھی کسی ایک کامیابی یا ناکامی پر ہار جیت نہیں ہوتی۔یہ لیگ سسٹم پر بہت لمبی

ٹیسٹ سیریز ہے۔''اس طرح کی بے شمار دانائی کی باتیں صبح شام بتاتے رہتے تھے۔شیر شاہ ہاؤس سے جو گزرا اسکی زندگی کی راہیں روشن ہو گئیں۔انھوں نے اپنی ''خودی'' اور قومی ذمہ داریوں کا شعور پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ ایک نظام وضع کر رکھا تھا۔ ہر لاکر پر سب سے اوپر خط صفریٰ میں گول دائرے میں رب زدنی علما کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔اس کے نیچے I can, I will اور اس کے نیچے From Discovery to Development ہاؤس کے کاریڈور میں دیوار پر سافٹ بورڈ کے چار بورڈ لگے تھے۔جن پر ہر روز آج کا خیال، آج کا شعر، آج کی حدیث، آج کی آیت لکھی جاتی۔اس طرح کے مقولے۔''زندگی انعام بھی ہے اور آزمائش بھی'' یا ''علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے۔لیکن خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔'' یا اقبال کے یہ شعر:

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
تو راہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول
پردم ہے اگر تو ' تو نہیں خطرہ افتاد

میری طرح ہر اولڈ شیرین کو یاد ہوں گے اور پتہ نہیں کہ کب کب انکی دستگیری کی ہو گی۔پھر اقبالیات کا سلسلہ تھا۔وہ مکالمے تھے جو اب انکی کتاب ''گفتار و کردار قائداعظم'' میں شامل ہیں۔وہ ولولہ انگیز اور پر مغز تقریریں تھیں جو'' شاد باد منزل مراد'' کی صورت میں چھپ چکی ہیں۔شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری تھی۔جس سے کتابیں لے کر پڑھنا لازمی تھا۔ ہفتہ میں دو بار، بدھ اور جمعہ کی رات کے فنکشن تھے۔جن میں باری باری تقریباً سارے ہی لڑکے حصہ لیتے تھے۔ان سب چیزوں کے علاوہ علمی اور تہذیبی فضا تھی۔جس کو اس زمانہ کے شیر شاہ ہاؤس کی پہچان کہا جا سکتا ہے۔شیر شاہ ہاؤس نہ رہا، راشد صاحب بھی ریٹائر ہو گئے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ شیر شاہ ہاؤس کے فلسفہ، نظام تربیت اور راشد صاحب کے طریق تربیت پر ایک ریسرچ پیپر مرتب کیا جائے تا کہ اس تجربہ سے یہاں اور ملک میں استفادہ کیا جا سکے۔

ڈاکٹر سکندر اقبال
(کالج نمبر 3503، زمانہ تعلیم 1977-1972ء)

میرے زمانہ (74-1973ء) میں شیر شاہ ہاؤس میں اقبالیات پر بڑا زور تھا۔ انھوں نے ہاؤس کی 'مجلس اقبال' کی طرف سے کلام اقبال کا ایک انتخاب سائیکلو اسٹائل کرا کے ہر لڑکے کو دیا تھا۔ اس میں بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے سو اشعار کا انتخاب تھا۔ اس کے علاوہ کلام اقبال کے عنوانات عقل و عشق، مومن، مسلمان، شاہین کے حوالے سے اہم اشعار بھی اکٹھے کئے گئے تھے۔ کلام اقبال سے مرتب کئے ہوئے پچاس اشعار کی بیت بازی کے تین سیٹ تھے۔ تیسرے سیٹ میں یہ بھی بتانا پڑتا تھا کہ یہ شعر، قطعہ.... رباعی کس نظم یا مجموعہ کلام کی ہے۔ مثلاً میر محفل نے بیت بازی کا آغاز کر یا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے ٹیم کی طرف سے آواز آئی:

بال جبریل سے رباعی حاضر ہے:

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے مسلمان میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں سجدہ بے ذوق کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

بی ٹیم نے فوراً جواب دیا:

بال جبریل ہی کی رباعی عرض ہے:

یہی آدم ہے سلطاں بحروبر کا؟ کہوں کیا، ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

اے ٹیم نے الف سے شروع ہونے والا بال جبریل کا قطعہ پڑھا:

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردانِ خودآ گاہ و خدامست یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

''بی'' ٹیم نے کہا بال جبریل کی رباعی پیش ہے:

تیرا اندیشہ افلاکی نہیں ہے تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تیری تیری آنکھوں میں بے باکی نہیں ہے

اس طرح دس منٹ میں حوالوں کے ساتھ کوئی پچاس ساٹھ شعر ہو جاتے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ بیت بازی کے ہر سیٹ کے اشعار کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کے کیا گیا تھا۔ یہ نہیں کہ صرف مات دینے کے لئے کوئی

مشکل ردیف کا کم اہم شعر ڈالا گیا ہو۔ان باتوں کی سمجھ مجھے بھی اب آئی ہے۔جب میں نے اپنی فائل سے یہ انتخاب نکال کرا سے غور سے پڑھا۔اسی مجموعے میں اقبال کے کلام کا دوسوا شعار کا ایک انتخاب حروف تہجی کے حساب سے تھا۔ مجھے یقین نہیں کہ پاکستان کے کسی تعلیمی ادارے کے کریکیولم میں اقبالیات کے مطالعہ کو وہ بھی آٹھویں درجہ میں وہ مقام دیا گیا ہو جو راشد صاحب نے اس کو اس زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس میں دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ کاوش پاکستانیت کے فروغ کے لئے تھی۔ میں چاہوں گا کہ کلام اقبال کا یہ پورا انتخاب اس کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا جائے۔تا کہ دوسرے ادارے بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس انتخاب کے علاوہ راشد صاحب نے پندرہ نظموں کا ایک اور مجموعہ ''وطن کے نغمے'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ ہاؤس کے ہفتہ وار فنکشنوں میں اس کے ترانے سولو (solo) اور کورس میں گائے جاتے تھے۔ 1973-74ء کے ہاؤس کے سالانہ یوم والدین پر جو دو نغمے میں نے جاوید اختر، شاہد احمد، زاہد رسول، مسعود احمد خاں، افضال احمد اور ارجمند شاہد کے ساتھ گائے تھے وہ ریکارڈ پر لانے کے لئے نقل کرتا ہوں۔ جناب جعفر طاہر کا لکھا ہوا وہ ترانہ جس سے سالانہ فنکشن شروع ہوا یہ تھا:

آیا نیا زمانہ، گائیں نیا ترانہ ، آیا نیا زمانہ
نئی بہاریں لے کر آئیں پھولوں کے نذرانے

بھر گئے آج خزانے
بادل ٹوٹ کے ایسا برسا گونج اٹھے ویرانے
آیا دور سہانا گائیں نیا ترانہ
آیا نیا زمانہ گائیں نیا ترانہ
ایک خدا پر ایک نبی ﷺ پر ہے اپنا ایماں
ہاتھ میں ہے قرآن
ہوتے ہوتے ہو گئے پورے دل کے سب ارمان
آیا نیا زمانہ گائیں نیا ترانہ
کام ہمارا یاد رکھیں گی آنے والی نسلیں
ہری بھری یہ فصلیں
شیر دلیر مجاہد، گھبرو، غازی کمریں کس لیں

دشمن مار بھگانا، پاکستان بچانا

آیا نیا زمانہ گائیں نیا ترانہ

ایک نرالا سورج چمکا، پھیلا نیا سویرا

اونچا سبز پھریرا

آج عوامی دور ہے بھیا، راج ہے تیرا میرا

سب کا ہاتھ بٹانا، آگے قدم بڑھانا

آیا نیا زمانہ گائیں نیا ترانہ

واضح رہے کہ 1973ء کے نئے دستور اور نئے عوامی دور کے پس منظر میں یہ ترانہ لکھا گیا تھا۔اس دور کی دھڑکنیں اس میں صاف سنی جا سکتی ہیں۔

وسیم ارشد، زاہد رسول، جاوید اختر، محمد وحید، جاوید کوثر کے ساتھ مل کر 6 ستمبر کے حوالے سے میں نے یاور عباس صاحب کا رزمیہ گیت

کبھی بھول کر نہ آنا کبھی بھول کر نہ آنا

کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب

میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

بڑی پاک سر زمین ہے یہاں سنتری کھڑے ہیں

کوئی دشمنوں سے کہہ دے یہاں غزنوی کھڑے ہیں

یہاں بدر کا ہے عالم یہاں حیدری کھڑے ہیں

کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب

میری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

فقط اک خدا کو سجدہ ہے نشان سرفرازی

میرا نام ہے مجاہد مری آن ہے نمازی

گئی جان تو شہادت ہوئے سرخرو تو غازی

کبھی بھول کر نہ آنا میری سرحدوں کی جانب

مری سرحدوں کی جانب کبھی بھول کر نہ آنا

میری سرحدوں کے اندر نہ قدم بڑھا سکو گے

میری سرحدوں تک آئے تو بچ کے نہ جا سکو گے

کورس کی شکل میں پیش کیا تھا اور بڑا اہٹ ہوا۔طبلہ پر سنگت شاہد احمد نواز نے دی تھی اور ہارمونیم طارق میر نے بجایا تھا۔راشد صاحب نے نغموں اور ترانوں کی موسیقی سیٹ کرنے اور اس کی ریہرسل کرانے کے لئے جہلم کے ایک ماہر موسیقار فضل الٰہی صاحب کی خدمات حاصل کی تھیں۔راشد صاحب نے ہاؤس کے بچوں کے لئے معیاری لطیفوں کا ایک مجموعہ اپنی بیگم سے مرتب کروایا تھا۔وہ کاپی ہاؤس کے دفتر میں پڑی رہتی تھی۔ چونکہ مہینہ میں کم از کم ایک بار ہاؤس کے اسٹیج پر آنا ہر لڑکے کے لئے لازمی تھا۔بعض لڑکے تیاری نہ ہو سکنے کی صورت میں ان ہی مجموعوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔راشد صاحب نے ایک کاپی میں دس معیاری نعتیں بھی جمع کر رکھی تھیں۔پہلی نعت حالی کی تھی۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

دوسرے ظفر علی خاں کی

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

شاہ نامہِ اسلام سے حفیظ جالندھری کا ''سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی''، بھی اس مجموعہ میں شامل تھا۔اللہ اکبر، کیا تربیت کیا range تھی۔

میجر طارق حبیب

(کالج نمبر 3504، زمانہ تعلیم 1972-1976ء)

یہ بات اس وقت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ''راندۂ درگاہ'' لڑکوں سے راشد صاحب کو اتنی دلچسپی کیوں ہے۔وہ ان سے مایوس یا بیزار کیوں نہیں ہوتے۔وہ ان کو دھتکارتے یا نظر انداز کیوں نہیں کرتے۔ جبکہ دوسروں کے ہاتھوں ان کا مقدر یہی تھا۔

ہم شیطان قسم کے لڑکوں کا ایک گروپ تھا، جنھوں نے قسم کھائی ہوئی تھی کہ سیدھے نہیں چلنا۔اس وقت ہم اسی کو بڑا کمال سمجھتے تھے۔جب میں راشد صاحب نے ہمیں اردو پڑھانا شروع کی، ہم نے انکی شہرت سن رکھی تھی کہ باتوں باتوں میں ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نگاہوں نگاہوں میں چیک کرتے رہتے ہیں۔چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ آئے تو ہم بھی alert ہو گئے۔ان کی عادت تھی کہ تھوڑا سا کام روز دیتے اور ہر روز چیک کرتے تھے۔ہم نے تو تہیہ کیا ہوا تھا کہ ہمیں ٹھیک نہیں ہونا۔ (اس وقت اپنی شخصیت کے اظہار کا یہی ایک ذریعہ سمجھ میں آتا تھا) دوسرے روز وہ ہماری طرف آئے تو ہم باری باری کھڑے ہو گئے، اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے کام نہیں کیا۔انھوں نے کاپی کھولی، تاریخ ڈالی،

دستخط کئے اور 'تشریف رکھئیے' کہہ کر چلے گئے۔ کئی دن خاموشی سے یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ہمیں جھنجھلاہٹ ہونے لگی کہ وہ چڑتے کیوں نہیں، انہیں غصہ کیوں نہیں آتا ہمیں برا بھلا کیوں نہیں کہتے کم از کم لمبا سا لیکچر ہی پلائیں، کچھ تو کریں۔ تشریف رکھئے، تشریف رکھئے، یہ کیا بات ہوئی کم از کم سختی سے بیٹھ جاؤ ہی کہیں۔ کچھ تو سزا دیں۔ کچھ تو مانیں کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ آخر کار ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے کہا کم از کم ای ڈی ہی دلا دیں۔ بولے ''میں آپ لوگوں کو شرم دلا رہا ہوں'' ہم ہار چکے تھے۔ دوسرے روز سے کام شروع کئے بغیر چارہ نہ تھا۔

ستمبر 1965ء کی جنگ کی وجہ سے چند دن کے لئے کالج بند ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد کھلا تو یہ عقدہ بھی کھلا کہ مجھے بغیر کسی کارنامے کے سیکشن پریفیکٹ بنا دیا گیا ہے۔ اب مجھے شبہ ہوتا ہے کہ مجھے راہِ راست پر لانے کی یہ سازش راشد صاحب نے کی ہوگی۔ بہر حال کچھ دنوں کے بعد سالانہ تقسیم انعامات اور یوم والدین کی تقریب کی آمد کا غلغہ ہوا۔ اس سے پہلے انٹر ہاؤس Interior Economy کی شیلڈ کے لئے تیاری شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں ذاتی طور پر راشد صاحب میرے سیکشن میں آئے اور جیسا کہ انکی عادت تھی کہ بہت جز رسی سے انسپکشن شروع کیا۔ ڈارم کی ایک لائٹ کے شیڈ پر کچھ گرد تھی انھوں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔ ''یس سر'' اور انکے جانے کے بعد میں نے ایک کیڈٹ کو بتا دیا کہ شیڈ صاف کرنا ہے۔ پھر چیک کرنا مجھے یاد نہیں رہا اور بات آئی گئی ہوئی۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور سب سے پہلے اسی شیڈ کو چیک کیا اور بغیر کچھ کہے، خود اسٹول پر کھڑے ہو کر اسے اپنے رومال سے صاف کیا۔ میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے صفائی پیش کی'' سر میں نے ایک جونیئر کو بتا دیا تھا'' انھوں نے کہا۔ ''طارق اب تم دوسری غلطی کر رہے ہو۔ تم پریفیکٹ ہو، یہ کام کروانا تمہاری ذمہ داری تھی۔ اب تم کسی اور کو قصوروار ٹھہرا رہے ہو۔ کام نہ کروا سکنا صرف inefficiency تھی۔ ایک جونیئر کو scapegoat بنانا بزدلی بھی ہے اور ذمہ داری سے فرار بھی چونکہ یہ کردار کا نقص (flaw) ہے''۔ اس دن سے یہ بات میرے دل میں اتر گئی ہے۔ میرے اندر اور بہت سی خامیاں ہونگی لیکن اپنی ذمہ داری کسی اور پر ڈالنے کو میں اپنے اوپر حرام سمجھتا ہوں۔

راشد صاحب کبھی کبھی ہمیں اپنے گھر چائے پر بھی بلاتے تھے۔ چائے کا تو بہانہ ہوتا تھا۔ اصل مقصد لیکچر دینا ہوتا تھا۔ جس میں ہماری کارستانیوں کا اشارتاً کنایتاً تذکرہ بھی ہوتا۔ پھر سمجھاتے کہ ذہانت، توانائی اور وقت کا صحیح استعمال کیوں ضروری ہے۔ ان کا ایک جملہ اب بھی یاد آتا رہتا ہے، "I'm a teacher not an instructor"۔ ہم جو چکنے گھڑے مشہور ہو چکے تھے، ہم سے نہ صرف مایوس نہ ہونا بلکہ ہماری

حوصلہ افزائی کرتے رہنا، ان ہی کا حوصلہ تھا۔ ایک بار کالج میں انگریزی کی فلم لگی تھی۔ دوسرے دن کلاس میں پوچھا کہ فلم کیسی تھی۔ ہم نے کہا اچھی تھی۔ ''کیا بات اچھی تھی؟ پلاٹ کیسا تھا؟ مکالمے کیسے تھے؟ کس کی ایکٹنگ اچھی تھی۔ اور کیوں؟ تھیم کیا تھی؟ ڈائریکشن کی کیا خوبی تھی'' وغیرہ وغیرہ۔ انھوں نے تفریح میں بھی تعلیم کا پہلو نکال لیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ آہستہ آہستہ انھوں نے ہمارے ذہنوں کو کھولا تو غلط نہ ہوگا۔

ایک روز کلاس میں آئے ایک تکون بنائی۔ ایک پر (ایچ) دوسرے پر (ایس) اور تیسرے کونے پر (اے) لکھا۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ ہم کیا بتاتے؟ ایسے ہی تکے لگاتے رہے۔ پھر خود ہی بتایا کہ یہ دو طالب علموں کی داستان محبت ہے۔ جو کل رشتہ ازدواج میں خوشی خوشی بندھ گئے۔ (ایچ) سے مراد شاہ حسین کے چھوٹے بھائی شہزادہ حسن اور (ایس) پاکستان کے مسٹر اکرم اللہ اور شائستہ اکرام کی بیٹی ثروت۔ جو (اے) یعنی صدر ایوب کی blessings سے خوشی خوشی رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ خدا مبارک کرے۔ پھر بتایا کہ کس طرح دونوں کیمبرج میں کلاس فیلو تھے۔ ذہنی ہم آہنگی نے دونوں کو یکجا کر دیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ جب ہم زندگی میں یہ قدم اٹھائیں تو ذہنی ہم آہنگی کو ملحوظ رکھیں۔

ایک بار میں سی، ایم، ایچ میں داخل تھا تو راشد صاحب اپنی بیگم کے ساتھ مجھے دیکھنے اسپتال آئے۔ وہ ساڑھی پہنے ہوئے تھیں۔ وہ میرے کھانے وغیرہ کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ آنٹی شام کو اکثر راشد صاحب کے ساتھ گھومنے نکلتی تھیں اور اسپتال کا چکر لگاتی تھیں۔

ستمبر 1987ء میں کالج گیا تو راشد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میں نے ان کو وہ ڈارمیٹری میں شیڈ کی صفائی والا واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ اس نصیحت پر میں اب بھی عمل پیرا ہوں، تو انہوں نے کہا ''اسی طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ خود میرے ساتھ اس طرح کا واقعہ پیش آ چکا ہے میں جب علی گڑھ کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں تھا تو سیمنار کی لائبریری میں وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔ میں اس کا انچارج تھا۔ انھوں نے کچھ کتابوں پر پڑی گرد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے عذر پیش کیا کہ چپڑاسی نے صفائی ٹھیک نہیں کی۔ انہوں نے فرمایا۔ اس سے کام لینا آپ کی ذمہ داری ہے۔ اس سے پہلو تہی نہ کیجئے۔ کتابوں پر اگر آئندہ گرد پڑی ہوئی تو میں خود اسے صاف کرونگا۔''

اسی ملاقات میں، میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ آپ ہمارے ''بدنام'' گروپ پر اتنی توجہ کیوں دیتے تھے؟ فرمایا اس طرح کے لڑکوں میں ذہانت، جرأت، توانائی بہت ہوتی ہے۔ بس اس ''جنون'' کو راہ پر لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی، اس لئے میں لگا رہتا تھا، کہ کسی دن تو اثر ہوگا۔''
و تواصو بالحق و تواصو بالصبر'' پر نظر رہے تو انسان مایوس نہیں ہوتا۔

میجر احسان اللہ
(کالج نمبر 3510، زمانہ تعلیم 1972-1977ء)

راشد صاحب نے شیر شاہ ہاؤس میں لڑکوں کی تربیت کے لئے اچھا خاصا لٹریچر تیار کر رکھا تھا۔ آج کا خیال، آج کا شعر ہو، میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، تقریبِ نزولِ قرآن، یوم اقبال، یوم استقلال، یوم قائداعظم غرض کوئی فنکشن ہو اس کی علیحدہ فائل بنی ہوئی تھی۔ کمپیوٹر کے انداز سے کھٹ سے فائل نکالتے اور کام شروع ہو جاتا۔ قابلیت، تجربہ اور شوق ان تینوں چیزوں کے ان کی ذات میں جمع ہو جانے سے وہ بہت effective ہو گئے تھے۔ ہر لڑکے کے آتے ہی development کا نصاب (syllabus) اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ ''بچو! اس منزل تک پہنچنا ہے''۔ اس سے awareness کی سحر طلوع ہونے لگتی تھی۔

ساجد حسین
(کالج نمبر 3558، زمانہ تعلیم 1973-1976ء)

میں سی ایس ایس کا انٹرویو دے رہا تھا کہ جنرل عتیق الرحمان نے کتابوں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا مختار مسعود کی 'آواز دوست' اور ساتھ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ کتاب میں نے سب سے پہلے 1973ء میں آٹھویں درجہ میں پڑھی تھی۔

''آٹھویں درجہ میں؟''

انھیں حیرت تھی کہ آٹھویں درجہ میں کوئی یہ کتاب کیسے پڑھ سکتا ہے۔ تو میں نے انھیں بتایا کہ اس وقت میں ملٹری کالج میں پڑھ رہا تھا۔ شیر شاہ ہاؤس میں میرے ہاؤس ماسٹر راشد صاحب نے یہ کتاب سب کے لئے پڑھنا لازم کی ہوئی تھی۔

ہاؤس کی لائبریری میں ''آواز دوست'' کی تین کاپیاں تھیں۔ اور کتابیں جو میں نے ہاؤس کی لائبریری سے راشد صاحب کے ایماء پر پڑھیں یہ تھیں۔

جہاں دانش	احسان دانش کی آپ بیتی
بے تیغ سپاہی	نواب صدیق علی خاں، سالار مسلم گارڈ کی آپ بیتی تحریک پاکستان کے حوالے سے
درس زندگی	ترجمہ پطرس بخاری
آندھی میں چراغ	خواجہ غلام السیدین

کامیاب زندگی کا تصور	انور شمیم
کمپنی کی حکومت	باری علیگ
تاریخ کی کہانی	باری علیگ
الفاروق	شبلی نعمانی
روشنی	شاہ بلیغ الدین
رزم حق و باطل	شاہ بلیغ الدین
قرآن حکیم اور ہماری زندگی	دوسری جلد
قرآن نمبر	سیارہ ڈائجسٹ
جینے کی اہمیت	ترجمہ مختار صدیقی (لن یوتانگ) کی مشہور کتاب The Importanace of Living کا ترجمہ
فکر محکم	ترجمہ کمال رضوی Dr. NormanVincent Peale کی کتاب The Power of Positive Thinking. کا ترجمہ

سول سروس میں راشد صاحب کے بہت سے شاگرد ہیں۔ پڑھنے کا شوق دلانا اور فنون لطیفہ کا ذوق پیدا کرنا بھی شیر شاہ ہاؤس کی روایت تھی۔

ڈاکٹر صغیر اکبر

(کالج نمبر 3565، زمانہ تعلیم 1973-1976ء)

شیر شاہ ہاؤس کا اپنا آڈیٹوریم تھا۔ اس میں سر راشد اہم شخصیات کو ہمیں لیکچر دینے بلواتے رہتے تھے۔ 1973-74ء کے سیشن میں جب میں وہاں تھا تو 22 ستمبر کو لارنس کالج کے پرنسپل اور کالج کے سابق کمانڈانٹ بریگیڈیئر رفیق نے ہمیں لیکچر دیا۔ اس ماہ کی 30 تاریخ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن بریگیڈئر نذیر احمد نے ہمارا فنکشن دیکھنے کے بعد لیکچر دیا اور مجھے یاد ہے کہ انھوں نے مطالعہ کرنے کی عادت اپنانے پر زور دیا تھا۔ دسمبر 73ء میں پی، ایم، اے کی سپورٹس ٹیمیں آئی تھیں۔ بارش ہی میں باسکٹ بال کا میچ ہوا۔ پتہ نہیں کس طرح manage کیا اور پی، ایم، اے کمانڈانٹ بریگیڈئر عبداللہ سعید کو وہ ہاؤس لے آئے اوران سے آڈیٹوریم میں لیکچر دلوایا۔ اس کی تصویر 73-74ء کے تربیت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (سامنے کی کرسی پر میں بیٹھا ہوں) 74ء کے اوائل میں کرنل سلطان احمد (ستارہ جرأت دوبار) جمال پور کے ہیرو، ان

سے ملنے آئے تو انھوں نے بہت شارٹ نوٹس پر ہمیں جمع کروا کران کے جنگی اور پھر بطورِ جنگی قیدی کے تجربات ہمیں سنوائے۔اس وقت آ ٹھویں میں ہمیں اس بات کی کیا سمجھ آتی کہ وہ وی آ ئی پیز کو گھیر گھار کے کیوں ہاؤس میں لاتے ہیں۔اب پندرہ برس کے بعد کچھ ادراک ہے کہ غالبًا وہ ہمارا Mental exposure چاہتے تھے۔ بڑے انسانوں سے ملوا کر وہ ہماری بڑائی کی image کو بنانا چاہتے تھے۔ ان لیکچروں سے پہلے وہ ہمیں سوالات کرنے کی ترغیب ضرور دیتے تھے اس کی مصلحت بھی اب عیاں ہے۔

کیپٹن عبدالوحید

(کالج نمبر 3572، زمانہ تعلیم 1976-1973ء)

راشد صاحب بڑے سخت disciplinarian تھے۔ بہت چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں کو نوٹ کرتے تھے، باز پرس کرنے کا اپنا انداز تھا۔مثلاً کلاس میں غلط جواب پر یا کسی اور غلط حرکت پر ان کا مسکرا دینا غلط کار کو اس کا اشارہ ہوتا تھا کہ تم سے غلطی ہوگئی ہے اپنی اصلاح کرو اور اگر وہ ایکدم خاموش ہو جائیں اور چہرہ پر اداسی چھا جائے تو سمجھ جایئے کہ کوئی blunder یا بڑی حماقت سرزد ہوگئی ہے۔

ہاؤس میں ان کا ریکارڈ تھا کہ اتوار کو توصبح سے شام تک صحن میں یا آفس میں رہتے تھے۔لیکن براہ راست کسی کو چیک نہیں کرتے تھے۔ایک عام سی ہدایت ہاؤس کیپٹن کے توسط سے آ جاتی کہ یہ کرنا ہے اور ایسا نہیں کرنا چاہیے۔خود اس فرد کو وہ کسی موزوں وقت بتاتے کہ فلاں موقعہ پر تم نے یہ کام غلط کیا تھا۔خود میرے ساتھ یہ ہوا کہ جب میں 1973ء میں شیر شاہ ہاؤس میں آٹھویں میں تھا مجھے نہ جانے کیا شرارت سوجھی، پہلے تو پانی کے پائپ پر بار بار پاؤں رکھتا رہا، پھر اس کو خوب ٹھوکریں ماریں۔راشد صاحب نے دیکھا لیکن اس وقت کچھ نہ کہا۔تقریباً دو ہفتہ کے بعد ماہانہ انٹرویو کے وقت کہا۔’’وحید تمہاری طبیعت میں تندی ہے، aggressiveness ہے۔اس روز تم کوئی غصہ لاشعوری طور پر اس غریب پانی کے پائپ پر اتار رہے تھے، ہاؤس کا پائپ مفت میں خراب ہوا۔دیکھو impulsiveness کبھی کبھی بہت نقصان پہنچا سکتی ہے۔اگر تم اپنی مزاجی تندی پر قابو پا سکو تو یہ آگ تمہارے لئے asset بھی ثابت ہو سکتی ہے‘‘۔ یہ تھا انکی تربیت کا طریقہ۔

ڈاکٹر خالد محمود

(کالج نمبر 3635، زمانہ تعلیم 1977-1974ء)

راشد صاحب سفید کو سپید کہتے تھے، یہ ان کا پسندیدہ رنگ تھا اور چنبیلی ان کا پسندیدہ پھول۔ انکے آفس کی میز کے بائیں کنارے پر جو فلاور واز ہوتا تھا اس میں میں نے ہمیشہ چنبیلی کے پھول لگے دیکھے۔ 77-1976ء میں جب میں شیر شاہ ہاؤس کا پریفیکٹ تھا تو میں نے نوٹ کیا کہ ہر ڈارم کی جو تین تین کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں، وہاں انھوں نے چنبیلی کے پودے لگوائے ہوئے تھے۔ اسی طرح ہاؤس کے آگے کے لانز (lawns) پیچھے کے کناروں پر بھی چنبیلی اور سرخ بوگن ویلیا کی بیلیں تھیں۔ ہاؤس میں تمام سال یا تو چنبیلی کے سفید پھولوں کے ستارے چمکتے ہوتے یا پھر بوگن ویلیا کے سرخ پھول نظر آتے۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ پھولوں کے رنگ اور جگہ کا انتخاب بے وجہ نہ تھا۔ ہاؤس آفس میں کتابوں کی پانچ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ 'سیلف ایشو' سسٹم تھا۔ سیکنڈ پریپ کو چھوڑ کر صبح شام جس وقت جس کا جی چاہے آ کر پڑھے۔

شیر شاہ ہاؤس کی میری امیج میں ہاؤس کی لائبریری، چنبیلی کے پھول اور راشد صاحب اور آنٹی شامل ہیں۔ آنٹی بھی ہاؤس کا لازمی حصہ تھیں۔ کیانی اور علم الدین ڈارمز کے چھوٹے لڑکوں کی وہ ماں بنی ہوئی تھیں۔ ہر فنکشن اٹینڈ کرتی تھیں۔ باغ کے پپیتے اور امرود کے پیڑوں میں ہمارا مستقل حصہ تھا۔ ہمارے گھر میں راشد صاحب کی حیثیت خاندانی بزرگ اور پیر کی سی ہے۔ میرے والد محترم کو راشد صاحب سے کتنی عقیدت ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے۔ کہ میرے کالج چھوڑنے کے خاصے عرصہ بعد انھوں نے اپنے نواسے کا نام راشد صاحب کے نام پر شعیب راشد رکھا۔ اکثر کہا کرتے ہیں کہ ہم نے راشد صاحب کے نام کا بوٹا گھر میں لگالیا ہے تاکہ انکی یاد تازہ رہے۔

کیپٹن مرزا محمد عطاء اللہ

(کالج نمبر 3625، زمانہ تعلیم 1979-1974ء)

12 اگست 1988ء کو میں اپنے چھوٹے بھائی فیض محمد خاں کے ہمراہ انکی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوا تو پہلی بات میں نے یہ نوٹ کی کہ وہ ہم دونوں کو ڈرائینگ روم میں بیٹھا کر اندر گئے اور تھوڑی دیر میں جب دوسرے دروازے سے اندر آئے تو چپل کے بجائے سلیم شاہی پہنے ہوئے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ پوچھا یہ صاحب زادے کون ہیں؟ میں نے عرض کیا۔ سر یہ فیض محمد ہے، میرا چھوٹا بھائی۔ بولے ماشاءاللہ اتنا بڑا ہوگیا ہے۔ پھر فرمایا۔ ''تمہیں معلوم ہے کہ اس کا نام تمہارے والد مرحوم مرزا غلام احمد نے اپنے ایک علیگ صوبیدار فیض محمد خاں کے نام پر رکھا تھا۔ فیض محمد خاں اس کالج میں 1925ء

سے مرزا صاحب کے رفیق کار تھے۔ بہت اچھے استاد، بہت اچھے کھلاڑی اور سب سے بڑھ کر عابد و زاہد، تہجد گزار۔ مرزا صاحب نے فیض محمد خاں سے اپنے مراسم کو ان کی وفات کے بعد بھی (1931ء میں ان کا عین عالم جوانی میں ہاکی کے ایک میچ کے بعد انتقال ہوا تھا) پچاس سال تک نبھایا'' وہ کیسے؟''، ''وہ اس طرح کہ 1971ء میں جب تمہارا یہ بھائی پیدا ہوا تو ان کی یاد میں اس کا نام فیض محمد خاں رکھا اور 1981ء تک یعنی اپنی وفات سے دو سال پہلے تک جب وہ لمبا سفر کر سکتے تھے وہ فیض محمد خاں کے بیٹے اور بیٹی سے ملنے بہاول نگر جاتے رہے اور درمے سخنے ان کی خدمت کرتے رہے۔ اس کو کہتے ہیں کردارِ وضع داری۔ تعلقات کو پچاس سال تک نبھایا، بڑی بات ہے بہت بڑی بات ہے۔ یہ کام کوئی معمولی آدمی نہیں کر سکتا۔''

پھر سر راشد نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تمھیں معلوم ہے کہ تمہاری پیدائش کی پیشگوئی ایک پامسٹ بدھ نے کی تھی۔ میں نے عرض کیا ''سر، والد نے ایک بار کچھ کہا تھا لیکن اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔ آپ فرمائیں آپ کو یاد ہوگا''۔ ''ہاں مجھے انھوں نے اپنے انٹرویو میں یہ دلچسپ واقعہ بھی سنایا تھا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارا ایک بڑا بھائی سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ لڑائی کا زمانہ تھا مرزا صاحب کمیشن ہو کر برما کے محاذ پر چلے گئے۔ وہاں رنگون سے کچھ فاصلے پر ایک پگوڈے میں ایک بوڑھے بدھ بھکشو سے انکی ملاقات ہوئی۔ وہ پامسٹ بھی تھا۔ وہ سال بھر کا روزہ رکھے ہوئے تھا، اشاروں سے بات کرتا تھا۔ اس کے ایک چیلے نے مرزا صاحب کو سمجھایا کہ گرو جی کہتے ہیں کہ ایک بیٹا نہ رہا اب پچیس برس میں بیٹا بدھ بھگوان دیں گے۔ پھر بڑے بھکشو نے حساب لگا کر بتایا کہ ایک پندرہ، دوسرا آج سے پچیس برس کے بعد۔ مختصر یہ کہ مرزا صاحب اولاد سے بالکل مایوس ہو چکے تھے تو میاں تم دنیا میں تشریف لائے کسی نے بھکشو کی پیشگوئی یاد دلائی۔ انھوں نے فرمایا، ''نہیں یہ عطائے الٰہی ہے'' یوں تم عطاءاللہ موسوم ہوئے''۔

پھر راشد صاحب نے فرمایا ''تمہارے والد مرزا غلام احمد صاحب عظیم انسان تھے۔ تم دونوں اُن کی جائداد ہی کے وارث نہیں ہو ان کے نام اور کام کے وارث بھی ہو۔ جو پچاس سال تک دوستی نبھائے اور 65 سال تک اپنی ماں سے کئے ہوئے وعدے کو ہر ماہ پورا کرے وہ کس کردار کا انسان ہوگا؟ 65 سال تک وعدہ نبھانے سے میرا اشارہ اس ماہانہ صدقے سے ہے جو وہ اپنی والدہ کے فرمان کے مطابق 1918ء سے مارچ 1983ء۔ اپنی وفات تک پابندی سے ادا کرتے رہے''۔

''میاں عطاء اللہ، وہ نوٹ بک یا ڈائری محفوظ ہے جس میں مرزا صاحب صدقے کا حساب لکھا

کرتے تھے؟''جی ہاں وہ انکے کا غذات میں ہے تو سہی''۔''وہ ڈائری ایک قومی ورثے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ سب سے معتبر سند ہے یہاں کس کردار کے استاد پڑھاتے رہے ہیں۔تم اس کو کالج میوزیم میں رکھدو۔ میں سب سے پہلے اس کی زیارت کروں گا''!جب ہم چلنے لگے تو فرمایا کہ جولوگ پہاڑوں پر ہیں انھیں پہاڑ کی وسعتوں کا اور بلندیوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔تم باپ غلام احمد کو جانتے ہو،تمھیں کیا خبر کہ انسان غلام احمد کتنا بڑا تھا۔ جب ہم دونوں بھائی موٹر بائیک پر کالج سے واپس آ رہے تھے تو میں فیض سے کہہ رہا تھا کہ جب میں خود راشد صاحب سے پڑھتا تھا ،جب میں انکے ہاؤس میں رہتا بھی تھا،تو بھی مجھے انکی بلندیوں اور وسعتوں کا اندازہ نہ تھا جواب ذرا فاصلے سے،دور ہٹ کر، ہو رہا ہے۔

مرزا اعجاز بیگ

(کالج نمبر 3662،زمانہ تعلیم 1975-1970ء)

شیر شاہ ہاؤس میں ہفتہ میں دوبار بدھ اور جمعہ کی رات کو فنکشن ہوتے رہتے تھے۔ایک فنکشن پر انھوں نے کہا ہر لڑکا باری باری یہ بتائے کہ اس نے اب تک زندگی میں کونسا ایسا کام کیا ہے جسے یاد کر کے اسے خوشی ہوتی ہے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی داستان بیان کی۔آخر میں ہم نے سر سے کہا سر آپ بھی بتائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز صبح سویرے میں فلیگ اسٹاف کے ایریا میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ جب میں واپس آنے لگا تو دیکھا راستہ میں ایک بلوٹا اپنی بلی ماں کے ساتھ کھیل رہا ہے اور بلی نے مامتا کے پیار سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔اگر میں ایک قدم بھی آگے بڑھاتا تو وہ ماں بیٹا ڈسٹرب ہوتے۔ میں الٹے پاؤں لوٹا اور پورے مین بلاک کا چکر لگا کر گھر واپس آیا۔ مجھے اپنا یہ behaviour جو بغیر سوچے یکا یک سرزد ہو گیا تھا، بعد کو بہت اچھا لگا۔

شیر شاہ ہاؤس کے کاریڈور میں 'آج کا خیال' ایک بورڈ تھا۔اس پر ہر روز ایک نیا فقرہ لکھا ہوتا تھا۔ ایک روز یہ لکھا تھا۔

''عبادت کی قضا ہے،خدمت کی نہیں''

مجھے یہ فقرہ اکثر یاد آتا ہے۔راشد صاحب بھی اور وہ واقعہ بھی جو ابھی میں نے لکھا ہے۔

کیپٹن جمیل سرور

(کالج نمبر 3744،زمانہ تعلیم 1978-1975ء)

میری انٹری 17 اپریل 1975ء کو شیر شاہ ہاؤس میں آئی تھی۔ اسی شب کو ہمارا تعارف ہوا۔ دوسرے دن سر راشد نے ہاؤس کے سینئرز کی طرف سے ہمارے لئے ایک شو کا اہتمام کرایا۔ (غالباً یہ دکھانے کے لئے کہ کم از کم اس منزل تک ہمیں بھی پہنچنا ہے) اس میں ایک آئیٹم تھا۔ 'ماں کا خواب'، جو ماں کے انداز میں (پردہ پر عکس ڈال کر) دکھایا گیا تھا۔ جس وقت بچہ نے اپنے بجھے ہوئے چراغ کو ماں کو دکھا کر کہا۔

ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے

بڑا موثر سین تھا میں اس لمحہ کو نہیں بھول سکتا۔ شیر شاہ ہاؤس میں فنکشن تو بے شمار ہوتے تھے اور ہر فنکشن پر سر راشد خود موجود ہوتے تھے۔ ایک بار انٹر ڈارم تقریری مقابلہ ہو رہا تھا۔ ایک نیا لڑکا تقریر کرنے کھڑا ہوا تو گھبرا کر ہکلانے لگا۔ پہلے لفظ ''جناب'' کو اس نے جنا جنا ب بے صد صدر کہا۔ لڑکے بے اختیار ہنسنے لگے۔ اور وہ لڑکا اور گھبرا کر بیٹھ گیا۔ راشد صاحب خلاف معمول کھڑے ہوئے اور روسٹرم پر جا کر پہلے تو ایک لمحہ خاموش کھڑے رہے پھر انتہائی دکھی آواز میں کہا۔ ''آپ لوگوں نے اس بچے کو ہنسی کے جو پتھر مارے ہیں وہ میرے دل پر جا کر لگے ہیں۔ اس کا جو دل ٹوٹا اس کا مجھے افسوس ہے لیکن آپ لوگوں نے دانستہ طور پر ہی سہی، ایک ساتھی کا دل دکھانے کا جو گناہ کیا اس پر افسوس اس سے زیادہ ہے۔ آپ لوگ کتنے ظالم ہیں کہ اپنے بھائی، اپنے ساتھی کی پریشانی پر خوش ہو رہے ہیں''۔ پھر کچھ دیر رک کر کہا ''مجھے احساس ہے کہ آپ لوگوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ آپکی ہنسی بھی بے اختیار نکل گئی ہوگی۔ دیکھو میرے بچو! self restraint سیکھنے ہی تو آپ یہاں آئے ہیں''۔

مختصر یہ کہ اس روز انھوں نے بڑی دل سوزی سے کوئی آدھ گھنٹے لیکچر دیا۔ پھر اس لڑکے کو اپنے پاس کھڑا کر کے اس سے تقریر کروائی۔ ماشاءاللہ پھر وہ بڑا اچھا مقرر بنا۔ اور پی ایم اے میں تقریری انعامات تک جیتے۔

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

مسرور زمان

(کالج نمبر 3748، زمانہ تعلیم 1975-1978ء)

سر راشد نے ہمیں پہلے دن سے آٹو گراف بک خرید وا دی تھی اور بتایا کہ علم حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں۔ براہ راست مشاہدے اور تجربے سے، کتابوں کے ذریعے، دوسروں کے تجربے سے۔ آٹوگراف لینے کے دو فائدے ہیں ایک تو اس شخصیت سے براہ راست رابطہ ہو جاتا ہے جو بجائے خود ایک موثر تجربہ ہے۔ دوسرے اس شخصیت کے کسی خاص تجربے سے اسکی اپنی تحریر میں استفادہ کا موقع ملتا ہے۔

اس طرح آٹوگراف اس شخصیت سے مسلسل ذہنی اور جذباتی رابطے کا ہی نہیں ذہنی تعلق کا کام دیتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد سر راشد کے ایماء پر شیر شاہ ہاؤس ہی کی لائبریری سے میں نے مختار مسعود کی مشہور کتاب ''آواز دوست'' پڑھی تو آٹوگراف کی اہمیت و معیار کا مزید احساس ہوا۔ مختار مسعود نے قحط الرجال کے عنوان سے ایک بھرپور باب لکھا ہے ان معروف لوگوں کے حوالے سے جن کے انھوں نے آٹوگراف لئے تھے۔ کالج کے حوالے سے میری آٹوگراف بک میں آخری آٹوگراف سر راشد کا ہے۔

الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

دیانت، شرافت، محبت کے پیکر　　　صداقت، عزیمت، شجاعت کے پیکر

الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

خودآ گاہ، بیباک، بیدار انساں　　　غریبوں، یتیموں کے غمخوار انساں

الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

نہ تن کی محبت نہ دھن کی محبت　　　دلوں میں فقط ہو وطن کی محبت

الٰہی ہمیں ایسے انساں عطا کر

آخر میں اپنے خوبصورت دستخطوں کے نیچے یہ عبارت بھی لکھی:

''اثر صہبائی کی یہ نظم دسمبر 1950ء کے 'ماہ نو' کے قائداعظم نمبر کے صفحہ 8 پر قائداعظم کے حوالہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس وقت سے یہ میرے دل پر نقش ہے اور میں ایسے انسان پیدا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہوں۔''

کیپٹن عابد محمود

(کالج نمبر 3769، زمانہ تعلیم 1978-1975ء)

مسٹر راشد مجھے شیر شاہ ہاؤس کے خوبصورت لانوں، گلابوں، چنبیلی کے سفید پھولوں اور بوگن ویلیا کی قرمزی بیلوں کے حوالے سے یاد آتے ہیں۔ سال کا کوئی مہینہ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ ہاؤس تا حد نظر پھولوں سے خالی ہو۔ ڈارمزکی کھڑکیوں کے پیچھے رات کی رانی کی پودے لگوائے تھے کہ رات کو خوشبو آتی رہے۔ دن کو جہاں جہاں سے لڑکے گزرتے تھے وہاں سے چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی۔ لانوں میں سرخ گلاب بہار دکھاتے تھے۔ سردیوں میں جب گلاب سوئے ہوئے ہوتے تو بوگن ویلیا کی بیلیں قرمزی اور سرخ پھولوں

سے بھری ہوتی تھیں۔ 78-1977ء میں، مَیں ہاؤس پریفیکٹ تھا۔ نومبر 77ء میں اقبال کا صد سالہ جشن تھا۔ اس سلسلہ میں ہاؤس میں اقبالیات پر فنکشن ہوئے اور اقبال کی زندگی کو مکالموں کی سیریز میں پیش کیا گیا۔ ان کی کتاب 'مکالمات اقبال' کی بنیاد شیر شاہ ہاؤس کے جشن اقبال میں پڑی تھی۔ انہوں نے ہاؤس کے لڑکوں سے اقبال کی یاد میں ایک عملی اقدام بھی کرایا۔ وہ یہ کہ کالج کے مین گیٹ کے بائیں طرف کا قطعہ شیر شاہ ہاؤس تک ویران پڑا تھا۔ اس کو انہوں نے اینٹوں، پتھروں سے صاف کروا کے پھر ہم ہی سے ہموار کروایا۔

اس کام میں وہ خود بھی ہمارے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ پھر یہاں گلہڑ، لسٹونیا اور بارسنگھار کے پودے لگوائے۔ ''یہ تمہارا اقبال پارک ہے۔ صرف نام کا ہی نہیں کام کا بھی۔ تم جہاں بھی ہوگے اس کے پھولوں کی نہیں تو اس کام کی خوشبو تمہیں پہنچتی رہے گی۔'' ابھی پچھلے دنوں میں کالج گیا تو پہلے اس پارک پر نظر پڑی۔ اب وہ جگہ بہت بدل گئی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ 78-1977ء کی انٹری کے 72 لڑکوں کی زندگی میں اس کام کی خوشبو باقی ہوگی۔ یہ لمبا کام تھا ہر جمعرات کی دوپہر یا جمعہ کو تھوڑا تھوڑا کام کرتے تھے۔ ایک روز وہاں لڑکے کھرپوں سے کام کر رہے تھے تو انھوں نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کر کے جو کھرپے کے ساتھ ایک چھوٹے سے پتھر کو اکھاڑ کر جگہ کو ہموار کرنے میں لگا ہوا تھا، پوچھا ''عابد اس لڑکے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے اسے کمیشن مل جائے گا؟'' میں نے کہا ''سر میں کیا کہہ سکتا ہوں''۔ فرمایا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ یہ بہت اچھا پاکستانی افسر بنے گا''۔ میری نظر میں کوئی شک دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا ''آزاد کشمیر کے ایک حد درجہ پس ماندہ علاقے کا یہ لڑکا جس کا باپ بھی مر چکا ہے اور جس کی فارمل اسکولنگ بہت کمزور ہے اور جو Co-curricular activities میں بھی بہت پیچھے ہے گویا کلچرل بیک لاگ بھی ہے۔ یہ سارے points اس کے خلاف جاتے ہیں لیکن دیکھ رہے ہو کس طرح ایک resistance کو resist کر رہا ہے۔ اس کا determination اس کا سب سے بڑا asset ہے۔ یہ بچہ اندر سے سونے کا ہے دیکھنا یہ ایک دن چمکے گا''۔ جب ایک عرصے کے بعد میں نے اسے اے کے رجمنٹ کی ایک یونٹ میں بڑا ازوردار ایڈجوٹینٹ دیکھا تو سر راشد بہت یاد آئے۔ مجھے یاد ہے انھوں نے کہا تھا۔ ''امتحانات میں فرسٹ آنا یا کورسز میں ٹاپ کرنا بڑی حد تک intellectual پروسس ہے۔ اس میں self-interest کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ یہ سوشل یا اخلاقی عمل نہیں۔ زندگی میں کچھ ابتدائی کامیابیاں ٹاپ پوزیشنوں اور ٹاپ کورسز سے بھی مل جاتی ہیں لیکن کارزار حیات میں اصل فیصلہ رویوں attitude اور values سے ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں برائٹ لڑکوں سے تھوڑا سا الرجک ہوں۔ میں خود بھی کم از کم امتحانات کے اعتبار سے برائٹ رہا ہوں۔ (اگر علی گڑھ یونیورسٹی ٹاپ کرنے کو

برائٹ نس کا معیار مانا جائے)ذہنی تابندگی دودھاری تلوار ہے۔ذہنی تابندگی کے ساتھ کرداری تابندگی بھی ہو تو بات بنتی ہے۔ورنہ تیز آدمی سے بچ کر رہنا چاہیےاس کی تیزی عموماً صرف اس کے اپنے کام آتی ہے۔''

سر راشد پریفیکٹس کو اس قسم کے بہت لمبے لیکچر دیا کرتے تھے۔ یہ لیکچر اب انکی کتابوں Learning to Lead اور Ripeness is All میں شامل ہیں۔ میں اپنی اعزازی تلوار کا کریڈٹ شیر شاہ ہاؤس کی ہاؤس کیپٹنی کو دیتا ہوں۔شیر شاہ ہاؤس کا ماٹو بھی آئی کین' آئی وِل ہے۔وہاں زندگی اور کیریر کی اتنی awareness ہوجاتی تھی اور ایک ایسا لائف اسٹائل مل جاتا تھا جس کی بنیاد پر ایک sword of honour کیا،زندگی کی بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔سر راشد نے ایک ایسا سسٹم وضع کیا ہوا تھا جس سے خودآ گہی اورآ گے بڑھنے کی امنگ مسلسل بڑھتی رہتی تھی۔اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ سوالنامہ تھا جو وہ نئی انٹری کو پہلی ٹرم کے آخر میں گرمیوں کی چھٹیوں سے چند دن پہلے دیتے تھے۔اس کی افادیت پر تبصرہ کئے بغیر میں یہ سوالنامہ نقل کرتا ہوں۔

شیر شاہ ہاؤس
اپنی تربیت کا خود جائزہ لیجئے

حصہ اول

1 صحت کیسی رہتی ہے؟
2 پچھلے ایک مہینے میں کتنی بار کالج اسپتال گئے؟
3 خوب بھوک لگتی ہے؟
4 گہری نیند سوتے ہو؟
5 دوپہر کا ریسٹ پابندی سے کرتے ہو؟
6 پی۔ٹی کے بعد زیادہ تھکن تو محسوس نہیں ہوتی ؟
7 کونسا کھیل بہت اچھا کھیلتے ہو؟
8 ہاتھوں اور پیروں کے ناخن تراشتے ہو؟
9 دن میں دانت کتنی بار صاف کرتے ہو؟
10 انڈرویئر،موزے،رومال ہفتے میں کم از کم دوبار بدلتے ہو؟
11 خوش لباس ہو؟اسمارٹ نظر آتے ہو؟

حصہ دوم

1 کتنے وقت کی نماز پابندی سے پڑھتے ہو؟
2 قرآن کریم کی کتنی سورتیں زبانی یاد ہیں؟
3 تلاوت کرنے کی عادت ہے؟ ترجمے سے/ بغیر ترجمے سے؟
4 سیرۃ النبی پر کوئی کتاب پڑھی ہے؟
5 احادیث کی چند مشہور کتابوں کے نام بتا سکتے ہو؟
6 اسلامی تاریخ پر کوئی کتاب پڑھی ہے؟
7 تاریخ پاکستان پر کوئی کتاب نظر سے گزری ہے؟
8 قومی ترانہ زبانی یاد ہے؟

حصہ سوم

1 ملٹری کالج اور شیر شاہ ہاؤس کے بارے میں بنیادی باتیں جانتے ہو؟
2 ''ملٹری کالج کے پچیس سال'' نامی کتاب دیکھی ہے؟
3 ملٹری کالج کے شہدا، ستارہ جرأت پانے والوں، اور ممتاز طلباء کے ناموں سے واقف ہو؟
4 ملٹری کالج کا ترانہ اور شیر شاہ ہاؤس کا ترانہ زبانی یاد ہے؟
5 ہاؤس کے ہیرو، شیر شاہ سوری کی زندگی اور کارناموں سے واقف ہو؟
6 کالج اور ہاؤس کے لئے اب تک تم نے کیا کیا ہے؟ کیا کچھ کر سکتے ہو؟ کچھ کرنے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟

حصہ چہارم

1 کونسا اخبار پابندی سے پڑھتے ہو؟
2 اور کون کون سے رسالے؟
3 اخبار اور رسالوں کے تراشے لیتے ہو؟ یا نوٹس بناتے ہو؟
4 کس کس موضوع پر کتابیں پڑھتے ہو؟ پچھلے دو ایک مہینوں میں پڑھی ہوئی چند کتابوں کے نام لکھو۔
5 آداب زندگی، آواز دوست، سو بڑے آدمی، سو تاریخی واقعات، مسلمان موجد اور سائنس دان، مشہور مسلمان سپہ سالار، دس ولی، دس سلطان، مسدس حالی، روشنی، الہامی افسانے، شاہ نامہ اسلام ایسی کتنی کتابیں دیکھیں ہیں یا پڑھی ہیں؟
6 اچھی کتابوں کو پڑھ کر ان پر کوئی تبصرہ بھی لکھتے ہو؟ یا ان سے نوٹس لیتے ہو؟

7 کوئی مزاحیہ کتاب بھی پڑھی ہے؟

8 خود بھی کوئی کہانی، افسانہ یا نظم لکھ سکتے ہو؟

9 اردو یا انگریزی میں بے جھجک تقریر کر سکتے ہو؟

10 ڈراموں میں حصہ لینے کا شوق ہے؟

11 انگریزی کی کتنی تقریریں اور نظمیں یاد ہیں؟

12 ''منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی'' یاد ہے؟

13 اقبال کے کتنے اشعار زبانی سنا سکتے ہو؟

14 پچھلے امتحان میں سب مضمونوں میں پاس تھے؟

15 اردو انگریزی کا خط اچھا ہے؟ کتابیں کاپیاں صاف ستھری رکھتے ہو؟

حصہ پنجم

1 ہاؤس فال ان، ریسٹ، پریپ، میس کا behaviour ٹھیک ہے؟

2 کلاس میں وقت پر جا بیٹھتے ہو؟ punctual ہو؟

3 کبھی شارٹ کٹ تو نہیں کرتے؟

4 محنت کرنے میں مزہ آتا ہے؟ کام سے بھاگتے تو نہیں؟

5 اخلاقی جرأت moral courage رکھتے ہو؟

6 غلطی کر کے اس کا اعتراف کرنے کا حوصلہ ہے؟

7 غصہ ضبط کر سکتے ہو؟ مخالفت برداشت کرنے کا مادہ ہے؟ جلد مایوس تو نہیں ہو جاتے؟ شکایت سن کر بھڑک تو نہیں اٹھتے؟

8 شکر ادا کرنا جانتے ہو؟ ایثار اور احسان کی لذت سے واقف ہو؟

9 خوش مزاج ہو؟

10 فاصلے پر رہنا اور فاصلے پر رکھنا جانتے ہو؟

11 Bullying کی کمزوری میں مبتلا تو نہیں؟

12 انصاف کر سکنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟

13 تم اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتے ہو؟

14 تمھیں اپنی شخصیت کے کس پہلو پر فخر ہے؟

15 کم ازکم کن تین باتوں میں تم اپنے جونیئر ز سے بہتر ہو؟

16 تمہارےideals کیا ہیں؟اور ہیروز؟

17 کیاتم خودبھی کسی میدان میں ہیرو بننے کا شوق اور حوصلہ رکھتے ہو؟

18 اقبال کےاس شعرکا کیا مطلب ہے؟

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

آخر میں، سر راشد سے ایک ملاقات کے چند نکات ریکارڈ پر لانا چاہوں گا۔ایک عرصے کے بعد اکتوبر88ء میں، میں انکی خدمت میں حاضر ہوا۔میرے ساتھ میرے بڑے بھائی کیپٹن ڈاکٹر طارق کے علاوہ میرے والد صاحب بھی تھے(وہ بھی سر راشد کےعقیدت مندوں میں سے ہیں)۔برسبیل تذکرہ میں نے پوچھا کہ ہم اولڈ بوائز نے اس پوائنٹ کو اکثر ڈسکس کیا ہے، آپ نے جب بھی انٹرویولیا،کبھی مارکس کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ہمارا یہ تاثر بھی تھا کہ اکیڈیمکس میں ٹاپ لڑکوں کے مقابلہ میں آپ اقبالیات وغیرہ یاہاؤسappointments میں نمایاں کارکردگی کوزیادہ اہمیت دیتے۔''تمہارا تاثر کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔اصل میں دو چیزیں ہیں،تعلیم کی ماہیت اوراسکی مقصدیت۔تعلیم کا ایک معلوماتی،نصابی یا کتابی پہلو ہےاور دوسرا اقداری value oriented۔جیسا کہ میں تم لوگوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ معلومات اور علم میں فرق ہے۔تعلیم کومعلومات سے بہت آگےعلم کے حصول پر زور دینا چاہیے یہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں جو سراسر reproductive ہےممکن نہیں۔تعلیمی process کوبغیر creative بنائے بغیر تفکر، تدبر، تجربہ پر زوردیئےتعلیم کا اصل مقصد یعنی شعوراور aware شخصیت کا فروغ ممکن نہیں۔اس لئے میں ٹاپ لڑکوں کو یاد دلاتا رہتا تھا کہ جب تک زیادہ پڑھو گےنہیں، زیادہ سوچو گےنہیں بات نہیں بنے گی۔نمبر آتے رہیں گےعلم نہیں آئے گا۔دوسرا نکتہ تعلیم کی مقصدیت کے بارے میں ہے۔دیکھو ٹاپ کرنا قطعاً ذہنی عمل ہے۔سماجی،اخلاقی عمل نہیں چونکہ ٹاپ کرنا قطعاً اپنی ذات کے لئے ہوتا ہے اسلئے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ٹاپ کےلڑکےعموماً self-centered اورتنگ دل اور تنگ نظر ہوتے ہیں یا ہوجاتے ہیں۔ماشاءاللہ وہ اپنے کیریرکو بنانے اوراپنی ذات کو آگے بڑھانے میں ruthlessly مصروف رہتے ہیں۔دیکھو علم تو ایک ذریعہ ہے۔مقصد تو خدمت اور بھلائی ہے۔اسلام نے بھی انسانی فضیلت کا معیار علم کونہیں تقویٰ یعنی اخلاقی برتری کو بنایا ہے۔اب یہ بڑےافسوس کی بات ہے کہ ہم صرف ٹاپ مارکس کوسر پر چڑھائیں اور یہ نہ دیکھیں کہ وہ ٹاپ لڑکا ان ٹاپ مارکس سے کرکیا رہا ہے؟ وہ انسان کیسا ہے؟اس کا سماجی رویہ کیسا ہے؟اس

لئے اس ٹاپ لڑکے کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ ابھی تم نے آدھی ریس جیتی ہے اصل منزل ابھی بہت دور ہے۔

''اقبال نے خود آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خدا مست ہونے کو بھی مشروط کیا ہے۔ خبر کے ساتھ نظر اور نظر کے ساتھ اذان سحر کا ذکر بھی کیا ہے۔ مغربی ملکوں کے ''بے خدا'' علم نے دنیا کو جس عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ بات بہت لمبی ہو جائے گی مختصر یہ کہ ان وجوہ کی بناء پر میں کوشش کر رہا تھا کہ تعلیم کو broadbase کر کے ممکن حد تک creative کیا جائے۔ لائبریری، فنکشنز، توسیعی لیکچرز وغیرہ اسی لئے تھے۔ تم اس کالج ہی کے شہیدوں اور Awardees کی فہرست تو دیکھو پھر ان کا اکیڈیمک ریکارڈ چیک کرو، تمہیں خود اندازہ ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ کس حد تک درست ہے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

''ایک اور سوال جو تم نے پوچھا بہت اہم ہے کہ میں عام لڑکوں کو اتنا encourage کیوں کرتا ہوں اور کرتا تھا۔ ہمارا نظام highly competitive ہے۔ وہ لڑکے جو cultural backlog کے ساتھ کالج میں آتے ہیں انہیں سنبھلتے سنبھلتے ایک آدھ سال لگتا ہے۔ اس لئے ان کو بار بار سمجھانا ضروری ہے کہ زندگی کی میراتھن (marathon) میں، جس میں ہزاروں چکر دوڑنے ہیں اور سینکڑوں میدانوں میں، tracks میں دوڑنا ہے ایک آدھ track میں یا ایک آدھ بار پیچھے رہ جانے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ زندگی کی بازی ہمیشہ کیلئے ہاری گئی۔ No, not at all کیریئر کے گراف میں بہت زیادہ اونچ نیچ کے امکانات ہمیشہ رہتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو آج پیچھے ہے وہ ہمیشہ پیچھے رہے یا ہر ٹریک میں پیچھے رہے اصل نکتہ یہی ہے۔

''کون ہارا کون جیتا؟ اس کا فیصلہ تو بہت دیر میں ہوگا۔ پھر ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے کہ کسی کی کامیابی یا ناکامی میں کتنا حصہ خداداد ذہانت کی کمی و بیشی کا یا ماحول، والدین اور اسکول کی کاوشوں کی کمی بیشی کا ہے۔ اس کا تعین کرنا بیشک مشکل ہوگا لیکن اس فرق کو ملحوظ رکھنا تو مشکل نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عملی زندگی میں مقابلہ ہے اور بے رحم مقابلہ ہے۔ لیکن شیر شاہ ہاؤس میں اس اصول پر کام کرتا ہوں کہ Let every boy compete primarily against himself کم از کم شروع کے مرحلوں کے لیئے یہ اصول بہت اچھا ہے۔''

میجر جنرل طاہر حبیب صدیقی
(کالج نمبر 3835 زمانہ تعلیم 1975-1978ء)

سعید راشد صاحب ایک ہمہ جہت اور committed انسان تھے۔ ملٹری کالج جہلم کے پس منظر میں ان کی شخصیت کو دیکھا جائے تو وہ واقعی ایک Legend تھے۔ اندازِ تعلم، اپنے طالب علموں سے کماحقہ وابستگی، تخلیقی و تحقیقی کاوشیں، تصانیف اور پروفیشن کے ساتھ مکمل وفا داری، تدریس میں psychological approach اور وسیع مطالعاتی ذوق، یہ کمالات انہیں روشنی کا ایسا منبع بنا دیتے ہیں، جونو واردانِ کوچہء علم وفن کے دلوں کو جگمگا دیتا ہے۔ زندگی کو اس کے وسیع تر مفہوم کے ساتھ سمجھ کر کیڈٹس کی اس طرح تربیت اور راہنمائی کرنا کہ ایم سی جے میں گزرے ہوئے لمحات ان کا سرمایہ افتخار ٹھہریں۔ خود میں نے بھی ان سے کسب فیض کیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری ذات پر اُن کے اثرات بہت دوررس اور گہرے ہیں۔ ان کی شخصیت، مزاج اور پروفیشن کے بارے میں میرے تاثرات، ان کے باقی شاگردوں اور رفقہائے کار سے کسی طرح کم نہیں۔

محمد آصف خان
(کالج نمبر 3857، زمانہ تعلیم 1976-1978ء)

شیر شاہ ہاؤس میں 'آج کا شعر' کے بورڈ پر عموماً اقبال کے اشعار لکھے نظر آتے تھے۔ ایک روز میں بریک فاسٹ کے لئے میس کو جاتے ہوئے کاریڈور سے گزر رہا تھا تو اس بورڈ پر حالی کا یہ شعر لکھا دیکھا:

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ سر راشد ڈریس انسپکشن پر آئے تو میں نے اس شعر کا مطلب پوچھا۔ دو چار اور لڑکے بھی جو اس وقت وہاں کھڑے تھے کہنے لگے۔ سر، شعر بہت مشکل ہے۔ ہمارے تو کچھ پلے نہیں پڑا۔ کہنے لگے کچھ شعروں کا مطلب موتی کی طرح علامتوں کی سیپی میں بند ہوتا ہے۔ سیپی کھولو موتی مل جائے گا۔ پھر اسے زندگی بھر اپنی آنکھوں سے لگا کر رکھو گے۔ یہ شعر ہزار موتیوں پر بھاری ہے۔ اس میں زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت نشاط محفل شب کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔ جمعہ کے فنکشن پر اسکی وضاحت کروں گا۔ اس عرصے میں تم سیپی کھولنے کی کوشش کرتے رہو۔

سر راشد کی عادت تھی کہ عموماً جمعہ کی شب کے فنکشن پر آج کا شعر، آج کا خیال، آج کی حدیث یا

آ ج کی آیت کی تشریح کرتے تھے۔ چنانچہ اگلے جمعہ کوانھوں نے شعر کے لفظی معنی بتانے کے بعد اس کے symbolism کی وضاحت کی۔ فرمایا یہ وہی Hit it while the iron is red کا فلسفہ ہے۔ ہر کام کو کرنے کا ایک صحیح وقت آتا ہے۔ جس کسی کو timing کا sense نہیں ہوتا وہ زندگی میں مار کھا جاتا ہے۔ شیکسپئر نے اپنے ڈراما جولیس سیزر میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

There is a tide in the affairs of men
which taken at the flood, leads them on to fortune;Omitted,
all the voyage of their life
is bound in shallows and miseries.

لیکن موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے awareness چاہیے، ترجیحات کا شعور چاہیے۔ پھر انھوں نے sense of priorities پر لیکچر دیا۔ (جواب ان کی کتاب "Learning to Lead" میں شامل ہے)۔ آخر میں انھوں نے حالی کا ایک اور شعر پڑھا۔

؎ کچھ کرلو نو جوانو، اٹھتی جوانیاں ہیں

مجھے یقین ہے کہ اس روز میری طرح بہت سے لڑکے جب آڈیٹوریم سے ان کا لیکچر سن کر نکلے تو ذہنی طور پر وہ، وہ نہیں تھے جو وہ آڈیٹوریم میں جاتے وقت تھے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے میں اپنے وقت سے، اپنی انرجی سے، مواقع سے بھرپور کام لینے کی وہ awareness پیدا ہوئی جس کا اثر میں آج تک محسوس کر رہا ہوں۔ کوئی ''شیرین'' ایسا نہ ہوگا جو زندگی کے بارے میں ایک نئی awareness لے کر وہاں سے نہ آیا ہو۔ ایک عرصے کے بعد میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے جہد مسلسل کا یہ نکتہ سورۃ الشّمس کی آیت ''قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا '' کے حوالے سے بیان کیا اور کہا ان آیات کا ترجمہ پکتھال نے انگریزی میں کیا ہے:

He is indeed successful who causes it (the self) to grow and he is indeed a failure who stunteth it.

فرمایا۔ ''اقبال کے فلسفہ خودی کا مآخذ یہی آیہ گرامی ہے۔ کامیابی و کامرانی self، یعنی ذہنی شخصیت کو نشو ونما دینے میں مضمر ہے''۔ ارشاد ہوا کہ ''من زکّھا''، کے عام ترجمے اور تشریح سے متفق نہیں ہوں۔ تزکیہ نفس کے عمل میں growth کے عمل اور تصور کو شامل کرنا پڑے گا جیسا کہ پکتھال نے کیا ہے۔ تزکیہ، رسم خانقہی سے آگے کی چیز ہے''۔

میں نے یہ مضمون شیر شاہ ہاؤس میں آج کے شعر کے حوالے سے شروع کیا تھا۔ اسی حوالے پر اپنی

گفتگوختم کرنا چاہتا ہوں۔ایک روز آج کا شعر تھا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہین کا جہاں اور

اسکی وضاحت میں فرمایا ''کرگس اور شاہین دوعلامتیں ہیں۔دوقسم کے کرداروں اور شخصیتوں کی۔کرگسیت اور شاہینی یہ زندگی کے بارے میں دورویئے ہیں۔ اس شعر میں ایک اورنکتہ بھی ہے کہ فضا، ماحول یا حالات یکساں ہوتے ہیں،لوگوں کے responses میں فرق ہوتا ہے۔وہ ان کی خودی یا Super-ego structure یا اندرونی شخصیت کی وجہ سے ہوتا ہے۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ''انسان ماحول یا حالات سے بلند تر چیز ہے''۔اس وقت ان کی بہت سی باتیں ہمارے سروں کے اوپر سے گزر جاتی تھیں۔بس ایک مبہم سا احساس ہوتا تھا کہ تعلیم، کتابوں اور امتحانوں سے آگے بھی کچھ ہے۔یہ احساس جسے ادراک میں تبدیل ہوتے ہوتے بہت وقت لگا وہ سب سے قیمتی چیز تھی جو ہمیں سر راشد کے حوالے سے ملٹری کالج میں ملی۔

اختر عباس
(کالج نمبر 3868،زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

اپریل 1976ء میں، میں ملٹری کالج کے مشہور جونیئر شیر شاہ ہاؤس (جسکا نام میرے خیال سے اب سعید راشد ہاوس ہونا چاہیے) میں داخل ہوا، پھر اسی ہاؤس میں 79-1978ء کے دورانیہ میں اسسٹنٹ ہاؤس کیپٹن (ہاؤس کیپٹن ریاض عظیم تھا) اور میس سیکرٹری رہا۔اس لیے شیر شاہ ہاؤس سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔اب چونکہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا یعنی شیر شاہ ہاؤس جونیئر ہاؤس نہ رہا۔ایک عظیم روایت خزاں کی نذر ہوگئی اور شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر راشد صاحب بھی نہ رہے۔اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں شیر شاہ ہاؤس کے حوالے سے سر راشد پر اور سر راشد کے حوالے سے شیر شاہ ہاؤس پر کچھ روشنی ڈالوں تا کہ یہ باتیں اور واقعات ریکارڈ پر آجائیں اور آئندہ کام آئیں۔

پہلی بات تو یہ (جسکی سمجھ مجھے اب آئی ہے) کہ راشد صاحب علی گڑھ کے پروردہ،تحریک پاکستان کے کارکن اور اقبالیات کے سکالر تھے۔اس بیک گراؤنڈ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو شیر شاہ ہاؤس میں ان کے بڑے ambitious تعلیمی وتربیتی پروگرام کی بعض باریکیوں اور گہرائیوں کو بہتر طور پر appreciate کیا جا سکتا ہے۔

اب میں ذرا تفصیل سے بتاؤں گا کہ ہماری motivation کے لیے سر راشد نے کونسا طریقِ کار اور

نظام وضع کیا ہوا تھا اور ہر معاملہ اور ہر قدم پر کتنا personal touch اور personal involvement تھا۔

پہلے دن شیر شاہ ہاؤس میں ہماری پذیرائی اسطرح ہوئی جیسے ہم سب وی آئی پی ہوں۔(نئے طلباء کے ساتھ آئی ہوئی خواتین کا پُرخلوص استقبال آنٹی (بیگم راشد مرحومہ جو بعد میں ماؤں کی ماں ثابت ہوئیں) نے اپنے گھر میں کیا اور حضرات کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لیے خود راشد صاحب (اپنے مخصوص سفید براق لباس میں ملبوس) ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں موجود تھے۔شامیانے کے نیچے کرسیاں لگی تھیں اچھا خاصا جشن کا سماں تھا۔راشد صاحب ہر لڑکے سے اسکے والد یا سرپرست کے ساتھ مختصر سی تعارفی گفتگو کرتے۔میرے والد مرحوم چونکہ خود کہنہ مشق صحافی تھے، وہ راشد صاحب کے انٹرویو کے انداز سے بہت متاثر ہوئے۔(اثر، تاثر بھی اصل میں خلوص کا کرشمہ ہوتا ہے) انٹرویو کے بعد وہ والدین کو ان کے نام ایک خط دیتے جاتے۔ سہ پہر کو راشد صاحب نے سارے طلبا کو آڈیٹوریم میں ایڈریس کیا۔

شروع شروع میں شیر شاہ ہاؤس کا اصل ترانہ انگریزی میں تھا۔

We are the Boys of Sher Shah House

لیکن جب 71ء کی جنگ کے بعد ڈارمیٹریوں کے نام ہاؤس کے شہیدوں حق نواز شہید ڈارم، اکرم شہید نشان حیدر ڈارم، افتخار شہید ڈارم، علم الدین شہید ڈارم، صاحب زاد گل ڈارم، احمد ضیا شہید اور حنیف شہید ڈارم کے ناموں پر رکھے گئے تو راشد صاحب نے ہاؤس کے لیے نثری ترانہ لکھا۔(خود ہی بتایا ''میں شاعر نہیں ورنہ منظوم ترانہ لکھتا لیکن جذبہ ہے'')

دوسرے ہفتہ تقریروں کا پروگرام شروع ہوا۔ایک تقریر سب کے لیے لازمی قرار دی گئی، وہ یہ تھی۔

منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی

اسکے علاوہ اقبالیات کے سلسلہ میں اقبال کے سو اشعار پر مشتمل بانگ درا اور بالِ جبریل کا ایک انتخاب چھپوا کر کیڈٹس کو دیا گیا۔اقبال کے اشعار پر مشتمل بیت بازی کے سیٹ تھے۔(جو طوالت کے خیال سے نقل نہیں کیے جا رہے)۔ایک نئی چیز اقبال کی زندگی اور کردار پر مکالمے تھے۔راشد صاحب کی کتاب'' مکالماتِ اقبال'' کی ابتدا یہی مکالمے تھے جو انہوں نے خاص طور سے ہمارے لئے لکھے تھے۔انگریزی کی دس دس تقریریوں، مکالموں اور نظموں کا سیٹ علیحدہ تھا۔اردو ڈراموں کا ایک مجموعہ انہوں نے شیر شاہ ہاؤس کے لیے مرتب کیا تھا، جس میں کچھ ڈرامے جو ہر ڈارم باری باری کرتی تھی یہ تھے۔

1۔ اور ٹکٹ کھو گئے

2۔ آرام وسکون — امیتازعلی تاج
3۔ بیگم کی بلی — امتیازعلی تاج
4۔ میاں کا کتا — (بیگم کی بلی کی پیروڈی)
5۔ قرطبہ کا قاضی — امتیازعلی تاج
6۔ نیکی اور بدی کا مکالمہ
7۔ مُلا نصیرالدین سلسلہ کے اسکٹ
8۔ دماغ کا آپریشن
9۔ پیسہ بولتا ہے
10۔ افریقہ والے چچا جان

بارہ ملی ترانوں اور نظموں کا ایک مجموعہ بھی ہاؤس میں رکھا ہوا تھا۔

1۔ ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
2۔ چاند میری زمیں پھول میرا وطن
3۔ اٹھ مجاہد وطن
4۔ اے دیس کی ہواؤ

نعتوں کا ایک مجموعہ بھی تھا۔ چند نعتوں کے نام یاد آ رہے ہیں:

1۔ سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
2۔ وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
3۔ وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں

حد یہ کہ لطیفوں کی ایک کاپی بھی تھی۔ ان کی بیگم نے اخبار خواتین اور اخبار جہاں اور دوسرے رسالوں سے قریب دوسو لطیفے جمع کئے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ لڑکے جو لطیفے سنائیں وہ معیاری ہوں اور ان میں مزاح (humour) کا صحیح ذوق پیدا ہو۔

1976ء قائداعظم کے صد سالہ جشن پیدائش کا سال تھا، چونکہ قائد کا ماٹو کام، کام، کام تھا اس لیے انہوں نے اس علاقہ کو جو شیر شاہ ہاؤس اور مین گیٹ کے درمیان ہے (جہاں آجکل کار پارک ہے) ایک پروگرام کے تحت دو مہینے میں develop کروایا۔ جو علاقہ ویران پڑا ہوا تھا اسے گل وگلزار میں تبدیل کروادیا۔ 9 نومبر کو (چونکہ یہ پروگرام 25 دسمبر کو چھٹیوں کی وجہ سے نہیں ہوسکتا تھا) شیر شاہ ہاؤس نے قائداعظم کی یاد میں خصوصی پروگرام کیا۔ جس میں کوئز کے علاوہ خاص چیز قائداعظم کی زندگی اور کردار کی جھلکیاں بھی تھیں۔ یہ وہ ڈرامانما مکالمے تھے جو انکی کتاب ''گفتار وکردار قائداعظم'' کی بنیاد بنے۔ یہ کہنا غلط

نہیں ہوگا کہ شیر شاہ ہاؤس نے راشد صاحب کو مصنف بنا دیا۔ 79-1978ء میں جب میں شیر شاہ ہاؤس وی سی (وائس کیپٹن) اور میس سیکرٹری ہو کر آیا تو سر نے میس کے لیے کچھ ہدایات چھپوا کر دی تھیں پتہ نہیں ان ہدایات کا کیا حشر ہوا۔

کچھ باتیں ایسی بھی تھیں جو اس ہدایات نامہ میں درج نہیں تھیں۔ مثلاً سر کا اصرار ہوتا تھا کہ ہم پریفیکٹس جونیئر لڑکوں کے ساتھ بیٹھ کر کھائیں اور باری باری ہر ٹیبل پر بیٹھیں۔ ایک جملہ اکثر کہا کرتے۔ Taking lead at the table to get more and better food is not your privilege, اس طرح ہر ٹیبل کے لیے ہدایت یہ تھی کہ لنچ پر ڈونگے سے سالن لینا ایک طرف سے شروع ہو اور ڈنر پر دوسری طرف سے۔ عدل ایک ایسی value تھی جسکی تربیت ہر قدم پر تھی۔ اسی اصول کے تحت وہ ایک ڈارم سے دوسری ڈارم میں تبادلے کثرت سے کرواتے تھے تاکہ ہر جگہ اور ہر قماش کے لڑکوں کے ساتھ گزارہ کرنے کی عادت ہو۔

ہاؤس کی ادبی مجلس، آرٹ کلب، لائبریری اور سوشل سروس کلب کی اپنی سرگرمیاں تھیں، یاد آیا، سر، پریفیکٹس کی رہنمائی کیلئے جو لیکچر دیا کرتے تھے وہ ''Learning to Lead'' کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ لیکن جونیئر لڑکوں کی رہنمائی کے لیے جو Guidance Folio انہوں نے لکھا تھا وہ شاید نہیں چھپا ہے۔ اس میں کلاس روم، ہاؤس، کھیل کے میدان، مسجد، موسیٰ ہال، اسپتال وغیرہ ہر situation کے لئے ہدایات Guidance Cards کی شکل میں تھیں۔

کیپٹن ریاض عظیم

(کالج نمبر 3873، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

79-1978ء کے سیشن میں، میں اور اختر عباس (3868) شیر شاہ کے سینئر پریفیکٹس بنے۔ (جونیئر پریفیکٹس آٹھویں کے ہوتے تھے جو ہر ہفتہ بدلتے رہتے تھے)۔ راشد صاحب نے ہمیں ہاؤس آفس کے ساتھ بائیں طرف کا کمرہ الاٹ کیا۔ (اس میں ان کی مصلحت تھی۔ اسکا احساس کچھ عرصہ کے بعد ہوا)۔ سردی، گرمی، ہر موسم اور ہر وقت آفس کھلا رہتا تھا۔ چونکہ ہاؤس لائبریری بھی اسی کمرہ میں تھی اور خود راشد صاحب رات کو اور کالج کے اوقات کے سوا تقریباً ہر وقت آتے جاتے رہتے تھے اور ہمیں بھی ہدایت تھی کہ سونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے سوا ہر وقت اپنے کمرہ کے دروازے کھلے رکھیں تا کہ ہم سارے ہاؤس کو

دیکھتے رہیں اور سارا ہاؤس ہمیں دیکھتا رہے، جونیئر لڑکوں کو حکم تھا کہ وہ ہماری سنیارٹی کا لحاظ کرتے ہوئے ہمارے کمرہ کے سامنے سے نہ گزریں اور ہمیں یہ سکھانے کے لیے کہ اپنے جونیئر کی بھی عزت کی جاتی ہے، وہ خود شدید گرمی اور ہلکی بارش میں بھی ہمارے کمرہ کے سامنے سے نہیں گزرتے تھے۔ سال بھر شاید ایک بار بھی انہوں نے خود ہمارے کمرے کی انسپکشن نہیں کی لیکن ہمیں ہر روز کالج جانے سے پہلے اور ہاؤس کا انسپکشن کرنے سے پہلے اپنے کمرے کو سیٹ کرنا پڑتا تھا۔ جمعہ کو ہاؤس میں صفائی ستھرائی اور سیٹنگ کا انٹرڈارم انسپکشن ہوتا تھا جس میں ہر ڈارم نئے سے نیا آئیڈیا پیش کرنے کی کوشش کرتی تھی اور ڈارمز اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ایک دوسرے کا راز حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ دشمن کا جو جاسوس پکڑا جاتا اسکی چپلوں سے تواضع ہوتی، یہ موقع ہاؤس میں بڑی پر رونق گہما گہمی کا ہوتا تھا۔ بعد میں ادراک ہوا کہ راشد صاحب اس طریقے سے لڑکوں میں مقابلہ کی سپرٹ (ڈارم سپرٹ) پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جمعہ کی صبح اس انسپکشن کا مہمان خصوصی کسی اور ہاؤس کا ہاؤس پریفکٹ یا کالج پریفکٹ یا یونین پریزیڈنٹ یا کوئی مہربان انسٹرکٹر ہوتا تھا۔ جسکا خیر مقدم کرنے کے بعد راشد صاحب اندر چلے جاتے۔ پھر مہمان خصوصی پورے ہاؤس کا انسپکشن ہمارے کمرہ سے شروع کرتا۔ (دیکھا کس خوبصورتی سے ہمیں بھی فٹ کر دیا)۔ ہاؤس آفس کی انسپکشن آفس انچارج اور ہاؤس لائبریری کی انسپکشن لائبریری انچارج کراتا تھا۔ انسپکشن کے بعد بیسٹ لاکر، بیسٹ بیڈ، بیسٹ ڈارم کے کپ دیئے جاتے اور اسی وقت اگلے ہفتے کے بارہ جونیئر عہدے اناؤنس کیے جاتے جس میں ٹائلٹ انچارج اور ریڈنگ ٹیبل انچارج جیسے چھوٹے لیکن اہم عہدے شامل تھے۔ یہ عہدے لیڈرشپ کی تربیت کی پہلی سیڑھی تھے۔ (اگر شیر شاہ ہاؤس کے دس بارہ لڑکوں نے اعزازی تلوار لی ہے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے) نو بجے کے بعد یہ انسپکشن کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور نماز کے بعد لازمی قرآن خوانی کے وقت تک لڑکوں کو مکمل چھٹی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ ہمیں بھی سیٹی بجا کر بلانے کی اجازت نہیں تھی۔ ابھی میں نے کہا ہے کہ اگر شیر شاہ ہاؤس سے مستقبل کے دس بارہ اعزازی تلوار یافتگان نکلے تو غلط نہیں۔ تربیت کا انداز ہی ایسا تھا کہ سب کو اپنی صلاحیتیں پیدا کرنے اور اپنے آپ کو develop کرنے کا موقع ملتا تھا۔ شیر شاہ ہاؤس میں ہر روز ایک جونیئر پریفکٹ ہوتا تھا۔ جسے ہر روز Daily Report لکھنا ہوتی تھی۔ یہ رپورٹ اتنی انتظامی ضرورت نہ تھی جتنی تربیتی ضرورت تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سارے ڈیوٹی کیپٹن اس رپورٹ کے مطابق کام نہیں کرتے تھے شاید کر ہی نہیں سکتے تھے لیکن اس تجربے سے گزرنا یا دوسروں کو یہ ڈیوٹی کرتے دیکھنا ہی بڑے دُوررس اثرات کا حامل ثابت ہوا۔ کم از کم مجھے جے سی بی سے پی ایم اے تک کوئی ذمہ داری نئی یا زیادہ معلوم نہیں ہوئی۔

آپ ہی بتائیں جو لڑکا اس بھٹی سے تپ کر نکلا ہو وہ کہیں مار کھائے گا؟ شیر شاہ ہاؤس ایک بہت بڑا

تجربہ تھا، جو پاکستان میں پبلک اسکول ایجوکیشن میں کیا گیا۔شیر شاہ ہاؤس میں پر یفیکٹس کی حیثیت وی آئی پیز کی سی تھی۔(کام بھی بہت،عزت بھی بہت کا اصول)۔

شیر شاہ ہاؤس میں سب سے زیادہ دباؤ پر یفیکٹس پر تھا۔(گو سیکھتے بھی وہی تھے) راشد صاحب بڑے رحمدل، لیکن سخت ٹاسک ماسٹر تھے۔ بقول شخصے،ان کے تین حربے تھے۔ خاموشی، مسکراہٹ اور شرافت، جسکے دباؤ سے مفر نہ تھا۔ڈیلی رپوٹ کو upto minute رکھنا اہم ذمہ داری تھی۔اس رپورٹ پر وہ ہر روز لائٹس آؤٹ کے بعد دستخط کرتے تھے۔اس میں ہاؤس کی پریڈ اسٹیٹ،سِک رپورٹ، ہاؤس کی اور کلاس کی سزا جزا ہر چیز کا ذکر ہوتا تھا۔ ہاؤس کیپٹن اگر ہاؤس سے باہر جاتا تو اسے ان کی میز پر ایک چٹ چھوڑنی پڑتی تھی کہ وہاں جا رہا ہوں اور اس وقت واپس آؤں گا۔اس سے پہلے کہ آگے بڑھوں یہ بھی بتاتا چلوں کہ انہوں نے خود احتسابی self assessment کے لیے تین کارڈ سائیکلوسٹائل کرا کے کیڈٹس کو دیئے تھے۔نہ جانے اب وہ زیر استعمال ہیں یا نہیں۔

لیکن راہنمائی کا اصل source وہ ماحول تھا جو شیر شاہ ہاؤس میں انکی دن رات موجودگی،آنٹی کی دیکھ بھال،تربیتی پروگرام،اور خوبصورت لانوں اور پھولوں سے پیدا ہوا تھا۔وہ لڑکے کے behaviour کو ایک سائیکالوجسٹ کی نظر سے مختلف حالات (situations) میں اسکے بچپن اور والدین کے پس منظر میں واچ کرتے رہتے تھے۔اور پھر اسکو بڑے پیار سے، دردمندی اور فراستِ سے سمجھاتے تھے۔انٹرویوز کا یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا۔ 'I can I will' ہاؤس کا ماٹو تھا۔اپنی ذات اور مستقبل کی ذمہ داری کی کچھ نہ کچھ awareness سب کو ہو ہی جاتی تھی۔میری طرح بے شمار اولڈ بوائز ہوں گے جو شیر شاہ ہاؤس کو اور اس کے روح رواں سر راشد اور آنٹی کو شکر گزاری اور فخر کے گہرے جذبے کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

آنٹی تقریباً ہر ہفتے ہمارے لئے کوئی نہ کوئی ڈش بھیجتی رہتی تھیں۔ راشد صاحب اپنے وی آئی پی مہمانوں (زیادہ تر سینئر اعزاز یافتہ اولڈ بوائز) کو ہاؤس میں لاتے اور ہم سے ملواتے۔ پھر ہم ان کے conducting آفیسر بنتے۔شیر شاہ ہاؤس میں سالانہ یوم والدین بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ 16 مارچ 1979ء کے یوم والدین کے مہمان خصوصی بریگیڈیر(اب لیفٹیننٹ جنرل) آر ڈی بھٹی تھے۔ بریگیڈیر محمد یونس (1949) بھی موجود تھے۔اس موقع پر ایک ڈراما قرطبہ کا قاضی بھی پیش کیا گیا تھا۔جس میں عاطف ضیا نے قاضی اور مسعود اشرف نے حلاوہ کا کردار کمال کا ادا کیا تھا۔

ساری نئی انٹری سے سال کے آخر میں لڑکوں کا final development assessments کرنے کے لیے ایک پروفارما بھرواتے تھے۔پھر اسکی روشنی میں ہر لڑکے سے رخصتی انٹرویو کرتے تھے۔

سید محمد ہارون الیاس
(کالج نمبر 3876، زمانہ تعلیم 1980-1976ء)

دسمبر 1976ء میں ولادت قائداعظم کی صدسالہ تقریبات کے سلسلہ میں شیر شاہ ہاؤس میں جو پہلا فنکشن ہوا اس میں سر راشد نے کہا کہ صرف یہ فنکشن کافی نہیں ہیں۔ قائداعظم کا ماٹو کام، کام اور مزید کام تھا۔ ہمیں کام کے حوالے سے بھی انہیں یاد کرنا ہے تاکہ یہ حوالہ زندگی بھر ہمارے ساتھ رہے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ شیر شاہ ہاؤس کے عقب میں کیفٹیریا کے پیچھے، سڑک کے کنارے تک جو ٹکڑا ویران پڑا ہے اسے چمن بنایا جائے۔ چنانچہ رضا کارانہ بنیاد پر یہ کام شروع ہوا۔ میں چونکہ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں لمبا اور مضبوط تر تھا اس لئے میرے سپرد یہ کام ہوا کہ بڑے درخت کے نیچے تین فٹ چوڑا تین فٹ گہرا گڑھا کھودوں تاکہ اسمیں فالتو اینٹیں روڑے بھر دیئے جائیں اور گڑھے کی مٹی زمین ہموار کرنے کے کام آئے۔

جب ہم یہ کام کر رہے ہوتے تو کچھ لڑکے ہمارا مذاق بھی اڑاتے کہ تم مکھن لگا رہے ہو۔ یہ باتیں انکے کانوں میں بھی پڑتی تھیں۔ ایک روز انہوں نے ہمیں اس موضوع پر لیکچر دیا۔ سورۃ العصر کا حوالہ دیا۔ اب یہ لیکچر ان کی کتاب "Learning to Lead" میں "Your Rivals & You" کے عنوان سے شامل ہے۔

یہ علاقہ جب develop ہوگیا تو انہوں نے فروری 78ء میں یہاں گلہڑ اور ہارسنگھار کے درخت لگوائے۔ 80-1979ء میں جب میں بابر ہاؤس میں ہاؤس پریفیکٹ تھا تو صبح کی پی ٹی پر شیر شاہ کے سامنے سے ہاؤس کے اسکواڈ کو لے کر گزرتا تھا۔ کنٹین کے قریب پہنچتے ہی ہارسنگھار کی مست کن خوشبو ہمارا خیر مقدم کرنے لگتی تھی۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسوقت مجھے کون یاد آتا تھا۔

وہ خوشبوئیں وہاں اب بھی آتی ہوں گی لیکن کم ہی کسی کو علم ہوگا کہ "خوشبوؤں کا ہجوم کالج کے اس گوشہ میں کیوں ہے اور کس عظیم انسان کی یاد میں ہے"۔

کیپٹن شجاعت علی قاضی
(کالج نمبر 3897، زمانہ تعلیم 1981-1976ء)

جب میں آٹھویں میں شیر شاہ ہاؤس میں تھا تو راشد صاحب اردو، انگریزی تقریر، ڈرامے سب کچھ خود لکھ کر دیتے تھے۔ اگلے سال سنئیر ہاؤس میں پہنچ کر جب میں نے ان سے انٹر ہاؤس مقابلے کے لئے ایک اردو تقریر لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے فرمایا۔ ''ساری، شجاعت! میں یہ تقریر تمہیں لکھ کے نہیں دوں

گا۔ جب شیر بڑا ہو جائے تو خود مار کے کھاتا ہے۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو، خود شکار کرنا سیکھو۔ کرگس اور شاہین میں یہی تو فرق ہے۔ وہ شعر تو سنا ہے نا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

میرے بچے! اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھو۔ وہ دور اور تھا یہ منزل اور ہے۔ حوصلوں کو بلند رکھو، پتہ ہے کہ سکندر کے بچپن میں جب اسکا باپ فیلفوس ملک پر ملک فتح کرتا جا رہا تھا تو اس نے ماں سے گلہ کیا کہ اگر میرا باپ اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو میرے لیے کیا بچے گا۔ یاد رہے کہ شیر شاہ سوری جو عظیم مغلوں سے بھی عظیم تر تھا، اپنے باپ حسن کے گھر سے صرف حوصلہ لے کر قسمت آزمائی کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔ باپ کی جاگیر وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کے لئے چھوڑ آیا تھا''۔

میرا خیال ہے اس طرح انہوں نے مجھے کوئی آدھ گھنٹہ لیکچر پلایا ہو گا لیکن تقریر لکھ کے نہیں دی۔

ڈاکٹر زاہد نوید

(کالج نمبر 3901، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

8 اپریل 1976ء کی صبح میں نے شیر شاہ ہاؤس میں رپورٹ کی،۔ میرے دادا جان مرحوم کیپٹن شیر احمد میرے ساتھ تھے، ہمارے بیٹھنے کا بندوبست ایک شامیانے کے نیچے شیر شاہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں تھا۔ اندر راشد صاحب نو واردوں سے انکے والدین کے ساتھ تعارفی انٹرویو کر رہے تھے۔ جاتے ہی ہمیں تین کاغذات دیئے گئے۔ والدین کے نام خط، نئے طلبا سے چند باتیں اور کھانے پینے کے اسلامی آداب'' والدین کے نام خط'' دادا جان پڑھنے لگے۔ 'نئے طلباء سے چند باتیں' میں نے اسکو دیکھنا شروع کیا۔ اتنے میں ہماری باری آ گئی۔ تو دادا مجھے لے کر شیر شاہ ہاؤس کے آفس میں گئے جو آفس کم لائبریری زیادہ تھی۔ میرے کوائف بتاتے ہوئے جب دادا نے یہ بتایا کہ زاہد ایک شہید کا بیٹا ہے اور دو سال ہوئے ماں کی شفقت سے بھی محروم ہو چکا ہے تو راشد صاحب اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''شیر احمد صاحب! یہ بچہ ایک شہید کی امانت ہے اور آج سے میرا بیٹا ہے۔ آپ فکر نہ کریں''۔ ''فکر کیسے نہ کروں اسمیں میری آدھی جان ہے''۔ آج سے آدھی میری بھی ہے۔

دو ہفتے کے بعد 6 مئی کو ہمیں پہلا ویک انڈ ملنا تھا۔ راشد صاحب نے ہاؤس فنکشن پر اعلان کیا جو لڑکے گھر جانا چاہتے ہیں شوق سے جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ انہیں گھر سے کوئی بڑا لینے آئے۔ میں نے خط لکھا تو اتفاق سے دادا اور ماموں دونوں آ گئے۔ جب میں کلاسز سے واپس آیا تو دونوں کو سر کے آفس میں

بیٹھے دیکھا۔ اتفاق سے اسی دن موسیٰ ہال میں کوئی فنکشن تھا۔ میں نے دادا سے کہا میں فنکشن اٹینڈ کرآؤں تو چلوں گا۔ سر راشد صاحب نے کہا۔ نہیں دوسرے لڑکے گھر جا چکے ہیں تم چاہو تو جا سکتے ہو لیکن میں یہ کہتے ہوئے موسیٰ ہال کی طرف بھاگ گیا۔ آپ لوگ ذرا انتظار کریں میں فنکشن اٹینڈ کرآؤں، سارا ہاؤس جا چکا ہے۔ دادا جان اس وقت تو خاموش رہے لیکن بعد میں انہوں نے اس واقعہ کا ذکر بارہا گھر اور باہر کیا۔ دیکھو کمال ہے کہ کس طرح زاہد دو ہفتے میں بدل گیا۔ کہاں تو بار بار خط لکھ کر بلایا اور پھر الٹا ہمیں انتظار کرایا۔ سب کیڈٹس کی طرح میں بھی شروع شروع میں ہر روز گھر خط لکھتا تھا۔ جس میں صبح وشام تک کی ساری روداد ہوتی تھی۔ آدھا خط راشد صاحب کی باتوں سے بھرا ہوتا تھا اور آدھے خط میں ہاؤس اور کلاس کی باتیں ہوتی تھیں۔

22 جون کو جب ہم گرمیوں کی چھٹیوں پر جانے لگے تو اس سے ایک رات پہلے ہاؤس کی لائبریری سے سب کو ایک ایک انگریزی اور اردو کی کتاب دی گئی۔ اسکریپ بک بنانے اور آٹو گراف بک خریدنے کو کہا گیا۔ ساتھ ہی چھٹیوں کے بارے میں ایک خط بھی دیا گیا جس میں ان چند کتابوں کے نام بھی تھے جو ہمیں پڑھنا تھیں۔

اسی رات سر راشد نے ہمیں بتایا کہ گھر میں بہن بھائیوں کے لئے کوئی چھوٹا سا کم قیمت کا تحفہ لینا ہے۔ چھٹی میں پرانے استادوں سے ملنا ہے اور ان کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے اس قابل بنایا کہ ملٹری کالج میں داخلہ مل سکا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں جو کچھ تم لوگوں نے سیکھا ہے، اسکا اثر گھر پر سب کو نظر آنا چاہئے۔ وہاں پر اگر پودے پیڑ ہیں تو انکو تواتر سے پانی دینا ہے۔ کوئی پالتو جانور مثلاً گائے یا بھینس ہے، اسکی دیکھ بھال پہلے سے زیادہ کروتا کہ اسے بھی پتہ چلے کہ چھوٹے میاں کچھ بدل کر آئے ہیں۔ گھر میں والدین کو بھی فرق محسوس ہو۔ دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ کے ہاں جاؤ تو ان کو وضو کرانا ہے۔ جائے نماز بچھانا ہے۔ اگر بزرگ حقہ وغیرہ پیتے ہیں تو اسکا انتظام کرنا ہے۔ انہوں نے توجہ دلائی کہ چھٹی کا مطلب کاہلی یا آوارہ گردی یا کھانے پینے میں بے اعتدالی نہیں۔ انہوں نے خاص طور پر تاکید کی کہ جو لائف سٹائل یہاں شروع کیا ہے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ وہاں بھی جاری رہے۔ میں نے بھی تھوڑا بہت ان ہدایات پر عمل کیا۔ خاص طور پر اس حصے پر جس کا تعلق دادا جان کی خدمت سے تھا۔ جب بھی میں گھر پر ہوتا ناممکن تھا کہ میں انکو وضو کرانا، ان کا جائے نماز بچھانا اور اٹھانا، بھول جاؤں یا انکے جوتے پالش نہ کروں۔

دادا جان سر راشد کا ذکر بہت کیا کرتے تھے اور ایک جملہ بار بار دہراتے 'تمہارا ہاؤس ماسٹر سعید راشد ''کے جی آر'' کی ماں ہے۔ باپ نہیں ماں! اسکے دل کو مولا کریم نے ماں کا دل بنایا ہے'۔ شیر شاہ ہاؤس کی

کس کس بات کو یاد کروں۔ شیر شاہ ہاؤس کی روٹین کالج سے مختلف تھی۔ بعض باتیں بڑی عجیب لگتی تھیں۔ جس دن بارش ہورہی ہوتو پی ٹی برآمدوں میں کرتے تھے۔ جمعہ کو بھی Morning Jerks لازمی تو نہیں تھے لیکن انکی تاکید تھی اور Appointment Holders کو حکم۔ آج بحیثیت ڈاکٹر کے میں خوب جانتا ہوں کہ صبح کی ریگولر اکسر سائز کتنی ضروری ہے۔ زندگی میں ترتیب، تنظیم اور نفاست پسندی کی کیا اہمیت ہے۔ نفاست پسندی پر یاد آیا کہ کلاس میں پہلے کلاس کی صفائی اور Lay out وغیرہ چیک کرتے تھے۔ یہ بھی کہ ڈوراسٹاپ لگے ہوئے ہیں یا نہیں پھر پڑھائی شروع کرتے تھے۔ چاک یا کاغذ کے ٹکڑے خود اٹھا لیتے یا کسی سے کہتے۔ کلاس میں ہر طرح کے لڑکے ہوتے ہیں۔ ایک روز ایک لڑکے کو (میں نام نہیں لکھوں گا) شرارت سوجھی تو اس نے چاک کے بہت سے ٹکڑے ادھر اُدھر پھیلا دیئے۔ ڈیسکوں کو جان بوجھ کو ٹیڑھا میڑھا کر دیا۔ مختصر یہ کہ جب وہ آئے تو خلاف معمول کلاس کا حلیہ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ پھر مسکرائے جس کا مطلب تھا کہ وہ سمجھ گئے ہیں کہ کیا قصہ ہے پھر بغیر کچھ کہتے ہوئے صرف اتنا کہا، سبق شروع کیجیے۔ اس نارمل طریقے سے سبق پڑھایا۔ بیچ بیچ میں ایک آدھ بار ادھر اُدھر دیکھا بھی لیکن کہا کچھ نہیں اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی حسب عادت خاموشی سے چلے گئے۔

دوسرے دن کلاس کو سیٹ کرنے، چاک کے ٹکڑے اٹھانے اور بورڈ کو صاف کرنے میں وہ لڑکا پیش پیش تھا جو کل کی شرارت کا سرغنہ تھا۔ بہرحال جب وہ کلاس میں داخل ہوئے تو کلاس کو معمول سے بہتر دیکھ کر پھر مسکرائے۔ (یہ مسکراہٹ گذشتہ دن کی مسکراہٹ سے مختلف تھی) اور کہا "Thank you gentlemen" آپ لوگوں نے آج بھی اہتمام کیا ہے لیکن مختلف انداز سے۔ "very kind of you"۔ پھر بہت سنجیدہ ہو کر سمجھایا۔ ''یہاں آپ لوگ صرف نوٹس رٹنے اور امتحان پاس کرنے نہیں آئے۔ آپ درس زندگی لینے آئے ہیں۔ ایک بھرپور لائف اسٹائل اپنانے اور اپنی انسانی اور قومی ذمہ داریوں کو پورا کرنا سیکھنے آئے ہیں۔ یہ کلاس روم آپ کا پاکستان ہے۔ آپ کا ہاؤس آپ کا کالج آپ کا پاکستان ہے۔ اسکو لک آفٹر کرنا پاکستان کو لک آفٹر کرنا ہے، یہ آپ کی منزل مراد ہے اسکو شاد رکھیئے، آباد رکھیئے''۔

یہ درس زندگی سر راشد کی پہچان ہے۔ یہ وہ خاص سبق ہے جو ہم نے ان سے ہاؤس میں اور کلاس روم میں سیکھا۔ جس کی افادیت آج پہلے سے زیادہ محسوس ہورہی ہے۔

ڈاکٹر محمد سرفراز عالم

(کالج نمبر 3903، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

1976ء کی جنوری میں سخت سردی کی وجہ سے کمانڈانٹ صاحب نے صبح کی پی ٹی معاف کردی تھی۔ راشد صاحب نے ہاؤس سے کہا کہ صبح صبح پی ٹی گراؤنڈ میں جا کر پی ٹی معاف ہوئی ہے وقت پر اٹھنے اور ڈارم میں، ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں آ کر تھوڑی سی ایکسرسائز(morning jerk) سے کس نے منع کیا؟ ان کے خیال میں صبح کی نماز کی طرح کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی جگہ صبح کی ایکسرسائز بھی لائف اسٹائل کا حصہ تھی۔ سردی میں صبح سویرے اٹھنا کسے گوارا ہوتا ہے؟ دوسری صبح ہم نے بستر سے منہ نکال کے یہ نظارہ دیکھا کہ ہاؤس تو سارا سویا پڑا ہے یا کم ازکم بستر میں ہے اور راشد صاحب گھر کے سامنے کی اپروچ روڈ پر تیزی سے ٹہل رہے ہیں اور ہاتھ بھی جیب سے باہر ہیں۔

دوسرے روز کچھ کو شرم آئی اسطرح رفتہ رفتہ صبح سویرے اٹھنے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوتا گیا۔

بابر بلال

(کالج نمبر 3910، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

اپریل 1976ء میں، میں شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ پہلے دن انہوں نے ایک پروفارما ہم سب سے بیک وقت باہر کورٹ یارڈ میں بیٹھا کر بھروایا تھا۔

راشد صاحب نے شیر شاہ ہاؤس میں جو لٹریچر تیار کیا تھا۔ اسکی ایک ایک کاپی انہوں نے میرے والد اور اختر عباس کے والد ترمذی صاحب کو دی تھی۔ میرے والد نے ہیڈ ماسٹر ہونے کے ناطے اس سوالنامے کو بہت پسند کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ یہ سوالنامے ملک کے دوسرے اسکولوں میں بھی کام آئیں گے۔ اس سوالنامے میں بھی سر راشد کی سوچ کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

کیپٹن علی ظاہر سید

(کالج نمبر 3962، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

میرے زمانہ میں ہر ہفتہ شیر شاہ ہاؤس کے سارے عہدے دار بدلتے رہتے تھے۔ جن میں ٹائلٹ انچارج، آفس انچارج، ریڈنگ ٹیبل انچارج، Wing Capt., AVC, ADC, DC ہاؤس سیکریٹری، میس سیکریٹری، گیمز اور سوشل سیکریٹری سمیت کوئی گیارہ Appointments تھیں۔ اسطرح پورے سال میں ہر لڑکا کم ازکم تین چار بار کسی نہ کسی ذمہ داری کی منزل سے گزرتا تھا۔ اسکے ساتھ بار بار ڈارمیٹری بھی تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ کبھی اِس ڈارمیٹری میں کبھی اُس ڈارمیٹری میں، ہم سر راشد کی اس پالیسی

سے بہت تنگ تھے۔ کہیں ٹکنے ہی نہیں دیتے تھے۔ جہاں نئے دوست ملے اور دوستی بڑھنی شروع ہوئی حکم مل گیا۔ اٹھاؤ بستر۔ اب کمیشن لے کر جب اِدھر اُدھر جانا پڑا اور کبھی adjustment میں دشواری پیش نہیں آئی تو یاد آیا کہ اوہو یہ تو شیر شاہ ہاؤس کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ ہمیں تو اس کچی عمر میں اس سوشل adjustment کی ریہرسل کرائی جا چکی تھی۔

میں شیر شاہ ہاؤس کے سالانہ یوم والدین کا ذکر بھی کرنا چاہوں گا۔ میں نے جو ہاؤس فنکشن اٹینڈ کیا وہ 16 مارچ 1979ء کو ہوا تھا۔ اسکے مہمان خصوصی ایک ممتاز عالمگیرین لیفٹیننٹ جنرل آر ڈی بھٹی تھے۔ جس میں ہاؤس کے 78 کیڈٹس کے والدین کو خصوصی دعوت دی گئی تھی۔ مہمانوں میں کیڈٹس کے والدین ہی نہیں ان کے بھائی بہن بھی تھے۔ تین چار سو مہمانوں کا مجمع تھا کالج کا اسٹاف تھا ان کی بیگمات اور بچے تھے۔ کالج کے سنیئر کیڈٹس تھے۔ شیر شاہ ہاؤس کا سارا صحن کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور سارا انتظام ہاؤس کے کیڈٹس کا تھا۔ عارضی اسٹیج بھی انہوں نے ہی بنایا تھا۔ اسکی تربیتی اہمیت اپنی جگہ، میں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ فنکشن 5 گھنٹے کا تھا۔ جو ٹھیک دس بجے مہمان خصوصی کے استقبال سے شروع ہوا، آرٹ کرافٹ کی نمائش کی رونمائی ہوئی جو مرزا عبدالطیف صاحب ہاؤس کے اسسٹنٹ ماسٹر صاحب نے کیڈٹس سے تیار کروائی تھی۔ ساڑھے دس بجے سے ایک بجے تک کے سیشن میں ترانے انگریزی، اردو تقریریں، مباحثے، مذاکرے ہوئے۔ اقبال اور قائداعظم پر ڈرامائی مکالمے پیش کئے گئے (یہ سارا مواد اب راشد صاحب کی کتابوں ''شاد باد منزل مراد''، ''مکالماتِ اقبال'' اور ''گفتار و کردارِ قائداعظم'' میں شامل ہے۔) اس سیشن کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ہاؤس کے تمام 78 آٹھویں درجہ کے لڑکے کم از کم دو بار اور کم از کم دو منٹ کے لئے اسٹیج پر آئے۔ کوئی بچا نہیں، سب نے کچھ نہ کچھ اسٹیج پر ضرور کہا۔ ڈھائی گھنٹے کے اس بہت ہی دلچسپ سیشن کے بعد سب مہمانوں کے لئے ہاؤس ہی میں لنچ ہوا۔ 2 بجے ڈراموں کا سیشن شروع ہوا۔ انگریزی میں ''شاپ اسسٹنٹ'' اور اردو میں ''پیسہ بولتا ہے'' اور ''قرطبہ کا قاضی''، بہت ہٹ ہوئے۔ عاطف ضیا، مسعود اشرف کی ایکٹنگ لاجواب تھی۔ یہ ڈراما اس پائے کا تھا کہ کالج اسٹیج پر بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ اس سیشن میں ڈراموں کے علاوہ کورس اور نغمے بھی تھے۔ یہ پروگرام بھی دو گھنٹے چلا اور اس میں پھر ہاؤس کے ایک چوتھائی لڑکوں نے حصہ لیا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ میرا پوائنٹ یہ ہے شیر شاہ ہاؤس کے یہ سارے لڑکے جو اس عمر میں چار پانچ سو اجنبی چہروں کا اسٹیج پر سامنا کر گئے کیا وہ آیندہ کسی audience کو face کرنے میں جھجکتے ہوں گے؟ اپنے تجربے سے کہتا ہوں جے سی بی اور پی ایم اے میں بھی پبلک speaking کی ٹریننگ ہوئی تھی۔ وہ صرف پلاٹون کے ان کیڈٹس کے سامنے

ہوئی تھی جن کے ساتھ ہم سال دو سال سے رہتے تھے۔ صحیح exposure تو شیر شاہ ہاؤس میں ہوا تھا۔ ملٹری کالج اور ملٹری کالج میں بھی شیر شاہ ہاؤس کے اسٹیج کے exposure نے ایم سی جے کے لڑکوں کو اتنا اعتماد دیا اور اتنی مہارت دی کہ جے سی بی اور پی ایم اے میں اس شعبہ میں ہمارے کیڈٹس نے مسلسل امتیازی کارکردگی کا ایک ریکارڈ قائم کر دکھایا۔

اس طرح کے فنکشن میں والدین کو بلا کر شیر شاہ ہاؤس نے ایک اچھی روایت قائم کی تھی۔ جس کی نظیر کسی اور کیڈٹ کالج میں نہیں ملتی۔ والدین اپنے بچوں کو خوب جانتے ہیں۔ جب انہوں نے اپنے بچہ کو اسٹیج پر پرفارم کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو انہیں اندازہ ہوا کہ ہمارے بچہ کو کالج میں راشد صاحب نے کیا دیا اور وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تجربہ والدین کے لیے بڑی طمانیت کا باعث ہوا۔ دوسرے یہ کہ جب انہوں نے ہاؤس کے دوسرے 80 لڑکوں کو بھی پرفارم کرتے دیکھا تو انہیں یہ بھی اندازہ ہوا کہ مقابلہ کی دوڑ میں ان کے لاڈلے کی پوزیشن کیا ہے؟ اسکی خوبی خامی کیا ہے؟ اس کے جیتنے کے امکانات کیسے ہیں اور یہ کہ انہیں خود اس کی تربیت کے لیے کیا کرنا ہے۔ راشد صاحب والدین کو ان کے بچہ کے بارے میں مشورہ اور counselling کے لیے بھی بلاتے تھے۔ یہ بھی بہت مفید سلسلہ تھا۔ وہ کیڈٹس کا تقریباً ہر ماہ انٹرویو کرتے تھے۔ یہ براہ راست counsilling بھی بہت کام کی چیز تھی۔

ان کا انٹرویو کرنے کا اپنا اسٹائل تھا۔ انہوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ امیدوں اور امکانات کے چراغ دل میں جل اٹھتے تھے۔ Look Beyond the Hill پر تان ٹوٹتی اور آخر میں کہتے کہ اب تم مجھے انٹرویو کرو۔ پوچھو جو دل میں ہے۔ بتاؤ دل کے اندیشے کیا ہیں؟ امنگیں کیا ہیں اور اگر کوئی شکایت ہے، گلہ ہے۔ پرابلم ہے تو بتاؤ اور اگر ذاتی سوال پوچھنا ہے تو وہ بھی پوچھو۔ پُر وقار طریقے سے، بے تکلفی سے پیش آتے تھے۔ اس طرح لیڈر شپ کا جو معیار یا جو امید ان کے حوالے سے ابھری، وہ بھی بڑی خدمت ہے۔

آخر میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ ذاتی پسند یا ناپسند ان کی بھی ضرور ہوگی۔ لیکن مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کسی سے کوئی امتیازی سلوک روا رکھا ہو۔ میرے بڑے بھائی صولت چونکہ کالج کے اولڈ بوائے اور ایڈجوٹینٹ رہ چکے تھے۔ اس زمانہ میں ان کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ آنٹی بھی آتی تھیں۔ تو کالج میں داخل ہونے سے پہلے خواہ مخواہ میرا خیال تھا کہ مجھے کچھ نہ کچھ رعایت تو ضرور ملے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ ویک انڈ اور واکنگ آؤٹ دینے میں جو سخت اصول انھوں نے تیار کئے تھے وہ میرے لیے سخت تر تھے۔ چونکہ کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ تھا۔ اس لئے سب کو اطمینان تھا اور اپنی پہچان کرانے کے لئے سیدھے طریقے سے جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ شیر شاہ ہاؤس کا ماٹو I can, I will بہت زبردست تھا۔ اب بھی میرے ساتھ

ہے۔میرے زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس کا انگریزی ترانہ We are the boys of Sher Shah House جس میں ڈارمیٹریوں کے نام ، ہاؤس کے نام، شیر کے ہر حرف کے ساتھ تھے۔ S سے H,Spark سے Heralds, E سے Eagle اور R سے Radiants تھے۔یہی نام ترانے میں آتے تھے۔ یہ ترانہ ہاؤس کے پہلے ہاؤس ماسٹر مسٹر حیدری کا لکھا ہوا تھا اور اسکی دھن London bridge is falling down کی دھن پر بنائی گئی تھی۔ یہ ترانہ ہم کورس کی شکل میں گاتے تھے۔اس ترانے سے ہمیں اپنے آپ پر pride محسوس ہوتا۔

آخر میں میں دو ایک باتیں سر راشد کے طریقۂ تادیب کے بارے میں بھی کہنا چاہوں گا۔ راشد صاحب کی نرم دلی اور دردمندی مشہور ہے۔انہیں غصہ ضرور آتا ہوگا لیکن غصہ کرتے نہیں دیکھا۔کبھی اونچی آواز سے ڈانٹتے یا بولتے نہیں سنا۔لیکن لڑکوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ چھوٹی سے چھوٹی بات وہ چیک کرتے تھے۔اس کا نوٹس لیتے تھے۔لیکن اسکو نمٹانے کا اپنا انداز تھا۔کبھی چیک کر کے غور سے دیکھ کر خاموش ہو جاتے۔ چھوٹی موٹی غلطی جیسے شارٹ کٹ لینا، جیبوں میں ہاتھ ڈالنا،معنی خیز انداز میں دیکھ کر مسکراتے۔ اسکا مطلب تھا Mind, what you are doing۔بات زیادہ سنگین ہوتی تو آفس میں بلاتے۔ کچھ دیر خاموش رہتے۔ پھر بڑے دل دوز انداز سے پوچھتے معلوم ہے کہ کیوں بلایا ہے۔ جواب آتا جی ہاں۔تو بہت دکھ کے انداز میں کہتے کہ جاؤ۔نفسیاتی اپروچ تھی۔مقصود یہ تھا کہ غلط کار جاگ جائے۔ان کی توجہ کارناموں کے ساتھ مشروط نہیں تھی۔ جو کسی شمار میں نہ ہوتے انکو اسٹیج پر لانے کی، ان کو appointment دینے کی،انکو خود اعتمادی دینے کی وہ اس درجہ اہتمام سے کوشش کرتے کہ بعض اوقات چمکتے ستاروں کو گلہ ہوتا کہ میں نظر انداز کیا جا رہا ہوں۔ایک سوال جو اس زمانے میں میرے اور دوسرے لڑکوں کے ذہن میں بار بار آتا تھا وہ اتنے قابل ہو کر کالج میں کیوں نوکری کر رہے ہیں اور یہاں بھی صرف آٹھویں درجے تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہوا ہے۔ جب مجھے اس امر کا شعور ہوا کہ بنیادوں کو مضبوط کرنا کتنا ضروری ہوتا ہے تو مجھے اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ سر راشد نے اپنی تمام صلاحیتیں اور قابلیتیں ملٹری کالج کی نذر کرنا کیوں پسند کیا؟ جس طرح بچے گھر سے باہر کھیل کود میں مگن رہتے ہیں لیکن جب چوٹ لگ جائے تو ماں کو پکارتے ہیں اسی طرح ہم اولڈ بوائز کے ساتھ بھی ہے۔سب اپنے اپنے کاموں میں، اپنے اپنے کیریر میں محو رہتے ہیں لیکن جب کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو راشد صاحب کو یاد کرتے ہیں اور وہ بغیر یہ پوچھے کہ میرے بچے اب تک کہاں تھے۔فوراً respond کرتے ہیں۔انکا خیال آتے ہی مجھے I can, I will کا خیال آتا ہے اور آدھا مسئلہ تو وہیں حل ہو جاتا ہے۔

جن لوگوں نے سر راشد سے آٹھویں میں پڑھا ہے انہیں یاد ہوگا کہ وہ پہلا پیریڈ ڈیسک ترتیب سے ایک پیٹرن (pattern) کے مطابق ایک سیدھ میں لگوانے ،لڑکوں کو ان کے قد کے مطابق بٹھانے اور سننے، پڑھنے اور لکھنے کے پلس ، زیرو اور مائنس پوسچرز postures بتانے بلکہ demonstrate کرنے میں گزارتے تھے۔اسی طرح کھڑے ہونے، چلنے اور ٹہلنے کے پوسچرز بھی بناتے تھے۔جب وہ غلط پوسچرز کو demonstrate کرتے تو بڑا مزہ آتا تھا۔ان کا دھاگے سے ڈیسک سیدھے کروانا۔چاک اور کاغذ کے ٹکڑے یہاں تک کہ پنسل کی شیونگ تک اہتمام سے اٹھوانا اور بار بار سٹ اپ اور لک اپ کہنا شروع میں عجیب سا لگتا تھا۔خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ کوئی دوسرا استاد ان چیزوں پر اتنا ''fuss'' نہیں کرتا تھا۔ یہ لفظ فس کرنا اس زمانے کی feeling کی ترجمانی کرتا ہے۔ورنہ آج جبکہ میں خود انسٹرکٹری کر رہا ہوں تو مجھے احساس ہوا ہے کہ کس طرح ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے کلاس کا ماحول اور ماحول سے کلاس کا موڈ بنتا ہے۔سر راشد نے شروع میں کلاس روم کے decorum کو ملحوظ رکھنے کی ایسی عادت ڈال دی تھی کہ جب ہم یہاں سے جے سی بی میں گئے تو جو بھی نیا انسٹرکٹر آتا وہ ملٹری کالج کے اولڈ بوائز کو محض ان کے بیٹھنے کے انداز سے پہچان لیتا کہ یہ ایم سی جے کے ہیں۔ پوسچر کی consciousness ہو یا decorum کا لحاظ،لباس کی نفاست یا وقت کی حد درجہ پابندی۔یہ عادتیں پھیل کر پورے لائف اسٹائل اور آؤٹ لک کو متاثر کرتی ہیں۔شیر شاہ ہاؤس کے لڑکوں نے جس تواتر سے اعزازی تلواریں لی ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شیر شاہ ہاؤس میں ہماری بنیادوں کو کتنی مضبوطی سے اٹھایا جاتا تھا۔

ہاؤس کو گھر کا سا ماحول دینے کے بعد سر راشد نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا وہ اقبالیات، تقریریں، مباحثے، مذاکرے وغیرہ، اسٹیج کی سرگرمیاں تھیں۔اقبالیات نے اس زمانے میں ہمارا ناک میں دم کر رکھا تھا۔آج میں سمجھتا ہوں کہ اقبالیات نے ہمارے کرداروں کو خاموشی سے کس طرح متاثر کیا اور کس طرح وہ بہت سے شعر جو اس وقت ہم سمجھتے نہ تھے اب سمجھ میں آتے ہیں۔زبانی یاد کر کے سناتے رہتے تھے۔ اسی طرح وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی تقریریں تھیں۔جیسے منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی، تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا۔گمنام شہیدوں کو سلام۔گمنام مجاہدوں کو سلام۔اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر، میں بھی پاکستان ہوں تو بھی پاکستان ہے۔ شاد باد منزل مراد، اور انگریزی میں ایجوکیشن، فریڈم، ڈسپلن نظمیں Not gold but only men can make a nation great and strong جیسے Nation's strength, Lives of great men وغیرہ۔ایک زبردست پروگرام تھا جس میں ہم بری طرح پھنسا ہوا محسوس کرتے تھے۔(یا پھر لائبریری کی کتابیں تھیں)۔ہاؤس لائبریری دن رات

کھلی رہتی تھی۔کتاب لینے دینے کا کوئی حساب نہ تھا۔لاکرز دن رات کھلے رہتے تھے۔فنکشن ہفتہ میں دوبار ہوتے تھے۔'وہ لڑکی کون تھی'، 'ملا نصیرالدین'، 'سینما'، بیسوں چھوٹے چھوٹے اسکٹ ڈرامے تھے۔جن میں سب لڑکے حصہ لیتے تھے۔ان سے جو فائدہ ہوا، وہ کئی سال بعد ظاہر ہوا۔میرا خیال ہے کہ اگر آج شیر شاہ ہاؤس کے پرانے لڑکوں سے کہا جائے کہ ان تقریروں کا کوئی مسودہ تمہارے پاس ہے یا نہیں، کوئی پرانی تقریر پوری یاد ہے تو ان کا جواب نفی میں ہوگا۔لیکن کوئی جے سی بی یا پی ایم اے میں ملٹری ایجوکیشن کے lectures پیچھے بیٹھ کر سنے تو اسے تعجب ہوگا کہ ان میں آدھے فقرے وہ ہوں گے جو شیر شاہ کے آڈیٹوریم میں بار بار گونجتے تھے۔جو ان کے دماغ کے تہہ خانے میں محفوظ تھے۔جب ان موضوعات پر سوچا تو وہ تصورات شعور کی سطح پر ابھر آئے۔کبھی کبھار کوئی فقرہ یا جملہ یاد آجاتا ہے تو سوچتا ہوں کتنی بڑی بات کتنی کم عمر میں سیکھ لی تھی۔مثلاً ''منزل ہے کہاں تیری'' کے چند جملے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔'آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے' اور 'زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی'۔'سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں' اور شاد باد منزل مراد کا آخری جملہ غالباً یہ تھا۔''جس پیڑ کی چھاؤں میں انسان بیٹھا ہو اس کی جڑوں کو پانی دینے میں اپنا ہی فائدہ ہے۔پاکستان ہے تو ہم بھی ہیں۔پاکستان مستحکم و محفوظ رہے گا تو ہم بھی زمانہ کی ہوائے گرم سے محفوظ رہیں گے''۔شیر شاہ ہاؤس میں سر راشد کی اسٹریٹجی غالباً یہ تھی کہ کام کی باتیں بتاتے جاؤ، وقت آنے پر خود سمجھتے جائیں گے۔ لاکر کھلے رہتے تھے۔ہاؤس آفس کھلا رہتا تھا۔اسکے اندر کی ہاؤس لائبریری کی پانچوں الماریاں کھلی رہتی تھیں۔چھوٹی موٹی چوریاں بھی ہوتیں تھیں لیکن بدستور بغیر تالوں کی دنیا میں رہتے رہے۔لاکرز پر زبردستی براون شیٹ لگانے پڑتے تھے۔لاکر کے ہر پٹ پر پہلے I can I will کا اسٹکر پھر 'رب زدنی علما' کا گول دائرہ، اس کے نیچے اسٹکر discovery to development کا تھا۔ Orientation کا کتنا مکمل انتظام تھا۔ہاؤس کے ماٹو 'آئی کین آئی ول' کی فلسفیانہ اور نفسیاتی گہرائیوں پر سر راشد مسلسل لیکچر دیا کرتے تھے۔رب زدنی علما، منزل مقصود تھی اور discovery to development اسکا راستہ۔ذہنی تربیت کے دوسرے طریقے بھی تھے۔کوریڈور میں سافٹ بورڈ کے دو بورڈ/فریم لگے ہوئے تھے۔ان پر ''آج کا خیال''، ''آج کا شعر'' کے شیٹ پر ہر روز بدل بدل کر لکھتے تھے۔جیسے quotations چل چل کی تھیں۔Luck is a whole, Life is a whole۔اسی طرح شعر تھا۔

فرشتہ سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

ایک دو فقرے تھے:

''آدمی پیدا ہوتا ہے انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے''

''عبادت کی قضا ہے خدمت کی نہیں''

''علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔'' یا We live in deeds not in years یا Discipline is Freedom وغیرہ وغیرہ ایسی Quotations تھیں جو اس وقت اس عمر میں نہ سمجھ آئیں۔ لیکن ذہن کے کسی گوشہ میں محفوظ رہ گئیں جنہیں ذہن کا کمپیوٹر بروقت یاد دلا دیتا ہے اور مسئلہ پر ایک دم فلیش لائٹ پڑ جاتی ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی ان باتوں کو تھوڑا بہت سمجھا ضرور ہو گا۔ اقبال کے اشعار پر مبنی بیت بازی کے چار سیٹ تھے۔ بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم سے تقریباً دو سو اشعار کا ایک انتخاب تھا چھپا ہوا۔ جسکی کاپیاں، سیکشن، لائبریری میں اور ریڈنگ ٹیبل پر اخبار رسالوں پر پڑی رہتی تھیں۔

سر راشد کا طریق کار یہ تھا کہ نئے لڑکوں کے آتے ہی والدین سے رابطہ قائم کرتے تھے۔ آڈیٹوریم میں خیر مقدمی لیکچر دیتے تھے۔ جس میں اپنے تعارف کے علاوہ شیر شاہ ہاؤس کا تعارف، طریق کار، طریق تربیت بتاتے تھے۔ یہ لیکچر اتنا بے ساختہ، خلوص اور روشنی سے اتنا بھرپور ہوتا تھا کہ جو والدین اپنے جگر گوشوں کے لئے اندیشے لئے آتے تھے وہ اطمینان وسکون قلب لئے ہوئے واپس جاتے تھے کہ بچہ بہت ہی safe اور لائق ہاتھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ یہی اطمینان ماؤں کو آنٹی سے مل کر ہوتا تھا۔ راشد صاحب اس موقع پر والدین کو پبلک سکول طرز تربیت کے بارے میں اور ممکنہ مسائل ومشکلات کے بارے میں بتاتے تھے اس کے بعد ایک سیٹ دیتے تھے ''نئے طلبہ کے نام پیغام'' اور دو سوال نامے بھی ہوتے تھے۔ ایک ذاتی کوائف اور شخصیت کے آب ورنگ کا کھوج لگانے کے لئے اور دوسرا سوالنامہ لڑکوں کے لئے تھا کہ اپنی ترقی کا آپ جائزہ لیجیے۔ یہ سیٹ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ بھی اس مضمون کے ساتھ شامل کریں تو کچھ اندازہ ہو کہ کسطرح سر راشد نے ملٹری کالج میں شیر شاہ ہاؤس کو ایک علیحدہ ادارہ بنا کر رکھا تھا۔ والدین اس پر فخر کرتے تھے کہ ان کا بچہ شیر شاہ ہاؤس میں راشد صاحب کے زیر تربیت ہے۔

کیپٹن محمد جاوید اختر

(کالج نمبر 4014، زمانہ تعلیم 1981-1977ء)

میں سر راشد کے شیر شاہ ہاؤس میں 1978ء میں داخل ہوا۔ سال بھر انکے زیر تربیت رہا۔ اگلے سال

کچھ عرصہ وہاں پر یفیکٹ بھی رہا۔اس تربیت کو میں اس اعزازی تلوار کی بنیاد سمجھتا ہوں جو میں پی ایم اے لانگ کورس میں حاصل کر سکا۔شیر شاہ ہاؤس میں سر راشد نے لیڈر شپ کی تربیت کا ایک ایسا موثر نظام چلایا ہوا تھا جس سے جو نکلتا کندن بن کر نکلتا۔ ہفتہ میں دو بار بدھ اور جمعہ کو شام کے فنکشن ہوتے تھے جن میں باری باری ہاؤس کے تمام لڑکے حصہ لیتے تھے۔اقبالیات پر بڑا زور تھا۔لیڈر شپ کی تربیت کے لیے ہر لڑکے کو سال میں دو تین بار کوئی نہ کوئی ذمہ داری کا منصب دیا جاتا تھا۔'ڈیوٹی کیڈٹ آف دی ڈے' دن میں اتنے کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا جتنا بعد کو مجھے ڈیوٹی افسر کے طور پر بھی نہیں کرنے پڑے۔سونے پر سہاگہ ان کی مسلسل نگرانی اور راہنمائی تھی۔ ہر ماہ انٹرویو کرتے۔اس کلاس میں،اس عمر میں انھوں نے اتنی خود آگہی (awareness) پیدا کر دی تھی جس میں بعد کو بہت کم اضافہ ہو سکا۔میری کالج کی زندگی کا،تربیت کے اعتبار سے،وہی زمانہ سب سے موثّر تھا جو میں نے شیر شاہ ہاؤس میں گزارا۔آگے چل کر جو میں اعزازی تلوار لے سکا،اسکی بنیاد وہیں رکھ دی گئی تھی۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ 1947ء سے 1975ء تک کالج کے محض چند طلبہ نے اعزازی تلواریں لیں۔لیکن جب سے شیر شاہ ہاؤس کے جونیئر لڑکے پی ایم اے پہنچے یعنی 1975ء،اس وقت سے اعزازی تلواروں کی قطار لگ گئی۔1975ء سے 1985ء تک 10 کا اعزاز بڑی حد تک شیر شاہ ہاؤس کو جاتا ہے۔اس حقیقت کی سب سے زیادہ تائید وہ کیڈٹس کریں گے جنہوں نے اعزازی تلواریں لیں ہیں ۔میں خود ان میں سے ایک ہوں۔ سر راشد کے شیر شاہ ہاؤس نے جو awareness دی اور پاکستانیت کا جو جذبہ بیدار کیا وہ ان کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ میں یہاں 1978ء میں داخل ہوا لیکن میں اس سے بہت پہلے جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا،سر راشد کو جانتا تھا اور انکے ہاں کئی بار آنے کا اتفاق ہوا۔ایک بار مجھے چند دن انکے ہاں رہنے کا اتفاق بھی ہوا۔ میں نے انکو اور آنٹی کو بہت قریب سے دیکھا۔چونکہ میرے والد صاحب لیفٹیننٹ کرنل اختر حسین (1623) ان کے شاگرد تھے اور ان دنوں جہلم میں پوسٹ تھے۔اس تجربہ اور مشاہدہ کے حوالے سے میں چند باتیں لکھنا چاہتا ہوں۔ایک تو یہ کہ سر راشد،جن کو میں اس وقت انکل کہتا تھا،کی اپنی زندگی بڑی منظّم تھی۔ وہ ان تمام باتوں کا خیال کرتے تھے جو میں نے انھیں بعد میں کیڈٹس کو بتاتے دیکھا۔گرمیوں میں بھی کرتے کے سارے بٹن لگے ہوتے تھے اور رات کو سلیپنگ سوٹ پہن کر سوتے تھے اس کے بھی بٹن لگے ہوتے تھے۔ دوسرے تیسرے دن سوٹ کو بدلتے تھے اور ہر بار استری کرا کر پہنتے تھے۔ جاڑوں میں گھر میں بھی انھیں دستانے یا مفلر پہنے یا جیبوں میں ہاتھ ڈالتے نہیں دیکھا۔کھانے پر باقاعدہ نیپکن ڈال کر بیٹھتے تھے اور اٹھتے ہوئے الحمد اللہ کہتے تھے۔صبح

سویرے اندر سے ناشتہ کی میز کی طرف آتے ہوئے السلام علیکم ضرور کہتے تھے (السلام علیکم کہنے کی انکوایسی عادت تھی اکثر السلام علیکم کے جواب میں بھی السلام علیکم کہہ جاتے تھے)۔راشد صاحب رات کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔رات کو دودھ کے ساتھ تھوڑی سی چائے اور بسکٹ وغیرہ لیتے تھے۔اس وقت وہ آنٹی اور بچوں کے ساتھ کچھ باتیں کر لیتے تھے۔وہ بیشتر وقت ہاؤس میں گزارتے تھے۔رات کو لائٹس آؤٹ کے دس منٹ بعد گھر میں آتے تھے۔اس وقت ہاؤس کے آفس میں بھی اور ان کے گھر میں انکی اپنی بھی لائبریری تھی۔اخبار سہ پہر کو پڑھتے تھے اور رات آٹھ بجے کی خبریں بڑی پابندی سے سنتے تھے۔ٹی وی نہ تھا۔

ایک بار میں ان کے ہاں دو ہفتے ٹھہرا لیکن اس عرصے میں انہیں بنیان میں یا الجھے ہوے بالوں کے ساتھ نہیں دیکھا۔اکثر جوتوں پر خود کپڑا مار لیتے تھے۔چھٹیوں میں مسلسل لکھنے کا کام کرتے رہتے تھے۔جن دنوں میں وہاں ٹھہرا ہوا تھا اور بعد میں جب میں ہاؤس میں تھا تو وہ صبح وشام ہاؤس کے سامنے لان کے درمیان راہوں میں ٹہلتے تھے اور شام کو پریپ کے وقت آنٹی کے ساتھ ٹہلتے تھے۔ان کی اندرون خانہ زندگی بڑی پُرسکون اور منظّم انداز میں گزر رہی تھی۔ ہاؤس میں وہ اس طرح مگن تھے کہ کسی اور چیز کا انہیں ہوش نہ تھا۔فنکشن پر آنٹی بھی آتی تھیں۔

1978ء میں،مَیں کالج میں باقائدہ طور پر شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوا تو خاص طور سے سر نے اپنا رویہ بدل لیا۔خلاف توقع مجھے کوئی رعائت نہیں دی۔ بلکہ ہاؤس میں بھی اس طرح ملتے تھے جیسے ہاؤس سے باہر جانتے ہی نہیں۔صرف ایک بار ایسا ہوا کہ شروع کے دنوں میں جب میں ہوم سک محسوس کر رہا تھا تو ایک جمعہ کو آنٹی نے واکنگ آوٹ پر مجھے گھر میں بلوایا۔(کالج داخل ہونے کے بعد ان کا گھر میرے لئے آوٹ آف باونڈ ہو گیا تھا)اور مجھے کچھ کھلایا پلایا اور دلداری کی۔لیکن اس میں بھی میری کوئی تخصیص نہ تھی۔سرفراز حمید وغیرہ اور کئی ہوم سک لڑکوں کو بھی اسی طرح گھر میں بلا کر سمجھاتی بجھاتیں اور پیار سے خاطر تواضع کرتی تھیں۔آنٹی کے بغیر شیر شاہ ہاؤس وہ نہ رہا جو وہ کبھی تھا۔

آخر میں میں سر راشد کی meticulousness اور رکھ رکھاؤ کی ایک مثال دونگا۔ستمبر 87ء میں، میں اور میرا دوست ندیم دوپہر کو ان سے ملنے گئے اور ان کو اندر اطلاع کرائی تو ایک دومنٹ کے بعد وہ اونٹ کی کھال کی ملتان کی سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے آئے۔یقیناً انہوں نے ہماری وجہ سے چپل اتار کر سلیم شاہی پہنی تھی۔ چہرہ مہرہ پر،سر کے بالوں پر ماہ وسال کا اثر یقیناً تھا۔لیکن پُر امید اور پُر امنگ پہلے کی طرح تھے۔نام بہ نام میری انٹری کے لڑکوں کو پوچھتے رہے پھر کچھ دیر علوی نامہ کی باتیں کیں۔

مجھے شیر شاہ ہاؤس میں دو سال رہنے کا موقع ملا۔سالانہ یوم والدین کے علاوہ اس دوران جو خصوصی

فنکشن ہوتے ان کی تفصیل یہ ہے۔ میلادالنبی، رمضان، یوم نزول قرآن، معراج، شہید اعظم، عاشورۂ محرم، بیادسرسید، یوم اقبال 9 نومبر، یوم دفاع 6 ستمبر، یوم قائداعظم 11 ستمبر، 23 مارچ یوم پاکستان۔

مجھے یاد ہے یوم دفاع کی صبح قرآن خوانی یادگار شہدا کی چوکی پر ہوئی اور وہیں سب لڑکوں نے ایک ایک دو دو پتیاں پھولوں کی چڑھائی تھیں۔اسی طرح یوم قائداعظم پر قرآن خوانی اور فنکشن، ان سب کے فائل موجود تھے۔جس میں سال بہ سال کا ریکارڈ تھا۔خدا کرے یہ سارا لٹریچر محفوظ کر دیا گیا ہو۔

کیپٹن طارق محمود

(کالج نمبر 4089، زمانہ تعلیم 1981-1978ء)

یہ واقعہ 1978ء کا ہے میں شیر شاہ ہاؤس کی علم الدین ڈارم میں تھا۔ایک دفعہ انسپکشن کے وقت راشد صاحب بیچ کے دروازے سے اندر آنے لگے تو دروازے کے ایک شیشہ پر کچھ گرد پڑی نظر آئی، وہ وہیں کھڑے ہوگئے۔دروازے کے قریب پہلا لاکر میرا تھا، مجھے اشارہ سے بلایا اور کہا ''جب تم یہ سمجھو کہ یہ گرد تم پاکستان کے چہرے سے ہٹا رہے ہو تو یہ کام کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے گا''۔اس عرصے میں ڈارمیٹری کے دوسرے لڑکے بھی وہاں جمع ہوگئے، راشد صاحب اس وقت اتنے دکھی نظر آرہے تھے کہ لڑکے یہ سمجھے شاید کوئی حادثہ ہوگیا ہے۔رندھی ہوئی آواز میں کہا ''تمہارا پاکستان، یہ ہاؤس ہے یہ ڈارمیٹری ہے۔ یہ چپہ چپہ برگزیدہ ہے، اسکی خدمت کرو، یہ پاکستان کی خدمت ہوگی''۔

لیفٹیننٹ اشفاق احمد

(کالج نمبر 4104، زمانہ تعلیم 1981-1978ء)

نومبر 1987ء میں جب میں اور واثق فیاض راشد صاحب سے ملنے ان کے گھر گئے تو ڈرائینگ روم میں بیٹھے اپنے پرانے رفیق کار دوستوں سے باتیں کر رہے تھے۔وہ انھیں رخصت کرنے باہر گئے۔جب واپس آئے تو نوٹ کیا کہ چپل بدل کر سلیم شاہی پہن کر آئے۔قمیض پر سیاہ ویسٹ کوٹ بھی پہنا۔صاف ظاہر تھا کہ چونکہ ہم پرانے طالب علم تھے، اس رعایت سے برابر لباس کا اہتمام کیا۔اس وقت میں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی۔انھوں نے علیک سلیک کے بعد پہلا سوال میری داڑھی کے بارے میں کیا۔کہ یہ کس قسم کی داڑھی ہے؟ پھر خود ہی تینوں قسمیں گنوائیں اور کہا ''اس عمر میں داڑھی رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ داڑھی ضرور رکھو لیکن اسکے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ضروری ہے''۔واثق کا چہرہ غور سے دیکھ کر کہا ''اچھا تم

واثق فیاض ہو؟'' پھر ہنس کر بولے،'' شرارتی بچے مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہیں''۔شرارت اور ان ڈسپلن اصل میں initiativeاور confidence کی ایک صورت ہے،جس کا رخ ٹھیک نہیں ہوتا''۔پھر کہا'' یاد رکھو آرمی میں شروع کے چند سال کیریر کے نقطہ نظر سے بہت اہم ہوتے ہیں۔ پھر علوی صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔ کہنے لگے افسوس کہ علوی صاحب کے کلاس لیکچرز اور ڈراموں کو آڈیو اور ویڈیو ٹیپ نہ کیا جا سکا۔ میں نے 'علوی نامہ' میں ان کی گونا گوں versatile شخصیت کو کچھ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر انہوں نے مجھے 'علوی نامہ' کی ایک کاپی دی تاکہ میں ایم سی ای رسالپور میں اولڈ بوائز کو دکھاؤں۔ جب میں اسے لیکر چلنے لگا۔تو انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہرنا، پھر وہ اندر سے کالج کے مونوگرام کا ایک اچھا سا خاکی لفافہ لائے اور مجھے دے کر کہا'' علوی نامہ'' اس میں ڈال لو۔

کلاس میں انہوں نے ایک بار''The Art of Living'' نامی ایک کتاب دکھائی تھی۔ 'جینے کا قرینہ'۔راشد صاحب نے ہمیں سب سے زیادہ جینے کا فن دکھایا۔ان کی اپنی زندگی غیر معمولی طور پر منظّم تھی۔ مغرب کے فوراً بعد وہ آنٹی کے ساتھ اپنے گھر کے سامنے راستہ پر ہر روز ٹہلتے تھے۔وہ ہر معاملہ کی طرح اس ٹہلنے میں بھی بے انتہا ریگولر تھے۔آنٹی ہمارے بدھ کے اور جمعہ کے فنکشن میں بھی شرکت کرتی تھیں۔ منجملہ اور باتوں کے ہم نے ان کی نجی زندگی سے بھر پور خوشگوار تاثرات لئے۔

کیپٹن مسعود اشرف

(کالج نمبر 4109،زمانہ تعلیم 1981-1978ء)

شیر شاہ ہاؤس ہر سال فروری میں اپنا یوم والدین 'شیر شاہ ڈے' منایا کرتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کے کسی اور پبلک اسکول میں یوم والدین پر اس نوعیت کا پروگرام نہ پیش کیا جاتا ہوگا۔

غفران سرور

(کالج نمبر 4133،زمانہ تعلیم 1981-1978ء)

سر راشد کے آٹو گراف بھی انکی پہچان تھے۔ میرے حصے میں جمیل الدین عالی کے ایک ملی ترانے کا یہ ٹکڑا آیا:

تہذیبوں کے راز پرانے

نئے نئے ان گنت خزانے

محنت کش عاشق فرزانے

اسم محمدؐ کے دیوانے

سب کے لئے

سب کچھ ہے اس میں

یہ ہے پاکستان

اپنا

یہ ہے پاکستان

دین، زمین، سمندر دریا، صحرا کوہستان

سب کے لئے سب کچھ ہے اس میں

یہ ہے پاکستان

اپنا

یہ ہے پاکستان

کیپٹن نیئر لطیف عباسی

(کالج نمبر 4174، زمانہ تعلیم 1979-1982ء)

شیر شاہ ہاؤس کے کاریڈور میں (وہ راستہ جو ہاؤس کو میس سے ملاتا تھا) دیواروں پر چار بورڈ لگے تھے۔ دائیں طرف کے بورڈوں پر ہر روز 'آج کا خیال'، 'آج کا شعر' لگتا تھا۔ بائیں طرف 'آج کی حدیث' اور 'آج کی آیت'، میرا کام یہ تھا کہ ہاؤس آفس میں پڑی انہی ناموں کی فائلوں سے ایک ایک ورق لے کر صبح ناشتہ سے پہلے وہاں ڈرائینگ پن سے لگا دیا کروں۔ ان پر آتے جاتے سب کی نظریں پڑتی تھیں۔ دوسرے دن پورا سیٹ بدل دیا جاتا تھا۔ ان میں سے چند مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ مثلاً آدمی کا آدمی شیطان ہے، اعتماد پربت کا پتھر ہے، جو اکھڑ جائے تو نیچے ہی آتا ہے۔ فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا۔ بعض لوگ دوسروں کی عزت کو اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ آدمی مال ہی میں نہیں کھال میں بھی مست رہ سکتا ہے۔ علم کی کمی خلوص سے پوری ہو جاتی ہے، خلوص کی کمی کسی چیز سے پوری نہیں ہوتی۔ جس سرحد کو اہل شہادت میسر نہ آئیں وہ مٹ جاتی ہے۔ جو

لوگ نئی بنیادیں بھرنا چاہتے ہیں وہ یہ بھی سوچیں کہ پرانی کیوں بیٹھ گئیں۔۔۔

اشعار بیشتر اقبال اور مسدس حالی کے ہوتے تھے۔

راشد صاحب کی بیشتر لیکچر اور باتیں ہماری عمر اور تجربہ سے بہت زیادہ ہوتی تھیں۔ غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم ان دریچوں سے باہر کے کھلے آسمان کو دیکھ سکیں۔ اب وہ باتیں یاد آتی ہیں اور کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔ پوری طرح سمجھ میں آتے آتے تو شاید عمر بیت جائے۔ ہاؤس ماٹو I can I will اقبال کا سارا فلسفہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح From Discovery to Development تعلیم و تربیت کی ایک نئی اپروچ کا حامل ہے۔

راشد صاحب چار پانچ کتابیں ضرور پڑھواتے تھے۔ 'آواز دوست'، 'درس زندگی'، 'قرآن حکیم اور ہماری زندگی'، 'کمپنی کی حکومت'، 'تاریخ کی کہانی'، چوہدری فضل حق کی 'زندگی' اور نواب صدیق علی خان کی ''بے تیغ سپاہی'' اور احسان دانش کی آپ بیتی ''جہاں دانش''۔ اقبال کے پچاس شعر سب لڑکوں کو زبردستی یاد کرائے جاتے تھے۔ اردو کی دو تقریریں ''منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی'' اور ''اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا'' بھی سب کے لیے لازمی کر رکھی تھیں۔

مہینہ میں ایک بار انٹرویو کرتے تھے جس کے آخر میں لڑکے کو بھی انٹرویو کرنے کا موقع دیتے تھے۔ شیر شاہ ہاؤس کا تربیتی پروگرام اتنا ambitious تھا جیسے وہ اس ہاؤس کے ذریعے پورے پاکستان کو بدلنے کا عزم کئے ہوئے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سے خواب آنکھوں میں بسائے ہوئے تھے جو وہ دیوانہ وار جوئے شیر نکالنے میں مصروف تھے۔

سہیل اطہر صدیقی

(کالج نمبر 4179، زمانہ تعلیم 1982-1979ء)

1982ء کے میٹرک کے امتحان میں جب میں نے کالج میں ٹاپ کیا تو مبارکباد کا سب سے پہلا خط جو ملا وہ سر راشد کا تھا۔ چند روز بعد میں عبوری سند لینے کالج گیا تو ظاہر ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ فوراً مجھے ہاؤس میں لے گئے، وہاں آڈیٹوریم میں شیریز سے میرا تعارف کرایا۔ اتنا اچھا کہ میں شرمندہ ہوا اور ساتھ ہی امتحان میں اور زندگی میں کامیابی کا سب سے بڑا گر یہ بتایا کہ ترجیحات صحیح ہوں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک شیرین شرف علوی سے کہا کہ وہ میرا انٹرویو لے۔ انٹرویو کا سوالنامہ انہوں نے خود تیار کیا تھا۔ پھر از راہ کرم انہوں نے یہ انٹرویو 83-1982ء کے عالمگیرین میں شائع بھی

کیا۔اسی موقع پر میں نے ان سے فرمائش کی کہ وہ اس کوڈ آف کیڈٹ کی ایک کاپی مجھے عطا کریں جو انہوں نے میرے زمانہ میں ہاؤس میں جاری کیا تھا۔

کیپٹن فاروق احمد صدیقی

(کالج نمبر 4239،زمانہ تعلیم 1982-1979ء)

مَیں 1979ء میں شیر شاہ ہاؤس کا سوشل سیکرٹری تھا۔اتفاق سے میرے کاغذات میں ہاؤس کے قہقہہ کلب کے آئین کی ایک کاپی محفوظ رہ گئی ہے جو سر راشد نے ہاؤس مَیں شروع کیا تھا،وہ ناظرین کی نذر کر رہا ہوں۔

شیر شاہ ہاؤس قہقہہ کلب

ماٹو ۔ ہنستے رہو اور ہنساتے رہو

آئین:

1- ہر شیرین اس کا ممبر ہوسکتا ہے۔جو اس کلب کے ماٹو (نصب العین) پر یقین رکھتا ہو۔

2- ہر نئے ممبر کے لئے ایک زوردار قہقہہ لگا کر ایک زوردار لطیفہ سنانا ضروری ہے۔

3- قہقہہ کلب کا دائرہ،خیال انگیز گپ تک وسیع ہے۔

4- کلب کی مجلس اجتماعی قہقہے سے شروع ہوں گی۔

5- کلب کے ممبروں کے لئے ہنس مکھ رہنا اور وقت پر ہنسنا ہنسانا ضروری ہوگا۔

6- کلب کے ممبر مزاحیہ لطیفے،شعر اور ڈرامے ہاؤس فنکشن پر پیش کیا کریں گے۔

7- ہاؤس اسٹاف کو بھی اعزازی ممبر بنایا جا سکتا ہے لیکن ان کے لئے بھی قہقہہ بازی میں حصہ لینا ضروری ہوگا۔

8- کلب کے ممبروں کو اعزازی القاب دیئے جائیں گے۔

9- ممبروں کو کلب کی میٹنگوں میں فینسی ڈریس پہننے کی اجازت ہوگی۔

10- کلب "دیوار قہقہہ" کے نام سے ایک دیواری اخبار بھی نکالے گا۔جس میں مزاحیہ خاکے، مزاحیہ نظمیں،لطیفے اور کارٹون شائع کئے جائیں گے۔

11- کلب معیاری لطیفوں کی ایک scrap book بھی تیار کرے گا۔

12- کلب کے زیر اہتمام سال میں ایک بار انٹر ڈارم مزاحیہ تقریری مقابلہ ہوگا۔ہر مقابلہ کا افتتاح اس شعر سے ہوا کرے گا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

کیپٹن حسین عباس

(کالج نمبر 4242، زمانہ تعلیم 1982-1979ء)

میں شیر شاہ ہاؤس کے حوالے سے سر راشد کے طریق تربیت پر کچھ لکھنا چاہوں گا۔ میں 79ء میں شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوا۔ اس سے قبل 1970ء میں میرے بڑے بھائی محسن عباس کالج نمبر 3889 شیر شاہ ہاؤس میں ایک سال گزار چکے تھے۔ وہ اکثر گھر پر شیر شاہ ہاؤس کی باتیں کیا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ شیر شاہ ہاؤس میں اقبالیات اور پاکستانیات پر بڑا زور ہے۔ سو پچاس شعر ہر لڑکے کو زبردستی یاد کرائے جاتے ہیں۔ ہر لڑکے کو چارو ناچار اسٹیج پر تقریر اور ڈراما کرنے بھی آنا پڑتا ہے۔ ڈسپلن کی پابندی بھی بہت ہے۔ کتابیں بھی زبردستی پڑھائی جاتی ہیں۔ ہاؤس ماسٹر زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن صبح سے لے کر شام لائٹس آؤٹ تک سر پر مسلط رہتے ہیں۔

1977ء میں شیر شاہ ہاؤس کا یوم والدین کا بڑا فنکشن میں خود بھی دیکھ چکا تھا۔ غرض بہت سے اندیشوں اور بہت سی امیدوں اور امنگوں کے ساتھ اپریل 79ء میں، میں نے شیر شاہ ہاؤس میں قدم رکھا۔ جب سب لڑکے آ گئے تو انہوں نے سہ پہر کو شیر شاہ ہاؤس کے آڈیٹوریم میں نئے لڑکوں کو ایڈریس کیا۔ جس کے دوران انہوں نے ایک دو شعر بھی سنائے۔

سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

اور

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

اوران کی وضاحت بھی کی۔ اس وقت میری طرح اور بہت سوں کو قطعاً اس امر کا احساس بھی نہیں ہوگا کہ یہ دو شعر شیر شاہ ہاؤس میں ہمارے آئندہ ماہ و سال کے لئے بہت خطرناک منصوبوں یا بہت مفید پروگرام کے حامل ثابت ہونگے۔ تلخ زندگانی کو انگبین بنتے بنتے تو بہت دیر لگتی ہے، زندگی کو تلخ بنتے دیکھنے کا تجربہ فوری طور پر ہوا۔ یعنی قطار بندی ہوئی۔ وہ بھی فٹ رولر سے ناپ کے، قد کے حساب سے۔ میس میں بھی فال ان ہو کر جاتے تھے اور میس میں ایک ایک کر کے قدم رکھتے تھے۔ غرض ایک ایک حرکت جکڑی ہوئی تھی۔ یعنی

پابندیوں میں آزادی کو تلاش کر رہے تھے۔ جو اس وقت کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ راشد صاحب کا اصرار تھا کہ ڈارمیٹری حاجی بابا کا ہوٹل نظر نہ آئے۔ اس لئے جاڑوں میں رضائی ٹرنک روم سے ڈارم وائز قطار باندھ کر نکالتے تھے اور گٹ اپ کے پانچ منٹ کے اندر اسی ڈارم وائز قطار باندھ کے (اس سے الٹی ترتیب کے مطابق جس سے گزشتہ رات رضائیاں نکالی تھیں) رضائیاں اس جگہ واپس رکھتے تھے جو اس مقصد کے لئے مخصوص تھی۔ ڈارم میں سونے یا آرام کے اوقات کے علاوہ کھونٹیوں پر شب خوابی کے کپڑے یا ٹاول وغیرہ لٹکانے کی اجازت نہ تھی۔ تاکہ کمرہ اسٹڈی کا لک دے۔ ہر روز صبح ڈارم کیپٹن ڈارم کا انسپکشن کرتا تھا۔ راشد صاحب خود بھی باہر سے دیکھتے رہتے تھے۔ عجب بات ہے کہ راشد صاحب کو ڈارم کے اندر چکر لگاتے کبھی نہیں دیکھا۔ آرام اور پریپ کے وقت تو برآمدہ سے بھی نہیں گزرتے تھے۔ یہی وہ ادائیں تھیں جنہوں نے اتنی پابندیوں کو بوجھ نہیں بننے دیا۔ سہ پہر کو ریسٹ لازمی تھا۔ پریپ کے وقت میں کوئی اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ورنہ ڈورم کیپٹن اے۔ وی۔ سی کے ذریعہ رپورٹ کر دیتا۔

ہر جمعہ کو بریک فاسٹ کے بعد نو بجے ہاؤس پریفیکٹ کی انسپکشن ہوتی، گھنٹہ بھر غیر معمولی تیاری کرنی پڑتی تھی۔ ہر ڈارم کی کوشش ہوتی کہ ڈارم کی آرائش یا ترتیب میں کوئی نیا آئیڈیا پیش کرے۔ اس سلسلے میں کچھ آئیڈیا چور جاسوسی بھی کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے لئے بہت احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑتیں۔ انسپکشن ہاؤس کیپٹن، وائس کیپٹن، اے وی سی کرتے۔ اے وی سی ہاؤس کیپٹن کے تاثرات نوٹ کرتا جاتا۔ انسپکشن کے وقت ہاؤس میں سناٹا چھا جاتا اور اس سے زیادہ سسپنس اس وقت ہوتا جب رزلٹ سنانے کے لئے ہاؤس فالن کیا جاتا۔ جس میں بیسٹ ڈارم، بیسٹ لاکر بیسٹ بیڈ کا اعلان کیا جاتا اور بیسٹ ڈارم کو شیلڈ دی جاتی تھی۔ باقی دو کو کپ۔ اس موقع پر اگلے ہفتہ کے لئے ٹائلٹ انچارج سے لے کر اے وی سی تک بارہ اپائنٹمنٹس کا اعلان بھی ہوتا۔

ہر ہفتے سارے عہدے بدلتے تھے۔ اے وی سی، ونگ کیپٹن، میس سیکرٹری، ہاؤس سیکریٹری سے زیادہ ڈی سی، ڈارم کیپٹن کی ٹور تھی کہ اصل اور فوری اقتدار اسی کا ہوتا تھا۔ راشد صاحب کے ایما سے ہر ہفتے کچھ لڑکوں کی ڈارم کی تبدیلی بھی کی جاتی۔ سال بھر میں ہر لڑکا تقریباً ہر ڈارم کا چکر لگا لیتا تھا۔ اس سے ہر لڑکے کو ہاؤس کے تمام ساٹھ ستر لڑکوں کے ساتھ باری باری رہنے کا موقع مل جاتا تھا اور گروپ بندی نہ ہونے پاتی تھی۔ ہر روز کا ڈیوٹی کیپٹن علیحدہ ہوتا تھا۔ جو ایک لمبا چوڑا پروفارما بھرتا تھا۔ جس میں یہ بھی لکھا ہوتا کہ رات کو لائٹس آؤٹ بروقت ہوئیں اور اسکے بعد سکیورٹی راؤنڈ اپ کیا گیا۔ رات کو لائٹس آؤٹ کے بعد اے وی سی ہاؤس لاگ بک ہاؤس ماسٹر کو پیش کرتا تھا۔ جس میں پریڈ اسٹیٹ کے علاوہ سک رپورٹ

کرنے والوں کے نام، اسپتال میں داخل ہونے اور چھٹی جانے والوں کے نام کے علاوہ اس سزا جزا کا ذکر بھی ہوتا تھا جو کسی کو کلاس میں ملتی تھی۔ یوں تو ہاؤس لائبریری ہر وقت کھلی رہتی تھی لیکن جمعرات اور جمعے کو وہاں سے کتابیں خود اشو کر سکتے تھے۔ کتاب درج کرو اور لے لو کا سسٹم تھا۔ رات کو ڈی سی یہ بھی پوچھتا تھا کہ اخبار پڑھا یا نہیں۔ بدھ اور جمعہ کی شب سیکنڈ پریپ میں ہاؤس میں فنکشن ہوتا تھا۔ جس میں ہر ڈارم اپنا اپنا ورائٹی پروگرام پیش کرتی جو عموماً کھیلوں اور ترانوں، بیت بازی، انگریزی اردو تقریروں پر مبنی ہوتا۔ یہ دونوں پروگرام راشد صاحب، ان کی بیگم اور انکا چھوٹا بیٹا آصف پابندی سے اٹینڈ کرتے تھے۔ ہر مہینہ اور ہر امتحان کے بعد راشد صاحب طویل انٹرویو کرتے تھے۔ پڑھائی میں کمزور لڑکوں کے گروپ بنائے جاتے جو جمعہ کی صبح دو گھنٹے ہاؤس کے صحن میں بیٹھ کر پڑھتے۔ جمعہ کی شام ہاؤس میں ادبی مجلس میں کچھ لڑکے اپنی کہانیاں اور نظمیں سناتے۔ راشد صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ صبح پی ٹی سے لیکر لائٹس آؤٹ تک تقریباً سارے وقت ہاؤس میں موجود رہتے۔ کہتے کچھ نہیں تھے۔ خاموشی سے دیکھتے رہتے تھے اور ہاؤس کیپٹن کے توسط سے انکے تاثرات یا احکامات پہنچتے رہتے۔ میں نے انہیں کبھی کسی کو خود ٹوکتے یا چیک کرتے نہیں دیکھا۔ چین آف کنٹرول اینڈ کمانڈ کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ ریسٹ یا پریپ یا کھانے کو کبھی خود چیک نہیں کیا۔ بلکہ چیک کرنے والوں سے چیک کرواتے تھے۔ کھیلوں، اسپورٹس، تقریروں کے انٹر ونگ مقابلے ہوتے تھے۔ بیسٹ ونگ کو سالانہ تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر کمانڈانٹ شیلڈ دی جاتی تھی۔ جمعہ کے دن کیڈٹس کے والدین کو ہاؤس دیکھنے کی کھلی دعوت تھی۔ وہ خود ہاؤس آفس میں تمام دن والدین سے ملتے رہتے تھے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ جتنی پابندیوں سے پُر یا منظّم organized زندگی شیر شاہ ہاؤس کی تھی وہ پھر کبھی جے سی بی یا پی ایم اے میں بھی نہیں دیکھی۔ اس وقت میں کیا، ہم سب ہی اس سے تنگ بھی بہت تھے۔ لیکن جوں جوں زندگی کے سفر میں آگے بڑھتے گئے اندازہ ہوتا گیا کہ اس طرز زندگی کا فلسفہ کیا تھا۔ راشد صاحب کی فلسفیانہ تربیت، پدرانہ نگرانی اور مادرانہ شفقت سے تلخ زندگانی آخر کار رنگین ہوئی اور پابندیوں سے آزادی کو حاصل کیا۔ انہوں نے انگریزی کی جو آٹھ تقریریں (زبردستی) یاد کرائی تھیں ان میں ایک ڈسپلن پر بھی تھی۔ جس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا۔ Discipline is Freedom اس وقت یہ فلسفہ کیا سمجھ میں آتا، اب خیال آتا ہے کہ کتنی بڑی بات سادگی سے کہہ دی گئی ہے۔ شیر شاہ ہاؤس کی زندگی بھلانا ممکن نہیں۔ گو یہ صرف ایک سال تھا لیکن مجھے فوج کے سانچے میں ڈھالنے میں جتنا ہاتھ اس ہاؤس کا ہے اتنا کسی اور ادارہ کا نہیں۔

کیپٹن خالد محمود

(کالج نمبر 4281،زمانہ تعلیم 1982-1979ء)

خالد محمود: تعلیم وتربیت میں آپ کا آئیڈیل کون رہا ہے؟

پروفیسر راشد: ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ تعلیمی نظریات تو کتابوں میں بھی مل جاتے ہیں لیکن تربیت میں وہ حرف آخر تھے۔

خالد محمود: سر اسکی کوئی مثال؟

پروفیسر راشد: 1946ء جامعہ ملیہ دہلی کی سلور جوبلی کے موقع پر وہاں کے ایک استاد عبدالغفار مدہولی صاحب نے جامعہ ملیہ پر ایک کتاب ''جامعہ کے پچیس سال'' شائع کی تھی۔ اس میں ایک قصہ تھا کہ کسی تقریب میں سے اٹھ کر عشاء کی نماز کو جاتے ہوئے ذاکر صاحب نے جلسہ گاہ کے دروازہ کے قریب کھڑے ہوئے کسی جونیئر طالب علم سے کہہ دیا کہ بیٹے! میرے آنے تک یہیں کھڑے رہنا۔ اتفاق سے وہ واپس دوسری طرف سے آئے اور پھر وہاں سے اپنے گھر چلے گئے۔ صبح کو فجر کی نماز کے وقت جب وہ ادھر سے گزرے تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ گئے کہ وہ لڑکا صبح تک وہیں ایک ستون کو پکڑے نیم غنودگی کی حالت میں کھڑا تھا۔ یہ واقعہ میں نے 1946ء کے اواخر میں پڑھا تھا۔ بہت inspire کیا۔ اس وقت سے اب تک یہ میرے لئے تربیت کا حوالہ رہا ہے۔

خالد محمود: سر، آپ نے یہاں اتنے طویل عرصے تک پڑھایا اور ہاؤس ماسٹری کی۔ اس طرح کا کوئی واقعہ یہاں بھی آپ کے تجربہ میں آیا؟

پروفیسر راشد: اس طرح کا واقعہ تو کسی جامعہ ملیہ ہی میں جس کا قبلہ درست ہو، کسی ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہاتھوں میں جو خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں یکتا ہو پیش آ سکتا ہے۔ کیپٹن ریاض انجم نے اپنی کتاب میں 1987ء میں کالج کے طلباء کے ساتھ وادی کاغان میں hiking اور کوہ پیمائی کی داستان رپورتاژ کے انداز میں لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ ولولہ انگیز واقعہ لکھا ہے۔ کہ ایک شام دستہ دریا کنہار کے کنارے پڑاؤ کر رہا تھا لیکن لڑکوں کو حفاظتی تدبیر کے طور پر نہانے یا دریا میں اترنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا بیشتر لوگ اِدھر اُدھر کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہونے نکل گئے تھے۔ ریاض صاحب لکھتے ہیں کہ

میں نے دور ایک چوٹی سے نظارہ دیکھا کہ عین لب دریا بیٹھا ایک لڑکا ایک پتھر پر ہاتھ مار مار کر وضو کے لئے مسح کر رہا ہے۔ پھر اس نے وہاں کھڑے ہو کر آذان دی جسے سن کر سب نیچے اترے اور نماز پڑھی۔

اس بچہ (پدرامہ جے) کے لئے میرے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ایک ادارہ کے لئے قابل فخر صرف یہ امر ہی نہیں کہ اسکے طالب علم نے بورڈ میں ٹاپ کیا۔ By the way اس طرح کی کامیابی intellectual عمل ہے، social نہیں۔ ٹاپ کرنے والا بچہ انتہائی خودغرض، تنگ دل اور سماجی احساسات سے عاری بھی ہوسکتا ہے۔ بڑائی کا معیار تقویٰ یا social behaviour سے ہوتا ہے۔ ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے۔ علوی صاحب کا انتقال فروری 1987ء میں ہوا تھا۔ وہ کالج کے جی ٹی روڈ کے قبرستان میں جو سامنے کی مسجد کے پہلو میں واقع ہے دفن ہیں۔ دو بار ایسا ہوا کہ علوی صاحب کا ایک شاگرد ادھر سے گزرتے ہوئے رات کے دس دس گیارہ گیارہ بجے ان کی قبر پہ فاتحہ کے لئے گیا۔ ایک مرتبہ تو وہاں ایک حادثہ ہوتے ہوئے بچا۔۔۔ ایسا استاد ایسا شاگرد بڑی بات ہے۔

خالد محمود: آپ کے ساتھ بھی کوئی یادگار قصہ پیش آیا؟

پرفیسر راشد: ایسے بہت سے واقعات ہیں۔ ان میں سے صرف دو کا ذکر کروں گا۔ فروری 1973ء میں ہم شیر شاہ ہاؤس کے پہلے سالانہ یوم والدین کی تیاری کر رہے تھے۔ فنکشن سے ایک رات پہلے کوئی ایک بجے کے قریب ہاؤس کیپٹن شیر محمد نے مجھ سے کہا سر، آپ گھر جا کر آرام کریں، صبح کو سارے فنکشن کو آپ ہی نے سنبھالنا ہے۔ پنڈال میں seating وغیرہ کا جو کام باقی ہے انشاء اللہ صبح تک مکمل ہو جائے گا۔ میں جا کر سو گیا۔ لیکن فنکشن کی رات نیند کہاں۔ صبح پانچ بجے کے قریب میں باہر آیا تو سارا کام مکمل ہو چکا تھا اور ہاؤس کیپٹن اور ایک دو اور لڑکے پچھلے دن کی وردی میں کرسیوں سے آدھے نیچے گرے سو رہے تھے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوئی۔ اللہ کا شکر کہ فنکشن بہت کامیاب رہا۔ فنکشن کے بعد شام کو سارا کام ختم کرا کے میں گھر کی طرف مڑا اور میں نے کہا ''Now let us have a cup of hot tea'' مَیں بغیر کچھ کھائے پیئے کام میں لگا ہوا تھا۔ سارے مہمانوں کے لنچ کا انتظام تھا لیکن میں نہ کھا

سکا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے لیڈر شپ کا بڑا تیر مارا ہے۔ جب میں نے ہاؤس کیپٹن اور دوسرے سینئر پریفیکٹس کو دعوت دی کہ میرے یہاں آ کر چائے پیئں تو ہاؤس کیپٹن نے خاموشی سے مجھ سے معذرت کی۔ ''رات دو تین بجے آسمان پر بادل کے ٹکڑے نظر آئے تو میں نے فوراً منت کا روزہ مانا کہ آج بارش نہ ہو اور فنکشن خیریت سے گزر جائے''۔

"اور سحری"

''سر ایک گلاس پانی لیا تھا۔ Sir I am all right, don't worry میں اپنا حصہ افطار کے وقت لے لوں گا''۔

خالد! اب میں تمہیں کیسے بتاؤں اس وقت میں نے کیا محسوس کیا۔

خالد محمود: Great House. Great Boys

پرفیسر راشد: ملٹری کالج ایسے ادارہ میں سروکرنا ایک بہت بڑی privilege اور pleasure ہے۔

خالد محمود: ذرا اسکی وضاحت فرمایئے؟

پروفیسر راشد: privilege یوں جیسا کہ ناول Good Bye Mr. Chips میں Katherine Bridges چپس سے کہتی ہوں

School mastering in a public school is important. To be influencing those who are going to grow up and matter to the world.

زور کس پر ہوا۔ 'matter to the world' پر۔ ہمارے context میں matter to Pakistan پر۔ یہ دلیل تو اس بات کی ہوئی کہ ایک پبلک سکول قسم کے ادارہ میں سروکرنا privilege کیوں ہے ،نوٹ کرو میں نے teach کرنے یا استاد ہونے کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ یہاں چھوٹا بڑا جو بھی جہاں کام کر رہا ہے اہم ہوتا ہے۔ اب سوال کے دوسرے حصہ پر آتا ہوں کہ یہ pleasure کیوں ہے۔ وہ اس طرح کہ مثال کے طور پر جب آپ خود اپنے لگائے ہوئے آم کے پیڑوں میں بور آتے دیکھتے ہیں تو آپ کو خوشی ہوتی ہے کہ اب ان میں پھل بھی آئے گا یا جب آپ کی لگائی ہوئی قلموں میں انکھوے پھوٹتے ہیں تو آپ کو یقین آنے لگتا ہے کہ ایک دن ان پودوں کی ڈالیاں پھولوں سے لدی ہونگی۔ Is it not a pleasure? اب اس pleasure کی

میں تمہیں بہت concrete مثالیں دوں گا کہ مجھے یہ کیسے عطا ہوا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہو گا۔ کہ 19 جنوری 1988ء کو سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد میں اپنی خوشی کے لئے مزید چھ ماہ جون 88ء تک پڑھاتا رہا۔ (کمانڈانٹ صاحب کا شکریہ کہ انہوں نے یہ موقع دیا) اس دوران 1988ء کی انٹری کو میں نے جو نظمیں پڑھائیں ان میں سے دو "A Childs' Hymn"

God make my life a little light
within the world to glow,
A little flame that burneth bright
whenever I may go;

اور Big things and small things کی theme احسان یا سماجی ذمہ داری کا جذبہ تھی۔ اس نظم میں آخر میں یہ سطریں بھی آتی تھیں۔

But I can do the small things
That help to make it sweet

میں نے کوشش کی تھی زندگی کو چھوٹی چھوٹی باتوں یا احسان کے رویے سے sweet کرنے کی ضرورت اور اہمیت کی awareness دلائی جائے۔ مئی 1988ء میں جب میں یہ نظمیں پڑھا چکا اور اپنے پڑھانے اوران کے پڑھنے کا ٹیسٹ لینا چاہتا تھا تو یہ واقعات یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ جو میری معلمانہ زندگی کا سرمایہ ہیں اور میں تمہارے توسط سے تاریخ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آٹھویں اے میں، میں ایک نظم Sons of Pakistan لکھوا رہا تھا۔ پھر میں نے خود بورڈ پر لکھنا شروع کر دیا تا کہ لکھنے میں غلطیاں نہ ہوں۔

If you want to know who we are
We are sons of Pakistan
In times of peace and war
You'll find us marching on

جب میں آخری بند

Our pride to live and die
To see our flag e'er fly
And freedom far and high

پر پہنچا تو بورڈ بھر گیا۔ میں نے کلاس کی طرف دیکھا کہ کوئی بورڈ کو صاف کرے۔ میرا منشا تھا

کہ ڈیوٹی کیڈٹ آگے آئے لیکن ہوا یہ کہ چشم زدن میں ایک اور لڑکا عاطف جو نماز کے
کپڑوں میں تھا، اٹھا اور اسنے بورڈ صاف کرنا شروع کر دیا۔ ابھی اس نے دو تین ہی ہاتھ
مارے تھے کہ ایک اور بچہ مصطفیٰ علی سامنے سے بجلی کی سی تیزی سے اٹھا "Sir, let me
do it" اسکے TABTT کا ٹیکا لگا ہوا ہے'' اور اس نے اس کے ہاتھ سے ڈسٹر لے کر
بورڈ صاف کرنا شروع کر دیا۔ سبحان اللہ۔ This is social awareness۔
وہ دن بڑا مبارک تھا۔ میں دوسرے پیریڈ میں آٹھویں ڈی میں گیا میں نے آج اس نظم کا
ٹیسٹ لینا تھا۔ ''کسی واقعہ کے حوالے سے بتاؤ جس سے پتہ چلے کہ یہ نظم تمہارے دل
میں اتر گئی ہے۔'' ایک لڑکا ساجد زمان کھڑا ہو گیا سر، میں ایم جی ہاؤس کی سیکشن نمبر ون
میں ہوں۔ اس میں سہ پہر کو دھوپ آ جاتی ہے I can not do the big
things میں سورج کے رخ کو تو بدل نہیں سکتا۔ میں نے کنٹین سے بڑا آرٹ پیپر خرید
کر اس پر ایک چارٹ بنایا اور اسے کھڑکی پر دھوپ کے رخ پر پن کر دیا حالانکہ میرا اپنا بیڈ
اور لاکر دوسری طرف ہے''۔ "God bless you" میرے منہ سے بے اختیار نکلا
''تم یقیناً نظم کو سمجھ گئے''۔ What a great moment for a teacher
جسکی لگائی ہوئی قلم میں انکھوے پھوٹنے لگے ہوں۔ خالد بات لمبی ہوتی جاتی ہے۔
ایک اور مثال دوں گا جو social responsibility اور initiative کی مثال
ہے۔ ہوا یوں کہ آٹھویں سی میں سب سے پیچھے بیٹھے لڑکے کے ڈیسک کے ڈھکنے کو اٹھا
کر میں نے دیکھا وہ سویٹس اور ٹافی کے پیپرز سے اٹا اٹ بھرا ہوا تھا۔
''سر، یہ ڈیسک مجھے ایسا ہی ملا تھا۔'' اس لڑکے راشد (میرے ہم نام) نے جواب دیا۔
''اب تم ایسا کرو کہ اس گھنٹے کے بعد (وہ آخری گھنٹہ تھا) تم یہیں اس ڈیسک کو خالی کر دینا۔
سویپر جھاڑو دینے آئے گا تو اٹھا کر لیجائے گا۔'' وہ جمعرات کا دن تھا۔ تیسرے دن ہفتہ کو
میں نے اس سے پوچھا ''تم نے اس دن ڈیسک خالی کر دیا تھا؟'' بولا ''نہیں۔ سر، مجھے
خیال آیا کہ سویپر ہر دن نہیں آتا۔ اگر میں اسی دن کلاس کے باہر برآمدہ میں گند پھینک دیتا
تو شام کو موسیٰ ہال میں فلم ہوتی ہے، سب لوگ سامنے سے گزرتے ہیں اور یہ گند پڑا برا
لگتا۔ سر آج میں نے آپ کے آنے سے پہلے یہ دیکھئے سارے پیپرز اپنے satchel
میں بھر لئے ہیں۔ چھٹی کے بعد ہاؤس کے ڈسٹ بن میں پھینک دوں گا۔'' God

خالد bless him !   God bless him

What a pleasure and what a matter of pride

پاکستان کا مستقبل اس ادارہ کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔ جو ایسے طلبا پروان چڑھا رہا ہے۔

افتخار باقر

(کالج نمبر 4302، زمانہ تعلیم 1983-1980ء)

1981ء میں آٹھویں درجے میں سر راشد ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ہر روز انگریزی کی کتاب سے تین لفظوں کے معنی اور استعمال، انگریزی کی ڈکشنری سے لکھ کر لانے ہوتے تھے۔ وہ بھی ایک خاص ڈکشنری آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی Advanced Learner Dectionary of Current English اور ایک لفظ کے حوالہ کا مطالعہ reference study کے لئے ہاؤس لائبریری کی بلیو بک آف نالج سے کرنا ہوتا تھا۔ مثلاً کتاب میں ایک سبق مارکونی پر تھا۔ تو پہلے روز ریفرنس اسٹڈی مارکونی پر دوسرے روز Hertz پر تیسرے روز 1909ء میں مارکونی کو نوبل پرائز ملنے کا ذکر آیا۔ تو الفریڈ نوبل پر انسائیکلو پیڈیا سے نوٹ لکھنے کو کہا۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سر راشد text پر بالکل نئے سوال پوچھتے تھے۔ مثلاً یہ پوچھا کہ مارکونی کے باپ نے پہلے پہل اسے تجربے کے لئے پیسہ کیوں نہیں دیا۔ مارکونی اور اسکے باپ میں بنیادی فرق کیا تھا؟ پھر بتایا کہ Qualitative difference۔ آدمی اور انسان کا فرق تھا۔ والدین تو اکثر اور کبھی کبھی عام اساتذہ بھی غیر معمولی بچوں کو نہیں سمجھ پاتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب یہ فقرہ آیا۔ When he died in 1937, the whole world mourned his death تو رک گئے اور یہ سوال پوچھا کہ جب وہ 1874ء میں پیدا ہوا تھا تو خوشی صرف اس کے ماں باپ کو ہوئی ہو گی لیکن جب وہ مرا تو پوری دنیا نے اسکا سوگ منایا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے زندگی میں وہ کام کئے جس سے تمام انسانیت کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ تو جناب، محبت اس سے کی جاتی ہے جو احسان کرے، جو خدمت کرے۔ جو بھلائی کرے، اگر عورت صرف اپنے بچے کے کام آتی ہے تو صرف اسکا بچہ اس کے مرنے پر روتا ہے لیکن جو لوگ ساری دنیا کے کام آتے ہیں تو ساری دنیا ان کے لئے روتی ہے یاد کرتی ہے۔

Lives of great men all remind us
We can make our lives sublime.
And departing leave behind us
Footprints on the sands of time.

مارکونی بھی ایسے ہی نقش قدم چھوڑ گیا ہے۔اس روز جاتے جاتے انہوں نے کہا 1937ء ایک اور بڑے آدمی کا سال وفات بھی ہے،فرائڈ۔پھر چاک سے بورڈ پر(Sigmund Frued) لکھا۔ساتھ ہی یہ بھی کہا''یہ لفظ ریفرنس اسٹڈی کے لئے لازمی نہیں۔اگر کسی کو سائیکالوجی سے دلچسپی ہو تو ضرور دیکھ لے،کبھی یہ حوالہ کام آئے گا''۔ پتہ نہیں کیوں میں نے فرائیڈ کے لفظ کا مطالعہ کیا اور تقریباً پانچ برس کے بعد بی اے میں داخلہ لیتے وقت میں مضامین کا انتخاب کر رہا تھا تو میں نے Applied Psychology کا مضمون منتخب کیا۔

آخر میں ایک اور واقعہ کا ذکر کروں گا۔سر راشد ہر مہینے انگریزی کی ایک کتاب پڑھواتے تھے۔لیکن کتاب کو کلاس میں لانے کی سخت ممانعت تھی۔ایک روز میں ہارڈی بوائز سلسلہ کی ایک کتاب کلاس میں لے گیا اور نہ جانے کیسے بستہ سے نکل کر نیچے فرش پر گر گئی۔ہم تین لڑکے پاس پاس بیٹھے تھے۔عثمان میرے دائیں طرف تھا بائیں طرف غالباً عرفان،انہوں نے پوچھا کہ کتاب کون لایا ہے؟ میں چپ رہا۔میرے انداز سے یقیناً انہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ قصوروار میں ہوں۔بہر حال اس وقت وہ خاموش ہو گئے۔دوسرے دن courage کی تین قسموں physical courage, moral courage اور intellectual courage پر مثالوں سے ایک لمبا لیکچر دیا۔(سر راشد کی مثالیں مشہور ہیں)اور بات آئی گئی ہوئی لیکن میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا۔جواب قطب ستارہ بن گیا ہے۔

مَیں شیر شاہ ہاؤس میں ایک سال رہا۔جی نہیں مانتا ہے کہ یہاں میں سر راشد کی بیگم جنھیں ہم سب آنٹی کہتے تھے کی مہربانی کا ذکر نہ کروں۔جن لڑکوں کا گلا خراب ہوتا تھا وہ انہیں گرم پانی کے غرارے کرا تی تھیں۔خود میرے ساتھ یہ ہوا۔یہ واقعہ جنوری 1982ء کا ہے کہ ایک رات میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ہمیں معلوم تھا وقت ناوقت وہ سر کے درد اور پیٹ کے درد کی دوا دے دیتی ہیں۔کوئی رات گیارہ بجے کا وقت تھا میرے ڈارم کیپٹن نے سر راشد کو جگایا۔وہ آنٹی کو لے کر آئے۔انہوں نے مجھے بہت دلاسا دیا اور مجھے یاد ہے کہ انہوں مجھے پانی کے ساتھ کوئی پھکی کھلائی تھی اور ایک پلیٹ میں سونف لا کر دی کہ میں اسے چباتا رہوں۔صبح پی ٹی کے وقت انہوں نے مجھے پھر پوچھا اور سر راشد سے سفارش کی کہ مجھے پی ٹی سے excuse کیا جائے۔اس دن سے میرا اکثر جی چاہا کہ میں انہیں آنٹی کے بجائے امی کہا کروں۔

یوسف عالمگیرین

(کالج نمبر 4319،زمانہ تعلیم 1983-1980ء)

یہ واقعہ 1980ء کا ہے۔شیر شاہ ہاؤس میں اقبالیات کا فنکشن ہو رہا تھا۔جس کے ایک خاکہ میں میرا بھی مختصر سا پارٹ تھا۔راشد صاحب نے مجھ پر کافی محنت کی تھی۔لیکن میں اپنے حصے کی سطریں ٹھیک طریقے سے ادا نہ کر سکا۔فنکشن کے بعد میرے دل میں کھٹکا لگا رہا کہ ضرور مجھے بلا کر سرزنش کریں گے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں چھٹی پر گھر گیا تو میری بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اتفاق سے اسی وقت میرے چچا آ گئے ان کی موجودگی میں والد صاحب نے بڑے فخر سے راشد صاحب کا خط نکال کر دکھایا جس میں انہیں میرے ''اقبالیات'' میں کامیابی سے حصہ لینے کی مبارکباد دی گئی تھی۔ واپس آ کر مجھے پتہ چلا کہ اس طرح کے خط انہوں نے تمام لڑکوں کے گھر بھیجے تھے جنہوں نے پہلی بار اس فنکشن میں حصہ لیا تھا۔ یہ ان کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں اسلامیہ کالج لاہور میں اپنی جگہ بنا لینا میرے لئے کوئی مشکل نہ ہوا اور میں بیک وقت اس کالج کے میگزین کا ایڈیٹر،سینئر پراکٹر اور این سی سی کے دستے کا کمانڈر رہا۔اللہ نے انہیں عجب دل دیا تھا کہ دل جوڑتے ہی رہتے تھے۔

تو چل تو سہی دلِ شکستہ لے کر

وہ جوڑ دیں ایسا کہ پتہ بھی نہ چلے

ایک روز راشد صاحب ہاؤس کے کورٹ یارڈ سے گزر رہے تھے۔کیانی ڈارم کے سامنے کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔وہ اٹھا کر انہوں نے ہاؤس آفس کی ٹوکری میں لے جا کر ڈال دیا۔ایسا اکثر کرتے جسکی وجہ سے لڑکے بھی ہاؤس کی صفائی کے بارے میں بے حد محتاط ہو گئے تھے۔اگر میں یہ کہوں کہ شیر شاہ ہاؤس اس زمانے میں کالج کا cleanest ہاؤس تھا تو غلط نہ ہوگا۔

ان کی ایک اور عادت تھی کہ اگر ہم ریسٹ میں آرام کر رہے ہوں یا پریپ میں پڑھ رہے ہوں تو وہ چلچلاتی دھوپ میں بھی ڈارمیٹریوں کے برآمدے سے نہیں گزرتے تھے۔مبادا بچے ڈسٹرب ہوں۔ان کے ہاؤس آفس کے ساتھ ہی پریفیکٹ کا کمرہ تھا۔اسکا بھی اتنا لحاظ تھا کہ بارش میں بھی اس کمرے کے سامنے سے نہیں گزرتے تھے، حالانکہ ان کا روٹین ایسا تھا کہ دن میں وہ کوئی دس بار تو ہاؤس آفس میں ضرور جاتے آتے ہوں گے۔ اس طرح کی بے شمار تہذیبی نزاکتیں تھیں جو ہم نے ان سے شعوری اور لاشعوری طور پر سیکھیں۔جس لڑکے کی سالگرہ ہوتی اس کو آفس میں بلا کر مبارکباد دیتے۔ایک ماہ کے دوران جتنے لڑکوں کی سالگرہ ہوتی تھی، وہ ان سب کو مہینے کی آخری جمعرات کو اپنے گھر بلا کر انکی سالگرہ مناتے۔ایک آدھ کیک کچھ بسکٹ وغیرہ کا ساتھ بھی ہو جاتا 'Happy birth-day to you' اسکا اہتمام آنٹی کرتی تھیں۔ ایک آدھ بار آنٹی نے پنسلیں، رسالے، ویو کارڈ وغیرہ تحفے میں بھی دیئے۔

راشد صاحب کا پڑھانے کا بھی ایک طریقہ تھا، مثلاً گھر کا کام بہت کم دیتے تھے، صرف دو تین جملے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ، لیکن کام کو ہر روز چیک کرتے اور اسکی کوالٹی بھی چیک کرتے۔ ان کا یہ جملہ مجھے اب بھی یاد ہے کہ جملوں کا تعلق امتحان سے اور کوالٹی کا تعلق کیریر سے بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ انہوں نے ایک بار کہا اگر تین جملے لکھنے کا وقت نہیں یا موڈ نہیں تو نہ لکھو لیکن تاریخ ضرور ڈال دو تا کہ regularity باقی رہے۔ اب ہوا یہ کہ چند لڑکوں نے یہ وطیرہ بنالیا کہ ہر دوسرے دن سادی کاپی پر صرف تاریخ ڈال کر سامنے رکھ دیتے۔ وہ خاموشی سے Not done لکھ کر آگے بڑھ جاتے۔ یہ سلسلہ کافی دنوں چلتا رہا۔ ایک روز انہوں نے توقیر فاضل کی کاپی پر Not done لکھ کر اسے غور سے دیکھا۔ ان کے چہرے پر اتنا کرب تھا کہ وہ تو کیا خود مجھے پسینہ آ گیا۔ اس کے بعد توقیر نے مجھے بتایا کہ جس وقت انہوں نے خاموشی سے میری طرف دیکھا مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بجلی کی ایک لہر میرے دل میں اتر گئی ہے۔ اس دن کے بعد سے توقیر سو فیصد بدل گیا۔

اسی پہلے سال جب گرمیوں کی چھٹیاں ہونے لگیں تو میرے ابو جان مجھے لینے کالج آئے۔ چونکہ راشد صاحب نے سب لڑکوں سے کہہ رکھا تھا کہ والد آئیں تو مجھ سے ملانا۔ وہ اس وقت ہاؤس آفس میں بیٹھے تھے سامنے فرسٹ ٹرمینل کا رزلٹ پڑا تھا انگریزی میں میرے نمبر زیادہ بہتر نہیں تھے۔ اسے دیکھ کر ابو نے کچھ فکر کا اظہار کیا۔ سر راشد نے ان سے بڑی بے تکلفی سے کہا ''محمود عالم صاحب صرف نمبر ہی نہ دیکھیئے مجھ سے یہ بھی پوچھیئے کہ یہ بچہ کیسا ہے؟ اس میں قومی احساس ہے۔ یہ بڑھاپے میں آپ کے کام آئے گا اور زندگی بھر ملک و قوم کے کام آئے گا۔ رزلٹ چاندی ہے مگر سوچ سونا۔'' انہوں نے ہمیشہ زیادہ پڑھنے کو خصوصاً لائبریری کی کتابیں پڑھنے کو اور زیادہ سوچنے کو کہا نمبروں کی بات کبھی نہیں کی۔

ایک دن مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے ہاؤس کیپٹن حامد سجاد اور مجھے بحیثیت اسسٹنٹ ہاؤس کیپٹن کے اپنے آفس میں بلایا اور بتایا کہ مجھے آج انڈیا سے اپنی والدہ کے انتقال کی خبر ملی ہے۔ **انا اللہ و انا الیہ راجعون**۔ ہم دونوں کے لئے یہ صورتحال اتنی غیر متوقع تھی کہ ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ ہم کیا کہیں۔ ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔ پھر خود ہی بولے کہ آپ دونوں اپنی طرف سے اور ہاؤس کی طرف سے مجھ سے تعزیت کرنے ڈنر کے بعد میرے گھر آئیں۔ کھانے کے بعد ہم ان کے گھر گئے تو انہوں نے گھر کے برآمدہ کے باہر آ کر ہمارا استقبال کیا۔ اور ہمیں وی آئی پی کی طرح لے جا کر ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔ پھر خود ہی بتایا کہ میرے مقام اور منصب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسطرح تعزیت کیجیے۔ دعا کے بعد کچھ دیر تک اپنی والدہ

محترمہ کی باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ گھر کے پالتو پرندوں، جانوروں کو کھانا اور فقیروں کو خیرات اپنے بچوں کے ہاتھ سے دلوایا کرتی تھیں۔ رحمت بی بی نام تھا سارے محلّہ کے لئے ماں رحمت تھیں۔ اسی نشست میں انہوں نے بتایا کہ جب میں چھوٹا تھا تو مجھے مسجد میں اذان دینے کا بہت شوق تھا۔ نمازیوں کے وضو کے لئے پانی بھرا کرتا تھا اور فجر کی نماز کے لئے صحن میں صفیں بچھایا کرتا تھا۔

شیر شاہ ہاؤس چھوڑنے سے کچھ عرصہ پہلے کا واقعہ ہے کہ اتھلیٹکس کے مقابلے ہوئے جس میں ہمارے ہاؤس کی کارکردگی کچھ اچھی نہ تھی۔ خود میں نے ہاپ سٹاپ اینڈ جمپ اور لانگ جمپ میں حصہ لیا اور چوتھے نمبر پر آیا۔ اس زمانے میں ہمارے ہاؤس میں بیالوجی کے انسٹرکٹر انعام شیرانی صاحب نئے نئے آئے تھے وہ اس وقت ہاؤس میں سر کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ جونہی میں نے کسی کام سے آفس میں قدم رکھا انہوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا ''ماشاءاللہ اتنے لمبے اور ہٹے کٹے ہو ہاؤس کیلئے بھی کچھ کیا ہوتا۔ وہ اسی طرح شروع تھے اور میں شرمندہ کھڑا کہ راشد صاحب نے میری وکالت کی، ''نہیں شیرانی صاحب اس بچہ میں اور بہت کچھ ہے "He is socially responsible وغیرہ۔ راشد صاحب کسی کا دل ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ پھر بڑی خوبصورتی سے اسے حوصلہ دے کر اور ایک چیلنج دے کر اسے راہ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ سر راشد کا دیا ہوا حوصلہ ہی تھا کہ بعد میں شیر شاہ ہاؤس کی باسکٹ بال ٹیم جس کا میں کیپٹن تھا ملٹری کالج کی فاتح ٹیم ٹھہری اور مجھے ''کالج کلر'' دیا گیا۔

آخر میں راشد صاحب کی خطوط نگاری کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ بہت پابندی سے لکھتے تھے۔ ادھر خط ملا ادھر جواب آیا، گو بہت مختصر۔ کبھی کبھی تو ایک آدھ جملہ ہی ہوتا تھا اور بہت شفقت سے میاں خوش رہو، خدا تمہیں خوش رکھے یہ ان کے pet جملے تھے۔ بہت کشادہ خط ہے۔ دائرے بہت بڑے ہیں۔ ان کو اتنا بڑا کر کے لکھتے ہیں کہ چھوٹا ہلال بن جاتا ہے۔ ان کے خطوں میں جو مٹھاس اور اپنائیت ہوتی تھی وہ دل میں ٹھنڈک اتار دیتی تھی۔ میں ہر سال انہیں عید کارڈ ضرور بھیجتا رہا ہوں جس کا جواب بھی پابندی سے آتا تھا۔ 1985ء کی عید پر جو جون میں آئی تھی، حسب عادت انہیں عید کارڈ بھیجا۔ 6 جون کو انکا یہ مختصر جواب آیا۔

''میاں یوسف

خدا تمہیں خوش رکھے۔ عید نامہ کے لئے شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ اس بار تمہارے کارڈ کو دیکھنے اور خوش ہونے کیلئے تمہاری آنٹی اس دنیا میں موجود نہیں۔ گزشتہ ماہ کی 15 تاریخ کو انکا انتقال ہو گیا۔ اب دعا کرو عظیم خاتون تھیں، اَلْحَمْدُ اللہِ اَلْحَمْدُ اللہِ۔''

بد قسمتی سے مرحوم علوی صاحب کی رحلت کا علم بھی مجھے بر وقت نہ ہو سکا تھا۔ 10 مارچ کو میں نے

راشد صاحب کو معمول کا خط لکھا ان کی خیر خیریت دریافت کرنے کے لئے۔ تیسرے دن مجھے 12 مارچ کو لکھا یہ خط ملا۔

''میاں یوسف

تمہارے خط میں علوی صاحب کے بارے میں کوئی تاثر نہیں۔ غالباً تمہیں علم نہیں کہ مختصر علالت کے بعد 21 فروری کی شب کو وہ انتقال کر گئے۔ گویا چراغ جلاتے جلاتے خود جل بجھے''۔

میری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ راشد صاحب کو میری عمر بھی لگا دے کہ آندھی میں یہ چراغ جو رہ گیا ہے تا دیر جلتا رہے۔

کیپٹن طارق احسان

(کالج نمبر 4323، زمانہ تعلیم 1983-1980ء)

1981ء میں جب میں شیر شاہ ہاؤس میں تھا، وہاں ہر جمعہ کو صبح کے انسپکشن نے میرا بڑا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ راشد صاحب کو alignment کا جنون تھا کہ ہر چیز سیدھی با قاعدہ ایک pattern میں ہو۔ اس وقت ان باتوں کا فلسفہ سمجھنے کی فرصت تھی نہ شائد عمر تھی۔ ایک انسپکشن ہفتہ کی صبح کو ایڈ جوٹنیٹ کی بھی ہوتی تھی اس سے بھی جان عذاب میں تھی۔ ایک ہفتہ کو عین انسپکشن کے وقت میرا ایک بٹن ٹوٹا، وہ بھی کمبخت گلے کا اور سامنے کا۔ اتفاق سے اس وقت بیگم راشد ''بوگن ویلیا'' کی بیلوں کو پانی دے رہی تھیں میں نے ان سے کہا آنٹی میرا بٹن ٹوٹ گیا ہے۔ وہ اندر سے سوئی دھاگہ لائیں اور وہیں کھڑے کھڑے میرا بٹن ٹانکنے لگیں۔ میں نے کہا آنٹی یہاں میرا دل نہیں لگتا۔ یہاں کا کھانا پینا بھی خراب ہے میرے پیٹ میں درد بھی رہتا ہے۔ انہوں نے کہا، یہ سٹور کا آٹا ہے، ذرا باریک ہوتا ہے برسات میں تکلیف دیتا ہے۔ کچھ دنوں میں عادی ہو جاؤ گے تو یہ تکلیف بھی جاتی رہے گی۔ آخر میں کہا ایک بات بتاؤں۔ اصل میں مسئلہ نفسیاتی ہے جس دن تمہارا دل لگ گیا پیٹ کا درد بھی جاتا رہے گا۔

میں نے دل میں کہا لو یہ بھی نفسیات دان نکلیں۔ ویسے ان کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ کچھ دنوں بعد جب دل لگا تو کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ کھانا کیسا ہے؟ کھانا نہیں بدلا میں بدلا تو کھانا بھی بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ یہ بات بھی مَیں سر راشد کی بتائی ہوئی دُہرا رہا ہوں۔ حیرت کی بات ہے کہ انکی جو باتیں اس وقت اتنا بور کرتی تھیں آج مختلف موقعوں پر از خود یاد آتی رہتی ہیں نہ جانے دماغ کے کن تہہ خانوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

آخر میں ایک بات اور 1983ء میں ہم میٹرک کے سارے لڑکے شیر شاہ ہاؤس میں جمع کر دیئے گئے تھے۔ ارادہ تو نیک تھا لیکن شیطانوں نے اس سے ناجائز فائدہ بہت اٹھایا۔ رات کو خوب مستیاں کرتے تھے اور دن کو اچھے بچے بن جاتے تھے۔ بہر حال ایک روز رات کو یہ مستی بلکہ خرمستی کی کہ سر راشد کے پپیتوں پر چھاپہ مارا۔ قمر اور اشرف پپیتوں پر چڑھنے لگے، ہمیں اندازہ نہ تھا کہ پپیتے کا درخت اتنا کمزور ہوتا ہے وہ ٹوٹا اور اشرف دھڑام سے نیچے، وہ بھی کانٹوں میں۔ مختصر یہ کہ کچھ خراشیں وغیرہ بھی آئیں لیکن چار پکے پپیتے ہاتھ آ ہی گئے جو یار لوگوں نے ٹائیلٹ میں بیٹھ کر کھائے۔

دوسرے دن لنچ پر سر راشد کے گھر سے دو بڑی قابوں (trays) میں کٹے ہوئے پپیتے آئے۔ جو ہم سب نے مزے سے کھائے۔ لیکن ہم تین کے سوا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ اس دعوت کا پس منظر کیا ہے۔ یہ دعوت یقیناً آنٹی نے کی تھی۔ مجھے تو وہ راشد صاحب سے زیادہ یاد آتی ہیں اور ہر سال 15 مئی کو ان کی برسی پر ان کے لئے خصوصی دعا کرتا ہوں۔

نعیم اشرف

(کالج نمبر 4335، زمانہ تعلیم 1980-1983ء)

سر راشد سے میں نے 82-1981ء میں پہلے سال آٹھویں میں انگریزی پڑھی تھی۔ اس وقت وہ ڈکشنری کا استعمال بہت کراتے تھے۔ Longmans سیریز کی انگریزی کی کتابیں پڑھنے کو دیتے تھے اور ہر روز ایک لفظ ریفرنس اسٹڈی کے لئے دیتے جو عموماً انسائیکلوپیڈیا سے دیکھنا پڑتا تھا۔ میں جب ایم ایس سی تک پہنچا تو اس میتھڈ کی افادیت کا احساس ہوا۔ میں نے دسویں میں ان سے چند ہفتے انگریزی پڑھی اور اس عرصے میں انہوں نے زیادہ نظمیں Casablanca اور A Nation's Strength وغیرہ پڑھائیں۔ پڑھانے سے پہلے انہوں نے ایمرسن کا تعارف کرایا۔ ایمرسن کے مضامین میں نے انہی کے ایماء پر لائبریری سے نکلوا کر دیکھے۔ انہوں نے ایک روز فریزر کی کتاب "The Golden Baugh" کا ذکر بھی کیا تھا۔ اس کو میں نے گارڈن کالج کی لائبریری سے حاصل کیا۔ اس وقت تو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ چار سال بعد بی اے کرنے کے بعد اسکو دوبارہ نکلوا کر دیکھا تو آنکھیں کھلیں۔ راشد صاحب کو کسی یونیورسٹی میں ہونا چاہیے تھا۔ کالج میں پاکستانیت ان کا خاص موضوع تھا۔ ہاؤس میں تقریریں ہر لڑکے کے لئے compulsory تھیں۔ 'منزل ہے کہاں تیری اے لالہ صحرائی'، 'تو اے مسافر شب خود چراغ بن اپنا' اور انگریزی کی تقریر The making of Pakistan۔ اردو کی یہ دو تقریریں تو انکی کتاب ''شاد باد

منزل مراد' میں چھپ چکی ہیں۔

کیپٹن محمد تاج

(کالج نمبر4369،زمانہ تعلیم 1982-1980ء)

راشد صاحب سے کوئی لڑکا کسی لفظ کے معنی پوچھ لیتا تو وہ برا مناتے تھے۔کہتے مَیں آپ کی ڈکشنری نہیں ہوں اور نہ ہوسکتا ہوں۔ ہر لفظ کے exact لفظی معنی جاننا ضروری ہوتا ہے پھر ہر لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور لفظ کے لفظی معنی سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ استعمال کیسے ہوتا ہے۔usage کی feel تو کثرت مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر اسکا علم ایسی ڈکشنری کثرت سے استعمال کرنے سے حاصل ہوتا ہے جس میں مثالوں سے لفظوں کا usage بھی بتایا گیا ہو جیسے Advance Learner's Dictionory of Current English اکثر کہا کرتے گرائمر سے زبان نہیں آسکتی،اس کے لئے exposure چاہیے۔زبان سنو، بولو، یا پھر کم از کم پڑھو۔انگریزی سیکھنے کا یہ ایک قابل عمل طریقہ رہ گیا ہے۔تلفظ اور لب ولہجہ (accent) زبان کا حسن ہیں، زبان نہیں۔خود انگریزی زبان انگلستان میں 22 مختلف لب ولہجوں میں بولی جاتی ہے۔ہاں وہ زبان جو اشراف بولتے ہیں اسکی prestige زیادہ ہوتی ہے۔زبان تو آوازوں کا نظام ہے۔دنیا میں تقریباً تین ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔زبان ترقی نہیں کرتی لوگ ترقی کرتے ہیں۔سولھویں صدی تک انگریزی یورپ کی ایک پسماندہ زبان تھی۔ پبلک اسکولوں میں اس زمانے میں انگریزی بولنے پر پٹائی ہوتی تھی۔صرف انگریزی جاننے والے کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔یورپ کی علمی زبان لاطینی تھی۔نیوٹن کی Principia لاطینی میں تھی۔Renaissance یا enlightement سے صنعتی انقلاب آیا۔صنعتی انقلاب سے انگلستان کی فوجی قوت میں اضافہ ہوا،جس کے نتیجہ میں British ایمپائر وجود میں آئی۔راشد صاحب کو لسانیات سے بھی دلچسپی تھی۔اکثر لفظوں کا تجزیہ کرتے اور انکی تاریخ بتاتے۔ایک روز "The Doll's House" پڑھاتے ہوئے ڈرائینگ روم کا لفظ آ گیا۔بتایا کہ اصل میں یہ لفظ withdrawing room تھا۔کھانے کے بعد ڈائینگ روم میں شراب اور dirty jokes چلتے تھے،تو وکٹوریہ کے عہد کی "باحیا" خواتین برابر والے آراستہ پیراستہ کمرہ میں withdraw ہوجاتی تھیں۔یہ withdrawing روم اب ڈرائینگ روم ہوگیا ہے اسے ڈرائینگ یا آرٹ سے کوئی تعلق نہیں۔وکٹوریہ دور کے انگلینڈ کی ریاکاری Hypocracy بھی مشہور ہے۔ایک طرف تو انکی اخلاقی حس اتنی نازک تھی کہ میز کی ٹانگوں کو بھی legs نہیں unmentionable کہتے

تھے مبادا کہ ٹانگ کے لفظ سے کسی کا تخیل صنف نازک کی ٹانگوں کی طرف منتقل ہو جائے۔ خواتین جو اسکرٹ پہنتی تھیں وہ نہ صرف ٹخنوں تک ہوتا تھا بلکہ کمر کے نیچے سے ایک طرح مصنوعی چھتری کے ذریعے سے سکرٹ کو پھیلایا جاتا تھا تاکہ جسم کے خطوط کا کوئی اندازہ نہ ہو۔ ادھر mistresses of court of London بھی تھیں۔ اخلاق کے دو معیار تھے ظاہر کچھ باطن کچھ۔ ایک روز لفظ assassination کا ذکر آ گیا۔ وضاحت کی murder اور assassination میں فرق ہے۔ یہ لفظ حشیشین سے نکلا ہے۔ حسن بن صباح کے پیروکار حشیشن کے نشہ میں اپنے مخالفوں کو قتل کرتے تھے وہ حشیشین کہلاتے تھے۔ اب ایسا قتل (murder) جو کسی خاص مقصد سے یا خاص ذہنی حالت کے تحت کیا جائے اسے "assassination" کہتے ہیں۔ اس لفظ میں ایک تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ اسی طرح بعض لفظ جن جگہوں سے یا افراد سے نکلتے ہیں اس طرح مشہور ہوئے ہیں کہ انکی اصل معدوم ہی ہوگئی ہے۔ سینڈوچ ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے بنتے ہیں۔ سینڈوچ لارڈ تھا۔ 4th ارل آف Sandwich جو تاش کا اتنا شوقین تھا کہ گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا اور اسے کھانے کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ اسکے باورچی نے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں کے درمیان بیف ڈال کر اس شکل میں کھانا تیار کیا جو شروع میں اس کے ہاں پیش کیا جاتا تھا۔ اب یہ ایک بین الاقوامی ڈش ہے اور نام وہی سینڈوچ۔ گو اب مختصر ہو کر سینوچ رہ گیا ہے۔ اب بیڈمنٹن مشہور کھیل کا نام ہے۔ منٹن اصل میں ڈیوک آف بیوفورٹ کی جاگیر کا نام تھا۔ ڈیوک نے یہ کھیل ایجاد کیا یا اسکو موجودہ شکل دی۔ اب وہ کھیل ہی بیڈمنٹن کے نام سے مشہور ہے۔ نفسیات کی دو معروف اصطلاحیں sadism اذیت پرستی اور Masochism یعنی خود اذیتی ہیں۔ sadism ایک فرانسیسی جاگیردار (1740-1814ء) De Sade کے نام سے نکلا ہے۔ جو ساڈ کا جاگیردار تھا۔ جو عورتوں کو اذیت دے کر لذت لیتا تھا۔ اس perversion کا نام ہی sadism پڑ گیا۔ اسی طرح خود اذیتی Masochism انیسویں صدی کے ایک آسٹرین ناولسٹ کے نام سے موسوم ہے جس نے اس perversion کو موضوع بنایا۔

راشد صاحب کی کچھ pet themes تھیں جیسے what matters is your performance not position۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ پوزیشن ہمیشہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ آپ زندگی کی کس منزل کس مقام پر ہیں، کیا پیشہ کیا، رینک یا گریڈ پاتے ہیں، یہ پورے طور پر اپنے اختیار میں نہیں ہوتا۔ لیکن performance بڑی حد تک انسان کے اختیار میں ہوتی ہے۔

کسی نے پوچھا کیا performance پر ماحول کا اثر نہیں ہوتا؟ ان کا برجستہ جواب تھا، ہوتا ہے بلکہ ضرور ہوتا ہے لیکن کون کتنا اثر قبول کرتا ہے یہی کردار کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یکساں ماحول میں بھی

لوگوں کاresponse یکساں نہیں ہوتا۔ یہ فرق ہی انسان کی چھوٹائی بڑائی کا معیار بنتا ہے۔
ایک روز یہ لائنquote کی:-

He most lives who thinks most
feels the noblest, acts the best

پھر کہا یہ بھی سوچیں کہ پہلے thinks most آیا ہے۔ پھرfeels the noblest اور آخر میں acts the best کیوں؟

لٹریچر کے علاوہ جس چیز سے راشد صاحب کی دلچسپی بہت نمایاں تھی وہ سائیکالوجی تھی۔ انہوں نے حالاتِ حاضرہ یا سیاسی موضوعات کو بہت ہی کم بلکہ شاید کبھی touch نہیں کیا۔

attitudeبنانے میں ان کا بڑا کردار تھا۔ کبھی کبھی abnormal psychology اور Neurosis پر بھی بات کرتے تھے۔ انہوں نے ہمارے اندر ہمارے اپنے والدین کے احسانات کی awareness بھی پیدا کی۔ ایک روز پوچھا تم میں سے کس کس کو اپنے والدین کی سالگرہ کا دن یا ویڈنگ ڈے یاد ہے؟ والدین بھی توجہ چاہتے ہیں۔ پہلے پہل جب آٹھویں میں آئے تھے اور پہلی عید آئی تو انہوں نے تاکید کی کہ اپنے پرائمری کے کسی استاد کو جس نے آپ کو متاثر کیا ہو عید کارڈ ضرور بھیجیں اور جب گرمیوں کی چھٹی پر جانے لگے تو انہوں نے suggest کیا کہ گھر کے سب افراد کے لئے چھوٹے چھوٹے تحفے لے کر جائیں۔

اکثر کہا کرتے بنیادی چیز آدمی کی سوچ ہے۔ شیر شاہ ہاؤس کا موٹوI can I will ہے اسکی تشریح گہرائی میں جا کر کرتے تھے۔ یہ بھی اُنہی نے بتایا کہ یہ موٹو ان کا دیا ہوا نہیں ہاؤس کے فاؤنڈر ہاؤس ماسٹر مسٹر حیدری کا ہے۔

راشد صاحب کی ایک اورfavourite theme تھی good unilaterally اس موضوع پر ان کی کتاب "Living with Leadership" میں ایک آرٹیکل بھی ہے۔ وتواصو بالحق وتواصو بالصبر پر بہت زور دیتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ صبر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

How sublime a thing it is to suffer and be strong

کیپٹن اقبال حیدر رضا خان

(کالج نمبر4371،زمانہ تعلیم 1980-1982ء)

ستمبر 1980ء میں کالج میں وائی کیڈٹ اسکیم کے تحت داخل ہوا تھا۔ راشد صاحب انگریزی

پڑھانے کے ساتھ ساتھ ہمارے کیریر بلکہ کیریر سے بھی آگے پوری زندگی پر نظر رکھتے تھے۔ انگریزی کی بک ون کا پہلا سبق His First Flight تھا۔ یہ بظاہر نوجوان آبی پرندہ Seagull اور اسکے خاندان کی کہانی ہے۔ لیکن انہوں نے اسے ہمیں ایک علامتی (symbolic) کہانی کے طور پر پڑھایا۔ فرمایا یہ ایک ناتجربہ کار (uninitiated) نوجوان کی نفسیات کی عکاسی کرتی ہے۔ ناول "Good Bye Mr. Chips" (جو ایک پبلک سکول بروک فیلڈ کے ایک استاد ہاؤس ماسٹر کی کہانی ہے) کو پڑھانے سے پہلے انہوں نے انگلستان کے پبلک سکول سسٹم کی تاریخ اور اسکی خوبیوں خامیوں پر بھرپور روشنی ڈالی اور مسٹر چپس کے کردار کو انتہائی تفصیل سے ڈسکس کیا۔

ناصر محمود اعوان

(کالج نمبر 4389، زمانہ تعلیم 1982-1980ء)

انٹرمیڈیٹ میں دو سال (82-1980ء) راشد صاحب سے انگریزی پڑھی۔ زبان تو سیکھی ہی، اصل لطف لٹریچر پڑھنے کا آیا۔ زندگی کی ایک نئی awareness ملی خود آگہی، جینے کا سلیقہ، انسانوں کو سمجھنے کا فن، قدروں کا شعور، بہت کچھ حاصل ہوا۔ وہ دن اس لحاظ سے بہت قیمتی تھے کہ طرز احساس (sensibility) میں بہت گہری اور دوررس تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ انہی کا سنایا ہوا محمد علی جوہر کا شعر سناتا ہوں:

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دنیا بدل گئی

جس نے اُن سے پڑھا اس کی دنیا ضرور بدلی۔ انہوں نے ہمیں زندگی کی نزاکتوں اور فراستوں سے نوازا۔ ان کا ایک اپنا لائف اسٹائل تھا جو کم موثر نہیں تھا۔ لیکن میں یہاں اپنی اور مسعود کی یادداشتوں سے انکی کلاس روم ٹیچنگ کے بعض ٹکڑوں کو reproduce کرنے کی کوشش کرونگا۔

راشد صاحب سے میرا اصل تعارف Katherine Mansfield کی شارٹ سٹوری 'The Doll's House' کے حوالے سے شروع ہوا۔ میں ملٹری کالج میں فرسٹ ائیر میں داخل ہونے سے پہلے ایک اور ممتاز کالج میں کچھ عرصہ زیر تعلیم رہا تھا۔ لیکن وہاں بھی روایتی reproductive طریقہ تعلیم رائج تھا۔ سبق کی ریڈنگ، مشکل الفاظ کے معنی اور کہانی کا خلاصہ بتایا جاتا۔ بہت ہوا تو کرداروں پر نوٹس لکھوائے اور بات ختم۔ راشد صاحب نے بات یہاں سے شروع کی کہ اس شارٹ اسٹوری کا نام تو 'دی ڈالز ہاؤس'

ہے’A Doll's House‘ نام کا مشہور ناروجیئن ڈراما نگار ہنری ابسن کا ایک معرکہ آرا پلے بھی ہے۔ اسکی ہیروئن نورا کا کردار اتنا جاندار ہے کہ حد نہیں۔ وہ نئی عورت ہے جو صرف ایک خوبصورت گڑیا بنے رہنے سے انکار کر دیتی ہے۔ کبھی فرصت ملے تو پڑھ لینا۔ اسکا ڈراما’ معمار اعظم‘ 'The Master Builder' بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ لیکن Mansfield کی یہ شارٹ اسٹوری بھی نہ صرف کلاس conflict کی عکاسی کرتی ہے بلکہ اس میں نفسیاتی آب ورنگ ہے۔ انہوں نے نفسیاتی مطالعہ تو سب ہی کرداروں کا کیا لیکن غالباً ہماری دلچسپی اور دور رس رہنمائی کے لئے تفصیل سے گفتگو ایک مائنر کریکٹر لینا لوگن(Lena Logan)پر کی۔

لینا اپر کلاس کی ایک حسین لیکن خود بین اور خود سر لڑکی ہے جو غریب کیلوی سسٹر ز کا مذاق اڑانے میں پیش پیش ہے۔ انہوں نے کہا لینا لوگن ایک ٹائپ کیریکٹر ہے یہ کردار زندگی میں اور فکشن میں عام ملتا ہے۔ انہوں نے تھیکرےThackray کے ناول"Vanity Fair" کی ہیروئن Becky Sharp کو بھی ڈسکس کیا جو حسین، ذہین اور قلوپطرہ کی طرح ambitious ہے۔ اس ضمن میں انہیں نے عذرا جمال کے مشہور افسانہ گلدانی کا ذکر کیا۔ جسکی ہیروئن گلدانی کے کیریکٹر کی traits کا combination بھی یہی تھا۔ حسین ذہین اور بے انتہا ambitious۔ وہ تن تارا صبح کا تارا افسروں کے گھروں میں برتن مانجھتے ہوئے اوران کی بیگمات کے نخرے سہتے ہوئے خود بھی دل ہی دل میں بیگم صاحبہ بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی اور اس میں اتنی ذہانت، اتنی متانت، اتنی قوت ارادی تھی کہ وہ اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے سکے۔ پھر وہ بیگم بن بھی۔ وہ پورا قصہ انہوں نے سنایا اور یہ بھی بتایا کہ یہ افسانہ صرف افسانہ نہیں بلکہ پی ایم اے کا کول کے ایک حقیقی واقعہ اور کر دار پر مبنی ہے۔ پھر وضاحت کی کہ حسین ذہین اور ambitious عورتیں صرف فکشن کے اوراق ہی میں نہیں زندگی میں بھی ملتی ہیں۔ حسن کے ساتھ ذہانت بھی شامل ہو جائے تو اسکے جادو سے بچنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر مسکرا کر کہا خصوصاً بیوقوف آدمیوں کے لئے جس میں عمر کی قید نہیں بلکہ شاید بیوقوفی کی بھی نہیں۔ مارک انتونی کا جو حشر قلوپطرہ کے ہاتھوں ہوا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ گفتگو کے اس مرحلہ پر انہوں نے یہ نکتہ discuss کیا کہ ایک کیریئر آفیسر کی زندگی میں اسکی بیوی کا کیا رول ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے پوائنٹ آؤٹ کیا کہ اکثر نوجوان اپنی wants اور needs میں فرق نہیں کر پاتے اور مار کھا جاتے ہیں۔ بات بڑھتے بڑھتے بڑے آدمیوں کی بیگمات تک پہنچی تو انہوں نے کہا قدرت کی ستم ظریفی دیکھو کہ دنیا کے بہت سے بڑے آدمی بیویوں کے معاملے میں بڑے بدقسمت تھے۔ سُقراط کی بیوی کی بدزبانی مشہور ہے۔ شیخ سعدی بھی بیوی کو طوق درگلو ہی

کہتے رہے۔شیکسپئر کی بیوی نے اسکا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ٹالسٹائی اپنی خودسر لیکن مالدار نیک بخت سے اتنا تنگ پڑا کہ اس نے گھر چھوڑنے میں عافیت سمجھی اور 1910ء میں ایک ریلوے اسٹیشن پر کسمپرسی کی حالت میں جان دی۔غالب اپنی نصف بہتر امراؤ بیگم سے کتنے خوش تھے اسکا ذکر ان کے مرزا تفتہ کے نام خطوط میں موجود ہے۔جاوید اقبال نے ماہ لالہ فام میں لکھا ہے کہ اقبال کی بیگم سردار بیگم نے ایک بار ان سے کہا آپ گھر پر پڑے رہتے ہیں کوئی کام ہی کیا کریں۔غالباً یہ خطبہ الہ آباد کے زمانہ کی بات ہے۔

ان کے ایک پیریڈ میں علم و آگہی کی مختلف سمتوں میں ہمارا اتنا mental exposure ہوتا تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا چھوڑیں کیا نوٹ کریں۔

انگریزی کی بک ون میں Hans Anderson کی ایک fantasy دی ریڈ شوز 'The Red Shoes' کے نام سے تھی۔ایک مغرور احسان فراموش لڑکی Karin کی کہانی جسے احسان فراموشی اور نافرمانی کی عبرتناک سزا ملی۔اس کو راشد صاحب نے اپنے مخصوص اسٹائل میں پڑھایا۔پہلے انگریزی شارٹ اسٹوری کی تاریخ موپساں سے لے کر او ہنری تک بیان کی۔مختصر افسانہ کی قسمیں بھی بتائیں۔ایچ جی ویلز کی ہارر اسٹوریز،سائنس فکشن،موپساں،چیخوف،ٹرچنیف کا ذکر کیا۔گورکی،سمرسٹ ماہم کی ایک کہانی 'دی نیکلیس' بھی سنائی۔اردو افسانہ میں پریم چند کے 'کفن' اور قدرت اللہ شہاب کے طویل افسانہ 'یا خدا' کا تذکرہ ہوا۔یہ سلسلہ کئی روز چلا۔اس ضمن میں اناطول فرانس کی تائیس کا پلاٹ بھی سنایا۔وہ حسین رقاصہ تائیس جو گناہ کی زندگی سے تائب ہوئی اور وہ راہب جو اسے یسوع کے راستہ پر بلاتے بلاتے خود گناہ کا شکار ہوا۔اس کہانی کو ہم teen agers نے بہت حیرت اور دلچسپی سے سنا۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ تائیس کا اردو ترجمہ عنایت اللہ صاحب اور ڈراما کے انداز میں 'مصر کی رقاصہ' کے نام سے پطرس بخاری نے کیا ہے۔

'دی ریڈ شوز' ایک fantasy ہے۔فینٹیسی کی بحث میں لاشعور (unconscious mind) کا ذکر ہوا۔لاشعور سے بات سگمنڈ فرائڈ اور psychoanalysis اور تحلیلی نفسیات تک پہنچی۔

پھر تحلیلی نفسیات کی وضاحت کی۔فرائڈ کے جو Concepts ہیں۔ ID ego اور superego پر تفصیلی گفتگو کی۔اڈلر کی Individual psychology کے بارے میں بتایا۔ احساس کمتری اور احساس برتری کی تشریح کی oedipuse complex کے بارے میں بھی بتایا۔ ایک روز extrovert اور introvert رجحانات پر لیکچر دیا اور دونوں patterns کی limitations اور limits کی وضاحت کی۔ایک بار اشتہاروں،خاص طور پر ٹی وی کے اشتہاروں پر

مضمون لکھانا تھا۔ کہنے لگے اشتہار بازی اب ایک سائنسی فن ہے۔ اس میں نفسیاتی اصول مربوطیّت (conditioning) کے اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ پھر انہوں نے conditioning کے نظریہ پر روسی سائنس دان Pavlov کے تاریخی تجربات کی وضاحت کی کہ کس طرح اس نے بھوکے کتے پر تجربات کئے۔ جب بھی اسے راتب دیا جاتا تو اسکی خوشبو سے منہ کا لعاب نکلنے لگتا ساتھ ہی گھنٹی بجتی۔ کچھ روز کے بعد کتے کے لاشعور میں راتب کی خوشبو اور گھنٹی کی آواز مربوط condition ہوگئی۔ آخر کار صرف گھنٹی کی آواز سن کر لعاب نکلنے لگتا۔ اب اصول یہ ٹھہرا کہ جب دو چیزیں ساتھ ساتھ واقع ہوں تو لاشعور میں ایک کی feeling دوسرے تک منتقل ہو جاتی ہے۔ اسی اصول پر اشتہار بازی ہوتی ہے۔ جوتے یا ٹوتھ پیسٹ یا چائے کے نام کے ساتھ جو حسین چہرہ بار بار آتا ہے وہ حسین چہرہ یا خوبصورت آواز کا تاثر دوسری چیز کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔ حسین ماڈل پر تو بس نہیں چلتا، انسان وہ ٹوتھ پیسٹ یا جوتا خرید لاتا ہے جو اس کے زیرِ استعمال دکھایا جاتا ہے۔ انہوں نے وضاحت کی کہ جانداروں کو اسی اصول پر سدھایا جاتا ہے۔ پھر ریچھ کے سدھانے کی وضاحت کی کہ کس طرح ایک گڑھا کھود کر، اس پر لوہے کا توا رکھ کر اسے مٹی سے ڈھک دیا جاتا ہے۔ توے کے نیچے آگ جلائی جاتی ہے۔ آگ کی گرمی سے ریچھ اچھلتا ہے۔ ساتھ ساتھ ڈگڈگی بجائی جاتی ہے۔ آگ کی آنچ بڑھانے کے ساتھ ساتھ ڈگڈگی بھی تیز کی جاتی ہے تو وہ اور زور زور سے اچھلتا ہے اور آخر میں اسے راتب دیا جاتا ہے۔ تکلیف سے اچھلنا کودنا ڈگڈگی کے ساتھ condition ہو جاتا ہے۔ سانپ بھی سپیرے کی بین کی حرکت کے ساتھ condition ہو جاتا ہے۔ سنتا تو وہ ہے نہیں۔ کسی نے پوچھا کیا یہ اصول انسانوں پر بھی صادق آتا ہے؟ جی ہاں، انسانی زندگی میں، لیڈر شپ میں، عشق، محبت اور نفرت سب میں بڑی حد تک conditioning کارفرما ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ conditioning لاشعوری ہوتی ہے، نفسیاتی اعتبار سے چہرہ کا نقاب کھلے ہوئے روئے زیبا سے زیادہ ہیجان خیز ہوسکتا ہے۔ پردہ کے حق میں علامہ اقبال نے علامہ سید سیف علی کو ایک دلیل یہ بھی دی کہ پردہ سے جنسیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اسکا راز بھی لمبی conditioning ہے۔ پردہ سے erotogenic area بڑھ جاتا ہے۔ بلکہ پورا ملبوس جسم erotogenic ہوسکتا ہے۔ غالب کا شعر اسی حقیقت کا غماز ہے۔

دیکھو تو انداز شوخی نقش پا
موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

یورپ میں جہاں بے پردگی بہت زیادہ ہے اور جسم کے بیشتر حصوں کو ڈھکا نہیں جاتا ہے، وہاں

erotogenic area بہت کم ہو گیا ہے۔

یورپ میں اونچے اسکرٹ کے استعمال نے خرام ناز کو بے اثر بنا دیا ہے۔ اونچے اسکرٹ پر یاد آیا کہ ایک روز فیشن کا ذکر آیا۔ کہنے لگے بعض فیشن، خلاف فطرت بھی ہوتے ہیں یا نفسیات کی نفی کرتے ہیں۔ مثلاً منی اسکرٹ چلے گا نہ ہی یہ ٹاپ لیس چلے گا۔ سنسنی خیزی (Sensation) پیدا کرنے تک تو ٹھیک ہے اس سے آگے اس کا چلنا مشکل ہے۔ چونکہ یہ خلاف فطرت ہے۔ لباس کا ایک کام Erotogenic area بڑھانا ہے۔ عریانی سے فی الحقیقت erotogenic فیلڈ کم ہوتی جاتی ہے۔ تم لوگ دیکھ لینا کہ تھوڑے دنوں میں تنگ تنگ ڈیپ نیک (Deep neck) کے بجائے ڈھیلے ڈھالے کلوز کالر کے کپڑے آ جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند ہفتے گزرے تھے کہ flapper آ گئے۔

راشد صاحب کی تربیت کا طریقہ بڑا scientific اور نفسیاتی تھا۔ ہماری کلاس میں ایک بانکے سنوریا بھی تھے۔ قمیض کا ایک آدھ بٹن اکثر کھلا ہوتا جو وہ غریب راشد صاحب کے پیریڈ میں جلدی جلدی بند کرتا۔ گرمیوں میں آستین کے دو تین فولڈ اوپر کرتا تاکہ بازو کی مچھلیاں زیادہ نمایاں ہو جائیں۔ راشد صاحب کی نظر تو ہر لڑکے پر رہتی تھی۔ ایک روز باتوں باتوں میں کہنے لگے نفسیاتی اعتبار سے انسان کی بنیادی needs تین ہیں۔ security , recognition اور adventure۔ نوجوانوں کو recognition کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب تک کسی فیلڈ میں ان کو امتیاز حاصل نہ ہو جائے وہ recognition کے لئے فیشن کا سہارا لیتے ہیں۔ بعض نوجوانوں میں نرگسیت زیادہ ہوتی ہے۔ ''نرگسیت کیا ہوتی ہے''۔ نرگس یا نرگیسین Nar-cissus یونانی دیو مالا کا کردار ہے۔ وہ خوبصورت نوجوان تھا لیکن اپنے حسن سے بے خبر۔ اس پر ایک دیوی Echo عاشق ہو گئی لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تو اُس نے اسے بددعا دی کہ تو اپنے عشق میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جائے۔ مختصر یہ کہ ایک تالاب سے گزرتے ہوئے جب اس نے اپنا عکس پانی میں دیکھا تو وہ اسے کوئی غیر سمجھا اور دیکھتا رہ گیا۔ گویا اپنے آپ پر عاشق ہو گیا کہ وہاں سے ہلا تک نہیں تا آنکہ وہ گھل گھل کر ختم ہو گیا۔ جہاں وہ گرا تھا۔ وہاں سے ایک پودا اُگا جس کی شکل آنکھ کی سی تھی۔ اس پھول کا نام نرگس رکھا گیا۔ Narcissism نرگسیت یعنی خود محبتی یعنی اپنی محبت میں آپ مبتلا ہونا۔ ہر انسان اپنی جذباتی ارتقا کی ایک منزل میں اپنے جسم میں نارمل حد تک دلچسپی لیتا ہے۔ اپنے آپ کو بنا سنوار کر رکھنا اور نفاست سے رہنا، خود نمائی کی ایک نارمل صورت ہے لیکن نرگسیت اس کی غیر معمولی صورت ہے۔ پھر انہوں نے کسی لڑکے کا ذکر کیا جو نرگسیت میں مبتلا تھا۔ جس کا لاکر cosmetics سے بھرا رہتا تھا۔ ایسے ابنارمل cases بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔

فرمایا اگر شخصیت personality کا ارتقا صحیح خطوط پر ہو۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں solid achievement ہوتو انسان نرگسیت اور خودنمائی (exhibitionism Narcissism) سے آزاد ہو جاتا ہے۔ گریک مائی تھالوجی کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ہر قوم کی کہانیاں ہوتی ہیں۔ لیکن گریک myths بہت ہی خیال انگیز اور خوبصورت ہیں۔ گلاب کا پھول سرخ اور محبت کی علامت کیسے بنا۔ اس کی دیو مالائی کہانی یوں ہے۔ ایک دیوی جھاڑیوں میں آرام کر رہی تھی۔ پاس ہی اس کا بیٹا کھیل رہا تھا۔ اتنے میں ایک وائلڈ بور بچے پر جھپٹا۔ بچے کی چیخ کی آواز سن کر وہ نیند سے چونکی اور سفید گلاب کی جھاڑیوں کو پھلانگتی ہوئی بچہ کو بچانے دوڑی، بچہ تو بچ گیا لیکن گلاب کے نوکیلے کانٹوں سے اس کے تلوے زخمی ہوگئے۔ اس کے تلووں سے جو سرخ خون گرا وہ سفید گلابوں کو سرخ کر گیا۔ یوں ایک ماں کی محبت کی یاد میں گلاب سرخ چلا آتا ہے۔

ایک دن انہوں نے سینہ کے بٹن کھولنے اور بازو یا رانوں کی مچھلیاں ابھار کر دیکھانے کی نفسیاتی توجیہہ کی exhibitionism۔ فرمایا چوڑا سینہ، سینہ کے گھنے بال اور پتلی کمر مردانگی کی روایتی علامت ہے۔ (شیر کے سینہ اور کمر کو دیکھیں) سنا ہے جاپان میں امریکی قبضہ کے بعد جاپانیوں میں پلاسٹک کے مصنوعی بال سینہ پر چسپاں کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن وہ زمانہ گیا جب صرف جسمانی شہ زوری کسی کو زیادہ eligible بناتی تھی۔ آج کل تو مرد کی قیمت اس کے سینے کی چوڑائی اور گھنے بالوں یا بازوؤں کی مچھلیوں سے نہیں اس کے معاشی اور سماجی status سے گھٹتی یا بڑھتی ہے۔ اگر کسی نوجوان کا کیریر برائٹ ہو تو خاندان کی حسین ترین لڑکی سے وہ شادی کر سکتا ہے۔ بلکہ لڑکی والے گھر آ کر رشتہ دیں گے۔ اس لئے بھولے بادشاہو! کیرئیر کو بناؤ۔ سینے کے بالوں اور بازوؤں کی مچھلیوں کے چکر میں پڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

زندگی کے بارے میں awareness پیدا کرنا راشد صاحب کی خاص Contribution ہے۔ انکی نظر ہمارے کیرئیر پر ہی نہیں ہماری زندگی پر بھی رہتی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کی انگریزی کی بک تھری کے نصاب میں تین پلے اور 12 نظمیں تھیں۔ ایک پلے 'رائزنگ آف دی مون' تھا۔ اس میں سارجنٹ کے ذہن میں جو conflict تھی اپنے ذاتی مفاد اور قومی وفاداری میں، اس کو موضوع بنا کر انہوں نے idealism اور commitment پر بڑی خوبصورت بحث کی۔ کالج میں patriotism کے sentiment کو انہوں نے بہت پروان چڑھایا۔ ان کا چاک کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے سے لکھنا۔ بلاضرورت پنکھا اور بلب سوئچ آف کرتے رہنا ہمیشہ یاد رہے گا۔

قائداعظم کا یہ قول کہ اپنی دولت کو ضائع کرنا بیوقوفی اور قومی دولت کو ضائع کرنا جرم ہے۔ پہلی باران

ہی سے سنا اور بار بار سنا، جب The Dear Departed پڑھایا تو Amelia Slater کی احسان فراموشی کا تجزیہ کرتے ہوئے شیکسپیئر کے ڈرامے "King Lear" کا پلاٹ بھی سنایا۔ یہ جملہ نوٹ کروایا ’Ripeness is all‘ یہ جملہ ان کی کمزوری بنا ہوا تھا۔ اس کو اکثر دہرایا اور مختلف situations کے حوالے سے اس کی تشریح کی۔ awareness,life style, maturity اور sensibility یہ تین چار الفاظ وہ اکثر استعمال کرتے تھے۔ ایک فرانسیسی ضرب المثل 'To understand all is to forgive all' کی بازگشت بھی ان لیکچروں میں اکثر سننے میں آتی۔ انگریزی کی بک ٹو میں ونسٹین چرچل کا ایک مضمون First year at Harrow تھا۔ اس کو پڑھاتے ہوئے انہوں نے چرچل کے دو فقرے نوٹ کروائے a Life is a whole & luck is whole بہت دیر تک ان کی وضاحت کرتے رہے۔ مقصد یہ تھا کہ زندگی کے سفر میں ہم ثابت قدم رہیں۔ چرچل کے سلسلے میں جسے اس صدی کا سب سے بڑا انگریز لیڈر کہا گیا ہے یہ دلچسپ انکشاف کیا کہ وہ Sandharst کے لیے دوبار ناکام ہوا تھا۔ انگریزی کی بک تھری میں تیسرا پلے The Princess on the Road تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ پلے انہوں نے ڈوب کر پڑھایا تو غلط نہیں ہو گا۔ خصوصاً یہ نغمہ جو شہزادی پلے کے شروع میں گاؤں میں پہنچ کر گاتی ہے۔

For me, are your songs as your smiles and your tears
For me, for ever, for all the years,
I have conquered all your fears,
Now, for ever, for all the years,
For me, are you, are you, and your smile,
Now, for ever and all the while.

کہنے لگے اس سے بڑھ کر love poem میری نظر سے نہیں گزری۔ یہ دھرتی کی، مادرارضی کی آواز ہے۔ یہ مادریت کی پکار ہے۔ دیکھیے اس نے مسکراہٹیں ہی نہیں آنسو بھی اپنا لئے ہیں۔ ایک دن کے لئے نہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، پھر اس نے اپنے بچوں کو خوفوں سے نجات دلا دی ہے۔ خوف، انسان کو haunt کرتا رہتا ہے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ کس والہانہ انداز سے اور کس گہرائی میں جا کر انہوں نے ان مصرعوں کی وضاحت کی۔ ساری کلاس سحر زدہ تھی اور اشعار کی معنویت کی دھڑکن کو محسوس کر رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ he was at his best that day ”کتنی محبت ہے، کتنی گہرائی ہے total commitment کیسے لافانی مصرعے ہیں۔ کتنا آفاقی احساس ہے گویا خدا بول رہا ہے، اس کی شان

کریمی بول رہی ہے۔کتنا زبردست idealism ہے''۔جب گھنٹی بجی اور وہ یکا یک تھینک یو جنٹلمین کہہ کر باہر جانے لگے تو سحر ٹوٹا۔ پلے کا پلاٹ یہ ہے کہ جب شہزادی گاؤں پہنچتی ہے اور محبت کا یہ لافانی گیت گاتی ہے تو گاؤں خالی پڑا تھا۔سب لوگ کھیتوں میں گئے ہوئے تھے۔شہزادی کو بھوک پیاس نے ستایا تو ایک گھر میں جا کر اس نے کچھ کھانے پینے کی کوشش کی ۔اتنے میں گاؤں والے آ گئے اور اسے چور سمجھ کر اس کی وہ گت بنائی کہ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ایک بازی گر نے جو شہزادی کو محل میں دیکھ چکا تھا اپنے کرتبوں سے بمشکل اس کی جان بچائی ورنہ دیہاتیوں نے تو اسے اذیتیں دے دے کر مار ہی دیا تھا۔راشد صاحب نے دوسرے دن پھر توجہ دلائی ۔دیکھا،شہزادی جوان کی بلائیں لے رہی تھی، جوان کے آنسو پی رہی تھی، جوان کا دکھ درد بانٹ رہی تھی، جوان کو ان کے خوفوں سے نجات دلانا چاہتی تھی، دیکھا اسکا کیا حشر ہوا۔لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔سقراط سے لے کر گلیلیو تک، جون آف آرک تک (میں اسلامی تاریخ سے مثالیں قصداً نہیں دے رہا ہوں) idealist آدرش پرستوں کو اس آگ کے دریا سے گزرنا پڑا ہے۔سورۃ العصر ایک مکی سورت ہے۔اس میں وتوالصو بالحق و تو اصوبالصبر کی تلقین ہے۔سچائی(truth) کے لئے سب کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔

For truth and honour's sake
stand fast and suffer long.

اس لئے انسان کے لئے اس سے بڑا شرف نہیں کہ وہ زہر کا پیالہ پی لے اور پھر پکار کر کہہ دے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

نظمیں بھی راشد صاحب نے خوب پڑھائیں۔Emily Bronte کی دو نظمیں I'am the only being اور The Lines پر خوب سیر حاصل بحث کی۔تنہائی کے فلسفہ پر روشنی ڈالی۔تنہائی انسان کا مقدر تو ہے جس کا حل محبت ہے۔دوسروں کی زندگی میں involve ہونا۔لیکن کولرج کی نظم 'Water Ballad' میں بڑا مزہ آیا۔

And still they sang together,
As steering o'er the tide
Row on through wind and weather
For ever by my side

دیکھا محبت کتنی طاقت ور ہے، کتنا confidence دیتی ہے۔اپنی محبوبہ کے ساتھ طوفانوں کا مقابلہ کرتا

آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے سفر میں اس سے بڑی شکتی کوئی نہیں کہ آپ کی رفیق حیات زندگی کے سفر میں آپ کی آرزوؤں اور امنگوں aspiration کو share کر کے آپ کے ساتھ ہو۔ راشد صاحب کی عادت تھی اور کمال تھا کہ ہر نظم، ہر سبق، ہر پلے کو زندگی کے حوالے سے پڑھاتے تھے۔

ہمارے نصاب میں ایک ناول گڈ بائی مسٹر چپس بھی تھا۔Good Bye Mr. Chips انگلستان کے ایک پبلک اسکول کے ایک veteran استاد مسٹر چپس کی داستان حیات ہے جو 43 سال تک خدمت بلکہ اسکول سے عشق کے بعد ریٹائر ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی اس نے اس سکول سے ذہنی اور مکانی تعلق رکھا۔ چپس تو خیالی کردار تھا ہوسکتا ہے اس کی بھی کچھ حقیقت ہو۔ راشد صاحب میں ہم نے چپس کو پایا۔ ان کا نک نیم بھی مسٹر چپس پڑ گیا تھا۔ میں یہاں یہ بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے اس ناول کو پڑھایا کیسے؟ انہوں نے کہانی اور داستان سے بات شروع کی۔ پھر انگلش ناول کی تاریخ بیان کی۔ فیلڈنگ، اسکاٹ، جیمس جوائس بے شمار ناول نگاروں کا تذکرہ کیا۔ لیکن جو ناول بطور خاص پڑھنے کو کہے۔ جارج ایلیٹ کا Adam Bede، تھیکرے کا "Vanity fair" ایملی برانٹے کا "Wuthering Heights"، شارلٹ برانٹے کا "Jane Eyre"، ہارڈی کا Tess، جین آسٹین کا "Pride and Prejudice" وغیرہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا پلاٹ بھی مختصراً بیان کیا اور کرداروں کا تعارف کرایا۔ Tom Brown's School Days اور Last Days of Pompeii یہ دو ناول انہوں نے مجھے پڑھنے کو بھی دیئے۔ ایک موقع پر انہوں نے کچھ فرانسیسی ناولوں کا تذکرہ بھی کیا۔ Dumas کے Hunch-back of Notredame وکٹر ہیوگو کا Les Miserables اور فلابیئر کے ناول "مادام بواری" کی بہت تعریف کی۔

مادام بواری کے لئے ان کے دل میں بہت ہمدردی تھی۔ جو محبت اور خلوص میں ماری گئی۔ آخر میں کہا ' لیکن دنیا کے سب سے بڑے ناول روس میں لکھے گئے، گورکی کا 'ماں'، دوستوفسکی کا Brothers Karamozov اور ٹالسٹائی کا War & Peace بطور تاکید پڑھنے کو کہا اور بار بار کہا "زندگی کی کسی منزل میں انسانی سوچ، تخیل کے یہ شاہکار ضرور پڑھنا، تم لوگ زندگی کی ایک نئی awareness پاؤ گے''۔ ٹالسٹائی کے ناول "Anna Karenina" کا یہ پہلا فقرہ جو انہوں نے بورڈ پر لکھا تھا اور کاپی پر نقل کرنے کو کہا تھا مجھے آج بھی یاد ہے ۔ All happy homes resemble one another but each unhappy home, is unhappy in its own way

امریکی ناولوں میں Scarlet, Gone with the wind اور A farewell to Arms,

Old Man & the Sea متعارف کرایا۔ اس طرح یہ سلسلہ چند روز چلتا رہا۔ چونکہ وہ پلاٹ اور خاص خاص episodes بھی سناتے تھے اس لئے دلچسپی قائم رہتی تھی۔ اصل میں وہ خود اتنے involved ہوتے تھے کہ ان کا جوش و جذبہ ہمارے اندر بھی سرایت کر جاتا تھا۔ لیکن بعض لڑکے بور بھی ہوتے تھے۔ ایک آدھ نے پوچھا بھی ''سر کیا یہ امتحان میں آئے گا''؟ انہوں نے جواب دیا ''ہاں زندگی کے امتحان میں''، پھر ایک لمحہ چپ رہنے کے بعد قدرے اداسی سے کہا۔ ''جب گرنے لگو گے تو ان باتوں کو یاد کرو گے۔ زندگی میں سب سے قیمتی awareness فنون لطیفہ خاص طور سے شاعری، فکشن کے مطالعہ سے آتی ہے''۔

'گڈ بائی مسٹر چپس' پر آنے سے پہلے انہوں نے 1382ء سے انگلستان میں پبلک اسکولوں کی تاریخ بیان کی۔ آرنلڈ آف رگبی کا بطور خاص تعارف کرایا جس نے پبلک اسکول سسٹم کو مستحکم کیا۔ فرمایا، organized sports ہاؤس سسٹم اور Prefectorial سسٹم اسی کی اختراعات ہیں۔ برٹش ایمپائر کے عروج و زوال میں پبلک اسکولوں کے کردار پر بحث کی۔ فرمایا ''واٹرلو کی جنگ بیشک ایٹن کے میدانوں میں جیتی گئی اور بقول ای ایم فار سٹر برٹش ایمپائر وہیں ہاری بھی گئی۔ انہوں نے underdeveloped heart کے فقرہ کا حوالہ دیا تھا۔ چپس کی زندگی میں Katherine Bridges کے رول پر بڑی دلچسپ بحث کی۔ کیتھی کا تذکرہ جس انداز سے کیا مسعود نے مجھے آنکھ ماری۔ بعد کو میں نے پوچھا ''تمہیں یہ کیا ہوا تھا''۔ ''ہونا کیا تھا تم نے نوٹ نہیں کیا، راشد صاحب نے کیتھی کا ذکر کس ذوق شوق سے کیا'' ایک روز رات کو ایکسٹرا کلاس لے کر جب وہ شیر شاہ ہاؤس کی طرف جا رہے تھے تو میں نے جسارت کی ''سر! Kathenine Bridges کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' ان کے منہ سے بے اختیار نکلا ''وہ کئی لحاظ سے ideal woman ہے''، پھر بولے، میں تمہارے سوال کا اصل مدعا سمجھ گیا ہوں میں نے Tess اور چپس کی Kathy کی موت پر آنسو بہائے ہیں اور ایک اور پر بھی، ''وہ کون؟'' اداس ہو کر بولے، ''زیر لب'' کی صفیہ جاں نثار اختر۔ کیتھی ایک نئی عورت ہے۔ She is a new woman اس کی خوبی محض یہ نہیں کہ وہ حسین تھی 'talented' ذہین تھی۔ محض یہ صفات کسی کو قابل قدر نہیں بنا سکتیں۔ کیتھی کی اصل خوبی یہ ہے وہ انسان دوست، وطن دوست ہے، وہ چپس سے کہتی ہے کہ "its so important to be influencing those who are going to grow up and matter to the world" اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نے بے رنگ قدامت پسند چپس سے اس لئے شادی نہیں کی کہ وہ اس کی ذات سے متاثر تھی۔ اس نے چپس کو اس لئے پسند کیا کہ وہ بروک فیلڈ کا ہاؤس ماسٹر تھا، استاد تھا۔ اس واسطہ سے وہ ایک نئی دنیا کی تشکیل و تعمیر میں اپنا

رول ادا کرنا چاہتی تھی ۔چپس غریب تو محض ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بن گیا۔ She was a committed woman صرف devotion اور dedication بھی کافی نہیں ہوتا۔چپس کا idealism بہت محدود نوعیت کا تھا۔اسکو وسعت، گہرائی اور روشنی Katherine Bridges نے دی۔اس نے بروک فیلڈ کو humanize کیا اور democratise کیا۔خود ڈسپلن کے معاملہ میں اس نے چپس کی اس طرح راہنمائی کی کہ اس نے بروک فیلڈ کو ایک جدید ترقی پذیر ادارہ بنادیا۔بحیثیت ایک ماہر تعلیم کے کیتھی نے بروک فیلڈ کو نئی dimensions سے آشنا کیا''۔

راشد صاحب نے ناول کے کرداروں پر جو نوٹس لکھوائے ان میں کیتھی کے بارے میں یہ جملہ بھی تھا،

> "She rose on the horizon of Brookfield like a meteor and faded out that soon, leaving behind her a trail of blazing memories."

بقول ان کے وہ تن تارا یا صبح کا تارا تھی۔چپس کی کیتھی کے رول پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے ایک کامیاب انسان کی زندگی میں اس کی رفیقہ زندگی کے رول پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی۔ یہ لیکچر اب انکی کتاب Living with Leadership میں The role that Better Half plays کے عنوان سے شامل ہے۔

میں نے راشد صاحب کے پڑھانے کے اسٹائل کی یہ جھلکیاں اپنی ڈائری اور یادداشتوں سے نقل کی ہیں اور اپنی کلاس کے دوستوں مسعود، تاج، جاوید وغیرہ سے بھی مشورہ کیا۔اس تفصیل کے بغیر کالج کی آئندہ نسلوں اور باہر کے لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے اس کالج کو کیا دیا؟ وہ صحیح معنوں میں ایک creative ٹیچر تھے۔

لیفٹیننٹ محمد زبیر

(کالج نمبر 4404، زمانہ تعلیم 1981-1984ء)

مجھے پڑھنے کی عادت شیر شاہ ہاؤس میں پڑی۔سر راشد نے ہاؤس کی لائبریری میں جو اردو انگریزی کی انسائیکلو پیڈیا رکھوائی ہوئی تھیں، ان سے تحقیقی مطالعہ کا تجربہ ہوا۔لائبریری میں کتابوں کا انتخاب ایسا تھا کہ بہت سی اہم کتابیں جیسے قصص ہند، تزک بابری، کمپنی کی حکومت، حمید الدین کی تاریخ اسلام، سیرت النبی ﷺ، الفاروق، باغ و بہار، توبۃ النصوح، مسدس حالی، وغیرہ میں نے وہیں آٹھویں نویں میں پڑھ لی تھیں۔فیروز سنز کے اردو انسائیکلو پیڈیا کے بھی سینکڑوں صفحے میں نے پی ڈالے تھے۔

جمعہ کی صبح انٹر ڈارم انسپکشن کی بھی بڑی تیاری ہوتی تھی۔ڈارم سپرٹ ہم میں ان مقابلوں ہی سے پیدا

ہوئی۔imagination اور initiative کی تربیت بھی ملی۔جیتنے والی ڈارم کوشیلڈ ملتی تھی اور انفرادی انعامات میں عموماً ہلال کے پرانے پرچے یا دوسرے رسالے ملتے تھے۔ حوصلہ افزائی بہت تھی۔1982-83ء میں جب مَیں نویں میں تھا تو سر راشد نے مجھے انٹر ہاؤس کے انگریزی برجستہ مقابلہ کے لئے تیار کیا۔رات گئے تک دیئے ہوئے عنوانات ڈسکس کرتے رہے۔جان توڑ کر تیاری کروائی جس کی وجہ سے میں سرخرو ہوا۔وہ مقابلہ تو گزر گیا لیکن اس سے جو رویہ ابھرا وہ آج تک میرے ساتھ ہے۔

لیفٹیننٹ ذکاءالحسن

(کالج نمبر4413،زمانہ تعلیم 1984-1981ء)

جب میں شیر شاہ ہاؤس میں تھا تو ہاکی سے میری جنون کی حد تک دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ تقریباً تمام فارغ وقت میں ہاکی کھیلتا رہتا اور کچھ نہیں تو ہاؤس کے میس کی اوٹ میں چھپ کر ہٹ ہی لگاتا رہتا یا پھر ٹیبل ٹینس کے ساتھ چپکا رہتا۔راشد صاحب نے مجھے اس طرح کھیلتے دیکھ کر کہا ''ہاکی لے کر ہاؤس آفس میں آؤ''۔جب میں گیا تو انہوں نے کہا ''جتنی دیر کھیلا ہے اتنی دیر پڑھ کر اسے حلال کرو''۔یہ کہہ کر وہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے تو میں بھی کھسک گیا۔دوسرے دن جمعہ تھا۔انہوں نے پھر آفس میں بلایا اور خود ایک کتاب نکال کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ قصص الہند تھی ''اسکو پڑھنا ہے''۔اس دن وہ خود سامنے بیٹھے رہے۔کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد کہا اب تم جا سکتے ہو۔اگر چاہو تو کتاب لیجا سکتے ہو۔لائبریری کا کھلا کھاتہ تھا جس کا جی چاہے کتاب لے جائے،شرط صرف یہ تھی کہ پریپ کے وقت نہ پڑھے۔

مختصر یہ کہ انہوں نے اسطرح کئی جمعے متواتر اپنے سامنے بٹھا کر کتابیں پڑھوائیں۔پھر تو مزہ پڑ گیا۔دوسری کتاب جو انہوں نے مجھے پڑھنے کو دی وہ ڈاکٹر رؤف کی کتاب ''بچوں کے خطرے'' تھی۔ ہاؤس سے جاتے جاتے میں بے تیغ سپاہی،توبتہ النصوح،اور جہاں دانش پڑھ چکا تھا۔گزشتہ دنوں میں ان سے ملنے گیا اور میں نے خلیل جبران کی کتاب Broken Wings مانگی تو انہوں نے جبران کی ایک اور کتاب Sand and Foam عطا کی۔پڑھنے کی عادت میری طرح بے شمار شیرینز نے راشد صاحب کے شیر شاہ ہاؤس سے پک کی ہوگی۔

لیفٹیننٹ سید خرم حسنین ہمدانی

(کالج نمبر4471،زمانہ تعلیم 1986-1981ء)

میں اور نادر رانا رائڈنگ میں اتنے مگن ہوئے کہ دوسرے کھیلوں کو ڈاج ہی کرنے لگے۔ سر راشد نے ہماری یہ حرکت نوٹ کی اور ہم دونوں کو آفس میں بلا کر ایک لمبا لیکچر پلایا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں کیرئیر کی ضروریات کے پیش نظر دوسرے ٹیم کھیل بھی ضرور کھیلنے چاہئیں۔ پھر انہوں نے ٹیم کھیلوں کی اہمیت کی بھی وضاحت کی۔ اس طرح میں اردو تقریر میں ذرا آگے نکلا تو انہوں نے کہا کہ اب تم انگریزی پر ارتکاز کرو تا کہ اس میں بھی مہارت حاصل ہو جائے۔

جی سی سہیل فاروق

(کالج نمبر 4521، زمانہ تعلیم 1987-1982ء)

سہیل: سر، ایک بار آپ ہی نے کہا تھا کہ آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔

سر راشد: جی ہاں، اور تہذیبی عمل میں ماحول کو بڑا دخل ہوتا ہے خصوصاً ابتدائی ماحول کو۔

سہیل: سر، اسی حوالے سے میں آپ کی ذاتی زندگی اور شخصیت پر کچھ گفتگو کرنا چاہوں گا۔

سر راشد: سہیل، تم نے میری ذاتی زندگی میں دلچسپی ظاہر کی ہے وہ بھی ٹھیک ہے لیکن اصل چیز شخصیت اور اس کا ارتقا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنے سوالوں کا رخ شخصیت کی طرف رکھو۔ اس انٹرویو کے لئے میں راضی نہ ہوتا چونکہ میں اپنے آپ کو اتنا اہم نہیں سمجھتا کہ انٹرویو کا موضوع بنوں۔ بہر حال اگر میری زندگی کے حالات و واقعات سے کوئی کچھ سیکھ سکتا ہے تو میں اسے اپنی خوش بختی سمجھوں گا۔

سہیل: پہلے تو چند سوانحی باتیں کہ آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے، کس ماحول میں پرورش پائی۔ نسل و خاندان، آباواجداد کا تعارف بھی کرائیں۔

سر راشد: سہیل تم نے ایک سانس میں بہت سے سوال پوچھ لئے ہیں جن میں سے ہر سوال توجہ طلب ہے۔ بہر حال میں منطقی ترتیب سے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

سہیل: سر آپ جس طرح جواب دینا مناسب سمجھیں۔ مقصود تو آپ کی شخصیت کا ارتقائی مطالعہ ہے۔

سر راشد: میری تاریخ پیدائش 20 جنوری 1927ء کی ہے اگر تمہیں ستاروں اور برجوں سے دلچسپی ہے تو میرا برج دلو اور جدی ہے۔ گو میرا اپنا یقین ان چیزوں پر نہیں۔

سہیل: کیوں؟

سرراشد: اس لئے کہ پامسٹری ہو یا علم النجوم (Astrology) یہ انسانی شخصیت کی نفی کرتے ہیں۔ میں predetermination کے تصور کو انسانی خودی کی نفی سمجھتا ہوں۔ میں نے کبھی ان چیزوں کو اہمیت نہیں دی۔ 'نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں'۔ گو شرط مردِ مومن کی ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ ہندوستان میں سائمن کمیشن کی آمد کا بنتا ہے جس کے بعد سے ہندوستان کے سیاسی افق پر تیزی سے تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ 30 دسمبر 1930ء علامہ کے خطبہ پاکستان کی تاریخ ہے۔ اس طرح میرا بچپن کا زمانہ تحریک پاکستان کی inception کا دور تھا۔

میرے بھائی صدیق الرحمٰن نے بریلی کے محلّہ شہامت گنج کی ایک مسجد میں کئی برس جمعہ کی نماز کی امامت کی۔ ٹوپیاں سی کر گزارا کرتے تھے۔ دو پیسے کی ٹوپی دیتے تھے آدھا پیسہ منافع لیتے تھے۔ بتا کر دیتے تھے کہ اتنی لاگت ہے اتنا منافع ہے۔ میرے بچپن میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی نورانی صورت اب بھی میری نگاہوں میں پھرتی ہے۔

سہیل: اپنے بچپن کے ماحول کے بارے میں کچھ روشنی ڈالیں۔ کوئی ایسا واقعہ بھی جس سے آپ کی طبیعت کے میلان یا صلاحیت کے بارے میں پتہ چلتا ہو۔

سرراشد: بریلی میں کبوتر بازی اور پتنگ بازی کا عام رواج تھا۔ ہمارے گھر میں بھی کبوتر ہوتے تھے اور لڑائے بھی جاتے تھے۔ ہمارے پاس آرائشی کبوتر بھی تھے۔ جیسے لقا کبوتر یا شیرازی، مجھے لقے کبوتر پسند تھے۔ مجھے کبوتر بازی کا تو نہیں لیکن پتنگ بازی کا شوق ضرور تھا۔ پیچ بھی لڑاتا تھا لیکن اپنے بھائیوں کے مقابلہ میں اس میدان میں میری مہارت بہت کم تھی۔ جب میں پرائمری میں تھا تو بڑے بھائی خالق بھائی نے میرے ایک اردو کے مضمون کو دیکھ کر پیش گوئی کی کہ سعید ایک دن ادیب بنے گا۔ ہم جس کوٹھی میں رہتے تھے یہ واقعہ اس کے برآمدہ کا ہے۔ جس کے پاس دیوار کے ساتھ گل جھمکا جسے ہم درخت دولھا کہتے تھے کی سدا بہار بیل لگی تھی۔ یہ منظر آج بھی میری آنکھوں میں پھرتا ہے۔ اس تجربہ کی بنا پر میں شدت سے یقین رکھتا ہوں حوصلہ افزائی تریاق کا اثر رکھتی ہے۔ میں بچپن میں خاصا کم رو اور کم زور تھا۔ میں پانچ بھائیوں کے گھر میں چھوٹا بچہ تھا اور دیکھنے میں کمزور اور غیر دلکش اس لئے جب کوئی مہمان گھر میں آتا تو میرے اوپر چادر ڈال دی جاتی۔ مجھے میری انا اکبری

نے بڑے پیار سے پرورش کیا۔ جب میں 1956ء میں آخری بار بریلی گیا تو اس انا کے گھر کو تلاش کر کے اور اس کی چوکھٹ کو ہاتھ لگا کر واپس آیا۔ اب میرا خیال ہے کہ اپنی کم روئی اور کمزوری کی وجہ سے میں احساس کمتری کا شکار ہو گیا تھا۔ میرے بڑے بھائی نے بروقت میرا دل بڑھایا اور میں نے پڑھائی میں راہِ فرار ڈھونڈی۔ تمام زندگی میرا رویہ یہ رہا ہے کہ 'مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی' اس کی تہہ میں یہی ذاتی تجربہ ہے۔ انسان کی اپنی تدبیر کاری، حوصلہ اور پر یقین جدوجہد میں میرا بڑا faith ہے۔ ''لیس الا نسان الا ما سعی'' میرے لئے حق الیقین کا درجہ رکھتا ہے۔ اور وتواصو ا بالحق و تواصو بالصبر بھی۔

سہیل: آپ کے والدین نے آپ کے بارے میں کیا سوچا تھا یعنی وہ آپ کو مستقبل میں کیا دیکھنا چاہتے تھے؟

سر راشد: گھر میں چونکہ علم کی روایت موجود تھی اس لئے میں بھی اس ڈگر پر چل نکلا۔ والدین نے یا گھر میں کسی اور نے کیریر پلاننگ کی بات نہیں کی۔ میرے سب سے بڑے بھائی مولوی عبدالحق چونکہ زبان و ادب سے شغف رکھتے تھے اور ان کے پاس 'نگار نو'، 'صدق' 'نیرنگ خیال' کاروان، ہمایوں جیسے علمی ادبی رسالے آتے تھے، مجھے بھی لکھنے سے دلچسپی ہوئی اور اسلامیہ اسکول کے چند جید اساتذہ محسن صاحب، مبارک صاحب، ڈاکٹر سبزواری وغیرہ کو دیکھ کر از خود استاد بننے کا شوق پیدا ہوا۔

سہیل: بریلی میں ہندو اور سکھ بھی ہوں گے۔ ان کے ہونے سے آپ کے ذہن نے کیا اثر قبول کیا؟

سر راشد: بریلی میں آدھی سے زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی سکھ نہ ہونے کے برابر تھے۔ ہماری گلی میں اونچے درجہ کے آریہ سماجی ہندو رہتے تھے۔ ایک بار میں گلی سے ننگے سر گزر رہا تھا تو ایک آریہ سماجی بزرگ نے مجھے روک کر کہا ''میاں جی۔ آپ کے گھرانے میں کوئی ننگے سر نہیں رہتا''۔ بریلی کے بڑے بازار میں جو تقریباً ایک میل لمبا تھا زیادہ تر دکانیں ہندوؤں کی تھیں۔ ایک روز میں مدرسہ مصباح العلوم سے آمد نامہ پڑھ کر نکلا تو میں نے دیکھا کہ ایک ہندو لڑکا لٹیا سے ایک مسلمان بچہ کو پانی پلا رہا ہے۔ وہ اوک سے پانی پی رہا تھا اتنے میں اس کا باپ دکان کے اندر سے نکلا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا بیٹا ایک مسلمان بچہ کو لٹیا سے پانی پلا رہا

ہے گر جا، ''ابے مُسلے کو پلا رہا ہے۔ پانی تو بھرشٹ (ناپاک) ہوگیا''۔ بیٹے نے کہا ''میں نے پانی اوپر سے ڈالا تھا''۔ باپ نے ناراض ہو کر کہا ''گدھے دھار تو مل گئی''۔ یہ واقعہ اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ یہ واقعہ 36-1935ء کا ہے۔ دوقومی نظریئے سے یہ میرا پہلا لاشعوری تعارف تھا۔اس واقعہ میں بہت سی باتیں ہیں۔ تحریک پاکستان میں جو مذہبی،معاشی اور معاشرتی عوامل کارفرما تھے انکی غمازی بھی اس واقعہ سے ہوتی ہے۔اس سے میں لاشعوری طور پر پاکستانی بن گیا تھا۔

سہیل: بچپن میں کبھی ڈانٹ پڑی؟ یا سزا ملی۔ اگر ملی تو کس بات پر؟

سرراشد: ہمارے گھر کے ایک حصے میں پکی شکر بنانے کا کارخانہ تھا جس میں پندرہ بیس نیچی ذات کے ہندو جو دھیر کہلاتے تھے کام کرتے تھے۔ ان میں ایک پرانا ملازم پوپی نامی تھا جس کو ہم بابا جی کہا کرتے تھے۔اس کو میں نے ایک دن پوپی کہہ کر پکارا تو دادا نے پہلی دھپ لگائی اور ڈانٹا کہ گھر کے بزرگ ملازموں کا نام نہیں لیا کرتے۔ ایک دلچسپ شخصیت خاندانی حجام کی تھی۔ مجید نام تھا۔ہم خلیفہ جی کہتے تھے۔ مجید روایتی حجاموں کی طرح بہت چرب زبان تھا۔قینچی سے زیادہ تیز اس کی زبان چلتی تھی لیکن پڑھا لکھا تھا۔ چھ برس کی عمر میں پہلے پہل شعر اسی کی زبانی سنے۔اس کا ایک محبوب شعر جو وہ اکثر سنایا کرتا تھا۔

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

خلیفہ مجید ایک اور شعر بھی سنایا کرتا تھا

بلبل نے چمن سے آشیاں اُٹھا لیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

خلیفہ کو بہت سے مزاحیہ شعر بھی یاد تھے قصہ چہار درویش بھی از بر تھا۔سہیل،غور کرو انسان کے رویوں،قدروں اور ذوق کی نشو ونما کس طرح ابتدائی ماحول میں کتنے لامحسوس طریقے سے ہوتی ہے۔ اقبال کا سخت کوشی کا فلسفہ تو برسہا برس بعد پڑھا اس کی بنیاد خلیفہ مجید کے سنائے ہوئے اس شعر کہ:

دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

نے رکھی تھی۔ میں خلیفہ کو اپنے اولین استادوں اور محسنوں میں شمار کرتا ہوں۔حق مغفرت

کرے۔

سہیل: زندگی کے بارے میں آپ کے بنیادی نظریات کب مرتب ہوئے؟ ان میں اس عرصے میں کوئی توڑ پھوڑ بھی ہوئی؟ نوجوانی کو انتہا پسندی کا دور بھی کہا جاتا ہے۔آپ جوانی میں جنون کی حد تک کسی شوق یا کسی قسم کے extremism سے دوچار ہوئے؟

سر راشد: آٹھویں درجے تک میں عملاً بھی کٹر مذہبی تھا۔ مسجد میں اذان دینا، صبح سویرے صفیں بچھانا، وضو کے لئے پانی بھرنا، مسجد کی صفائی کرنا روز کا معمول تھا۔ تمام مذہبی جلسے جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ آٹھویں جماعت تک ہوش سنبھالنے کے بعد کوئی نماز قضا نہیں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی کے درس قرآن میں بھی شریک ہوا۔ اسکے بعد روایتی مذہبیت میں کمی آ گئی۔

سہیل: کیوں؟

سر راشد: نوجوانی میں جب ذہن بیدار ہوتا ہے تو ایک دور تشکیک اور روایت سے بغاوت کا آتا ہے۔اس دور سے میں بھی گزرا۔ایک عرصے تک تشکیک کے صحرا میں بھٹکنے کے بعد اب مجھے یقین کی چھاؤں میسر آ گئی ہے۔**الحمدللّٰہ**۔مَیں سیاسی یا سماجی طور پر انقلابی نہیں ہوں، میرا ذاتی رجحان conformity کی طرف ہے۔گو تعلیم میں، divergence کو ضروری سمجھتا ہوں ذہنی تربیت کے لئے۔

سہیل بریلی مذہبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔آپ کا کسی تحریک سے واسطہ یا تعلق رہا ہے؟

سر راشد بریلی دینی تعلیم کا مرکز بھی تھا۔احمد رضا خان بریلوی کا مزار اور مدرسہ محلّہ ذخیرہ میں ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا۔اس کے علاوہ ہمارے محلّہ میں دیو بندی مسلک کا مدرسہ، مدرسہ مصباح العلوم اور کچھ فاصلہ پر ایک معروف بڑا مدرسہ، مدرسہ اشاعت العلوم بھی تھا۔ان کے علاوہ بھی پرانے شہر میں کئی دینی مدرسہ جات تھے۔اہل تشیع کی خاصی آبادی تھی۔ بہت سے دوست اسی مسلک کے تھے ان کی مجلسوں میں بھی جاتا تھا۔ بریلی میں محلّہ قطب میں شاہ نیاز احمد کا مزار بھی مرجع خاص و عام تھا۔میرے لڑکپن میں شاہ نیاز احمد کے بیٹے ننھے میاں وفات پا چکے تھے۔ان کے بیٹے عزیز میاں سجادہ نشین تھے۔شاہ نیاز احمد صاحب سے میرے چند استاد جنیدی صاحب وغیرہ بڑی عقیدت رکھتے تھے۔وہاں سالانہ عرس بھی ہوتا تھا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارا گھرانا ایک مذہبی گھرانا تھا۔میرے نانا مرحوم حضرت

اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مجاز تھے۔ میرے ماموں غمیت اللہ صدیقی ہمہ صفت موصوف تھے۔ میں ہائی سکول میں تھا کہ انھوں نے تبلیغی جماعت کا تعارف کرایا۔حضرت مولانا الیاس صاحب سے انہیں نیاز حاصل تھا۔تبلیغی جماعت نے میوات سے اپنا تبلیغی کام شروع کیا تھا۔ ماموں جان نے ایک واقعہ سنایا تھا جو آج تک میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ کہتے تھے ایک بار میں تبلیغی جماعت کے ساتھ باہر گیا ہوا تھا۔گاؤں کے معزز مسلمان نمبر دار نے ہمیں اپنے کچے مکان کے برآمدہ میں ٹھہرایا ہوا تھا۔ برسات کے دن، مغرب کا وقت گھٹا جھوم کر اٹھی اور پلک جھپکتے میں موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ اتنے میں صاحب خانہ کے بچے باہر آ گئے اور خوشی سے ناچ ناچ کر گانے لگے۔''برسو رام جھڑا کے سے، برسو رام جھڑا کے سے''۔ اگر حضرت مولانا الیاس بروقت اپنی تبلیغ شروع نہ کرتے تو میوات کے علاقہ کے گاؤں کے گاؤں اسلام سے مطلق بیگانہ رہتے ۔کلمہ بھی وہاں کسی کسی کو آتا تھا۔ میں 1942ء میں جب آٹھوں درجے میں تھا تو جماعت اسلامی کے ہفتہ وار درس میں بھی کبھی کبھار جایا کرتا تھا۔اعظم گڑھ کے مشہور مدرستہ الاصلاح کے مولانا فراہی کے ایک شاگرد اور جید عالم دین مولانا جلیل احسن اصلاحی درس دیتے تھے۔مولانا اصلاحی بعد کو ہمارے چچا کے مکان میں ہی رہنے لگے تھے۔ان سے بھی اکثر نیاز حاصل ہوتا رہتا تھا۔

ہمارے ہاں اس زمانے کے مشہور دینی رسالہ 'الفرقان' کے مدیر مولانا محمد منظور نعمانی بھی اکثر تشریف لاتے رہتے تھے۔ چونکہ میرے بڑے بھائی عبدالحق انجمن اشاعت السنہ کے سیکریٹری تھے جس کا دفتر بھی ہمارے ہاں ہی تھا۔مولانا نعمانی کی بزرگی کا ایک بہت ہی خوش گوار تاثر میرے ذہن پر ہے۔ میرے بچپن میں معروف نعت گو شاعر جناب بہزاد لکھنوی میرے دادا مرحوم حافظ محمد یعقوب کے یہاں آئے تو ہماری کوٹھی پر بھی تشریف لائے۔ میرے بڑے بھائی عبدالحق مرحوم ان سے رسم و راہ رکھتے تھے۔ 1937-38ء کی بہزاد صاحب کی تصویر میرے ذہن میں محفوظ ہے۔شیروانی کے اوپر گلابی کپڑے کی ایک دھجی سلنگ کے طور پر پڑی ہوئی تھی جس پر وہ مستقل ہاتھ پھیرتے رہتے تھے۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ ان کو اختلاج کی شکایت ہے۔ چند سال بعد جب میں اسلامیہ ہائی اسکول بریلی میں پڑھ رہا تھا اور شعر و شاعری کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تو کسی نے

رازداری سے بتایا کہ یہ جنون ان کے کسی ناکام عشق کی یادگار ہے۔

اسی راوی نے یہ بھی بتایا کہ انہیں لکھنو میں ایک ہندو ماہ جبیں سے عشق ہو گیا تھا یہ اس کا شاخسانہ ہے۔ بہر حال فی البدیہ مسلسل شعر کہتے میں نے انہی کو سنا۔ ایک روز صبح وہ ہمارے ہاں آئے، ہمارے خاندانی حجام مجید نے ان کا خط بنانا شروع کیا۔ (فرنچ کٹ داڑھی تھی) مجید خط بنا رہا تھا اور ان کا ہاتھ دجھی پر مسلسل گردش کر رہا تھا۔ وہ مسلسل شعر کہہ رہے تھے۔ بڑے بھائی صاحب قریب بیٹھے وہ اشعار قلم بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہزاد صاحب مسلسل پان کھاتے تھے۔ جب وہ آتے تو فوراً پانوں کی ڈھولی (جس میں سو سے اوپر پان ہوتے تھے) منگوائی جاتی۔ میں پان برداری کرتا۔ اس طرح ان کے قریب رہنے کا موقع ملتا۔ ایک روز بہزاد صاحب کی داداجان کے دیوان خانے میں آنے کی اطلاع ملی تو میں بھاگ کر وہاں پہنچا۔ بہزاد صاحب کوئی نعت سنا رہے تھے۔ اسکے بعد دادا نے کوئی غزل سنانے کی فرمائش کی تو بہزاد صاحب نے معذرت کی۔ ''نعت کے بعد غزل پڑھنے کی جسارت نہیں کر سکتا''۔ یہ 1947ء سے چند سال پہلے کی بات ہے۔ بہزاد صاحب پر اس وقت تک جذب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ شاید شاہ نیاز احمد کے عرس کے موقع پر بریلی تشریف لائے تھے۔ دادا جان ہی کے ہاں ایک بار ساغر نظامی کو دیکھا۔ وہ اس زمانہ میں اپنے رسالہ ایشیا کے ایڈیٹر تھے۔ وہ بھی شاہ نیاز احمد بریلوی کے نیاز مندوں میں سے تھے۔

1944ء کے لگ بھگ مجھے بریلی کالج میں اپنے استاد جناب پروفیسر خلیق احمد کے توسط سے جناب روش صدیقی سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ اس زمانے میں مَیں تنقیدی مضامین لکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ روش صدیقی سے بعد کو کافی یاد اللہ رہی۔ ان کا کلام پڑھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ خیال انگیز رومانی نظمیں خوب لکھتے اور پڑھتے تحتُ الفظ لیکن بہت موثر انداز سے۔ انہوں نے اپنی چند نظمیں 'ابدی خواب' اور 'مردشب' اپنے ہاتھ سے لکھ کر مجھے دی تھیں۔ ان کے مجموعہ کلام 'محراب غزل' کی بہت سے غزلیں میں نے ان سے خلیق صاحب کے ہاں ہی سنیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین پر رشید صاحب کی کتاب 'ذاکر صاحب' میں پڑھ چکا تھا۔ روش صدیقی صاحب نے بھی ذاکر صاحب کے بارے میں یہ واقعہ سنایا جس نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ ایک بار جب وہ ذاکر صاحب سے ملنے ان

کے گھر او کھلہ نگر گئے تو ان کو باہر آنے میں دیر لگی۔ان کی بیٹی سعیدہ نے بتایا کہ ابا کپڑے دھور ہے ہیں۔ایک جوڑا پہنے ہوئے تھے دوسرا دھور ہے تھے اللہ اللہ۔روش صدیقی ہی نے 1946ء میں مجھے جامعہ کی جوبلی کے خطابات اور عبدالغفار مدھولی کی کتاب جو جامعہ کے شب روز کی تاریخ تھی دی۔انہی نے مجھے ڈاکٹر عابد حسین کی کتاب 'نفسیات عنفوان شباب' بھی دہلی سے منگوا کر دی تھی۔میں یہ اس لئے بتا رہا ہوں کہ میں ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات اور قومی جذبہ سے بے حد متاثر رہا ہوں۔انہی کی وجہ سے میں نے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ان کی کتاب تعلیمی خطبات کو میں نے ایک صحیفہ کے طور پر بار بار پڑھا ہے۔میں ان کا اتنا fan ہوگیا تھا کہ 1946ء میں جب میں انٹرمیڈیٹ میں تھا تو میں نے سر میں بیچ سے مانگ نکالنا شروع کی چونکہ ذاکر صاحب بھی بیچ سے مانگ نکالتے تھے۔ذاکر صاحب پر رشید احمد صدیقی نے پوری ایک کتاب لکھی ہے۔ذاکر صاحب کی سیاست کو چھوڑ کر میں ان کے نظریہ تعلیم وتربیت، قدروں، رویوں اور لائف سٹائل سے بہت متاثر رہا ہوں بلکہ ان سے inspiration لیا ہے۔اقبال کے آئیڈیل انسان کو کم از کم میں نے ان کے حوالے سے پہچانا۔خطبات میں ان کا جو اندازِ تحریر ہے اس کو میں نے اپنانے کی کوشش کی۔تعلیم میں ذاکر صاحب کی خلافت خواجہ غلام السیدین کے پاس تھی۔ان کی کتاب Faith of An Educationist جو ان کے یونیسکو کے لیکچرز کا مجموعہ ہے اور 'Iqbal's Educational Philosophy' نے بھی میرے تعلیمی نظریات اور تجربات کو بہت متاثر کیا ہے۔

سہیل: آپ نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟

سر راشد: میری رسمی تعلیم کی ابتدا اس زمانہ کے دستور کے مطابق قاعدہ بغدادی سے ہوئی تھی۔قرآن شریف کے ساتھ ساتھ راہ نجات بھی پڑھی۔یہ مسئلہ مسائل کی کتاب تھی۔اس کے بعد مدرسہ مصباح العلوم کے مولوی احمد سعید صاحب سے فارسی پڑھی۔پورب کے علاقے کے سیدھے سادے بزرگ تھے۔پھر مدرسہ مصباح العلوم میں حافظ حضور سے قرآن پڑھا۔اس دور کی صرف ایک بات یاد ہے کہ عید، بقرعید پر نیلے چکنے کاغذ پر سنہری حروف میں چھپی عیدی دیتے تھے۔جس کے جواب میں گھر سے آٹھ آنے لا کر ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ان ہی کے درس میں یہ قصہ بھی سنا کہ ایک جن زادہ ان سے قرآن شریف

پڑھنے آتا تھا۔ ایک رات کوانہوں نے اس سے چراغ کی لوتیز کرنے کو کہا۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے انگلی سے بتی کی لوتیز کر دی۔ جب دوسرے بچوں نے اس کی انگلی چار پانچ گز لمبی ہوتی دیکھی توان کی چیخیں نکل گئیں۔ یہ واقعہ میرے سامنے کا نہیں ویسے ہمارے حافظ حضور احمد صاحب میں اور کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کرامت ظاہر ہوتی ہو۔ جب بھی کوئی افسر معائنہ کے لئے آتا تو وہ کہتے رجسٹر جلد بند ھنے گیا ہوا ہے۔ ان کا یہ جھوٹ وہ پہلا صدمہ تھا جو باہر کی دنیا نے مجھے پہنچایا۔ آج میں اسے درگزر کرنے پر آمادہ ہوں، پتہ نہیں کیا حالات تھے کہ وہ رجسٹر نہیں دکھاتے تھے۔ لیکن اسوقت میرے کچے یا صاف ذہن نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔

بریلی کی مشہور چوراہے کی مسجد کے ایک گوشے میں مدرسہ تجوید القرآن تھا۔ وہاں کچھ عرصے قاضی احسان الحق سے تجوید کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ان دنوں میرا زیادہ وقت ان کے گھر آتے جاتے اور ان کی بیمار بیوی کی دوا لاتے گزرتا تھا۔ استاد کی شفقت اور حوصلہ افزائی کا پہلا تجربہ مجھے قاری صاحب اور ان کی بیگم کے حوالے سے ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائی عمر میں غیر معمولی شخصیتوں سے واسطہ پڑنا ideals بنانے اور قدروں اور رویوں (attitudes) کی تشکیل کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے۔ پرائمری کی تعلیم میں نے کوتوالی سکول میں حاصل کی۔ یہاں کے ایک ہندو استاد ایشوری پرشاد اور ہیڈ ماسٹر مشتاق حسین صاحب نے مجھ پر خصوصی توجہ دی۔ اردو کا خط مشتاق صاحب نے بڑی بیدردی سے سزائیں دے کے ٹھیک کرایا۔ ایشوری پرشاد اپنے گھر بلا کر پڑھاتے تھے۔ یہ 1937ء سے پہلے کا قصہ ہے۔ 1937ء میں، میں اسلامیہ ہائی اسکول بریلی میں داخل ہوا جو نواب رام پور کی عطیہ کردہ عمارت اور زمین پر قائم ہوا تھا۔ یہاں پر میں نے اردو کے استاد محسن صاحب سے بہت فیض حاصل کیا۔ انہیں جوش کی بہت سی نظمیں یاد تھیں۔ کبھی کبھی بڑے ترنم سے سناتے۔ جوش کی نظم 'جنگل کی شہزادی' پہلے ان ہی سے سنی تھی۔ اس دور میں بریلی مشاعروں کا شہر تھا، اسلامیہ اسکول جو بعد کو کالج بنا اور بریلی کالج کے علاوہ محلّہ محلّہ مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ بریلی کی مشہور وسالانہ نمائش کے موقع پر بہت بڑا مشاعرہ ہوتا تھا۔ جو صبح تک جاری رہتا۔ اس میں جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی، فراق گورکھپوری، روش صدیقی، ساغر نظامی، بہزاد لکھنوی، دل شاد جہانپوری کو بار ہا سنا۔

جگر کا ترنم اور پڑھنے کا انداز والہانہ تھا، جگر کی مشہور غزل۔

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں
خرام رنگیں، نظام رنگیں، پیام رنگیں کلام رنگیں
قدم قدم پر روش روش پر نئے گل کھلا رہے ہیں
تمام رعنائیوں کے منظر، تمام رنگینیوں کے مظہر
سنبھل سنبھل کر سمٹ سمٹ کر سب ایک مرکز پر آ رہے ہیں

وہیں ایک مشاعرہ میں سنی تھی۔ لیکن آخر آخر کا رنگ یہ تھا

جہل فرد نے دن یہ دکھائے گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت روح اگر تسکین نہ پائے

جوش تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ اس زمانہ میں ان کی نظم 'شکست زندان کا خواب' بار بار سنی جاتی تھی۔

سہیل: سر! اس نظم کا ذکر علوی صاحب نے بھی کیا ہے، اگر ایک آدھ مصرعہ یاد ہو تو عطا فرمایئے۔

سر راشد پہلے تو از بر تھی۔۔۔ذہن پر زور ڈالتا ہوں۔۔۔۔۔سنو۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے ، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا ، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لبوں کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے ،بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعبیریں
کیا ان کو خبر تھی زیرو زبر رکھتے تھے جو روح ِ ملت کو
اُبلیں گے زمین سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں

کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے ہیں
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ قیدی چھوڑ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

بریلی کے مقامی شعرا شیوا بریلوی وغیرہ کے علاوہ محشر بدایونی، بدایوں سے مشاعرہ پڑھنے اکثر آتے تھے۔ مشاعرے اکثر ہوتے تھے، ہمارے محلّہ کے ایک طرحی مشاعرہ کا مصرعہ طرح تھا۔

دنیا سے جا رہا ہوں دنیا لئے ہوئے

بریلی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کا مرکز بھی تھا، آئے دن جلسے جلوس نکلتے تھے۔ 1938ء کے اوائل میں شہید گنج کی بازیابی کے سلسلہ میں بچوں کے ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے میں موٹر کے ایک حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ حادثہ بریلی کی کوتوالی کے عین سامنے پیش آیا تھا اور وہ کار جس کے نیچے میں آ گیا تھا، بریلی چھاونی کے اسٹیشن کمانڈر کی تھی جس کا نمبر 1221 تھا۔

سہیل: سر، آپ میں پاکستانی قوم پرستی جسے آپ پاکستانیت کہتے ہیں کا جذبہ بہت شدید ہے۔

سر راشد: یہ میری پہلی محبت ہے۔

سہیل: سر، اس کا پس منظر کیا ہے؟

سر راشد: انسان کا ذہن ان تمام تجربات سے اثر قبول کرتا ہے جن سے وہ گزرتا ہے۔ میں نے بچپن میں مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمان سیوہاری، مولانا حسیب الرحمان لدھیانوی، مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کو مدرسہ مصباح العلوم یا مدرسہ اشاعت العلوم کے جلسوں میں سنا۔ یہ علما صرف عالم دین ہی نہیں بلکہ بہت اچھے مقرر بھی تھے عطا اللہ شاہ بخاری کی سحر بیانی اور ظفر علی خان کی شعلہ فشانی کا تاثر اب بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ مولانا حفظ الرحمان کی کتاب 'اسلام کا اقتصادی نظام' اس وقت پڑھی تھی جب

میں دسویں درجہ میں تھا۔ایک بار مشہور انقلابی عالم دین مولانا عبید اللہ سندھی کو بھی پرانے شہر کی مسجد میں سنا۔ جامع مسجد ہمارے گھر سے تین چار میل دور تھی۔ یہ تقریر سننے کے لئے ہم عشا کے بعد پیدل وہاں گئے تھے۔مولانا سندھی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔انہوں نے شاہ ولی اللہ کے سیاسی معاشرتی اور معاشی فلسفہ کو اپنی فکر کا موضوع بنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی فکری تاریخ شاہ ولی سے شروع کی جانی چاہیے۔وہ بہت بڑے مفکر، مدبر اور مجدّد تھے۔تحریک پاکستان کے زمانہ میں بریلی میں بہت بڑے بڑے جلوس نکلتے تھے اور جلسے ہوتے تھے۔ 47-1946ء کے بعد کے زمانہ میں وہاں ہندو مسلم فسادات بہت کثرت سے ہونے لگے تھے۔مسلمان بچے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔''لے کے رہیں گے پاکستان، بن کے رہے گا پاکستان''۔مکانوں کی بیرونی دیواریں بھی پاکستان کے نعروں سے سیاہ نظر آتی تھیں۔میرے قوم پرستی کے جذبہ کی تعمیر و تشکیل میں اسلامیہ کالج بریلی کا بھی بڑا حصہ ہے۔اسلامیہ انٹر کالج میں اس وقت یعنی 46-1940ء کے زمانہ میں جنیدی صاحب پاکستان کے شیدائی تھے۔سفید پائجامے کے ساتھ شیروانی پہن کر آتے تھے۔گویا سراپا پاکستان کا پرچم تھے۔بڑے اسمارٹ اور ذہین انسان تھے۔ایک دو اور استاد سید واصف علی اور حسیب صاحب بھی کٹر پاکستانی تھے۔اس دور میں خواجہ احمد فاروقی اور شوکت سبزواری اردو کے لیکچرر تھے۔دونوں نے بعد کو ادب میں ڈاکٹریٹ کی۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے دہلی یونیورسٹی سے اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ڈھاکہ یونیورسٹی میں اردو پر بڑا کام کیا۔60ء میں کراچی آ گئے تھے اور اردو لغت کی مجلس سے وابستہ ہو گئے۔ڈاکٹر شوکت سبزواری جینئس قسم کے آدمی تھے۔سنسکرت پر بھی بڑا عبور تھا۔اردو لسانیات پر ان کا کام کلاسیکی اہمیت رکھتا ہے۔میرا ادبی اور علمی ذوق جیسا کچھ بھی ہے، اس کو پروان چڑھانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔نام میں راشد کا جز وانہیں کی نظر کرم کا نتیجہ ہے۔انہی کی حوصلہ افزائی سے میں نے 1944ء سے ادبی مضامین لکھنا شروع کر دیئے تھے۔انٹر میں انگریزی میں نے مبارک حسین صاحب سے پڑھی۔لکھنو کے تھے۔لکھنو کی نزاکتوں کا کچھ اندازہ ان ہی کو دیکھ کر ہوا۔انگریزی پڑھاتے وقت لکھنوی شعرا کے موزوں شعر سناتے جاتے تھے اور بڑے ذوق شوق سے پڑھاتے تھے۔اس زمانے میں اسلامیہ انٹر کالج میں لڑکوں کی ایک پارلیمنٹ بھی تھی باقاعدہ الیکشن ہوتے

تھے۔ مختلف محکموں کے وزیر منتخب ہوتے تھے اور اساتذہ طالب علم وزیروں کے سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ عبادت یار خان کسی شعبہ کے وزیر تھے۔ ایک استاد ہاشم صاحب ان کے سیکرٹری تھے اور اپنی سیاہ شیروانی میں اپنے وزیر صاحب کے پیچھے بیٹھتے تھے۔ ہمارے دو استاد حسیب صاحب اور نقوی صاحب نمایاں طور پر بلند قامت تھے۔ کم از کم ساڑھے چھ فٹ کے ہونگے۔ دونوں کالج کی کرکٹ ٹیم کے اوپنرز تھے اور خوب چوکے چھکے لگاتے تھے۔ اس وقت کالج کی ٹیم علاقے کی بہترین کرکٹ ٹیم تھی۔ ہاکی ٹیم بھی بہت اچھی تھی۔

اب میرا خیال ہے کہ کسی ادارہ میں مختلف شعبوں میں غیر معمولی (outstanding) قسم کی شخصیتوں کا موجود ہونا طلبا کی شخصیتوں کو جلا بخشتا ہے اور انہیں ان کے حوالے سے اپنے آپ کو دریافت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اسلامیہ کالج بریلی کے استادوں میں قبلہ سید واصف علی صاحب بھی احسان مندی کے جذبات کے ساتھ یاد آتے ہیں۔ 1948ء میں مَیں نے بریلی کالج بریلی سے انگریزی ادب کے ساتھ بی اے کیا۔ بی اے میں انگریزی ڈراما ڈاکٹر داس گپتا پڑھاتے تھے۔ علم میں دریا نہیں سمندر تھے اور اس سے زیادہ پروقار (graceful) شخصیت تھی۔ انہی نے مجھے نارویجن ڈراما نگار ابسن سے متعارف کرایا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر پڑھاتے تھے اور میری نشست بالکل قریب تھی۔ میں سحر زدہ ہو کر ان کی انگریزی سنتا تھا۔ اس توجہ اور انہاک کی وجہ سے میں کبھی کبھی ان کا پورا لیکچر reproduce کر سکتا تھا۔ یہ ان کا فیض تھا کہ مجھے انگریزی زبان و ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی اور میں انگریزی میں چار کتابیں لکھ سکا۔ میرے دل سے ان کے لئے دعا نکلتی ہے۔ بریلی کالج کے استادوں میں جوہری صاحب انگریزی شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کو اس حوالے سے ہم حیرت سے دیکھتے تھے۔ بڑا شاعرانہ اور فنکارانہ مزاج پایا تھا۔ خلیق صاحب اردو غزل بہت دلچسپ انداز سے پڑھاتے تھے۔ شعبہ اردو کے صدر انگریزی کے ایم اے بھی تھے۔ قابل بہت تھے لیکن شخصیت بے رنگ تھی۔ دیکھو نام بھی یاد نہ رہا۔ ایک بار پھر میں اس یقین کا اظہار کروں گا کہ طلبہ کا غیر معمولی talented شخصیتوں کو قریب سے دیکھنا بھی ان کی اپنی شخصیتوں کو نکھارتا ہے۔ اداروں میں mediocrity وہ عذاب ہے جس سے طلباء کو ہر قیمت پر بچانا چاہیے۔ طالب علم کی

نگاہ تو چراغوں پر نہیں ستاروں پر ہونی چاہیے۔

میری طالب علمی کا زمانہ تحریک پاکستان کے عروج کا زمانہ تھا۔ 1945ء میں قائداعظم نے بریلی میں ایک بڑے جلسہ میں خطاب کیا تھا۔ پروفیسر شکور کے ہاں قیام تھا۔ ان کی تقریر انگریزی میں تھی جو ڈائس سے بہت دور بیٹھنے کی وجہ سے میری سمجھ میں کچھ آئی کچھ نہ آئی۔ بعد کو سنا کہ کسی منچلے عقیدت مند نے قائداعظم کا قلم اڑا لیا تھا۔ بریلی میں کانگریس کے اجلاس بھی ہوتے رہتے تھے۔ ایک اجلاس میں جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کو بھی دور سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نہرو حسب معمول چوڑی دار پائجامہ، نہرو کٹ واسکٹ اور گاندھی کیپ میں تھے۔

یہ تمام باتیں میں اس لئے بتا رہا ہوں کہ طالب علمی کے زمانے میں خاص طور سے گونا گوں تجربات انسان کی شخصیت کا تانا بانا بنتے ہیں۔ 49-1948ء میں تقریباً ایک سال ایک مڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر بھی رہا۔ اسی دوران بریلی کالج میں اردو ایم اے کا داخلہ بھی لے رکھا تھا۔ اسکول کے زمانہ کی خاص بات یہ ہے کہ ناپختگی کے اس دور میں سخت سزا دینے کا قائل تھا۔ دو ایک بار سخت سزا خود اپنے ہاتھ سے دی۔ اس لحاظ سے وہ میرا دور جہالت تھا۔ 1948ء میں، میں تمام ضلع میں فرسٹ ڈویژن لے کر فرسٹ آیا تھا۔ اس وقت یہ بہت بڑی بات معلوم ہوتی تھی لیکن اب میں اسے بالکل اہمیت نہیں دیتا۔ کسی امتحان کی فرسٹ ڈویژن بالکل میکانکی عمل ہے۔ سماجی، اخلاقی، تخلیقی عمل نہیں۔ اس لئے محض امتحانی چمک دمک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ نصابی لڑکے سماجی طور پر تنگ دل اور تنگ نظر ہو جاتے ہیں اللہ بچائے۔

50-1949ء میں مسلم علی گڑھ یونیورسٹی کے مشہور زمانہ ٹریننگ کالج میں زیر تعلیم رہا۔ پروفیسر حبیب الرحمان پرنسپل تھے۔ اسی زمانہ میں مجھے اپنے پیر ڈاکٹر ذاکر حسین سے نیاز حاصل ہوا۔ یعنی روبرو گفتگو کرنے کا موقع ملا، گو بات خوشگوار نہ تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین وائس چانسلر کی حیثیت سے ایک روز یکایک کالج کے معائنہ کے لئے آ گئے۔ میں چونکہ سیمنار (طلبہ کے لئے خصوصی اضافی لائبریری) کا انچارج تھا، مجھے بھی بلا بھیجا گیا۔ اتفاق سے اتوار بیچ میں آ جانے کی وجہ سے سیمنار کو چند روز کھولا نہ گیا تھا اور میزوں، کرسیوں پر خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ ذاکر صاحب نے ایک میز پر انگلی لگائی تو گرد آشکارا ہو گئی۔ انہوں

نے میری طرف دیکھا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے جان بچانے کے لئے چپڑاسی کو صفائی ٹھیک طرح سے نہ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی۔ جس کے جواب میں انہوں نے فرمایا اس سے کام لینا بھی انچارج کی ذمہ داری ہے۔ بہرحال آئندہ اگر میں نے دھول پڑی دیکھی تو میں اسے خود صاف کروں گا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ آخری جملہ میری زندگی میں چراغ رہگزر بن گیا ہے۔ علی گڑھ اس وقت تک بہت بدل چکا تھا۔ علی گڑھ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ پھر بھی رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر خورشید الاسلام، پروفیسر حبیب، ڈاکٹر حسیب، ایل کے حیدر، خواجہ غلام السیدین۔ ڈاکٹر ہادی حسن، ڈاکٹر مختار الدین احمد سے بزم میں کچھ چراغاں تھا۔ گویا اس موسم خزاں میں بھی بہت کچھ تھا۔ رئیس الجامعہ خود ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ سیاہ شیروانی کا رواج کم ہو گیا تھا۔ علی گڑھ کی زندگی کی مخصوص روایات دم توڑ رہی تھیں پھر بھی علی گڑھ علی گڑھ تھا۔

سہیل: سینئر جونیئر کا حساب تھا؟

سر راشد: وہ تو تھا، لیکن وہاں سینئر بڑا ارسٹوکریٹ، باوقار ہوتا تھا، اس کی ایک مثال دیتا ہوں۔ غالباً 1946ء میں مَیں اپنے دوستوں سے ملنے علی گڑھ گیا تھا۔ صاحب باغ میں جہاں انجینئرنگ کے طلباء رہتے تھے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں سے دوستوں کے ساتھ شاید دہلی جانا ہوا، واپسی میں فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ یہ پرانی روایت تھی کہ کم درجہ کا ٹکٹ لے کر یا بغیر ٹکٹ اعلیٰ درجہ میں سفر کیا جائے۔ رات کے تیسرے پہر ایک ٹکٹ چیکر نے آن لیا۔ اس پر کہ ہم پندرہ بیس جونیئر لڑکے تھرڈ کلاس کے ٹکٹ پر سفر کر رہے تھے، بہت گھبرائے۔ 1946ء میں سیاسی حالات بدل جانے کی وجہ سے علی گڑھ کے مسلم طلبہ یوں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی نگاہ میں کھٹکتے تھے۔ ہم میں سے کسی نے سکھ ٹکٹ چیکر کی کوئی خوشامد کرنی چاہی، اس پر ایک سینئر جو اطمینان سے ایک طرف بیٹھا تھا جلال میں آ گیا۔ اس نے کہا ''تم لوگ اتنے کچے تھے تو فرسٹ کلاس میں سفر کیوں کیا''؟ بہرحال اس نے بڑی تمکنت سے ٹکٹ چیکر سے کہا، ''سردار جی آپ ٹکٹ بنا دیجئے۔ میں پے کرتا ہوں''۔ یہ کہہ کر اس نے اپنا پرس کھولا اور نوٹ گننے لگا۔ اس سینئر کے اس اقدام سے سردار جی خاصے متاثر ہوئے اور اس تنبیہہ کے ساتھ کہ اگلے اسٹیشن پر بوگی بدل لینا، وہ دوسرے مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ تو جناب یہ تھا وہاں کا سینئر۔ اب میں اپنا ایک اور تجربہ سناتا ہوں۔ میں

وی ایم وقار الملک ہال کے نصر اللہ ہوسٹل کے روم نمبر دو میں اعظم گڑھ کے امین الدین کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ نمبر ون میں میرے دوست عون محمد، 4 میں افتخار شاہ تھے۔ زیرو کمرہ میں ہمارا سینئر اشفاق رہتا تھا جو بی اے کا طالب علم تھا لیکن اپنی اسٹینڈ نگ کی وجہ سے ہمارا سینئر تھا۔ آتے جاتے اس کے کمرہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے سلام کرتے تھے خواہ وہ موجود ہو یا نہ ہو، سینئر جو تھا۔ یہ ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ جب میں کچھ بیمار ہوا تو وہ اپنی سائیکل پر بٹھا کر کئی بار طبیہ کالج کے پرنسپل لطیف صاحب کے مطب میں لے گیا اور اس وقت تک بڑے بھائی کی طرح میری دیکھ بھال کرتا رہا جب تک میرا بھائی منظور بریلی سے نہ آ گیا۔

سہیل: ہوسٹل کی کوئی دلچسپ بات؟ بڑی کہانیاں مشہور ہیں۔

سرراشد: جی ہاں، وی ایم ہال میں ایک بہت بڑے سینئر پی ڈی خان تھے۔ وہ سالہا سال سے بی اے میں فیل ہو رہے تھے (چونکہ پاس ہونا ہی نہیں چاہتے تھے)۔ ایک ڈبل سیٹ میں بڑے شاہانہ انداز سے رہ رہے تھے۔ قالین وغیرہ بھی بچھا تھا ایک طرف کو ہارمونیم بھی رکھا تھا۔ ایک طبلہ بھی پاس پڑا تھا۔ بڑے مجلسی یار باش آدمی تھے۔ دوبار ملاقات ہوئی لیکن علی گڑھ کی پوری یونیفارم میں پایا۔ سارے بٹن لگے ہوئے تھے۔ وضع داری بھی انتہا درجہ کی تھی۔

علی گڑھ ایسی جگہ میں جو لائف سٹائل ہوتا ہے، جو روایتیں ہوتی ہیں، علم و فضل اور کردار کے جو چاند سورج ہوتے ہیں ان سے زندگی روشنی لیتی ہے۔ کردار کی بات آئی تو سنئے کہ میں ٹریننگ کالج میں تھا تو ایک بہت ہی با اصول استاد ڈاکٹر عشرت حسین تھے وقت کے بے انتہا پابند کام کرنے لینے میں بہت زیادہ سخت گیر۔ ایک روز وہ گھر سے سائیکل پر کالج آ رہے تھے۔ سائیکل پنکچر ہو گیا۔ چند منٹ دیر سے پہنچے۔ پہلا گھنٹہ شروع ہو چکا تھا، دفتر جا کر بغیر تنخواہ کے چھٹی کی درخواست دیدی۔ آفس سپرنٹنڈنٹ نے کہا بھی، ''ڈاکٹر صاحب سی لیو لے لیجئے'' انہوں نے کہا سی لیو اتفاقاً اور ضرورتاً لی جاتی ہے۔ یہ وہ صورت نہیں'' انسانی کردار ایسی ہی مثالوں سے تشکیل پاتا ہے۔ ایک اور صاحب زیدی صاحب اردو کے استاد تھے۔ جب مجھے یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس فرسٹ آنے کا اعزاز ملا (جسے میں آج کوئی اہمیت نہیں دیتا جو توجہ سے تواتر سے پڑھتا رہے وہ اس قسم کے اعزاز حاصل

کرتا ہے خواہ اس کی قدریں اور رویے صفر ہوں اور شخصیت ناپختہ اور علم ناقص) تو میر اسکالرشپ پر امریکہ جانے کا امکان پیدا ہوا۔ میرے استاد ڈاکٹر مجیب، خدا انہیں غریق رحمت کرے، یہی چاہتے تھے۔ لیکن زیدی صاحب نے کہا علی گڑھ کو اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کی کمی نہیں ہوگی۔ لیکن پاکستان کو سول سرونٹس سے بھی زیادہ اچھے استادوں کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ میں نے اسی وقت پاکستان آنے اور استاد بننے کا فیصلہ کیا۔

یہ 1950ء کی بات ہے۔ 26 مئی کو رزلٹ آؤٹ ہوا تھا۔ 11 جون کو پاکستان پہنچا اور 11 اگست سے 21 اگست تک جی ٹی روڈ کے کنارے گورنمنٹ ہائی اسکول گوجر خان میں استاد رہنے کے بعد 23 اگست 1950ء سے ملٹری کالج میں فرہاد کی کوہ کنی شروع کی جوئے شیر کے لئے۔ اس بات کو یہاں ختم کرنے سے پہلے یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ گوجر خان جانے سے پہلے جون، جولائی 1950 میں موہنی روڈ لاہور میں اپنے دوست خلیق فصیح الرحمان کے ہاں رہتے ہوئے میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ خوبصورت پھول کھلے ہیں اور اس کے سامنے ایک شاندار عمارت ہے۔ جب 21 اگست کو میں کالج کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوا جس پر محراب کی شکل میں سفید حروف میں لکھا تھا

Enter to learn go out to serve

تو رابرٹس ہاؤس کے سامنے بلکہ اس گھر کے سامنے وہ منظر تھا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ ایک طرف کالج کی مین بلڈنگ تھی۔ بعد کو پتہ چلا یہ سرخ پھول لیسٹونیا کے تھے جو سر کلر روڈ کے دونوں طرف کثرت سے لگے ہوئے تھے۔ اس جگہ کے قریب آتے ہی میرے دل نے کہا یہ تو وہ جگہ ہے جو میں نے خواب میں دیکھی تھی اور اسی وقت خیال آیا کہ یہ جگہ وہ ہے جو میرے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ اب 37 سال بعد میں convinced ہوں کہ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوش بختی اور چیلنج تھا کہ مجھے قدرت کا حکم ہوا۔ ''ترا جو نام وہی ترا مشن ہے۔ جا تیشہ اٹھا اور جوئے شیر نکال۔۔۔۔۔'' اس میں مَیں یہ اضافہ کرونگا میری ذمہ داری کوہ کنی ہے، جوئے شیر میری ذمہ داری نہیں۔

سہیل: یہاں آنے کے بعد 37 سال کی مختصر داستان کیا ہے؟

سر راشد: کالج میں تین مہینے میں اردو ایم اے مکمل کیا۔ انگریزی میں ایم اے کیا۔ ایک بار

سائیکالوجی اور ایک بار ایم اے اکنامکس کا داخلہ بھیجا۔ ایک بار پی، ایچ ڈی میں داخلہ لینے کے لئے تگ ودو کی، جب تھیسز کا عنوان منظور ہوگیا تو خیال بدل دیا۔

سہیل: کیوں؟

سر راشد: مجھے خیال آیا کہ یہاں استاد رہنے کی ضرورت پی ایچ ڈی نہیں، جو کچھ علم حاصل کیا ہے اس سے صحیح کام لینے کی ضرورت ہے۔

سہیل: آپ اپنے کیریر کی بات کر رہے تھے۔

سر راشد: مختصر یہ کہ یہاں 64ء تک اردو، اس کے بعد سے انگریزی اردو دونوں اور 71 سے صرف انگریزی پڑھا رہا ہوں۔ اس تمام عرصے کسی نہ کسی ہاؤس سے متعلق رہا۔ کالج میگزین کی ادارت سے بھی ایک عرصے تک وابستہ رہا۔ 67 سے 1987ء تک ایک آدھ سال کو چھوڑ کر شیر شاہ ہاؤس کا ہاؤس ماسٹر رہا۔ اس ہاؤس ماسٹری کو میں حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔

سہیل: اس میں کیا شک ہے۔ شیر شاہ ہاؤس پر گفتگو کرنے سے پہلے میں آپ سے روایتی انٹرویو کے انداز میں کچھ ذاتی باتیں پوچھنا چاہوں گا۔

سر راشد: جی ضرور۔

سہیل: آپ کے نام کے ساتھ "فیضی" بھی لکھا دیکھا ہے۔

سر راشد: میرے پردادا کا نام فیض اللہ تھا۔ انکی نسبت سے میں فیضی لکھتا تھا۔ بعد کو خیال آیا صرف راشد کافی ہے۔

سہیل: آپ کا جو نام ہے وہی آپ کی پہچان ہے

سر راشد: میں تو سمجھتا تھا کہ جو نام ہے وہی مشن ہے۔

سہیل: پسندیدہ رنگ؟

سر راشد: ظاہر ہے سفید

سہیل: پسندیدہ پھول؟

سر راشد: چنبیلی اور جوہی

سہیل: شخصیت؟

سر راشد: بحیثیت ماہر تعلیم اور انسان ڈاکٹر ذاکر حسین۔ بحیثیت ادیب اور مزاح نگار رشید احمد صدیقی، بحیثیت نقاد آل احمد سرور۔

سہیل: شاعر؟

سرراشد: غالب

سہیل: سیاست دان؟

سرراشد: قائداعظم، جب سے ''گفتار و کردار قائداعظم'' مرتب کی، میں قائداعظم کی عظمت کا کلمہ پڑھتا ہوں۔

سہیل: کن کتابوں نے متاثر کیا؟

سرراشد: مولانا امین احسن اصلاحی کی ترجمان القرآن جارج فریز رکی' The Golden Bough'(شاخ زریں) رابرٹ بر بفالت The Making of Humanity(تشکیل انسانیت)،لن یو تانگ کی The Importance of Livingوغیرہ چندایسی کتابیں ہیں جن سے میں غیر معمولی طور پر متاثر ہوا ہوں۔ یوں تو بے شمار کتابیں پڑھی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیمی خطبات، خواجہ غلام السیدین کی Iqbal's Educational Phiolisophy اور The Faith of an Educationist

سہیل: اردو کی کوئی اور کتاب؟

سرراشد: رشید صدیقی، مشتاق یوسفی کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ مختار مسعود کی 'آواز دوست' بھی بار بار پڑھی ہے۔

سہیل: ناول اور فسانہ؟

سرراشد: برسہابرس سے جب انگریزی میں زیادہ پڑھتا تھا تو انگلستان کے کلاسکی ناول نگاروں کے علاوہ سمرہٹ ماہم کے ناول اور افسانوں کو دلچسپی سے پڑھا۔ فرانسیسی ناول نگار وکٹر ہیوگو کا Les Miserables اناطول فرانس کا تائیس، فلابیر کا مادام بواری، روسی ناول نگاروں میں دوستووسکی کا The Brothers Karamazor اور Crime and Punishment کو پڑھا اور روشنی حاصل کی۔ ٹالسٹائی کے دو کلاسکی شاہکار Anna Karenina اور War and Peace برسہابرس بہت شوق سے پڑھے۔ چیخوف اور گورکی کے افسانے، ناول بھی دلچسپی سے پڑھے۔ ڈراما نگاروں میں میرا پسندیدہ ڈراما نگار Henrik Ibsen ہے اسے بہت enjoy کیا۔

سہیل: آپ کے تعلیمی نظریات کو کن کتابوں، اشخاص اور اداروں نے متاثر کیا؟

سرراشد: جب میں علی گڑھ کے ٹیچرز ٹریننگ کالج میں پڑھ رہا تھا تو وہاں کے سیمنار کی لائبریری میں ایک کتاب Education, Its Data & First Principles تھی۔ سر پرسی نن کی اس کتاب نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اسکی تھیم یہ ہے کہ تعلیم کا مقصدِ واحد انفرادیت (individuality) یا خودی کی نشوونما ہے۔ لیکن وہ کتاب جس نے مجھے استاد بنایا گویا مجھے جگایا، ڈاکٹر ذاکر حسین کی 'تعلیمی خطبات' نے۔ اس نے میرے طرزِ تحریر کو بھی متاثر کیا۔ خواجہ غلام السیدین کی 'اصول تعلیم' تو نصاب میں پڑھی تھی۔ لیکن انکی کتاب "The Faith of An Educationist" جو انکے U.N.O کے توسیعی لیکچرز پر مشتمل ہے، اس کتاب نے مجھے بہت گہرائی میں جا کر متاثر کیا۔ خصوصاً استاد کی قدروں، رویوں اور مشن کے بارے میں میرے لئے یہ کتاب تعلیم کی بائبل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سیدین صاحب ہی کی شخصی خاکوں کی کتاب " آندھی میں چراغ" کو بھی میں نے بار بار پڑھا ہے۔ اس نے humanism میں میرے یقین کو پختہ کیا۔ برٹرنڈ رسل کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ Unpleasant Essays اور Sceptical Essays اچھے لگے۔ لیکن اسکی Education & Social Order سے زیادہ متاثر ہوا۔ اس کی پبلک سکول سسٹم پر جو تنقید ہے وہ خاص طور پر خیال انگیز معلوم ہوئی۔ اس طرح Trevelyan کی English اور A History of England Social History اس لحاظ سے اچھی لگیں کہ ان میں انگلستان کی سماجی تاریخ کے علاوہ پبلک اسکول طرزِ تعلیم کے تاریخی پس منظر پر بڑی اچھی بحث ہے۔ جارج Frazer کی The Golden Bough رابرٹ بربفالت کی، The Making of Humanity کے نقوش بھی ذہن میں باقی ہیں۔ جان ڈیوی کی Education & Democracy بھی فکر انگیز کتاب پائی۔ بے شمار کتابیں پڑھیں اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ اثر قبول کیا۔

آپ نے افراد سے سیکھنے کے بارے میں بھی پوچھا ہے۔ میں تعلیم میں ڈاکٹر ذاکر حسین کو اپنا گرو مانتا ہوں۔ اداروں میں جامعہ ملیہ دہلی اور ھر دیوار کے قریب ہندوؤں کا ایک قومی ادارہ" گورو کل "ان دونوں اداروں میں علم کے علاوہ نیشنلزم اور کردار سازی کو

بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

سہیل: آپ کے اپنے تعلیمی نظریات کیا ہیں؟

سرراشد: معلومات اور علم میں فرق ہے۔ تعلیم کو معلومات سے آگے علم کو فروغ دینا چاہیئے۔ اس لئے معلم reproductive سے زیادہ تخلیقی (creative) ہونا چاہیے۔ طالب علم زیادہ سے زیادہ پڑھے اور سوچے۔ سوچنے کی صلاحیت کونشو ونما دینا تعلیمی مقاصد میں سرفہرست ہے۔ جو 1832ء کی میکالے کی نوآبادیاتی تعلیمی پالیسی کی باقیات سے بہت آگے کی چیز ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارا طریقہ تدریس اور امتحان تخلیقی (creative) نہیں۔ اقبال نے 1932ء میں جب وہ تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ملکہ این کے محل میں مقیم تھے تو انھوں نے ڈاکٹر وحید اور دوسرے مسلمان راہنماؤں سے کہا تھا کہ علم حاصل کرو اور علم پیدا بھی کرو۔ علم پیدا کرنا ہی اصل مقصود ہے۔ غور کرنے اور سوچنے کی قوت کو بھی باقاعدہ پڑھانے اور ترقی دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے میں نے کالج کے آر اینڈ ڈی سیل کے تحت تھوڑا سا تحقیقی کام کیا تھا۔ اور Exercises in Thinking کے نام سے آٹھویں سے لے کر بی اے تک کے طلبہ کے لئے تفکر کی مشقیں (exercises) مرتب کی تھیں۔ وہ مسودہ آج تک میرے پاس پڑا ہوا ہے۔ کوئی اس جنس کا خریدار ہی نہیں۔ میں نے اپنے طور پر کلاس میں پڑھانے کے creative طریقے کو اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ پبلک اسکول سسٹم بہت موثر سسٹم ہے لیکن اس کو کامیابی سے چلانا اتنا ہی مشکل ہے۔ ہاؤس اور ہوسٹل میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پریفیکٹوریل سسٹم اور ہاؤس سسٹم کے بغیر پبلک اسکول، پبلک اسکول نہیں رہتا خواہ ملٹری کالج جہلم ہی کیوں نہ ہو۔ پبلک اسکول کا مقصد total education دینا ہے، اور quality education بھی۔ آجکل کے spectrum میں یہ ایجوکیشن بہت وسیع اور بہت ہی creative ہوگی۔

سہیل: سر، ابھی چند لمحے پہلے آپ نے شیر شاہ ہاؤس کی ہاؤس ماسٹری کو ملٹری کالج میں حاصلِ زندگی کہا۔ کیوں؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا کلاس روم میں بھی بہت contribution ہے اور پھر اس سے زیادہ آپ کی بارہ کتابیں ہیں۔ جن میں سے چھ سات تو ملٹری کالج ہی پر ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ پاکستان میں کوئی چھوٹا بڑا ادارہ ایسا ہے

جس پر اس کے کسی استاد نے سات آٹھ تو کیا، دو چار ہی کتابیں لکھی ہوں۔ ہم تو سمجھتے ہیں آپ کے قلم نے اس کالج کو امر کر دیا ہے۔

سرراشد: تحسین کا شکریہ۔ ہاں بُرا بھلا کام جیسا بھی ہے، اللہ نے مجھے اسکو سرانجام دینے کی توفیق دی، اس کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا بے حساب کرم ہے کہ اس نے مجھ سے یہ کام لیا اور یوں سرخرو کیا۔ میں اس کام کی اہمیت سے انکار نہیں کر رہا۔ صرف شیر شاہ کی ہاؤس ماسٹری کے بے نشان کام کی اہمیت اور قدر و قیمت کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

سہیل: بجا فرمایا۔ میں خود (شیرین) ہوں۔ شیر شاہ ہاؤس کی پراڈکٹ

سرراشد: شیر شاہ ہاؤس کے کنٹری بیوشن کا اندازہ منجملہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ کالج کے تیرہ Swords of Honour میں سے، دس، 1974ء سے 1987ء تک آئے۔ باقی تین 1948ء سے 1974ء تک کے تھے۔ یہ کوئی flucke نہ تھا۔ شیر شاہ ہاؤس کا کھل جا سم سم یہ تھا کہ سب لڑکوں کو پہلے sense of security دیا جائے جس سے جذباتی طور پر adjusted محسوس کریں۔ یہ بغیر مسلسل ذاتی توجہ اور care کے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کام میں میری مرحومہ بیگم نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ مادرانہ ٹچ دیا جسکی اس عمر کے بچوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ اسکے بعد ہاؤس میں ایک تخلیقی و تعلیمی ماحول تھا۔ ہر ہفتے دو فنکشن ہوتے تھے۔ جس میں ہر لڑکا اسٹیج پر آتا تھا۔ کوئی لڑکا بچا نہ تھا جس نے دو تین بار تقریر نہ کی ہو یا ڈراما کرنے اسٹیج پر نہ آیا ہو۔ اس کے علاوہ ہاؤس میں اقبالیات پر زور تھا۔ جس سے پاکستانیت کو فروغ ملا۔ ہاؤس لائبریری ہر وقت کھلی رہتی تھی۔ جس کا جی جس وقت چاہے آکر پڑھے۔ پڑھنے سے ذہن کھلتا ہے اسٹیج پر آنے سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ لیڈرشپ کی نشو ونما کے بے شمار مواقع تھے۔ سارے عہدے گردش کرتے رہتے تھے۔ ڈیوٹی پریفیکٹ آف دی ڈے، ڈیوٹی کیڈٹ آف دی ڈے، آفس انچارج ریڈنگ ٹیبل انچارج وغیرہ بہت عہدے تھے۔ ہر جمعہ کو انسپکشن ہوتی تھی۔ سارا ماحول ذمہ داری سیکھنے اور اپنے آپ خود کاری (initiative) سیکھنے کا تھا۔

سہیل: آخر میں وہ سوال جو مجھے سب سے پہلے پوچھنا تھا۔

سرراشد: وہ کیا؟

سہیل: یہ کہ سر آپ کا زندگی کا نظریہ کیا ہے؟ آپ جیسا آدمی ایک مشن رکھتا ہے۔ آپ کا مقصد

حیات اور مشن کیا رہا ہے؟

سر راشد: اس سوال کے جواب میں، مَیں اپنے ذہنی مرشد جناب رشید احمد صدیقی کی آپ بیتی سے یہ الفاظ دھرانا چاہوں گا۔ ''زندگی کا حاصل یا انسانیت کا مقصد یہی ہے کہ آدمی نے جو زندگی یا زمانہ پایا اسکو اپنے خیال یا حسنِ عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے، بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لئے لازم ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔ یہ وہ عبادت ہے جو اسکو نفس کے تمام ناروا مطالبات سے باز رکھتی ہے اور مسرور و مطمئن بناتی ہے۔ ہر وہ بات اور ہر وہ فعل جو انسان کو اس عبادت سے باز یا محروم رکھے ظلم یا گناہ ہے۔ انسان مال اور کھال ہی میں مست نہیں رہتا، کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے''۔ یہ الفاظ میں نے سب سے پہلے 1944ء میں لکھنو کے رسالہ ''نگار'' کی ایک اشاعت میں پڑھے تھے۔ اس وقت سے یہ مرے دل میں کُھبے ہوئے ہیں۔ چالیس پینتالیس برس سے اس منزل، اس آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں ہوں جسکا تعین ان الفاظ سے کیا گیا ہے۔

تو راہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول

پاکستان کے حوالے سے دنیا کو بہتر اور برتر بنانا میرا مشن ہے۔ جسکو ''پاکستانیت کا فروغ'' کا نام دیا ہے۔

سہیل: ساری سر، چند سوال جو پہلے پوچھنے چاہیے تھے مس ہو گئے۔ اب آخر میں اجازت ہو تو عرض کروں۔

سر راشد: جی

سہیل: آپ کی پسندیدہ سورت کونسی ہے؟

سر راشد: سورۃ فاتحہ ام الکتاب ہے۔ 1943ء میں میں نے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' میں اسکی تفسیر پڑھی تھی۔ اس میں ''رب العالمین'' کی تفسیر میں انہوں نے نظام ربوبیت پر جو فاضلانہ بحث کی تھی وہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔ پھر ہماری خاندانی سورت سورۃ رحمان ہے۔ گھر بھر میں سب صبح سویرے اس سورۃ کی تلاوت کرتے تھے۔ **فبای الا ربکما تکذبان** کا آہنگ میرے دل کی دھڑکنوں میں سمویا ہوا ہے۔ ان دنوں ہر نماز میں سورۃ العصر ضرور پڑھتا ہوں۔ **و العصر ان لا نسان لفی خسر. الا الذین آمنو وعملو الصلحت۔** امام

شافیؒ نے لکھا ہے کہ اگر پورا قرآن مجید نہ اترتا تو بھی یہ سورۃ انسانیت کی ہدایت کے لئے کافی تھی۔

سہیل: آپ کو اس سورۃ میں کیا نظر آیا؟

سرراشد: اس میں وآمنو یعنی ایمان لانے کو عملوا الصلحت (نیک عمل) سے مربوط کیا گیا ہے۔ پھر عمل صالح کو وتوا صو بالحق سے مربوط کیا اور آخر میں بالصبر کی تلقین کی یعنی وتواصو بالحق بھی انسان کی ذمہ داری ہے یعنی social responsibility بھی ایمان کا منشا ہے۔ وتو اصو باصبر میں بڑا نفسیاتی نکتہ ہے کہ تعلیم وتربیت، تبلیغ کے عمل میں صبر وتحمل ایک بنیادی ضرورت ہے۔

سہیل: پسندیدہ شعر (اقبال اور غالب کے سوا)

سرراشد: شعروں کی پسندیدگی بہتا پانی ہے۔ کبھی کوئی شعر اچھا لگتا ہے کبھی کوئی۔ لمحہ لمحہ کی بات ہے، میں لکھتے لکھتے کبھی کبھی ریڈیو آن کر لیتا ہوں۔ ایک روز ریڈیو کھولا تو یہ شعر آ رہا تھا۔

ترے قرب نے جو بڑھا دیئے
کبھی کم ہوئے نہ وہ فاصلے

ایک مصرعہ سنا

عمر بھر کون حسیں کون جواں رہتا ہے

اس نے بھی strike کیا۔ ایک روز ''کریاں'' میں منو بھائی نے میر کا یہ شعر کوٹ کیا۔

مزاجوں میں یاس آ گئی ہے ہمارے
نہ مرنے کا غم نہ خوشی زندگی کی

بہت دیر تک سوچتا رہا depression کی کتنی مکمل عکاسی ہے۔

آج ہی صبح ریڈیو پر پروین شاکر کا یہ شعر سنا۔ اچھا لگا۔

گھر کا دروازہ کھلا رکھا ہے
وقت مل جائے تو زحمت کرنا

آل احمد سرور نے اچھے شعر کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ خیال سے یا بیان سے چونکا دیتا ہے۔ یہ بیان کا کمال ہے کہ شعر نثر کی سادگی رکھتا ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اقبال، فیض کے شعر کوٹ نہیں کئے یہ بتانے کے لئے کہ انسان کو اپنا ذہن کھلا رکھنا چاہیے اور نئ

sensibility کو بھی ساتھ لے کر چلنا بہتر ہوتا ہے۔

سہیل: اور پسندیدہ کتاب؟

سرراشد: اس کا معاملہ بھی بہتے پانی کا ہے، بے شمار کتابیں پڑھیں۔ بعض کو تو بار بار پڑھا۔ آج کل جب وقت ملے تو ڈاکٹر جیک گِب کی 'Trust' کی ورق گردانی کرتا رہتا ہوں۔ میرے ذوق کی فاضلانہ کتاب ہے۔ اسکا موضوع social behaviour بلکہ inter-personal relationship ہے۔ گِب کہتا ہے کہ trust انفرادی کارکردگی اور سماجی تعلقات کو sustain کرتا ہے اور خوف منفی قوت ہے۔

سہیل: قرآن پاک کی کونسی تفسیر آپ کے مطالعہ میں رہتی ہے؟

سرراشد: 'ترجمان القرآن' کا ذکر کر چکا ہوں تفہیم بھی دیکھی ہے۔ لیکن مطالعہ میں امین احسن اصلاحی صاحب کی ''تفسیر تدبر قرآن'' کا کیا کرتا ہوں۔

سہیل: اسکی کوئی خصوصیت۔

سرراشد: اس میں جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے تدبر پر زور دیا گیا ہے۔ مثلاً الحمدللہ کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اصلاحی صاحب نے اسکا ترجمہ کیا ہے تمام شکرگزاریاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ اس میں بڑا لطیف نکتہ ہے۔

سہیل: پسندیدہ کہاوت یا ضرب المثل؟

سرراشد: فرانسیسی کہاوت 'To understand all is to forgive all.' اور چینی کہاوت It's patience that wins ultimately اور پشتو کہاوت 'کچھ دانے گیلے ہیں کچھ چکی کے دانت کھٹل ہیں'۔ (صحیح الفاظ یاد نہیں رہے مفہوم یہی تھا)

سہیل: اردو کا کوئی فقرہ؟

سرراشد: رشید احمد صدیقی کا فقرہ اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ زندگی انعام بھی ہے اور آزمائش بھی۔

سہیل: رشید احمد صدیقی پر یاد آیا آپ ادب کس قسم کا پڑھتے ہیں؟

سرراشد: اب مزاحیہ ادب شوق سے پڑھتا ہوں۔ زور کس پر ہوا۔ ''اب'' پر۔ مشتاق یوسفی کی 'زرگذشت' کو بہت شوق سے پڑھا تھا۔ سیاسی اور معاشرتی طنز نگاری میں صدیق سالک مرحوم کا بھی جواب نہیں تھا۔ مجھ سے بھی یاداللہ تھی۔ میری ایک کتاب 'Ripeness is All' پر انہوں نے پیش لفظ بھی لکھا۔ سانحہ بہاولپور میں شہید ہوئے۔ ادب کا بھی بڑا

نقصان ہوا۔ صحیح ادیب وشاعر قوم کا بہت قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔

سہیل: آپ اتنے عرصہ ملٹری کالج میں رہے، آپ کو کن لوگوں نے متاثر کیا؟

سرراشد: فنکاری میں حیدری صاحب، علم وفضل میں علوی صاحب، بذلہ سنجی میں بلگرامی صاحب، انسان دوستی اور وضع داری میں میجر عبدالرشید، (اے ای سی) اور قیادت سیادت میں کرنل رفیق، باقی سب بھی اچھے تھے۔ یہ میرا ذاتی تاثر ہے۔

سہیل: آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟

سرراشد: پاکستان کے حوالے سے میرا نام کالج کے عاشقوں میں لکھا جائے اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

لیفٹیننٹ زاہد محمود

(کالج نمبر 4530، زمانہ تعلیم 1987-1982ء)

یہ واقعہ اوائل جنوری 1987ء کا ہے۔ مغرب کے بعد کسی کام سے میں راشد صاحب سے ملنے شیر شاہ ہاؤس گیا۔ میں نے بیل دی۔ وہ فوراً باہر آ گئے۔ علیک سلیک کے بعد وہ ہاؤس آفس کی طرف بڑھے۔ میں پیچھے پیچھے گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ وہ ہاؤس آفس کے برآمدہ تک گئے اور پھر لوٹ آئے اور وہیں صحن میں کھڑے کھڑے پوائنٹ ڈسکس کرنے لگے۔ اس روز خاصی ٹھنڈ تھی۔ وہ جلدی میں ضروری گرم کپڑے پہنے بغیر باہر آ گئے تھے اور اس وقت وہ صرف ایک جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ بہر حال اس خیال سے کہ کہیں انہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے میں نے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے گفتگو کو مختصر کیا اور واپس چلا گیا۔ دوسرے دن جمعہ تھا، وہ حسب معمول ہاؤس کے صحن میں سیاہ بازو والی آرام کرسی پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے کہا ''آؤ بیٹھو کیا بات ہے؟'' میں نے عرض کیا ''سر کوئی نئی بات نہیں صرف ایک سوال بلکہ وضاحت چاہیئے''۔ بولے ''وہ کیا'' میں نے کہا ''رات آپ نے مجھے بھی ٹھنڈ میں کھڑا رکھا اور خود بھی کھڑے رہے کوئی خاص وجہ تھی؟'' یہ سن کر وہ تھوڑا سا مسکرائے ''آئی ایم ساری، رات تمہیں تکلیف ہوئی۔ بات یہ تھی کہ میں آفس کی جانب بڑھا تو میں نے دیکھا کہ آفس میں لڑکے بھرے پڑے ہیں اور بڑے انہماک سے لائبریری کی کتابیں پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت میں تمہیں لے کر اندر جاتا تو لامحالہ انہیں میرے لئے کھڑا ہونا پڑتا اور ان کے مطالعہ کا سلسلہ ٹوٹتا۔ اس وجہ سے میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آئی ایم ساری اگر تمہیں ٹھنڈ لگی۔ ویسے یاد رکھو تحصیل علم افضل العبادت ہے اور چھوٹا یا بڑا

جو بھی طالب علم ہو، اس کا احترام واجب ہے''۔

میرا خیال ہے کہ میری طرح عالمگیرینز کی کئی نسلوں نے ان سے احترام آدمیت کا سبق سیکھا ہوگا۔ یہ تو ایک مثال ہے اس طرح کی باتیں ہر روز ہوتی رہتی تھیں۔ میں سال بھر شیر شاہ ہاؤس میں رہا۔ لیکن اس عرصے میں ایک بار بھی ریسٹ کے وقت بلا اشد ضرورت ڈارمیٹری کے اندر قدم نہیں رکھا۔ چلچلاتی دھوپ میں بھی وہ برآمدہ کے باہر باہر اپنے آفس میں آتے جاتے۔ دوپہر کے پریپ میں بھی یہی صورت ہوتی۔ ان کے یہ رویے اس وقت ہمیں odd لگتے تھے۔ لیکن ان کا اپنا اسٹائل تھا۔ جس پر انہوں نے کبھی compromise نہیں کیا۔

ہاؤس کی ڈارمز کے لاکرز میں تالہ ڈالنا ممنوع کر رکھا تھا۔ چوریاں بھی ہوئیں۔ لیکن وہ اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ چوری کا حل یہ نہیں کہ سب کو چور سمجھ کر تالے ڈال دیئے جائیں۔ کہا کرتے، ''ڈسپلن کی پرابلم دراصل development کی پرابلم ہوتی ہے''۔ ان کے آئیڈیل ازم سے لڑکوں کو اس افراتفری کے زمانہ میں ایک وژن ضرور ملا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔

ہاؤس کی لائبریری میں تقریباً دو ہزار کتابیں تھیں۔ کتابوں کی الماریاں ہر وقت کھلی رہتیں۔ حد یہ کہ ہاؤس آفس جہاں لائبریری تھی، سوائے رات کے دن بھر کھلا رہتا تھا۔ بعض لڑکے فجر ہی سے لائبریری جانا شروع کر دیتے۔ کوئی ایشو رجسٹر نہیں، کوئی اندراج نہیں، سارا کام آنر سسٹم پر چل رہا تھا۔ ایک روز میں نے پوچھا، ''سر آپ کو پتہ ہے کہ ہاؤس کی لائبریری سے کتابیں غائب ہوتی ہیں''۔ کہنے لگے'' ضرور ہوتی ہوں گی۔ جس طرح ہاؤس کے سارے لڑکے جسمانی طور پر فٹ نہیں رہتے، سک رپورٹ بنتی ہی رہتی ہے اسی طرح اوسطاً پانچ فیصد لڑکے غیر ذمہ دار بھی ہونگے۔ اس لئے ہر چار ماہ ہزار بارہ سو کی نئی کتابیں لاتا رہتا ہوں تا کہ جو نقصان ہوا ہے وہ پورا ہو جائے اور کتابوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا جائے''۔ تجربہ نے بھی ثابت کیا کہ اس اعتماد کو بڑے پیمانہ پر betray نہیں کیا گیا۔ شیر شاہ ہاؤس کے لڑکوں کے ذہنی فروغ میں ہاؤس لائبریری نے اور ان کی اخلاقی تربیت میں لائبریری کے آنر سسٹم نے اہم کردار ادا کیا۔

راشد صاحب کی بعض باتیں بہت عجیب سی لگتیں۔ ایک بار ہاؤس کے ٹرنک روم سے ایک لڑکے نے پلنگ کی نواڑ کا ایک رول نکال کر اپنے بیگ میں چھپا لیا۔ نیت صاف ظاہر ہے کہ خراب تھی اور بیگ بھی ٹرنک روم میں رکھا۔ جب ویک اینڈ جاتے ہوئے اس لڑکے نے بیگ ٹرنک روم سے نکلوایا تو ہاؤس اردلی کو کچھ شبہ ہوا۔ جب اس نے بیگ کھولا تو رول برآمد ہو گیا۔ اردلی نے فوراً راشد صاحب کو رپورٹ کی۔ انہوں نے کہا ''رول لے لو اور خاموش رہو۔ یہ لڑکا بہت اچھا ہے، اس کا پردہ رکھنا ضروری ہے۔ اضطراری غلطیاں سرزد

ہو ہی جاتی ہیں۔ انسان کی قدریں اور attitude ٹھیک رہیں''۔ راشد صاحب کے اعتماد پر وہ لڑکا پورا اترا۔ آج وہ اچھا بھلا ذمہ دار افسر ہے۔ پردہ داری، پردہ پوشی، دوسرے کی عزت رکھنا راشد صاحب کے کردار کی خصوصیت تھی۔ مشہور تھا کہ وہ اس لڑکے سے سوال نہیں پوچھتے جس کو جواب نہ آتا ہو۔ سبق ''الحمرا'' پڑھاتے ہوئے ایک بار آٹھویں بی میں انہوں نے ایک لڑکے سے Citadel کے معنی پوچھ لئے۔ اس کو نہیں آتے تھے، وہ کھڑا ہو گیا چپ اور شرمسار، اب راشد صاحب نے اس سے دو بار I'm sorry کہا، ساتھ ہی یہ بھی کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ تم ایسے اچھے بچے نے تیاری نہ کی ہوگی۔ اس کو بڑے اہتمام سے بٹھایا۔ نام لے کر انہوں نے کبھی کسی کی غلطی نہیں اچھالی۔

یہ ایک مثال ہے کہ راشد صاحب نے ہر طالب علم کی انا، اس کی عزت نفس (self respect) کا جتنا خیال رکھا اتنا تو اپنے والدین بھی نہیں رکھتے۔ ان کی یہی ایک صفت ان کو بے شمار دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔

لیفٹیننٹ زاہد نسیم اکبر

(کالج نمبر 4543، زمانہ تعلیم 1986-1982ء)

1982ء میں، مَیں شیر شاہ ہاؤس میں تھا۔ اس ہاؤس کا اپنا ماحول اور مزاج تھا۔ ہر بدھ کی شب ہاؤس فنکشن ہوتا اور جمعہ کی سہ پہر ہاؤس کی ادبی مجلس جس میں لڑکے اپنے تبصرے، مضامین، کہانیاں وغیرہ پڑھتے تھے۔ بدھ کی شب کو فنکشن، ڈراموں، تقریروں، نظموں اقبالیات، کے مقابلوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ ہر ڈارم باری باری اپنا پروگرام پیش کرتی تھی۔ ہر ڈارم کا کمپیئر علیحدہ ہوتا تھا۔ اس طرح ہر پروگرام میں ہاؤس کے تقریباً آدھے لڑکے حصہ لے لیتے تھے۔ آخر میں راشد صاحب تبصرہ کرتے اور انعامات تقسیم کرتے۔

یہ فنکشن راشد صاحب کی بیگم اور بچے بھی اٹینڈ کرتے تھے۔ میں نے یہ بات تفصیل سے اس لئے لکھی ہے کہ اب یہ سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں پہلے سال ان فنکشنوں سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ میں ان دنوں کچھ زیادہ دروں بین (introvert) تھا۔ راشد صاحب میرے چار انکلوں (بریگیڈئر نعیم اکبر، کرنل سلیم، پروفیسر شیر احمد، ڈاکٹر صغیر اکبر) کو پڑھا چکے تھے۔ صرف میرے والد کرنل نسیم اکبر مرحوم ان کے شاگرد نہ تھے۔ لیکن وہ جانتے ان کو بھی تھے اور میرے دادا جان جناب اکبر خان صاحب کو بھی۔ ان کو یہ بھی علم تھا کہ والدین کے انتقال کے بعد تنہا رہ گیا ہوں۔ اس لئے انہوں نے میری دروں بینی کو ایک نئی منزل سے آشنا کیا۔ یعنی مجھے ہاؤس کی لائبریری کا انچارج بنا دیا۔ وہ بھی انگلش سیکشن کا۔ راشد صاحب نے

شیر شاہ ہاؤس میں دوررس اثرات کے حامل دو بڑے کام کئے ۔ایک یہ کہ ہاؤس فنکشنز کے ذریعہ بولنا، ادبی مجلس کے ذریعہ لکھنا سکھایا اور لائبریری کے ذریعہ پڑھنے کی عادت ڈلوا دی۔ دوسرے یہ کہ تقریروں ، مذاکروں، اقبالیات اور قائداعظمیات اورسب سے بڑھ کر خود اپنے رویوں سے پاکستانیت کا شعور بیدار کیا۔ اندازہ کریں اس عمر میں بہت سے لڑکوں کو راشد صاحب آواز دوست، درس زندگی، روشنی، رزم حق و باطل جیسی کتابیں پڑھوا چکے تھے۔ میری ذمہ داری انگریزی کی لائبریری تھی۔ Longman's کی abridged کتابیں خاصی تعداد میں تھیں۔ بلیوبک آف نالج کی سترہ جلدیں تھیں نیوسپیس انسائیکلو پیڈیا کی 23 جلدیں تھیں۔ اس لائبریری کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اسکا کوئی وقت یا دن مقرر نہیں تھا۔ سیکنڈ پریپ اور رات کو سونے کے وقت کو چھوڑ کر جس وقت جس کا جی چاہے وہ لائبریری میں جا کر جو کتاب چاہے نکال کر پڑھ سکتا تھا۔ جمعرات جمعے کو اسے اپنے ڈارم میں لے جا سکتا تھا۔ ہر لڑکا خود ہی ایک رجسٹر میں اپنا نام لکھ دیتا تھا۔ اور خود ہی واپسی کی تاریخ ڈال کر دستخط کر دیتا۔ یہ بھی ایک تربیت تھی۔ مجھے یہ کہنے میں خوشی ہو رہی ہے کہ شیر شاہ ہاؤس میں اس لائبریری سے جن طلباء نے بہت زیادہ استفادہ کیا ان میں سے میں بھی ایک ہوں۔

مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ علوی صاحب، راشد صاحب ایسے استادوں سے اس سے زیادہ فائدہ کیوں نہ اٹھایا۔ مجھے یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ شروع شروع میں تو میں راشد صاحب سے گریز ہی کرتا رہا۔ زندگی میں missed opportunities کا ملال بہت بے چین کر دیتا ہے۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری ہی سے پڑھی ہوئی کتاب Oliver Twist کا ایک طویل اقتباس بیتے دنوں کی یاد میں نقل کرتا ہوں:-

> " --- and yet a hundred occasions rose up before him, on which he fancied, he might have been more jealous and more earnest and wished he had been. We need be careful how we deal with those about us, when every death carries to some small circle of survirors, thought of so much omitted and so little done - of so many things forgotten and so many more which might have been rquired! There is no remorse so deep as that which is unavailing! If we would be spared its torture, let us remember this in time."

آخر میں ایک اور بات بھی کہنا چاہوں گا۔ کسی نے اس پر غور کیا ہے کہ راشد صاحب اور شیر شاہ ہاؤس ایک برادر ہڈ کا حوالہ بن گئے ہیں۔ کسی کے لباس یا گفتگو سے ذرا سا شبہ ہو کہ یہ ملٹری کالج کا ہے تو پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ راشد صاحب کو جانتے ہو۔ شیر شاہ ہاؤس میں رہے ہو۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو فوراً گلے ملتے اور گھنٹوں راشد صاحب اور شیر شاہ ہاؤس کی باتیں کرتے دیر نہیں لگتی۔ راشد صاحب کے شیر شاہ ہاؤس میں رہنے کا مطلب ایک لائف اسٹائل attitudes اور values کا ایک set pattern بھی تھا۔ جس میں پاکستانیت کا جذبہ سب سے نمایاں تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ لاشعور میں چنبیلی کے ان سفید پھولوں کی خوشبو بھی ضرور بسی ہوگی جو ہاؤس کے ہر گوشہ میں کھلے ہوتے تھے۔

جی سی عمر بخاری

(کالج نمبر 4752، زمانہ تعلیم 1987-1984ء)

85 - 1984ء کے سیشن میں آٹھویں میں انگلش کی جو کتاب تھی اس کے بھی دو حصے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک "Special English Course for Class VIII" خود بھی مرتب کیا تھا جس میں خاص طور پر منتخب کی ہوئی چھ Orientational نظمیں

1. Drive the Nail Aright
2. Big Things and Small Things
3. A Nation's Strength
4. Lives of Great Men
5. I Vow to thee my
6. National Anthem (English Version)

پانچ تقریریں

1. Education
2. Discipline
3. Freedom
4. The Making of Pakistan
5. Advantages and Disadvantages of Public School Education

ایک ایکٹ کے چھ مختصر کھیل:

1. The Red Jewel

2. Robin Hood & Allan A-Dale
3. The Sword of Democles
4. How He Kept His Word (An Episode From Islamic History.(By Mr Alvi)
5. Shop Assistant
6. A Hilarious Comedy (By Mr Rashid)

اور کالج کی زندگی کی مختلف situations پر مبنی Sixteen Model Dialogues جیسے:

1. Admission to Military College.
2. The story of Military College.
3. On good manners - Meeting old boys.
4. Supplementary reading
5. On examinations
6. In the college hospital
7. Up Before the House Master

اور گرائمر کے لئے ڈبلیو ایلین کی "Livings English Structure" یہ بڑا ambitious نصاب تھا۔ جو سب تو نہیں ہو سکا لیکن جو ہوا وہ بہت موثر (effective) طور پر ہوا۔

28 اپریل 1984ء کو پہلا سبق "Drive the Nail Aright" سے شروع کیا۔ اس نظم کے چار بندوں پر انہوں نے چار دن لگائے۔ اس عمر میں (symbols علامتوں) کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ راشد صاحب نے ہزار مثالوں سے سمجھایا کہ کس کی کیل کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ کمانڈانٹ دفتر میں بیٹھے اپنے حصے کی کیل ڈرائیو کر رہے ہیں۔ میں اپنے حصے کی کیل ڈرائیو کر رہا ہوں اور جی ایچ کیو میں ٹاپ لوگ اپنی کیل ڈرائیو کر رہے ہیں۔ زندگی میں ہر انسان کو ہر لمحہ کوئی نہ کوئی کیل ڈرائیور کرنا ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح انہوں نے ہر علامت کو ہزار مثالوں سے واضح کیا اور کسی کام میں کامیابی حاصل کرنے کی جو تین بنیادی شرطیں ہیں یعنی اس کو صحیح طریقے سے، پوری قوت سے اور بر وقت کیا جائے۔ ان کو انہوں نے نظم کی ان تین سطروں کے حوالے سے ظاہر کیا۔

Drive the nail aright, boys
Hit it on the head,
Strike it with all your might, boys
While the iron's red.

اس نظم کا پانچواں مصرعہ ہے:

When you have work to do boys
Do it with a will

یہاں انہوں نے ول(will) کی تشریح کرتے ہوئے وضاحت کی کہ ''بعض کاموں کو دل سے کرنا آسان ہوتا ہے جیسے جب ماں بچے کی دیکھ بھال کرتی ہے اوراس سے محبت کرتی ہے۔ یا جیسے کوئی بچہ کھیلتا ہے یا کوئی بڑی عمر کا آدمی اپنے شوق کا کوئی کام کرتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ایسا کرنے کی تحریک اندر سے ہوتی ہے۔ لیکن بہت سے کام جو فوری طور پر دلچسپ یا فائدہ مند نہیں ہوتے ان کو دل سے یا پورے ذوق و شوق سے کرنا مشکل ہوتا ہے''۔ ''سر کیوں مشکل ہوتا ہے''۔ میرے منہ سے نکل گیا۔ اس کے جواب میں وہ پھر شروع ہو گئے، بات maturity اور awareness تک پہنچی۔ یہ دو لفظ راشد صاحب کی کمزوری تھے۔ بعض ستم ظریفوں نے ان کا نک نیم ہی maturity رکھ چھوڑا تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے pleasant اور unpleasant task کے فلسفہ کی وہ وضاحت کی جو میرے دل میں اتر گئی، جس نے اس لمحہ سے میری سوچ کا رخ ہی بدل دیا۔ انہوں نے کہا۔ maturity یہ ہے کہ آدمی یہ دیکھے کہ کوئی کام ضروری ہے یا نہیں۔ pleasant یا unpleasant کے چکر میں نہ پڑے۔ پھر وہ دلچسپ مثال دی کہ دیکھو ماں کس طرح اپنے بچہ کا گوموت کرتی ہے۔ اس میں کوئی یوڈی کلون کی خوشبو تو نہیں ہوتی، نیپی گلاب کی پتیاں تو نہیں ہوتیں۔ لیکن ایک ماں کے لئے نیپی بدلنا اس لئے آسان ہوتا ہے کہ بچہ کی فطری محبت اسے یہ ناخوشگوار کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر انسان خود سوچ کر کسی ضروری ناخوشگوار کام کو خوشی سے کر سکے تو یہی maturity ہے اور کامیابی کی کنجی۔ اسی نظم کا آخری بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

'Though you stumble oft, boys never be down-cast'

اس بند پر راشد صاحب نے پورا ایک گھنٹہ صرف کیا۔ اس نکتہ پر انہوں نے بڑا زور دیا کہ stumbling زندگی کا لازمی جز ہے۔ ''گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ جو پہاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرے گا وہ گرے گا ضرور، it is part of the game۔ اس لئے stumbling سے ڈرنا نہیں چاہیے stumbling & climbing ساتھ ساتھ چلتی ہے، کونسا بڑا آدمی، کون سا بڑا موجد یا سائنس دان ہے جس نے climbing کرتے ہوئے stumbling نہیں کی۔ بار بار نا کام نہیں ہوا اور پھر وہ کامیاب و کامران بھی ہوئے۔ They reached the top also۔

ایک شعر ہے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

اقبال کا شعر ہے:

دریا میں موتی اے موج بیباک
ساحل کی سوغات؟ خار و خس و خاک

پھر اقبال کی بات چل نکلی:۔'خواہی حیات، اندر خطر زی'، اگر زندگی چاہیے تو خطرات میں زندگی بسر کرنا سیکھو پر بحث کی۔ ڈارون کے نظریہ "survival of the fittest" کی تشریح کی۔ غالب کا یہ مصرعہ بھی سنایا:

جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اس تمام بحث کو لڑکوں نے کتنا سمجھا، کتنا نہیں سمجھا، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ زندگی کے سفر کے بارے میں کچھ awareness بڑھی۔ ایک بار راشد صاحب نے کلاس میں reproductive اور creative learning کے فرق کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ پڑھنے اور امتحان میں مکھی پر مکھی مارنے کے سخت خلاف تھے۔ خود ان کی teaching تخلیقی (creative) teaching کی ایسی مثال تھی جس سے کم از کم میں زندگی میں پہلی بار اور شاید آخری بار آشنا ہوا اور میں اسے اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں۔ ملٹری کالج میں پڑھنے کا یہ وہ فائدہ ہے جس سے محروم رہنا میری زندگی کی سب سے بڑی محرومی ہوتی۔ ایک اور نظم Big Things and Small Things تھی۔

I can not do the big things
That I should like to do
To make the earth for ever fair And the sky for ever blue
But I can do the small things
That help to make it sweet
Though clouds arise and fill the sky
And tempests beat

اس کو پڑھانے کے بعد پوچھا کہ اس نظم کی جان کونسا مصرعہ ہے۔ جس طرح انہوں نے پڑھایا تھا اس کی

روشنی میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کے ذہن میں کون سا مصرعہ ہے۔
یعنی

But I can do the small things
That help to make it sweet.

پھر وہ شروع ہو گئے، پورا گھنٹہ ان ہی دو لائنوں کی وضاحت پر صرف ہو گیا۔ جس کا حاصل کلام تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی سعادت اور اس سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ انسان دنیا کو یعنی اپنے ماحول کو sweet بنانے کی جدو جہد بلکہ جہاد میں زندگی صرف کر دے۔ اس لئے small things بھی small نہیں ہوتیں۔ زندگی کی sweetnesss چھوٹی چھوٹی خدمتوں، مروتوں اور احسانوں سے عبارت ہے۔ پھر کہا۔ تمہاری "It" تمہاری دنیا، تمہارا کلاس روم، تمہارا ہاؤس، تمہارا کالج ہے۔ تم اپنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی کو sweet بلکہ بہت ہی sweet بنا سکتے ہو۔

"مثلاً" کسی نے پوچھ لیا۔ "یہ کہ گزشتہ سال اسی کلاس میں زندگی کو sweet کرنے کا ایک کلاسیکی واقعہ پیش آیا"۔ "سر وہ کیا تھا"۔ وہ یہ کہ ایک روز کلاس میں سب سے پچھلی قطار کے ایک لڑکے نے شکایت کی "سر! میری نظر کچھ کمزور ہے۔ میں سی۔ ایم۔ ایچ معائنہ کے لئے بھی گیا تھا مجھے بلیک بورڈ پر لکھا دھندلا دھندلا نظر آتا ہے"۔ ابھی اس نے اپنی بات بھی ختم نہیں کی تھی کہ اگلی قطار میں بیٹھا ایک چھوٹا لڑکا اٹھ کھڑا ہوا کہ 'سر میں پیچھے چلا جاتا ہوں عارف میری جگہ آ جائے'۔ God bless him یہ لائف کو sweet کرنے کی ایک واضح اور بہت اچھی مثال ہے"۔ پھر انہوں نے وضاحت کی کہ عدل تمدنی زندگی کی پہلی شرط ہے۔ عدل سے تحفظ security کا احساس ہوتا ہے۔ احسان سے زندگی میں طمانیت sweetness آتی ہے اور ایثار سے تعلقات مربوط و مستحکم ہوتے ہیں اور تعمیر و ترقی یقینی اور تیز تر ہو جاتی ہے۔ گھر کیوں اچھا معلوم ہوتا ہے، ماں کیوں پیاری لگتی ہے۔ اس لئے کہ گھر میں عدل و احسان و ایثار سب ملتا ہے۔ وہاں احساسِ تحفظ ہوتا ہے۔ افلاطون نے عدل (Justice) کو اپنی خیالی ریاست Republic کی بنیاد بنایا ہے۔ حضرت علیؓ کا مشہور قول ہے "کفر سے حکومت قائم رہ سکتی ہے ظلم یعنی عدل کے فقدان سے نہیں"۔

نظم کے آخری دو مصرعوں:

Though clouds arise and fill the sky
And tempests beat.

پر انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ شاعر نے جس پر عزم بچے کا ذکر کیا ہے جو خدمت اور محبت کا پرچم اٹھا کے چلا

ہے۔وہ اس سے بے خبر نہیں کہ اس راہ میں کتنی مشکلات اس کا انتظار کر رہی ہیں۔لیکن اس کا حوصلہ تو دیکھو کہ وہ ہر قیمت پر زندگی کو sweet بنانے پر تیار ہے۔

Though clouds arise and fill the sky
And temests beat

غور کریں کہ پہلے "clouds arise" کہا ہے۔یہ مشکلات کی ابتدائی صورت ہے۔ Fill the sky یہ شدید تر صورت ہے۔ باد و باراں کے شدید طوفان کو جس میں ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ بادل گرجتے ہیں اور بجلیاں کوندتی ہیں Tempests کہتے ہیں۔گویا وہ مجاہد ہر قیمت پر ہر صورت میں احسان وایثار کرنے پر تلا ہوا ہے خواہ اسے اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے۔ایسے ہی لوگ salt of the earth ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لائف کو سویٹ کرنا اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟ کوئی صحیح قدم اٹھانا چاہے تو اس کے راستہ میں مشکلات ، رکاوٹوں اور مزاحمتوں کے طوفان کیوں آتے ہیں؟ اس صورت حال کی وضاحت انہوں نے کلاس روم، ڈارمیٹری، ڈائنیگ روم اور پلے گراؤنڈ کی بے شمار مثالوں سے کی اور وارن (warn) کیا کہ زندگی میں شر بھی ایک حقیقت ہے۔سورۃ الفلق کو یاد کرو من شر ما خلق۔۔۔۔و من شرِ حاسد اذا حسد ۔مسئلہ نیا نہیں۔سقراط کو حق کی خاطر زہر کا پیالہ پینا پڑا۔حسینؓ کا پاک خون فرات کے کنارے بہا۔طائف کے بازاروں میں رحمت العالمین پر کیا گزری۔اور اس کا حل؟ ”وہی جو سورہ العصر میں ہے۔”وتو اصو بالصبر “!

لانگ فیلو کی نظم سام آف لائف (Psalm of Life) کا بند

Lives of great men all remind us.
We can make our lives sublime
And departing, leave behind us
Foot-prints on the sands of time

انہوں نے بہت ذوق شوق سے پڑھایا۔خصوصاً ان آخری دوسطروں

Still achieving, still pursuing
learn to labour and to wait

پر بڑا زور لگایا۔

achieving اور pursuing کے بارے میں اقبال کو quote کیا۔

تو رہ نورد شوق ہے منزل نہ کر قبول

کچھ حاصل کر کے complacent ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیئے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ امتحان پاس کیا، نوکری کی، کمیشن لیا یا کسی پروفیشن میں گئے اور پڑھنا بند، مطالعہ ختم، روشنی کی تلاش معطل اور تن آسانی کی زندگی شروع۔ کچھ achieve کرنے کے بعد pursue کرتے رہنے میں ترقی کا راز ہے۔ نظم کے آخری الفاظ بھی توجہ چاہتے ہیں۔

Learn to labour and to wait.

کوشش کرنا اور مسلسل کرتے رہنا سیکھو۔ کسی کو کامیابی فوری طور پر نصیب نہیں ہو جاتی۔ جدو جہد کا طویل راستہ طے کرنا پڑتا ہے اور پھر صبر سے انتظار کرنا پڑتا ہے، یہ جو صبر ہے، patience ہے اس میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے 'Eventually it is patience that wins'

ایمرسن کی نظم A Nation's Strength جس کا پہلا بند ہے۔

Not gold but only men can make,
A people great and strong
Men who, for truth and honour's sake
Stand fast and suffer long

پڑھانے سے پہلے انہوں نے انیسویں صدی کے اس امریکی شاعر کے بارے میں بتایا کہ وہ مذہبی مبلغ (preacher) شاعر، انشائیہ نگار اور دانشور بہت کچھ تھا۔ پھر انہوں نے انیسویں صدی کے امریکی معاشرہ کے غالب معاشی اور معاشرتی رجحانات کا تجزیہ کیا کہ کس طرح امریکہ میں گولڈ یعنی معاشی ترقی ہی کو سب کچھ سمجھا جانے لگا تھا۔ اس وقت ایمرسن نے وارن کیا کہ اپنے قبلہ کو درست کرو۔ پھر اس نے great اور strong ہونے میں فرق کیا اور دونوں قسم کی ترقی کو کردار کے ساتھ مشروط کیا اور پھر کردار کی صفات کی بھی وضاحت کی۔

انہوں نے زور دے کر کہا یہاں بھی stand fast اور suffer long کے الفاظ توجہ طلب ہیں۔ suffering ہر اچھے انسان کا مقدر ہے، پھر جس کو جم کر کھڑا ہونا ہے، جس میں standing fast کا حوصلہ ہے اس کو بہت کچھ برداشت بھی کرنا پڑے گا۔ اسے صبر بھی بہت کرنا پڑے گا۔ اور صبر کا اپنا اجر ہے، اپنی طاقت ہے، اپنی تاثیر ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا ہے۔

How sublime it is to suffer
long and be strong

سر راشد نے ایمرسن کا تعارف کراتے ہوئے اس کے مضامین کے مجموعہ 'Essays of

'Emerson کا ذکر کیا تھا۔ خاص طور پر اس کے 'Law of compensation' نظریہ تلافی کا۔

کہنے لگے میں اس نظریہ پر ایمان رکھتا ہوں۔ قدرت رحیم و کریم ہے۔ قدرت کچھ چھینتی ہے تو کچھ دیتی بھی ہے۔ اگر کوئی handicap ہے تو اس کی تلافی کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کسی کو دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر Life is a whole. Luck is a whole کسی ایک نقص، کسی ایک کمال پر سارا فیصلہ نہیں ہوتا۔ یہاں انہوں نے Inferiority complex اور inferiority feeling کا فرق بھی واضح کیا۔ فرمایا inferiority کا احساس ایک بہت بڑا محرک بن جاتا ہے بہتر بننے کا اور تلافی کی کوشش کرنے کا۔

اب میں انگریزی کی ٹیکسٹ بک حصہ اوّل کے چند سبقوں کا ذکر کروں گا کہ وہ نثر کس طرح پڑھاتے تھے۔ کتاب میں پہلا سبق "The wizard of science" مارکونی کے بارے میں تھا۔ سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے کہا کہ سب لڑکے مارکونی کے بارے میں New Age انسائیکلو پیڈیا سے پڑھ کر آئیں۔ انہوں نے الفاظ کے مطالعہ اور حوالہ جاتی (reference) مطالعہ کے لئے ایک علیحدہ کاپی بنوا رکھی تھی۔ گویا انہوں نے ہمیں ریسرچ کے طریقے سے آشنا کیا۔ سبق میں ایک جگہ یہ تھا کہ مارکونی کے باپ نے جو ایک مالدار تاجر تھا پہلے پہل اسے یا اسکے کام کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی کوئی مدد نہیں کی تا آنکہ وہ برقی پیغام رسانی کے تجربہ میں کامیاب نہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے کہا'' آپ لوگ کتابیں بند کر دیں اور اس امر پر غور کریں کہ ایسا کیوں ہوا اور ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جینئس کو نظر انداز کیوں کیا جاتا ہے؟ اور سب سے پہلے گھر والے حتیٰ کہ استاد تک جینئس کو سمجھ نہیں پاتے۔ نیوٹن ہو یا مارکونی یا ایڈیسن سب کو discouragement سے واسطہ پڑا لیکن انہوں نے discourage ہونے سے انکار کر دیا؟ discourage کیوں کیا جاتا ہے؟ وجہ ظاہر ہے کہ والدین ہوں یا اساتذہ وہ ordinary انسان ہوتے ہیں۔ ان کے لئے غیر معمولی extra-ordinary جینئس قسم کی اولاد یا طالب علم کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً مارکونی کا باپ ایک عام دنیادار تاجر تھا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ بیٹا بھی کاروبار میں حصہ لے اور پیسہ کمائے۔ وہ کیا جانے کہ اس کا بظاہر عام سا بیٹا اندر سے imaginative جینئس ہے، تخلیقی ذہن رکھتا ہے اور ایک دن انسانیت کا محسن بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یاد رکھئے انسان مانوس چیزوں کو پسند کرتا ہے۔ مانوس ماحول میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ اجنبی آدمی کو ہی نہیں اجنبی خیال کو بھی ایک عام انسان مسترد کرتا ہے۔ یا اس سے بچتا ہے۔ اسلئے وہ لوگ جو عام لوگوں سے اپنے طرزِ احساس کی بنا پر مختلف ہوں

ہمیشہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں حتیٰ کہ انکے اپنے خاندان کے لوگ بھی انکو سمجھ نہیں پاتے۔ڈاکٹر جاوید اقبال جسٹس سپریم کورٹ، علامہ اقبال کے صاحب زادے نے اپنی کتاب "مے لالہ فام" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ اقبال کی چہیتی بیگم (سردار بیگم) نے ان سے کہا ''یہ آپ کیا بستر میں پڑے شعر کہتے رہتے ہیں، کوئی کام کیا کریں''۔گویا ایک مملکت کی تخلیق کوئی کام نہ تھا۔ایک عام گرہستن خاتون کی حیثیت سے ان کی ذہنی پرواز اتنی ہی تھی کہ وہ چند سو یا چند ہزار روپے ماہانہ کمانے کو زندگی کی معراج سمجھیں۔جو کچھ اقبال کے ساتھ ہوا وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔سقراط کی بیوی نے اسکا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔شیکسپیئر اپنی نصف بہتر سے بہت تنگ تھا۔بوڑھے ٹالسٹائی کو اسکی محترمہ نے اتنا عاجز کیا کہ اسے گھر چھوڑتے ہی بنی اور 1910 میں اس نے ایک ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں جان دی۔غالب کی زوجہ امراؤ بیگم بھی کچھ کم نہیں تھیں۔ماشااللہ''

''کیا یہ محض اتفاق تھا یا سب بڑے آدمیوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے''

''ایک حد تک تو اتفاق ہی تھا۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک جینئس دوسرے عام انسانوں سے اپنی سوچ اور احساس کے اعتبار سے مختلف اور ممتاز ہوتا ہے۔دوسرے عام انسان اسکو سمجھ نہیں پاتے۔میں کہنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ مارکونی کے ساتھ ہوا، وہ کل تمہارے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ہر ذہین آدمی کو اپنی ذہانت کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔لیکن مارکونی کی طرح Still achieving and still pursuing learn to labour and to wait پر کاربند رہنا۔اس کتاب کا دوسرا سبق 'کولمبس' تھا۔اسکو پڑھانے کے بعد پوچھا کہ اس سبق کا سب سے قیمتی فقرہ کونسا ہے۔کسی نے کچھ بتایا کسی نے کچھ تو انہوں نے اشارہ دیا کہ وہ فقرہ جس سے کولمبس کے کردار کی اس خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے جس نے بالآخر اسے کامیابی سے ہمکنار کیا۔یہ اشارہ پاکر فاروق نے ہاتھ اٹھا کر فقرہ پڑھا۔

صحیح جواب سن کر بہت خوش ہوئے، پھر انہوں نے بھرپور وضاحت کی۔''کولمبس کے ملاحوں نے اسلئے بغاوت کی تھی کہ ان کا علم بھی کم تھا اور کردار بھی۔conviction اور courage دونوں کی کمی تھی۔کولمبس ڈٹا رہا کیونکہ اسکا علم بھی زیادہ تھا اور اس میں ضروری patience بھی تھا۔بڑا کام بڑا حوصلہ چاہتا ہے اور ہر بڑے آدمی کا ایک vision ہوتا ہے۔آپ میں سے ہر ایک اپنی اپنی دنیا کا explorer ہے۔آپ لوگوں کو بھی مزاحمتیں موجود ہوتے ہوئے اپنے راستے پر گامزن رہنا پڑے گا۔جن crises سے بڑے بڑے ہیروز کو واسطہ پڑتا ہے، انہیں مرحلوں سے مختلف صورت میں ایک عام انسان بھی گزرتا ہے''۔

اسی سبق میں کولمبس براعظم امریکہ کی عظیم دریافت کے بعد واپس لوٹا تو دوسرے امیر امراء اس کے دعویٰ پر یقین ہی نہیں کرتے تھے۔انہوں نے اس امر کی وضاحت بھی کی کہ وہ یقین کیوں نہیں کرتے تھے۔ جب اس سبق میں کولمبس کی گرفتاری، پابہ زنجیر ہونے اور معزولی کا ذکر آیا تو انہوں نے پھر کہا ''دیکھو تاریخ کا فیصلہ کیا ہے؟ کون زندہ ہے؟ حاسدوں، تنگ نظروں اور جاہلوں کا انجام کیا ہوا؟ دنیا میں جہاں بھی کوئی کولمبس ہے، جسے کوئی نئی دنیا دریافت کرنے یا کوئی نئی دنیا بنانے کا شوق ہے وہ کولمبس کی زندگی پر نظر رکھے''۔

ایک سبق جاپانی بچوں پر تھا۔اسکو پڑھاتے پڑھاتے ایک چونکا دینے والا سوال پوچھا،''کیا جاپان میں پاکستانی بچوں کے بارے میں بھی اسطرح پڑھایا جاتا ہوگا؟'' لڑکے ہنس پڑے۔تو وہ آزردہ ہوگئے بولے،''میں آپ کے ہنسنے کا مطلب سمجھتا ہوں۔ خدا کرے وہ وقت آئے جب پاکستانی بچوں پر بھی دوسرے ملکوں میں سبق پڑھائے جائیں۔ پاکستان دنیا میں وہ واحد ملک ہے جس کا نام اسکی پہچان ہے، جسکے نام میں اسکا آئیڈیل پنہاں ہے''۔ پھر قائداعظم کا یہ قول نقل کیا کہ پاکستان کو بنانا اس کو حاصل کرنے سے زیادہ مشکل ہوگا۔

ایک سبق شاہ عبدالطیف بھٹائی پر بھی تھا۔آخر میں کہا، اس سبق کا خلاصہ یہ مصرع ہے، میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے''۔ پھر پوچھا،''کسی بھٹائی سے ملے ہو؟ تمہارے اردگرد کوئی بھٹائی ہے؟'' ایک لڑکے نے جواب دیا''جی ہاں، ملا ہوں''۔''کہاں؟''،''اپنے گھر میں۔میرے بڑے بھائی میرے بھٹائی تھے''۔ یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔''تم اس سبق کو سمجھ گئے ہو'' پھر فرمایا،''سبق پڑھنے کا بنیادی مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اس پر امتحان میں سوال پوچھے جائیں۔سبق کی روح کو روح میں اترنا ہوتا ہے۔'' ہماری کتاب میں دو سبق ستمبر 65ء کی جنگ کے حوالے سے بھی تھے۔سیالکوٹ اور بی۔آر۔بی پاکستان کی دفاعی لائن جسکو دشمن کبھی عبور نہ کرسکا۔اس لئے کہ اس کو عبور کرنے ہی نہیں دیا گیا۔پھر پوچھا''تمہاری بی آر بی کہاں ہے؟'' سوال خاصا مبہم تھا۔لڑکے چکرائے بہرحال سوال و جواب سے وہ اس مرحلہ پر لے آئے کہ لڑکے بی آر بی کی علامت (symbol) کو سمجھ سکیں۔آخر میں کہا''تمہاری بی آر بی تمہارا کلاس روم ہے تمہارا ہاؤس تمہارا کالج ہے۔اسکو اپنا سمجھو گے، اس کی دیکھ بھال کرسکو گے تو سمجھو کہ پاکستان تمہارے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔کہا جاتا ہے واٹرلو کی جنگ ایٹن اسکول کے کھیل کے میدانوں میں جیتی گئی تھی۔ ہاں یاد آیا۔آج کی ریفرنس اسٹڈی کے لئے واٹرلو، لارڈ نیلسن اور ایٹن نوٹ کرلو''۔

انگلش بک ٹو میں ایک باب جمال الدین افغانی پر تھا۔اس ضمن میں پین اسلام ازم کا تذکرہ بھی آیا۔

ایک ہو ں مسلم حرم کی پا سبا نی کے لئے
نیل کے سا حل سے لے کر تابخاک کا شغر

لیکن راشد صاحب نے ایک اور نکتے کو ابھارا کہ جمال الدین افغانی کی اتنی مخالفت خود اسلامی ملکوں میں کیوں ہوئی؟ اگر یہ شبہ صحیح ہے کہ انہیں اپنوں نے زہر دلوایا تو کیوں؟ انہوں نے یہ بھی پوچھا۔ جمال الدین افغانی پر کون کون سی نظموں کے مصرعے صادق آتے ہیں۔ جواب آیا Big things and small things کا though clouds arise and fill the skies and tempests beat اور Lives of Great men کا یہ مصرعہ: Still achieving and still pursuing

A Nation's Strength کے یہ مصرعے:

Men who for truth and honour's sake

stand fast and suffer long

جب جون آف آرک پڑھانے کی باری آئی تو راشد صاحب New Age انسائیکلو پیڈیا کی پانچویں جلد خود اپنے ساتھ لائے۔ (یہ امر معمول کے خلاف تھا) عموماً وہ ریفرنس اسٹڈی لڑکوں سے کرواتے تھے۔ غالباً موضوع کی اہمیت کے پیش نظر وہ انسائیکلو پیڈیا لائے، تصویر بھی دکھائی۔

اس دن ان سے پڑھنے کا بہت مزہ آیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ خود جون سے بہت متاثر ہیں۔ اس کے جلانے کے واقعہ تک پہنچتے پہنچتے وہ کچھ اداس ہو گئے۔ بولے اب جون کو ایک ولیّہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اب وہ Saint Joan ہے اس پر برنارڈ شاہ نے اسی نام سے ایک ڈراما بھی لکھا ہے۔ انہوں نے اس سبق پر جو سوالات پوچھے، وہ بہت دلچسپ اور خیال انگیز تھے۔ مثلاً ایک دیہاتی والدین کی اَن پڑھ بچی جس نے کسی ملٹری اکیڈمی کا نام تک نہیں سنا تھا، وہ اتنی زبردست کمانڈر کیسے بن گئی کہ Orleans کے مقام پر انگریز فوجوں کو شکست دے کر فرانسیسی بادشاہ چارلس کے سر پر تاج شاہی رکھ سکے؟ وہ کونسی قوت تھی جس نے اسے اتنا طاقت ور بنا دیا تھا۔ چارلس نے اپنی محسنہ کو قید میں کیوں ڈالا۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اپنے ہی دغا کیوں کرتے ہیں؟ اور ایک سوال یہ تھا کہ آپ نے کسی جون آف آرک، کسی مشن کے دیوانے انسان کو دیکھا۔ خود کبھی وہ آگ محسوس کی ہے جو جون آف آرک کے دل میں اپنے وطن کے لئے اپنے مذہب کے لئے بھڑکی ہوئی تھی۔ آخر میں ایک سوال جو انہوں نے امتحان میں بھی پوچھا یہ تھا کہ جمال الدین افغانی، جون آف آرک، کولمبس اور مارکونی میں کونسی کرداری صفت مشترک تھی؟

Determination to hold on to their course, courage in the face of increasing difficulties

'الحمرا' پڑھاتے ہوئے انہوں نے غرناطہ کی کنجیاں فریڈرک کے حوالے کرتے ہوئے ابوعبداللہ کے آنسوؤں کا حوالہ بھی دیا جنہیں دیکھ کر ابوعبداللہ کی ماں نے کہا تھا کہ "جب تو مردوں کی طرح لڑ نہیں سکا تو عورتوں کی طرح آنسو کیوں بہاتا ہے"۔ پھر پوچھا اسپین میں مسلمانوں کا وہ حشر کیوں ہوا جو ہوا؟

"نااتفاقی"؟

"بیٹے اسکا جواب نسیم حجازی کے ناولوں سے بہت آگے ہے۔" "پھر آپ بتائیں"۔ "میرا کام جواب دینا نہیں آپ کو جواب دینے کے قابل بنانا ہے۔ اشارہ کے طور پر صرف ایک کتاب کا حوالہ دوں گا۔ "قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ" از ڈاکٹر آغا افتخار حسین 'مجلس ترقی ادب' کلب روڈ لاہور نے چھاپی ہے اسے پڑھو گے تو آنکھیں کھل جائیں گی۔"

آخر میں دو اور نظموں کا حوالہ بھی دوں گا جو راشد صاحب نے اپنے منفرد تخلیقی انداز میں پڑھائیں۔ ان میں سے ایک Fred E. Weatherly کی نظم تھی "unless" جس میں ایک بچہ تالاب میں ایک مچھلی کو مزے سے تیرتے دیکھ کر یہ آرزو کرتا ہے کہ کاش میں مچھلی ہوتا تا کہ اسکول سے، ہوم ورک سے، صبح کے نہانے اور صبح شام کپڑے بدلنے سے تو نجات ملتی۔ جواب میں مچھلی کہتی ہے وہ تو ٹھیک ہے unless تمہارے گلے میں کانٹا نہ پھنسے اور تم شکاری کا شکار نہ ہو جاؤ۔ اس نظم کو بھی راشد صاحب نے بڑے اہتمام سے پڑھایا۔"

"اس کا عنوان اردو میں بتاؤ۔

"جب تک کہ نہیں"۔ "ایک بچہ اور مچھلی"۔ "ایک شریر بچہ"

غرض جتنے لڑکے تھے اتنے جواب آئے۔ آخر میں بولے۔ "اس کا عنوان 'تمناؤں کی نادانیاں' بھی ہوسکتا ہے۔ بچہ کی نظر مچھلی کی ظاہری آزادی پر ہے، انجام پر نہیں۔ بچہ کی دنیا میں آج ہوتا ہے کل نہیں۔ وہ خواہش (wants) کا اسیر ہوتا ہے۔ ضروریات needs سے بے خبر"۔ پھر انہوں نے wants اور needs کے اہم concept کی وضاحت کی۔ "آدمی پیدا ہوتا ہے انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔ بچہ کو ہم immature اس لئے کہتے ہیں کہ وہ (wants) کے پیچھے تو بھاگتا ہے اپنی needs کا اسے شعور بھی نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس کی ترجیحات صحیح نہیں ہوتیں۔ زندگی میں سارا کھیل priorities کے تعین کا ہے۔"

ایک اور نظم تھی۔ I like boys the best اس میں شاعر نے لڑکوں کا مقابلہ لڑکیوں سے کیا۔

ناخن میں میل بھرا ہوا، بال الجھے ہوئے، جیبیں الا بلا چیزوں سے بھری ہوئیں، ہر وقت مار دھاڑ پر آمادہ۔ شاعرہ کہتی ہے پھر بھی لڑکوں کو پسند کرتی ہوں۔ لڑکیاں پیاری پیاری من موہنی، صاف ستھری، سلیقہ سے بال گندھے ہوئے، لباس نفیس، قیمتی زیورات سے آراستہ رانی مہارانی بننے کے قابل لیکن میں لڑکوں کو پسند کرتی ہوں۔ اسی طرح شروع کے بندوں میں لڑکیوں کی خوبیاں گنوا کر اور لڑکوں کی بدتمیزیوں کو دوہرا کر ہر بار کہتی ہے کہ I like boys the best۔ چوتھے بند میں شاعرہ کہتی ہے ان میں سے کسی کو سپاہی بننا ہے، کسی کو ملاح، کوئی وزیر بنے گا اور کوئی گورنر۔ اس لئے I like boys the best۔ ان کی بہت سی خامیوں کے باوجود آخر شاعرہ لڑکوں کو ترجیح کیوں دیتی ہے۔ "اسکا جواب چوتھے بند میں ہے۔ چونکہ وہ کسی نہ کسی طرح قومی خدمت کریں گے۔ کسی نہ کسی حیثیت سے قوم کے لئے قربانی دینے کے لئے تیار ہونگے۔ زور کس پر ہوا؟ خدمت پر، قربانی پر۔ تو شاعرہ لڑکوں کو انکے لڑکے ہونے کی وجہ سے نہیں ان کے patriotism کی وجہ سے پسند کرتی ہے۔ ان کے اس انداز سے پڑھانے سے نصاب تو آدھا بھی ختم نہیں ہوا۔ لیکن جو پڑھ لیا اس نے، ان ہی کے الفاظ میں awareness کے دریچے کھول دیئے۔

یہاں میں نے صرف انکے نظم و نثر پڑھانے کے انداز کو ریکارڈ پر لانے کی کوشش ہے۔ جہاں تک زبان پڑھانے سکھانے کا تعلق ہے، اسکا بھی جواب نہیں تھا۔ ہر روز تین لفظوں کا مطالعہ ڈکشنری سے، ہر روز ایک ریفرنس اسٹڈی، انسائیکلوپیڈیا سے، ہر روز پانچ جملے Living English Structure سے، یہ ان کا معمول تھا۔ امتحان کے قریب 30 جنوری سے 13 مارچ تک ہر روز بلا ناغہ پانچ جملوں کا ٹیسٹ لینے کا ریکارڈ بھی انہی کا ہے۔

1984-85ء کا ایک اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو شاید کسی اور نے نہ لکھا ہو۔ ایک لڑکا تھا جو کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اسکا پیٹ خراب تھا۔ وہ بروقت باتھ روم نہ جا سکا اور کپڑے خراب ہو گئے۔ اسکی بو پھیلی تو راشد صاحب نے اسی وقت اس لڑکے کو پتلون بدلنے ہاؤس بھیجا۔ اسکے جاتے ہی کلاس کو اتنی دل سوزی سے سمجھایا کہ اب اس سے کچھ نہیں کہنا، یہ حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ آخر میں یہ بھی کہا ''اگر کسی نے اس کا نوٹس لیا اور اسکا تماشا بنایا تو مجھے ذاتی طور پر تکلیف ہو گی''۔ مختصر یہ کہ دس پندرہ منٹ کے بعد جب وہ لڑکا واپس آیا تو خود انہوں نے اسکا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ وہ آکر چپکے سے بیٹھ گیا اور وہ نارمل طریقے سے پڑھاتے رہے۔ غرض انکے سمجھانے کا انداز اتنا موثر تھا کہ بات باہر نہیں نکلی اور لڑکا شرمندگی سے بچ گیا۔ راشد صاحب کی قابلیت اپنی جگہ انکی جو یہ human side تھی، میں تو اس کا قائل ہوں۔ اچھا اور لائق معلم بھی مل جاتا ہے لیکن اچھا انسان کمیاب تر ہے۔

جی سی محمد طاہر اقبال

(کالج نمبر4759،زمانہ تعلیم 1987-1984ء)

سر راشد سے 85-1984ء میں ایک سال انگریزی پڑھی تھی۔ پھر دو سال کلاس روم میں یا باہر کوئی رابطہ نہ رہا۔ آتے جاتے بظاہر رسمی علیک سلیک ہوتی رہی۔ میں سمجھا کہ شاگردوں کے ہجوم میں سر راشد مجھے بھول چکے ہونگے۔لیکن جون 1987ء کے اواخر میں، جب میں والد صاحب کے ساتھ اپنا میٹرک کا رزلٹ لینے کالج گیا تو وہاں سی آئی کے دفتر کے سامنے سر راشد مل گئے۔ دیکھتے ہی پہچان لیا۔'' طاہر ہو؟ ماشا اللہ۔ بہت اچھے نمبر لئے ہیں''۔ پھر والد صاحب کو اور مجھے مبارکباد دی اور والد صاحب سے کہا'' جب آپ دفتر سے فارغ ہو جائیں تو شیر شاہ ہاؤس میں مجھ سے ملتے جائیں'' والد نے جواباً کہا،'' پتہ نہیں یہاں سے فارغ ہوتے ہوتے کتنی دیر لگے۔ ابھی سیکورٹی بھی لینا ہے۔ اسکے ہاؤس ماسٹر صاحب چھٹی پر ہیں اسکی تصدیق کون کرے گا''، ''تصدیق میں کئے دیتا ہوں''۔انہوں نے سی آئی صاحب کے سامنے جا کر میری تصدیق کر دی اور میرا کام ہوگیا۔ پھر وہ ہم دونوں کو اپنے گھر لے آئے خاطر تواضع کے بعد فرمایا:

''صوبیدار صاحب! میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف اس لئے دی کہ مجھے آپ کے بیٹے میں پاکستان کے حوالے سے کچھ interest ہے۔اس کا promise بہت زیادہ ہے۔ یہ بچہ آپ ہی کے نہیں انشاءاللہ ایک دن پاکستان کے کام بھی آئے گا۔ یہ محنتی ہے، ذہین ہے، ہونہار ہے لیکن اس میں ایک خامی ہے کہ اسکا مطالعہ بہت کم ہے۔اسکی تمام تعلیم reproductive ہے کتابی ہے، تخلیقی نہیں۔ تفکر اور تدبر کے عنصر کی کمی ہے۔ کمیشن تو اسکو مل ہی جائے گا۔اس کے calibre کے لئے وہ کوئی مسئلہ نہیں۔مسئلہ آرمی میں کیریر بنانے کا ہے۔جسکو مطالعہ اور تفکر کی بہت وسیع بنیاد چاہیئے''۔ پھر ہنس کر کہا ''جو کچھ اور جس طریقے سے اس نے اب تک پڑھا ہے وہ point22 کی گن ہے۔اس سے کمیشن کی مرغابی کا شکار تو ہوسکتا ہے لیکن آرمی میں کیریر کا شیر قابو میں نہیں آسکتا۔اس کے لئے 12 بور کی بندوق چاہیے۔ میرا مطلب ہے علم اور تجربہ کی وسیع تر بنیاد چاہئے۔جس گائے کے دودھ سے کریم نکالنا ہوا سے کھل بھی ڈالنا پڑتی ہے''۔ پھر کھل کے طور پر انہوں نے مجھے ازخود اپنی الماری سے پانچ کتابیں جے سی بی میں جانے سے پہلے پڑھنے کے لئے دیں۔

نقوش قائداعظم

اسلام کے نامور سپہ سالار

Some Unpleasant People

مارک ٹوئن کی Adventures of Huckleberry Fin
اور Tom Brown's school days ساتھ یہ بھی کہا ڈاکٹر اشتیاق حسین کی
The struggle for Pakistan بھی ضرور ''واہ'' کے کسی کالج سے لے کر پڑھ لینا،
بڑے کام کی کتاب ہے اسوقت میرے پاس نہیں۔ چلتے ہوئے میں نے کہا،'' سر، مجھے کوئی آٹوگراف
دیجئے''۔ انہوں نے کہا'' آجکل کراچی سے عظیم سرور صبح سویرے ایک بہت اچھا پروگرام کر رہے ہیں
"صبح پاکستان" اس میں ایک ملی ترانہ آتا ہے۔

یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو پاسبان اسکے

یہی میرا پیغام ہے لاؤ اسکو لکھ دوں۔

محمد قمر الاسلام

(کالج نمبر 4804 زمانہ تعلیم 1985-1988ء)

شیر شاہ ہاؤس میں نئے لڑکوں کے لئے ایک ایک آٹوگراف بک لینا لازمی ہوا کرتا تھا۔ سر راشد خود اپنا آٹوگراف سال کے آخری دن دیتے تھے۔ ایک روز ہاؤس آفس کی میز پر میں نے ان کا اپنا collection of quotations دیکھا۔ وہ اکثر اسی مجموعہ میں سے آٹوگراف دیا کرتے تھے۔ بہرحال میرے حصے میں یہ آٹوگراف آیا'' سفر دو ہیں، ایک اشخاص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کئے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لئے قربان کر دیں۔ جب انہوں نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا اور وہ کامیاب ہو گئے۔ ان کے لئے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں؟ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے۔ اس لئے جس مسافر نے اس مقصود کو پالیا، اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں، ایک ہی ہیں۔ باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اسکی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں ہے۔ جو بیج انسان بوتا ہے اس سے پیڑ اگانا خدا کا کام ہے۔ جو سورج چمکاتا اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اسکا قانون یہ ہے کہ اگر رہروانِ مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا مقصد پورا کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔ (ماخوذ از 'آزادی ہند' از مولانا ابوالکلام آزاد)۔

یہ تو آٹوگراف تھا لیکن زبانی بھی انہوں نے ایمرسن کا ایک قول بار بار دہرایا۔ ''سکولوں اور کالجوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ تعلیم نہیں ہے۔ صرف حصول تعلیم کا ذریعہ ہے''۔ غالباً اسی لئے وہ نصاب سے باہر زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی بہت تاکید کرتے تھے۔ آٹھویں درجہ میں ایجوکیشن پر جو تقریر

انہوں نے زبانی یاد کروائی تھی، اس میں بھی ایجوکیشن کے تین ہدف بتائے گئے تھے۔

Learning to learn
Learning to think
Learning to evaluate

اور اس کے بعد یہ جملہ تھا:

Education is a process of discovering possibilities - possibilities of development, possibilities of improvement and possibiliteis of growth.

ایک اور تقریر کا موضوع 'Discipline' تھا۔ اس کا پہلا اور دوسرا پیرا یہ تھا۔

Discipline means learning. Learning to organize oneself to grow, to develop, to improve. Discipline means learning to be free, learning to be creative, learning to be happy and learning to be successful. Discipline is freedom. To be more disciplined is to be more free. Discipline is power. To be more disciplined means to be more powerful, more effective and more efficient. Discipline is security too. To be more disciplined is to be more secure and more confident. What is a song? Discipline of sounds; what is a dance? Discipline of movements. What is a picture. Discipline of lines and colours.

تیسری تقریر جو لازمی طور پر یاد کرنی پڑتی تھی اس کا عنوان "Freedom" تھا۔

To be free means to be free to choose, choosing implies thinking, for you cannot make a choice unless you think about the possible advantages and disadvantage of choice. So only he can choose better who can think better. And only he can think better who is better educated. So ultimately to be really free is to be better educated. Freedom involves responsibility. To be free is to be responsible and to be more responsible is to be more free. Those who are not responsible or do not want to be responsible, feel a fear of freedom. They wish to escape freedom by one means or the

other. Irresponsibility or indiscipline is only a means of escape from freedom.

اس تقریر میں ایک فقرہ اور بھی تھا:

> Freedom is of two types;
> Freedom from and Freedom for.

ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ فقرہ Eric Fromme کی مشہور کتاب Fear of Freedom میں آتا ہے۔ جب ذہنی طور پر خوب mature ہو جاؤ تو پڑھنا اور روشنی کی لہروں کو اپنے ذہن سے نکلتے دیکھنا۔ فریڈم پر یہ تقریر بھی بڑی حد تک اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

پتہ نہیں وہ ہمیں کیا سمجھتے تھے اور ہم سے کیسی کیسی توقعات باندھے بیٹھے تھے کہ ایسی ایسی اونچی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ غالباً وہ غلط جگہ آ گئے تھے۔ لیکن خود ان کا اصرار تھا کہ صحیح جگہ پر ہوں۔ انہوں نے جو آٹوگراف مجھے دیا اس کے حوالے سے ان کے ذہن میں جھانکا جا سکتا ہے۔ اگر ان کے دیئے ہوئے دوسرے آٹوگرافوں کو بھی اکٹھا کر لیا جائے تو ان کی ترجیحات کی مکمل تصویر سامنے آ سکتی ہے۔

جی سی ضیاء الدین

(کالج نمبر 4842، زمانہ تعلیم 1985-1988ء)

سر راشد کی یادگار میرے پاس ان کا یہ آٹوگراف ہے۔

If you think you are beaten, you are
If you think you dare not, you don't
If you like to win, but think you can't
It is almost certain, you won't
If you think you'll lose, you are lost
For out of the world we find
Success begins with a fellows' ' will'
It's all in the state of mind.

راشد

جی سی علی اسد

(کالج نمبر 4849، زمانہ تعلیم 1985-1988ء)

شیر شاہ ہاؤس ایک ہاؤس ہی نہیں ایک ادارہ تھا، اس میں واضح طور پر ذہنی اور کرداری تربیت کا ایک

نصاب تھا۔ ذہنی بیداری کے لئے مطالعہ کی تحریک تھی۔ تحقیقی جو ہر کو ابھارنے اور چمکانے کے لئے ادبی مجلس تھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ نصاب سے آگے بڑھنا اور سوچنا بچوں کا اوڑھنا بچھونا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ لائبریری دن رات یوں کھلی رہتی تھی جیسے قہوہ خانہ کھلا رہتا ہے اور ہجوم بھی اتنا ہی ہوتا تھا۔ لائبریری میں کوئی رجسٹر نہ تھا۔ جس میں کتاب لینے دینے کا کوئی اندراج کرنا ضروری ہو۔ جس کا جی چاہے رات کے سونے کے اوقات اور لازمی ڈیوٹی کے اوقات کے سوا آکر پڑھے یا ڈارم میں لے جائے۔ اتنی آزادی تو بچے کو اپنے گھر میں بھی نہیں ہوتی۔ اسے بھی کسی سے پوچھنا پڑتا ہے۔ اس طرح ڈارمیٹری میں تالے لگانے کا رواج بھی نہ تھا۔ لائبریری کے اس طرح فنکشن کرنے سے لڑکوں کے کردار پر جو لاشعوری طور پر اثر پڑا وہ معلومات حاصل ہونے سے بھی زیادہ قیمتی تھا۔ لڑکوں نے سماجی زندگی کا سب سے قیمتی اصول باہمی اعتماد اور ذمہ داری، بڑی خاموشی سے سیکھ لیا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ بہت سے وہ لڑکے جنھوں نے اس سے پہلے شاید نصاب سے باہر کوئی کتاب نہ دیکھی تھی وہ (Emile the Detective, Secret Seven اور Hardy Boys پڑھنے لگے۔

شیر شاہ ہاؤس کی ایک اور خوشگوار اور فکر افروز یاد 6 ستمبر 85ء کی تقریب ہے۔ اس روز صبح سویرے باجماعت نماز ہوئی جس میں راشد صاحب خود بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد ہم ڈارم وائز یادگار شہدا پر گئے، وہاں قرآن خوانی ہوئی۔ فاتحہ کے بعد ہر لڑکے نے پھول کی ایک ایک پتی یادگار شہدا کے دونوں کتبوں پر چڑھائی۔ گلاب کی وہ سرخ پنکھڑی آج تک خون شہیداں سے میرا رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔

اسی طرح دسویں محرم پر انہوں نے ہاؤس میں فنکشن کرایا۔ گو بیشتر لڑکے چھٹی چلے گئے تھے لیکن جو باقی رہ گئے تھے انہوں نے یہ فنکشن کیا۔ خود میں نے سر راشد کی دی ہوئی ایک تقریر کی، عنوان تھا 'شہید اعظم' (یہ تقریر اب، شاد باد منزل مراد، میں شامل ہے)۔ رات کو انہوں نے کراچی کی مشہور مجلس شام غریباں سنوائی۔ ایک اور بات، شیر شاہ ہاؤس کی یوم اقبال، یوم قائداعظم، عید میلادالنبی ﷺ وغیرہ کی تقریبات موسیٰ ہال کی تقریبات کے علاوہ ہوتی تھیں اور ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ہر بار لڑکوں کی ایک بڑی تعداد حصہ لیتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو حصہ دینے کے لئے انہوں نے ایک خاص تکنیک وضع کی تھی۔ اقبال، قائداعظم، میلادالنبی ﷺ، کے بارے میں معلومات سوال و جواب کی شکل میں پیش کی جاتی تھیں۔ ایک تقریر کا ایک ایک پیراگراف الگ الگ لڑکوں کو دیا جاتا تھا۔ راشد صاحب اس طرح کی ہر تقریب کے لئے خصوصی مذاکرے لکھتے تھے اور ایک مذاکرہ میں کم از کم چھ سات لڑکے حصہ لیتے۔ (یہ مذاکرے بھی اب ان کی کتاب، شاد باد منزل مراد، میں شامل ہیں)۔ شیر شاہ ہاؤس کا آخری فنکشن وہ تھا جو

7فروری 87ءکوکالج میں پیش کیا گیا تھا، جس کے مہمانِ خصوصی کمانڈانٹ بریگیڈیرعثمان شاہ تھے۔شیر شاہ بک کلب کے تقریباً بیس لڑکوں نے اردو انگریزی کتابوں پر اپنے تبصرے پڑھ کر سنائے اور چند لڑکوں نے اپنی طبع زاد اردو انگریزی نظمیں بھی سنائیں۔صارم بن فخر کی، ساقی کی نظمیں اب بھی یاد آتی ہیں ایک فیچر 'سقراط کی موت' بھی پیش کیا گیا۔اس پروگرام کو دیکھ کر مجھے سر راشد کا یہ فقرہ یاد آیا:

Education is a process of discovering possibilities of development

شیر شاہ ہاؤس کے کمسن شیرین امکانات کو بروئے کار لا رہے تھے۔

علی بن حادی

(کالج نمبر 4854، زمانہ تعلیم 1985-1988ء)

جب اپریل 1985ء میں ہم شیر شاہ ہاؤس میں داخل ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد چند لڑکوں کا گلا سخت خراب ہو گیا۔انھوں نے فوراً نوٹ کیا اور کہا تمہاری آنٹی جب ٹھیک تھیں تو وہ لڑکوں کو غرارے کروایا کرتی تھیں۔ان دنوں وہ سخت بیمار ہیں۔(دو ہفتے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا) اسلیئے میں اندر سے نمک اور پانی گرم کروا کے لائے دیتا ہوں تم لوگ غرارے کر لو اور ہاں کھانے کے فوراً بعد برف کا ٹھنڈا پانی نہ پینا۔ہمیں اتنا اچھا لگا کہ یہاں بھی گھر کا سا ماحول ہے۔

شیر شاہ ہاؤس میں فنکشن تو بہت ہوتے تھے۔علی اسد "I like the Boys the Best" ٹیبلو کی شکل میں پیش کیا کرتا تھا۔ مجھے انہوں نے ملا نصیر الدین سیریز کے ڈراموں میں زبردستی حصہ دیا۔ پھر تو میں ایسا رواں ہوا کہ 1986ء کی ڈائمنڈ جوبلی کے اردو ڈراما جوتشی میں جوتشی کا رول ادا کیا اور فرسٹ پرائز لیا۔ڈائریکشن تو بیشک علوی صاحب کی تھی لیکن اسکی ابتدا شیر شاہ ہاؤس میں سر راشد نے کی تھی۔ ہاؤس کا ماٹو 'from discovery to development' تھا۔انہوں نے ہمیں اپنے آپ کو discover کرنا اور پھر develop کرنا سکھایا۔

جب الوداعی ملاقات کے لئے میں ان کے ہاں حاضر ہوا اور آٹو گراف کی فرمائش کی تو انہوں نے مجھے یہ اسٹکر عطا کیا اور نیچے مارکر سے اپنے دستخط کر دیئے۔

SUCCESS

He has achieved success who has lived well, laughed often and loved much; who has gained the respect of

intelligent men, the trust of pure women and the love of little children; who has filled his niche and accomplished his task; who has left the world better than he found it, whether by an imporved poppy, a perfect poem or a rescued soul; who has never lacked appreciation of earth's beauty or failed to express it, who has looked for the best in others and given them the best he had; whose life was an inspiration; whose memory is a benediction.

بشیر جمال

(کالج نمبر 4857، زمانہ تعلیم 1985-1988ء)

بلوچستان کے ایک دورافتادہ اور پسماندہ علاقہ سے آنے کی وجہ سے میری انگریزی خاصی کمزور تھی۔ راشد صاحب نے مجھ پر خصوصی توجہ دی۔ میں کلاس میں پیچھے ایک کونے میں بیٹھتا تھا۔ ان کا حکم تھا کہ انکے پیریڈ میں آگے آ کر بیٹھوں۔ ایک اور بات یہ یاد ہے کہ کلاس کو ہر روز، دو لفظ ڈکشنری سے دیکھنے کے لئے دیتے تھے۔ اسطرح تین جملے ایل ای ایس سے کرنے کو دیتے تھے اور کلاس میں آکر پہلے یہ کام چیک کرتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کام خواہ کم ہو یا زیادہ لیکن ہر روز ہو اور کوالٹی بہتر ہو۔ کہا کرتے تھے جو لکھتے ہو اسکا تعلق امتحان سے اور جیسے لکھتے ہو اسکا تعلق زندگی سے ہے۔ بدرالدجیٰ کے ساتھ کالج چھوڑنے سے پہلے انکو ملنے گیا تو غالباً اس خیال سے کہ پھر ملاقات ہو یا نہ ہوانہوں نے مجھے اپنی کتاب 'کردار کی کرنیں' تحفے کے طور پر دی اور اس پر لکھا "میاں بشیر جمال سلمہ کے لئے دعاؤں کے ساتھ!''

تنویر الیاس

(کالج نمبر 4887، زمانہ تعلیم 1986-1989ء)

سر راشد نے اپنی کتاب 'مکالمات اقبال' میں ایک حدیث نقل کی ہے اور اس پر اقبال کا برجستہ تبصرہ بھی۔ وہ حدیث یوں ہے کہ ایک بار ایک بلی نے رات کو مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں بچے دیدیئے۔ جسکی وجہ سے وہ جگہ خراب ہوگئی۔ صبح سویرے ایک صحابی نے یہ دیکھا تو کچھ ناراض ہوئے اور بچوں کو اٹھا کر باہر پھینکنا چاہا۔ اتنے میں حضور اکرم ﷺ اپنے حجرہ سے باہر آئے اور صحابی کو ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اب جبکہ بلی نے بچے دے ہی دیئے ہیں تو جب تک بلی بچوں کو خود نہ لے جائے انکو یہیں پڑا رہنے دو۔

یہ سن کر علامہ اقبال نے برجستہ فرمایا 'Motherhood is the major part of prophethood' (مادریت رسالت کا غالب حصہ ہے)۔ سر راشد نے کلاس میں اور ہاؤس میں بار بار یہ واقعہ اور حدیث دہرائی۔ ان کی اپنی تعلیمی و تربیتی اپروچ میں مادریت غالب تھی۔ اسکو میں ایک مثال سے واضح کرونگا۔ ایک بار موسیٰ ہال میں ظفر اقبال نے 'فرد قائم ربط ملت سے ہے' کے موضوع پر بڑی زبردست تقریر کی۔ بڑی واہ واہ ہوئی۔ سر راشد نے مبارکباد دی، خاموش تالیاں بجوائیں، اپنی طرف سے ایک بک مارک انعام میں دیا۔ (بائی دی وے، یہ بک مارک بھی راشد صاحب کی شخصیت کا مظہر تھا۔ اس کی ایک طرف یہ جملے لکھے تھے۔

Sher Shah House, the sunshine House,
Sher Shah House Boys , the sunshine boys,
Always on the move in search of light

اور دوسری طرف یہ عبارت چھپی تھی۔

A sun shine boy is,
fair, firm, kind and considerate.
He goes all out to serve Pakistan
in whatever way he can

لیکن غالباً اس خیال سے کہ ایک لڑکے کی اتنی تعریف سے اور اتنی اچھی تقریر سے دوسرے بچے کہیں احساس کمتری کا شکار نہ ہو جائیں، انہوں نے کلاس میں بڑی تفصیل سے بتایا کہ talent کی بے شمار قسمیں ہیں۔ کسی میں کوئی خوبی ہوتی ہے تو کسی میں کچھ، جیسے یہ سامنے گلاب بھی دس قسم کے کھلے ہیں۔ مسئلہ صرف From discovery to development کا ہے۔ ان دنوں ہم ایمرسن کی نظم A Nation's Strength پڑھ رہے تھے۔ ایمرسن کے حوالے سے انہوں نے ایمرسن کے قانون تلافی (Law of compensation) کا تذکرہ بھی کیا کہ کس طرح قدرت اگر کسی کو کسی چیز سے محروم کرتی ہے تو کوئی اور چیز دے کر اس محرومی کی تلافی بھی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے extrovert اور introvert مزاج کے بارے میں بتایا کہ ہر مزاج کے plus اور minus پوائنٹس ہوتے ہیں۔ جو خاص reticent اور شرمیلا ہے اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں کی اپنی قابل قدر خصوصیات ہوتی ہیں۔ مثلاً introvert زیادہ اچھے دوست، زیادہ وفادار، محنتی، جفاکش اور ذمہ دار ثابت ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس تمام گفتگو کا مقصد یہ تھا دوسرے بچے jealousey یا بیدلی یا مایوسی inferiority complex کا شکار نہ ہو جائیں۔

احسن وقاص
(کالج نمبر4898،زمانہ تعلیم1989-1986ء)

جب سر راشد کے جلد ہی ریٹائر ہونے کی خبر عام ہوئی تو میں نے اور ندیم احمد خاں نے سوچا کس طرح سر راشد کے لیکچروں کو ریکارڈ کیا جائے۔ جلد جلد نوٹس بنانے کی بھی کوشش کی لیکن بات نہیں بنی۔ ندیم کے پاس واک مین تھا۔ اسکی مدد سے (خاموشی سے) انکے چند پیریڈز کی ریکارڈنگ لیں۔ جو ضروری کانٹ چھانٹ اور ترتیب کے بعد پیش کر رہا ہوں:

انگریزی کی نظم

The Miller of Dee

There dwelt a miller, hale and bold
Down by the River Dee,
he worked and sang from morn till night,
No lark more blithe than he,
And this the burden of his song
For ever used to be
I envy no-body , no, not I
Nor nobody envies me
Thou'rt wrong, my friend, cried old king Hall
Thou'rt wrong as wrong can be,
For had I half such health as thine
I would gladly change with thee
Then tell me now what makes thee
with heart so light and free,
while I am sad although I am king
Down by the River Dee

نظم شروع کرنے سے پہلے سر راشد نے بتایا کہ جو چیز بھی نصاب میں شامل کی جاتی ہے (یہاں سر راہ انہوں نے نصاب یعنی سلیبس اور کری کیولم کا فرق بھی سمجھایا)۔ اسکا کوئی نہ کوئی خاص مقصد (objective) بھی ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی مہارت skill سکھانا، معلومات (information) دینا یا علم (knowledge) میں اضافہ کرنا یا پھر شعور زندگی، قدروں اور رویوں کی آگہی (awareness) چمکانا اور ابھارنا، یہ نظم بنیادی طور پر انگریزی لکھنے یا پڑھنے کی skill سکھانے یا کنگ ہال یا دریائے ڈی کے

حوالے سے انگلستان کے بارے میں تاریخی اور جغرافیائی معلومات دینے کے لئے نہیں کہ کنگ ہال کون تھا، دریائے ڈی کہاں واقع ہے، کہاں سے نکلا ہے وغیرہ، مقصد یہ بھی نہیں کہ یہ بتایا جائے کہ ملر Miller کون ہوتا ہے، وہ کیا کرتا ہے، پن چکی کیسے چلتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب ضمنی چیزیں ہیں۔ اصل مقصود اس نظم کے حوالے سے زندگی کی بعض قدروں (values) اور رویوں (attitudes) کے بارے میں کچھ awareness دینے کا ہے۔ تاکہ آدمی سے انسان ہونے کے سفر میں کچھ پیش رفت ہو سکے۔

بس کہ مشکل ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

''اس نظم کی تھیم (theme) یہ ہے'' یہ کہہ کر انہوں نے بلیک بورڈ پر ایک گلاس کا اسکیچ بنایا اور آدھے پر ایک لکیر کھینچی۔ ''اس میں یہاں تک پانی ہے۔ اب زندگی میں دو بنیادی رویے ہیں، ایک آدمی اس کو دیکھ کر کہتا ہے گلاس آدھا بھرا ہوا ہے۔ دوسرا اسی گلاس کو دیکھ کر آہِ سرد بھرتا ہے وائے افسوس، یہ آدھا خالی ہے۔ یہ فرق مثبت اور منفی رویے کا ہے۔ optimism اور pessimism کا ہے۔ اس نظم کا ملر بھی optimistic ہے اور positive attitudes رکھتا ہے، ہے تو غریب مزدور لیکن دل کا غنی ہے، اسکی سیدھی سادی شخصیت میں ٹھہراؤ stability ہے۔'' ان کے اصل الفاظ یہ تھے۔

''He is a man at peace with himself, not at war with himself.''

''اس کے اندر کوئی conflict نہیں۔ امنگوں اور خواہشوں کا ٹکراؤ نہیں جو اعصابی کھچاؤ strain اور جذباتی دباؤ stress میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا positive attitude اسکی شخصیت کی سب سے بڑی قوت ہے۔'' بات یہاں تک پہنچی تھی کہ ذو الفقار علی نے سوال کر دیا ''سر شخصیت اور کردار (personality & character) میں کیا فرق ہے؟'' ابھی انہوں نے جملہ شروع ہی کیا تھا کہ پریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور جیسا کہ انکی عادت تھی کہ وہ جملہ ختم کئے بغیر 'Thank you gentlemen' کہہ کر کلاس سے رخصت ہو گئے۔ (بعض لڑکوں کو انکی صرف یہ عادت بہت پسند تھی کہ گھنٹی بجنے پر جملہ کیا لفظ بھی پورا نہیں کرتے تھے اور بقول انکے پانچ منٹ کی بریک کا ایک سیکنڈ بھی ضائع کئے بغیر باہر چلے جاتے تھے) دوسرے دن حسب دستور انہوں نے وہ کام دیکھا جو وہ ہر روز دیتے تھے۔ ان کی عادت تھی آتے ہی ہر روز گرائمر کے تین جملے ٹیسٹ کے طور پر دیتے تھے۔ اور دوسرے روز سب سے پہلے وہ تین جملے چیک کرتے تھے، حکم تھا کہ کاپیاں سامنے کھلی رکھو، یہ کام بڑی پابندی سے ہر روز ہوتا تھا، ایک روز خود ہی وضاحت کی کہ یہ

تین جملے تمہیں انگریزی کی skill سکھانے کے لئے ہیں اور ہر روز لکھوانا اور دیکھنا تم لوگوں میں regularity کی عادت ڈالنے کے لئے ہے۔ یہ کرداری تعمیر (character building) کی مشق (exercise) ہے۔ایک روز بتایا جو تم لکھتے ہو (what you write) اسکا تعلق امتحان پاس کرنے سے اور جس طرح لکھتے ہو (how you write) اس کا تعلق تمہارے کیریر کے نشیب وفراز سے ہے۔تمہاری کاپیوں کے صفحات میں تمہارا مستقبل ہے۔ان صفحات کے آنگن میں تمہارے بچوں کو ہنستے کھیلتے دیکھتا ہوں۔ جو بچہ آج نالائق طالب علم ہے وہ کل لائق، کامیاب اور بامراد باپ کیسے ہوگا۔ پھر زور دے کر کہا ہمارے معاشرہ میں بچوں کی کامیابی کا دارومدار ان کی اپنی صلاحیتوں سے زیادہ ان کے والدین کی ذہنی و کرداری صلاحیت بلکہ ان کے کیریر اور financial & social status پر ہوتا ہے۔

یہ جملہ معترضہ تھا میں نے سوچا یہ بھی ریکارڈ پر لاتا چلوں کہ وہ کیریکٹر بلڈنگ کیسے کیا کرتے تھے۔ ہاں تو بات ہو رہی تھی شخصیت کی، فرمایا ''جب سے انسان نے شعور سنبھالا وہ اپنے آپ کو اور اپنی شخصیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ارسطو نے چھٹی حس (sixth sense) کا تصور پیش کیا، یہ سلسلہ چلتا رہا، شخصیت کو سمجھنے behaviour کو predict کرنے کے بہت سے اصول وضع کئے گئے۔جنہوں نے بعد کو باقاعدہ علوم کی شکل اختیار کر لی۔شخصیت کو سمجھنے کا غالباً سب سے پرانا طریقہ۔'Physionomy' یعنی جسمانی ساخت خصوصاً سر کی جسامت، پیشانی کی فراخی یا تنگی، آنکھوں، ناک، ہونٹ، رخسار کی ابھری ہوئی بیٹھی ہوئی ہڈی، ٹھوڑی (chin) کے مشاہدہ سے اندازہ لگایا جاتا ہے یا لگایا جاتا تھا کہ یہ شخص اندر سے کیسا ہے۔اس کو قیافہ شناسی کہتے ہیں۔ قیافہ شناسی کے سلسلہ میں ایک تاریخی لطیفہ بھی ہے۔سقراط کو فلسفہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔لیکن تھا بدشکل۔اس کے چہرے کے نقوش عام یونانیوں کے برعکس نہایت بھدے تھے (جو آج اس کے مجسموں میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں)۔اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایتھنز کی گلیوں کے نکڑوں پر کھڑا ہو جاتا اور نوجوانوں سے سوال و جواب کے ذریعے انہیں علم وحکمت کی باتیں سکھاتا، وہ نوجوانوں میں مقبول بھی بہت تھا۔ ایک روز اس کا ایک عقیدت مند شاگرد اسے کسی بہانے سے کسی قیافہ شناس (Physionomist)' کے پاس لے گیا۔وہ سقراط پر نگاہ ڈال کر برخود غلط بولا ''یہ شخص تو بالکل جاہل اور نفسانیت کا شکار معلوم ہوتا ہے''۔ یہ سن کر شاگرد نے اس نامعقول کو مارنے کو لیا۔سقراط نے اسے روکا اور اسے سمجھایا کہ تمہارا یہ قیافہ شناس بھی غلط نہیں کہتا۔ میں بھی جاہل ہی تھا اور اب بھی ہوں۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب فرق یہ پڑا ہے کہ اتنا جانتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ اس لئے سچائی کی تلاش (In

(search of truth میں نکل پڑا ہوں۔ وہ یہ بھی ٹھیک کہتا ہے کہ مجھ میں نفسانیت تھی۔ ہر شخص میں جبلی خواہش ہوتی ہیں۔ مسئلہ انہیں راہ پر لانے کا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سقراط اتنا بڑا انسان تھا کہ اس نے اس واقعہ سے بھی اپنے شاگرد کی تربیت کا کام لیا۔ ضبط نفس (Self restraint) تہذیب اور شائستگی کی جان ہے۔

''Physionomy کے بعد شخصیت کو سمجھنے کی کوشش علم نجوم (Astrology) ہے۔ اس میں آسمان کو 12 برجوں میں تقسیم کیا گیا ہے اس علم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے وقت اس کا ستارہ جس برج میں ہوتا ہے اس کا اثر اس کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ آج بھی ہزاروں لاکھوں لوگ اخبار رسالوں میں پہلے 'ستارے کیا کہتے ہیں' کا صفحہ دیکھتے ہیں اور برج حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، دلو، اور حوت کے خانوں میں اپنی اپنی قسمت پڑھتے ہیں۔

''سر، آپ کا برج کونسا ہے''

''میں 'دلو' ہوں۔''

''آپ برجوں کو مانتے ہیں۔؟

''مَیں اپنے بارے میں کمنٹ نہیں کیا کرتا۔ خلیل جبران نے کہا ہے کہ بچوں کو اپنے خیالات نہ دو، انہیں اپنے خیالات بنانے کے قابل بناؤ۔''

شاید وحید کا ذہن ابھی تک فزیانومی کے مسئلہ میں الجھا ہوا تھا۔ پوچھا ''سر فزیانومی کے کچھ خاص اشارے یا نکات آپ بتائیں گے۔؟

''مثلاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑا سر، ذہانت کا اشارہ ہے، اسی پر مبنی پرانی مثل تھی، سر بڑا سردار کا، پیر بڑا گنوار کا، کشادہ پیشانی، کشادہ دلی کی نشانی، بھینچے ہونٹ، باریک ہونٹ خود غرضی اور aggressiveness کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ موٹے ہونٹ خصوصاً نچلے ہونٹ کی گدازی جذباتیت کی نشانی کہی جاتی ہے۔ خصوصاً عورتوں میں اور آنکھیں انسانی شخصیت کا سب سے زیادہ موثر expressive ذریعہ ہیں۔ ذہین آدمیوں کی آنکھوں میں magnetic کشش ہوتی ہے۔ قائداعظم کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش مشہور ہے۔ اقبال نے مسولینی کی شعاعِ آفتاب کی سی تیز آنکھوں کے بارے میں لکھا ہے۔ آنکھوں کے تاثرات اور حسن کے اعتبار سے غزالی آنکھیں، شربتی آنکھیں، نرگسی آنکھیں مشہور ہیں۔ مشہور مصور عبدالرحمان چغتائی نے اپنی شاہکار تصویر میں دنبالہ دار بادامی آنکھوں کا جادو جگایا ہے۔ میر تقی میر نے نیم باز آنکھوں کی بات کی ہے۔

میر اِن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

''ہاں تو ہم بات کر رہے تھے شخصیت کو سمجھنے کے علوم کی، فزیانومی، اسٹرولوجی کے بعد شخصیت کے رجحانات یا امکانات کو سمجھنے اور پیشگوئی کرنے کا ایک علم یا سائنس (بعض لوگ اسے سائنس نہیں بھی کہتے) پامسٹری یا دست شناسی بھی ہے۔ مشہور عالم دست شناس کیرو کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ اپنے پاکستان کے ایم اے ملک صاحب دست شناسی کے فن کے ماہر مشہور ہیں۔ دست شناس ہاتھ کی ساخت اور لکیروں کو پڑھتے ہیں۔ ہتھیلی کا ابھار ماونڈ آف وینس، انگوٹھے کی بناوٹ وغیرہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔''

''کیا آپ کا دست شناسی میں یقین ہے''؟

''آپ لوگ خود روشنی کو تلاش کیجئے۔ میرا کام آپ کی راہنمائی کرنا ہے۔''انسان کی شخصیت کو سمجھنے کا جدید علم جس نے ایک سائنس کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سائیکالوجی ہے، جس کو science of mind کا جدید علم کہا جاتا ہے۔ شخصیت کی تشکیل میں ایک بڑا مقبول نظریہ ویانا کے ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ کا ہے، جس نے لاشعور کا تصور اور نظریہ پیش کیا۔ تحلیلی نفسیات (Psychoanalysis) کی بنیاد رکھی۔ 'Oedipus complex' وغیرہ اس نے شخصیت کو 'ego' اور 'super ego' کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی متنازعہ نظریات پیش کئے۔ اس کے بعد ایڈلر وغیرہ بہت سے ماہر نفسیات ہیں، بہرحال ماہرین نفسیات شخصیت کی تشکیل میں بچہ کے ابتدائی سالوں اور ابتدائی ماحول خاص طور سے والدین کی شخصیت و کردار کی تاثیر کے بارے میں متفق ہیں۔

آج کل ذہنی اور نفسیاتی ٹیسٹ دینے کا رواج عام ہے۔ personality کا تجزیہ کرنے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں چنانچہ Sixteen personality factors کا نظریہ آجکل معروف ہو رہا ہے''۔

''وہ کیا ہے۔''

''یہ تحقیق کہ، 16 اجزاء سے شخصیت ترتیب پاتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک جزو کا مقابل جزو ہوتا ہے۔ ان میں سے دس زیادہ ممتاز factors یہ ہیں۔

Outgoing	Reserved
More Intelligent	less Intelligent
Stable	Emotional
Assertive	Submissive

Happy-go-lucky	Sober
Conscientious	Expedient
Bold	Shy
Tenderminded	Toughminded
Suspicious	Trusting
Imaginative	Practical
Shrewd	Forthright
Apprehensive	Placid
Experimenting	Conservative
Self sufficient	Grouptied
Controlled	Casual
Tense	Relaxed

شخصیت کے ان بنیادی عناصر کی روشنی میں اپنی اور دوسروں کی شخصیتوں کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے''۔ ''کیا ان factors کو بدلا جا سکتا ہے''؟

''بالکل بدلا تو نہیں جا سکتا لیکن ایک خاص حد تک adjustment ہو سکتی ہے۔ خود آگہی سے خود احتسابی کے رجحان کو تقویت ملتی ہے اور پھر اصلاح کا عمل شروع ہو سکتا ہے۔ سقراط علم (knowledge) کو سب سے بڑی نیکی (greatest good) کہا کرتا تھا۔ اسکا خیال تھا کہ برائی جہالت کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر علم صحیح ہو تو برائی سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں تو بات ملرآف ڈی سے شروع ہوئی تھی۔ اسکی صحت اور قلبی اطمینان کا راز کیا ہے؟ اس کا جواب تیسری لائن میں موجود ہے 'he worked and sang from morning till night' کام کرنا اور خوش رہنا۔ نوٹ کیجئے کہ صحت اور خوشی کو کام سے مشروط کیا گیا ہے۔ یہی اسلامی تعلیمات کا نچوڑ بھی ہے۔ مولانا رومی نے کہا، ''دست بکار دل بہ یاد' ہاتھ کام میں ہو اور دل میں خدا کی یاد ہو' یہ ہے معیار، اصل قناعت یہ ہے''۔

تیسرے دن پھر وہی نظم شروع کی:

The miller smiled & doffed his cap
I love my wife, said he
I love my friends, I love my mill,
I love my children three
I owe no penny I can not pay

I thank the River Dee
That turns the mill to grind the corn
That feeds my babes and me

اس بند پر آ کر ان کی آنکھوں میں چمک، اور آواز میں زیادہ گرمی پیدا ہوئی۔ اور کلاس کے اس سرے سے دوسرے سرے تک ان کی گردش میں اضافہ ہوا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ ضرور اس بند کی گہرائی میں جا کر کوئی موتی لائیں گے۔

(سر راشد صاحب کو کبھی روسٹرم کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھاتے نہیں دیکھا، وہ کلاس کے وسط میں کھڑے ہو کر شروع کرتے اور پھر دائیں سے بائیں مسلسل حرکت کرتے رہتے تا کہ سب لڑکوں پر نظر رہے اور سب ان کی بات غور سے سنیں۔ جب انہیں کوئی خاص بات کہنا ہوتی تو وہ الفاظ ڈرامائی مکالمے کے انداز میں ادا کرتے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر تابنا کی آ جاتی) ''آپ لوگوں نے نوٹ کیا ملر نے صحت اور خوشی کا راز کیا بیان کیا ہے؟ وہ I love my wife سے شروع ہوا ہے۔ انسان کی کامیابی میں اس کی نصف بہتر (better half) کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن سب بڑے انسان اس blessing سے بہرہ ور نہیں ہوتے۔ سقراط کی بیوی کی بدمزاجی ضرب المثل ہے۔ شیکسپئر بھی اپنی نیک بخت کے ہاتھوں عاجز ہی رہا۔ شاید اسی محرومی کی وجہ سے اس نے اپنے ڈراموں میں مرچنٹ آف وینس کی پورشیا ایسی مکمل اور شاندار heroine تخلیق کی۔ دنیا کے سب سے بڑے ناول وار اینڈ پیس (War and peace) کے خالق ٹالسٹائی کو اپنی بیگم صاحبہ سے تنگ آ کر گھر چھوڑنا پڑا اور غریب نے 1910ء میں ایک ریلوے اسٹیشن پر جان دی۔''

''جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''مے لالہ فام'' میں لکھا ہے کہ ایک بار امی جان نے ابا جی سے کہا آپ گھر پر پڑے کیا کرتے رہتے ہیں کچھ کام ہی کیا کریں۔'Here you are' جی ہاں! کچھ کام ہی کیا کریں۔ قائداعظم کے بھی رتن بائی سے آخر میں تعلقات کچھ کشیدہ ہی رہے۔ تنہائی اکثر بڑے آدمیوں کا مقدر رہتی ہے۔ یہ استثنائی صورتیں exception ہیں، کلیہ یہی ہے کہ ذہنی سکون اور جذباتی آسودگی انسان کی تخلیقی قوتوں کو پروان چڑھاتی ہے۔ دیکھئے ملر نے اپنی صحت ومسرت کا راز بیوی بچوں کی محبت کے ساتھ ساتھ اور محبتوں "I love my friends I love my mill" کا ذکر بھی کیا ہے۔ اصل راز یہ ہے۔ بیوی بچوں کی محبت تو فطری چیز ہے۔ یہ تو ہر جاندار میں ہوتی ہے بلکہ زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کے لئے فاختہ کو شکرے سے لڑ کر جان دیتے میں نے خود دیکھا ہے۔ کونج کا جوڑا ٹوٹ جائے تو اس کی تڑپ دیکھی نہیں جاتی۔ دوستوں کی محبت اپنی ذات سے باہر کی دنیا سے محبت کی علامت ہے۔ آدمی اور انسان میں یہی

فرق ہے۔آدمی اپنی ذاتی ترقی وخوشحالی کے لئے تگ ودو کرتا ہے۔انسان دوسروں کوساتھ لے کر چلتا ہے۔ صحیح محبت possessive نہیں expansive ہوتی ہے۔ملر دوستوں کی محبت یا باہر کی دنیا کی محبت کے ساتھ ساتھ ایک تیسری محبت کا ذکر کرتا ہے 'I love my mill' مل کی محبت اپنے کام،اپنے پیشہ سے محبت کی علامت ہے۔''

میں نے اپنی کتاب ''جرأتوں کے نشان'' میں میجر جنرل جمشید (ایم سی،بار،ستارہ جرأت) کے اس آٹوگراف کا ذکر کیا ہے ''May God make you enjoy your work''یعنی آدمی کی اس سے بڑھ کر خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے کام کو enjoy کرے اور یہ enjoy کرنا بغیر محبت کے ممکن نہیں اور بغیر محبت کے کام،کامیابی سے نہیں ہوتا چونکہ کبھی کام pleasant ہوتا ہے اور کبھی un-pleasant بھی۔ایک نازک مزاج ماں اپنے بچہ کا گوموت کرتی ہے۔ ہر قسم کا unpleasant کام کرتی ہے جو بچہ کی محبت کی وجہ سے گوارا ہو جاتا ہے۔جب کام سے محبت ہوتو اسکا آسان یا مشکل ہونا،آرام دہ یا تکلیف دہ ہونا نہیں دیکھا جاتا،صرف ضروری ہونا دیکھا جاتا ہے۔ تو unpleasant کام بھی ضروری ہوسکتا ہے۔آپ کی mill یہ کالج ہے۔تعلیم و تربیت ہی loving the mill ہے۔ اگر آپ اس سے محبت کریں گے تو یہ کام بہتر ہوگا۔اس میں آپ کا بھلا ہے اور کام کا بھی۔اس بند میں ایک فقرہ I thank the River Dee بھی ہے۔یہ اس نظم کا سب سے قیمتی مصرعہ ہے۔شکرگزار ہونا محبت کرنے سے آگے کی منزل ہے۔اَلْحمدللّٰہ کا ترجمہ 'تدبر القرآن، میں اصلاحی صاحب نے یہ کیا ہے کہ تمام شکرگزاریاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔جو دل شکر سے لبریز ہو وہ بہت قیمتی قلب ہوتا ہے۔وہ حدیث قدسی تو آپ نے سنی ہوگی کہ ایمان نصف شکر ہے اور نصف صبر سورۃ رحمان کی تفہیم ہی شکر ہے۔ فبای الا رب کما تکذبنO''

آواز دوست میں مختار مسعود نے کیا خوب لکھا ہے۔''عطا کا پہلا حق یہ ہے کہ انسان اسکا شکر ادا کرے، دل شکر سے لبریز ہوتو روشن ہوجاتا ہے شکوہ کیجیے تو بجھ جاتا ہے۔ناشکرگزار ہوتو پتھر بن جاتا ہے۔ شکرگزار ہمیشہ روشن ضمیر اور روشن دماغ ہوتا ہے۔ناشکرگزار بے ضمیر اور بددماغ ہوجاتا ہے''

وہ ملر خواہ خود آگاہ ہو نہ ہو،خدامست ضرور تھا۔کہتا ہے۔

I thank the River Dee
That turns the mill to grind the corn
That feeds my babes and me

یہ شکر نعمت ہے۔ہمارا Dee اور پوری قوم کا Dee پاکستان ہے۔اس ذریعہ سے خدا کی بے بہا نعمتیں

ہمیں عطا ہوئی ہیں، ''فباء الا ربکما تکذبن'' 'Harvest of freedom' ایک کتاب ہے، جس میں مختلف لوگوں نے ان فوائد اور نعمتوں کا ذکر کیا ہے جو پاکستان سے ہمیں حاصل ہوئی ہیں، سب سے بڑی نعمت آزادی کی زندگی ہے، جس کو اس نعمت کی قدر و قیمت میں شبہ ہو وہ سرحد پار ہندوستانی اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمان بھائیوں کی حالت زار دیکھے۔ کئی سال ہوئے جنگ کے جمعہ ایڈیشن میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں صدر ایوب کا ایک واقعہ نقل کیا گیا تھا کہ کس طرح 46-1945ء میں جب وہ لیفٹیننٹ کرنل تھے تو دہلی کے سیکرٹریٹ میں بیٹھے اپنے ایک دوست ڈپٹی سکریٹری خورشید احمد صاحب سے یہ صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ جنگ تو ختم ہوگئی ہے۔ demobilisation کے بعد کیا کرنا ہے۔ پھر کہا میں تو فوج سے ریلیز ہونے کے بعد ہری پور ہزارہ میں ایک فلور مل لگانے کا پروگرام بنا رہا ہوں جی ہاں بعد کی داستان تو سب کو معلوم ہی ہے۔ ابھی چند دن ہوئے اخبارات میں ہائیکورٹ کے چیف جسٹس غلام مجدد مرزا کا بیان چھپا تھا اگر پاکستان نہ ہوتا تو میں کسی بڑے ہندو وکیل کا بستہ اٹھائے پھر رہا ہوتا۔ پاکستان ہمارے لئے نعمت ہے، مائی باپ ہے۔ سمجھو تو سب کچھ ہے نہ سمجھو تو اور بات ہے۔''

یہ تھے ہمارے سر راشد!

احمد جواد

(کالج نمبر 4899، زمانہ تعلیم 1989-1986ء)

یادش بخیر، زیرو پریڈ تھا (کالج میں جمعرات کو کبھی زیرو پیریڈ ہوتا تھا جو لیڈرشپ کے موضوعات پر لیکچرز کے لئے مخصوص تھا)۔ اس دن کا موضوع تھا "responsibility" ۔ تو راشد صاحب نے اس پر اپنے مخصوص تجزیاتی انداز میں گفتگو شروع کی ''یہ لفظ response اور ability سے مرکب ہے یعنی ability to response, ۔ زندگی کیا ہے؟ situations کا بہتا ہوا دریا ہے۔ یہ situation لمحہ بہ لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ ہر لمحہ بدلتی ہوئی situation کو respond کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح ہاکی کے کھیل میں حرکت کرتی ہوئی گیند ہر لمحہ ایک نئی جگہ ہوتی ہے۔ اسکی situation کے مطابق کھلاڑی respond کرتا ہے۔ اچھا کھلاڑی وہ ہے جسکے responses زیادہ صحیح ہوں۔ تمام ایجوکیشن کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی ability to respond کو بڑھایا جائے یا زیادہ موثر effective بنایا جائے۔ تہذیبی زندگی کی ابتدا میں زندگی کی situations محدود اور بہت سادہ نوعیت کی تھیں۔ انکو respond کرنا زیادہ مشکل نہ تھا صرف تھوڑا سا تجربہ چاہیے تھا۔ پھر جوں جوں زندگی کا کارواں آگے

بڑھتا گیا situations یا مسائل پیچیدہ تر ہوتے گئے اور ان کو respond کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ علم اور تجربے کی ضرورت ہونے لگی۔ تا آنکہ نوبت موجودہ زمانہ کی یونیورسٹیوں، ریسرچ اور ٹریننگ اداروں تک جا پہنچی ہے۔ اگر زندگی کی تمام situation کا تجزیہ کیا جائے تو ان کو چار یا پانچ قسموں میں بانٹا جاسکتا ہے، ۔ پہلی قسم کی situations وہ ہیں جن کو respond کرنے کے لئے بنیادی طور پر جسمانی مہارت physical skill کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں کرکٹ، اسکوائش، athletics، ڈرائیونگ، سوئمنگ سارے کھیل (اسپورٹس) شامل ہیں۔ اس کے بعد وہ situations ہیں جن کو respond کرنے کے لئے thinking اور intellectual response کی ضرورت ہوتی ہے۔ تیسری قسم کی situations سوشل نوعیت کی ہوتی ہیں، انسانی یا سماجی تعلقات social responses کے زمرہ میں آتے ہیں۔ چوتھی قسم کے responses جذباتی ردعمل ہوتے ہیں۔ محبت، نفرت، غصہ، خوف وغیرہ کی situations کو respond کرنا emotional ردعمل ہے۔

فزیکل نوعیت کے ردعمل responses کو سیکھنا اور ان میں کمال حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ مثال کے طور پر جان شیر خان، عمران خان ہونا ایک بات ہے اور ڈاکٹر عبدالسلام، ڈاکٹر عبدالقدیر یا ڈاکٹر محبوب الحق ہونا اور چیز ہے۔ کیوں کہ اس میں responses کی نوعیت creative, intellectual اور imganitive ہوتی ہے اور اس کے لئے بے انتہا علم، تجربہ اور قوت تخلیق چاہیے۔ social situations کو respond کرنے کے لئے اتنی intellectual depth کی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن اس نوعیت کے سوشل یا مورل responses کو صحیح سمت دے سکنا، purely intellectual responses سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ان میں کردار involve ہوتا ہے۔ چوتھی قسم کے responses کو ہم emotional responses کہہ سکتے ہیں جس میں انسان کا واسطہ اپنے اندرونی جذبات اور passions سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے emotional responses تیسری قسم سے بھی زیادہ صبر آزما ثابت ہوتے ہیں۔

ان نکات کو چند مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ پلوٹارک (Plutarch) نے اپنی کتاب ''The Parallel Lives'' میں سکندر اعظم اور اس کے چیف آف سٹاف پارمینو کی وہ گفتگو نقل کی ہے جو لڑائی سے پہلے دارا کی طرف سے صلح اور تحائف کی پیشکش کے بارے میں ہے۔ پارمینو نے کہا اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش قبول کر لیتا۔ سکندر نے جواب دیا کہ میں بھی اس پیشکش کو ضرور قبول کر لیتا اگر میں محض پارمینو ہوتا۔ یہ response بڑی حد تک intellectual تھا۔ اسی کتاب میں پلوٹارک نے دو یونانی جرنیلوں سوفوکلیز اور پری کلیس کا مکالمہ لکھا ہے۔ سوفوکلیز نے

ذرا ترنگ میں آکر مقبوضہ علاقہ کی ملکہ کے حسن کا ذکر کیا۔ بات نظارہ بازی کی تھی۔ پری کلیس نے جواب دیا: میرے دوست ایک جرنیل کے ہاتھ ہی نہیں اس کی نظر بھی پاک ہونی چاہیئے۔ یہ social emotional respons کی مثال ہے۔اس پاک نظر کا ذکر اس نامور یونانی مورخ نے سکندر اعظم کے باب میں بھی کیا ہے۔ کہ سکندر نے ایرانی سپاہ کے خلاف بڑی بے جگری دکھائی لیکن ایرانی خواتین کے ساتھ بڑی دلداری سے پیش آیا۔ پلوٹارک لکھتا ہے کہ وہ شجاعت سے بھی زیادہ شرافت کے لئے ممتاز تھا۔

سکندر ہی کے حوالے سے جذباتی response کی ایک مثال دیتا ہوں۔اس نے ایک یونانی افسر کی بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ ایک روز وہ اپنے خیمہ میں آیا تو وہ اپنے پہلے شوہر کی کوئی یادگار ایک ہاتھی دانت کے ڈبے سے نکال کر دیکھ رہی تھی۔ سکندر نے یہ منظر دیکھا اور خاموش رہا۔ یہ emotional response تھا۔لیڈرشپ وہ چیلنج ہے جس میں فزیکل 'Intellectual' مورل، اور ایموشنل ہر قسم کی ability to respond ٹھیک ہو تو بات بنتی ہے‘‘۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ پیریڈ ختم ہو گیا۔

جی سی نوید قادر

(کالج نمبر 4906، زمانہ تعلیم 1986-1988ء)

راشد صاحب صرف چھٹی دینے میں پس و پیش کرتے تھے اور بچوں کو زیادہ قیمتی اشیا دینے، بار بار فون کرنے پر شدید ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔اس کی ایک وجہ تھی کہ دوسرے لڑکوں کو احساس محرومی یا کمتری سے بچانا چاہتے تھے۔ جب تک وہ شیر شاہ ہاؤس کے ہاؤس ماسٹر رہے، ان کا حکم تھا کہ جاڑوں میں لڑکے جو ذاتی رضائیاں یا کمبل استعمال کریں وہ زیادہ قیمتی نہ ہوں اور ان پر بھی سفید چادر چڑھائی جائے۔تاکہ uniformity کا اصول برقرار رہے اور لڑکوں میں چیزوں کی بنا پر کوئی تفریق نہ ہو۔

جنید طیب کیانی

(کالج نمبر 4912، زمانہ تعلیم 1986-1989ء)

میں نے اواخر 87ء میں نویں میں سر راشد سے انگریزی پڑھی۔ وہ سوال ایسے پوچھتے تھے جن کے جوابات براہِ راست کتاب میں موجود نہ ہوتے اور جواب کے لئے سوچنا پڑتا تھا۔ایک لفظ سے نکلنے والے تمام الفاظ بتاتے تھے،ایک لفظ کے جتنے معنی ہوتے تھے وہ بھی بتاتے۔ مثلاً لفظ Treat آیا اس کے دو معنی بتائے پھر کہا یہ لفظ سول انجینئرنگ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہ معنی ڈکشنری میں دیکھنا۔کوئی لڑکا لفظوں کے

معنی پوچھ لیتا تو ناراض ہوتے اور کہتے ''مَیں ڈکشنری نہیں ہوں ۔لفظوں کے لفظی معنی اور استعمال بھی ڈکشنری سے دیکھو۔ ان کی وضاحت میں کروں گا ۔'' ہم نویں میں تھے کہ میٹرک کے پرچے شروع کروادیئے تھے۔آٹھویں درجے سے میں نے ان کی عادت دیکھی تھی کہ ہرروز تین جملے لکھنے کو دیتے تھے، دوسرے روزآتے ہی پہلے وہ کام چیک کرتے تھے۔ بڑی خوبصورتی سے سرخ پنسل سے نشان لگاتے جس نے کام نہ کیا ہوتا اس پر not doneاور تاریخ لکھ کرآگے بڑھ جاتے ۔کام کی کوالٹی کو بھی نوٹ کرتے ۔ جیسے حاشیہ صحیح کھنچا ہے،تاریخ صحیح جگہ لکھی ہے،نقطہ سطر کے ٹھیک اوپر ہے یانہیں وغیرہ وغیرہ ۔ ہینڈ رائٹنگ میں حروف کی نشست اوران کے باہمی تعلق پرنظر رکھتے ۔ یہ تین جملے تیس جملوں کا وقت لیتے تھے۔اس ضمن میں بار بار کہتے ۔''جو لکھتے ہو اس کا تعلق امتحان پاس کرنے سے اور جس طرح لکھتے ہو اس کا تعلق پورے کیریر، بلکہ اس بات سے بھی ہے کہ اب سے بیس برس کے بعد تمہارے بچے کن اسکولوں میں پڑھیں گے''۔ ان کی یہ باتیں اس وقت بہت عجیب لگتی تھیں۔انہیں دنوں کالج کا انٹرمیڈیٹ کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ جو صرف 75 فیصد تھااور جس میں اے گریڈ صرف تین تھے۔ انہوں نے بتایا کہ امتحان کی تیاری pyramidical ہونی چاہیے۔ یہاں انہوں نے اہرام کی شکل بنا کر بتایا کہ امتحان کی تیاری اس طرح ہونی چاہیے۔مضبوط بنیادفراہم کی جائے،امتحان جتنا دور ہو اس کی تیاری اتنی زیادہ اور امتحان قریب آتا جائے تو تیاری کا گراف رفتہ رفتہ نیچے آنا چاہیئے۔ پھر کہا''امتحان کی تیاری broad based ہونی چاہیئے۔ پھر بورڈ پر 22. لکھ کر کہا 22. سے آپ مرغابی تو مار سکتے ہیں، شیر کا شکار نہیں کر سکتے ۔اس لئے 12 بور کی بندوق چاہیے۔ آپ لوگ 22. سے شیر مارنا چاہتے ہیں۔ تقریباًہر روز ایک آدھ فقرہ یا quotation کریکٹر بلڈنگ کے سلسلہ میں بھی لکھواتے تھے۔ ایک روز لکھوایا We live in deeds not years اور ایک روز یہ لکھوایا A gentleman is one who can say No when it is due (وہ شریف ہی کیا جو کمزور ہو) پھرانہوں نے بورڈ پرلکھ کر بتایا کہ اخلاقی لحاظ سے کردار کو دوشقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اچھا یا برا(good or bad)۔نفسیاتی اعتبار سے بھی کردار کی دوقسمیں ہیں،مضبوط یا کمزور (strong or weak)اس طرح کردار character کے چار pattern بنتے ہیں:

good + strong

good + weak

bad + strong

اور   weak   +   bad

سب سے اچھا پیٹرن پہلا ہے (Good+strong) ،یعنی قدروں (Values) سے اچھا اور قوت ارادی، جرأت، عزم کے لحاظ سے مضبوط، قائداعظم کا تعلق اسی category سے تھا۔اس کے بعد دوسرا پیٹرن آتا ہے گڈ بٹ ویک یعنی نیت نیک لیکن دل کمزور تیسرا قدروں یا سوچ میں کھوٹ لیکن ارادہ مضبوط، دل شیر کا۔ چوتھا comibnation بدترین ہوتا ہے یعنی دونوں خراب، بدنیت بھی اور بزدل بھی۔ ساتھ یہ بھی کہا ان میں سے ہر ایک شق کے بے شمار shades ہیں۔اس طرح چار combinations کے لاتعداد combinations بن جاتے ہیں اور ان میں تبدیلی بھی واقع ہوتی رہتی ہے۔آج کا شیطان کل کا ولی بن سکتا ہے ایجوکیشن یا تربیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کردار کو سنوارا جائے، اس میں مثبت تبدیلیاں لائی جائیں۔انہوں نے یہ combinations ہمیں لکھوائے بھی۔

ستمبر 87ء میں اتفاق سے 4,3 ستمبر کو محرم، 6 ستمبر کو یوم دفاع اور 11 ستمبر کو وفاتِ قائداعظم کی چھٹیاں ہوئیں جن پر تقریباً سارے لڑکے گھر چلے گئے اور کالج میں کوئی فنکشن نہیں ہوا۔ 12 ستمبر کو انہوں نے کلاس میں ان قومی تقریبات پر چھٹی کرنے پر بڑا افسوس کیا۔ مجھے ان کے دکھ بھرے الفاظ آج بھی یاد آرہے ہیں فرمایا ”خونِ حسین کی، شہیدوں کے لہو کی، وہ بابائے قوم جو پاکستان کے لئے کام کر کر کے مر گیا، اب سب کی یہ توقیر ہے کہ ان مقدس دنوں میں جو نارمل کام ہوتا ہے، جو عمومی خدمت ہوتی ہے، وہ کام بھی بند کر دیا جائے اور سارے وقت کو سو کر یا لانگ ویک اینڈ کے طور پر گزارا جائے۔ان عظیم انسانوں نے خون بہایا، ہم پسینہ بہانے کو بھی تیار نہیں اور پھر یہ ظلم ایک قومی ادارہ میں، وہ جس کا مقصد ہی قوم کے مجاہد اور محافظ پیدا کرنا ہے۔لوگ اپنے ماں باپ کی برسی پر فاتحہ درود کا کچھ اہتمام کر لیتے ہیں۔قوم کے باپ کی برسی پر یوں مکمل چھٹی منائی جائے، بے حسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“

راشد صاحب بہت کم غصہ میں آتے تھے۔لیکن یوم قائداعظم اور 6 ستمبر یوم دفاع کے مسئلہ پر ہم نے انہیں excited دیکھا۔صاف نظر آتا تھا کہ اس صورت حال سے انہیں بہت دکھ ہوا ہے۔ وقاص نے ان سے پوچھا، تو سر پھر ان دنوں کو صحیح طریقے سے منانے کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا ”ان میں سے ہر دن کی نوعیت مختلف ہے لیکن اتفاق سے تینوں کا پیغام ایک ہے۔یعنی ایک اعلیٰ مقصد کے لئے ایثار و قربانی، جدوجہد، سخت کوشش، ملی و ملکی تعمیر کی کاوش، اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے صبح سے شام تک کے لئے مختلف النوع پروگرام مرتب کئے جاسکتے ہیں۔مثلاً 11 ستمبر کو قائداعظم کے حوالے سے قومی تعمیر کے لیے کچھ نہ کچھ عملی طور پر کرنا چاہیے۔اس دن صرف جلسہ جلوس کافی نہ ہوگا۔اس دن جو جہاں ہے قائداعظم کی یاد میں پاکستان کی

تعمیر کے لئے کچھ نہ کچھ کرے۔کوئی ایک دن کا کام donate کرے،کوئی ایک دن کی تنخواہ۔کوئی ایک دن کی آمدنی۔ پھر یہ working hours یا آمدنی اس علاقے کی فلاح و بہبود کے لئے ایک منصوبہ کے تحت خرچ کی جائے۔ چھوٹے بڑے ہر پاکستانی کو conscious کیا جائے کہ پاکستان اسکا گھر ہے،اسکی ماں ہے۔اس کے لئے کچھ کرے۔آخر کار اس میں اس کی اپنی فلاح ہی نہیں نجات بھی ہے"۔پھر یکا یک چپ ہوگئے۔پھر بولے"لیکن یہ سب کچھ بغیر awareness کے ممکن نہیں۔"

انہی دنوں انہیں 'Dignity of work' کے بعد جو دوسرا سبق پڑھانا تھا وہ ایمرسن کی نظم A Nation's Strength تھی۔

Not gold but only men can make
Men, who for truth and honour's sake
Stand fast and suffer long
Brave men who work while others sleep
Who dare while others fly
They build a nation's pillars deep and lift them to sky

پہلے تو انہوں نے ایمرسن کے بارے میں بتایا کہ وہ بڑا کٹر مذہبی انسان تھا، بڑا پر جوش preacher تھا اور شاعر،فلسفی،مضمون نگار اور وطن دوست (patriot) بھی۔نظم کو پڑھانے سے پہلے انہوں نے انیسویں صدی کے امریکہ کی صورت حال کا نقشہ کھنچا۔ گولڈ رش ، virgin lands colonization کا،پھر industrialization کی لہر، پیسہ کی دوڑ۔اس پس منظر میں ایمرسن نے اپنے ہم وطنوں کو یاد دلایا کہ روپے پیسے کی ضرورت اور اہمیت اپنی جگہ لیکن قوم کی مضبوطی اور عظمت کا انحصار اخلاقی ترقی اور کرداری برتری پر ہے۔اس تمام بحث میں گو پاکستان کا براہ راست ذکر کہیں نہیں آیا لیکن ہمارے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس نظم پر وہ اتنا زور کیوں لگا رہے ہیں۔پبلک اسکول ایجوکیشن کا اصل اصول یہ ہے کہ نصابی یا غیر نصابی،صبح سے شام تک ، جو سرگرمی بھی ہو اس پورے روٹین سے ایک لائف سٹائل ترتیب دیا جائے اور اسے مستحکم کیا جائے تا کہ اس total education سے شخصیت ابھرے اور لیڈر شپ کی صلاحیت خاص طور سے نشوونما پائے، develop ہو۔

ان کی پاکستانیت سے commitment کے علاوہ ان کا ادبی اور علمی مطالعہ کا ذوق بھی انکے بہت سے شاگردوں نے ان سے catch کیا۔ جہاں دانش،آواز دوست، فکر محکم،آندھی میں چراغ، بے تیغ سپاہی، کمپنی کی حکومت،نورستان وغیرہ بہت سی کتابیں ہم بیشتر پڑھ چکے تھے یا شیر شاہ ہاؤس چھوڑنے سے

پہلے کم از کم انکے ورق الٹ چکے تھے۔

سکندر سلطان

(کالج نمبر 4913، زمانہ تعلیم 1989-1986ء)

ایک روز لیڈر شپ کے زیرو پیریڈ میں self-respect پر بحث ہونی تھی۔
راشد صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ ودو میں

جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ مصرعہ اقبال کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

غالب نے بھی خودداری کو بڑی اہمیت دی ہے۔ غالب کا اپنا انداز ہے۔

ہم پکاریں اور کھلے یوں، کون جانے
کعبہ کا دروازہ گر چاہیں کھلا

رشید احمد صدیقی نے ایک جگہ لکھا ہے۔ 'ایک بڑآ دمی اپنی شکست میں بھی بڑا رہتا ہے'۔ فرمایا۔ ایک مثال یاد آئی، جب راجہ پورس گرفتار ہو کر سکندر کے سامنے پیش ہوا اور اس نے پوچھا بتاؤ تمہارے ساتھ کیا کیا جائے تو اسکا جواب تھا۔ ''جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں''۔ یہ جان کی امان پانے کا بڑا diplomatic طریقہ تھا۔ اسکے برمقابل تاریخ میں ایک اور واقعہ بھی محفوظ ہے۔ جب چنگیز خان کا ایک پرانا ساتھی لیکن بعد کا دشمن جموقا گرفتار ہو کر اسکے سامنے پیش ہوا تو چنگیز خان نے اس سے یہی سوال پوچھا تھا۔ بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ درحقیقت چنگیز خاں اس سے پرانے تعلقات کی مروت میں اس کی جان بخشی کرنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن پتہ ہے جموقا نے کیا جواب دیا اس نے کہا ''وہی جو دشمن دشمنوں کے ساتھ کرتے ہیں''۔ سبحان اللہ۔ جواں مرد ایسے ہوتے ہیں۔ غالب کا حوصلہ دیکھئے جو کہتا ہے۔

جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

یہ بڑا positive attitude ہے۔ ایسے ہی لوگ کامیاب وکامران ہوتے ہیں۔ سکندر اعظم ہی کا واقعہ ہے کہ ایران کی مہم میں ایک معرکہ کے موقع پر سارے سپہ سالاروں، چیف آف جنرل اسٹاف پارمینو نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ دشمن سے دن کی روشنی میں روبرو لڑنے کے بجائے اس پر رات کی تاریکی میں

خاموشی سے شب خون مارا جائے۔ سکندر اپنے تجربہ کار اور بزرگ صورت مشیر پارمینو کا مشورہ بہت کم رد کیا کرتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس نے جو جواب دیا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اس نے کہا۔ "I don't want to steal victory" یہ سکندر اعظم ہی کہہ سکتا تھا جس کے پاس فراست بھی تھی، اور جرأت بھی۔ جرأت، انسانی کردار کی سب سے زیادہ قیمتی صفت ہے۔ جس سے اور بہت سی قیمتی صفات جنم لیتی ہیں۔ اسی طرح بزدلی ہزار برائیوں کی جڑ ہے۔

کلاس میں ہر طرح کے لڑکے تھے۔ کچھ کی awareness اتنی کم یا immaturity اتنی زیادہ تھی کہ وہ ان کے طرزِ تعلیم کو سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ اسلئے respond نہیں کر رہے تھے یا پوری طرح respond نہیں کرتے تھے۔ ایک روز جوں ہی زیرو پیریڈ شروع ہوا ایک بھولے بادشاہ فرمائش کر بیٹھے۔ ''سر آج لائبریری لے جائیں'' وہ ایک دم خاموش ہو گئے اور چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہوئے۔ ہم سمجھ گئے کہ ان حضرت سے misfire ہو گیا ہے۔ اب لمبا لیکچر سننا پڑے گا۔

''میں تمہارے جاگنے کا انتظار کر سکتا ہوں۔ ماں باپ بھی کر لیتے ہیں لیکن زمانہ نہیں کرے گا۔ ماں باپ رعایت کرتے ہیں، باہر کی دنیا نہیں کرتی''۔ پھر پیار سے سمجھایا ''گھر میں کوئی مقابلہ نہیں ہوتا۔ استعداد یا اہلیت کو نہیں دیکھا جاتا۔ جس چیز کی تمہیں ضرورت ہوتی ہے بعض اوقات تمہیں وہ تمہارے اشارہ کرنے سے بھی پہلے مل جاتی ہے، بلکہ پیش کر دی جاتی ہے۔ گھر سے باہر جو کچھ ملتا ہے وہ مقابلہ میں جیتنا پڑتا ہے، وہ پہلے deserve کرنا پڑتا ہے جو اس حقیقت کو نہیں سمجھے گا وہ دھوکا کھائے گا، بلکہ مارا جائے گا''۔ اس دن انہوں نے elimination کے تصور کی وضاحت کی۔ کہنے لگے ''athletics یا swimming کے مقابلوں میں جب مقابلہ کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو heats کرواتے ہیں جسکے نتیجہ میں کچھ کھلاڑی شروع کی heats ہی میں eliminate ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ جن کی ترجیحات priorities ٹھیک نہیں ہوتیں وہ شروع ہی میں زندگی کی دوڑ میں eliminate ہو جاتے ہیں۔ ڈارون نے اپنی کتاب Origin of Species میں جو survival of the fittest کا نظریہ پیش کیا ہے وہ بھی elimination کے تصور کی تائید کرتا ہے۔''

پھر ایک زیرو پیریڈ میں priorities کے concept کی تشریح کی۔ ترجیحات اس وقت ٹھیک ہوتی ہیں جب کسی کو اپنی wants اور needs میں فرق کرنا آئے۔ wants خواہشات فوری نوعیت کی ہوتی ہیں۔ needs کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے۔ عقلمند وہی ہے جو کم از کم آخری راؤنڈ تک پہنچے ورنہ وہ جو (wants) جبلی خواہشات کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں بہت جلد eliminate ہو جاتے ہیں''۔

صارم بن فخر
(کالج نمبر4918،زمانہ تعلیم1989-1986ء)

سر راشد کی نظر مستقل طور پر ہمارے کردار کی تربیت پر ہوتی تھی۔ایک روز کلاس روم کا ایک پنکھا خراب ہوگیا۔دوسرا ٹھیک چل رہا تھا۔کہنے لگے''اس سے مجھے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ایران کی مہم میں سکندر کو اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ ایک ایسے ریگ زار سے گزرنا پڑا جہاں پانی کا نام ونشان نہ تھا۔تمام لشکر میں پانی کی شدید قلت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ سکندر اور جنرل اسٹاف کے پینے کے لئے بھی پانی نہ رہا۔ آخرکار بڑی تگ ودو کے بعد سکندر کا اے ڈی سی کہیں سے تھوڑا سا پانی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جو اس نے بصد احترام فوج کے کمانڈر انچیف سکندر اعظم کو پیش کیا۔سکندر نے اس کے ہاتھ سے چمڑے کی چھاگل لے لی۔کچھ دیر سوچتا رہا پھر چھاگل کو ریت پر الٹتے ہوئے کہا'جہاں سب پیاسے ہوں وہاں کسی ایک کا پانی پینا مناسب نہیں'۔یہ کہہ کر انہوں نے اس طرف جہاں پنکھا تیزی سے چل رہا تھا کچھ کہے بغیر غور سے دیکھا۔چند لڑکے سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں اور محمود نے جو دیوار کے ساتھ سوئچ بورڈ کے قریب بیٹھا تھا، ہاتھ بڑھا کر پنکھے کا سوئچ آف کر دیا۔وہ مسکرائے Thank you اور God bless you کہا۔اس وقت ان کے چہرے کی تابنا کی دیکھنے کے قابل تھی۔کہنے لگے''یہ لمحہ میری زندگی کا پر مسرت ترین لمحہ ہے۔اگر اسوقت میں مر بھی جاؤں تو مجھے غم نہ ہوگا''۔ان کے الفاظ انگریزی میں یہ تھے۔

''It's a great moment in my life, even if I fall dead just now, I wont mind''

پھر وضاحت کی''اس لئے کہ تم میں سے بہتوں میں جو awarenss, social maturity ابھرنے لگی ہے وہ میری نجات کے لئے کافی ہے۔انسان کی اس سے بڑی خوش قسمتی کیا ہوسکتی ہے کہ وہ کسی کو آدمی سے انسان ہونے میں مدد دے۔آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان تہذیبی عمل سے بنتا ہے۔تعلیم ایک منظّم اور موئژ تہذیبی عمل ہے اور معلم اس عمل کا ایک اہم حصہ''۔اسی سلسلہ میں کہا۔''شیکسپیئر کے ڈراما "King Lear" میں یہ لافانی لائن ہے۔'Ripeness is all' اسے لکھ لو،اس پر پندرہ بیس برس کے بعد غور کرنا۔''

انسان دوستی،social responsibility انکی تعلیم کی مستقل تھیم تھی۔اس نکتہ کی وضاحت کے لئے میں Eva Lovett کی نظم بعنوان A Poem کا ذکر کروں گا:۔

This is the way my father sows,

As up and down the field he goes
Walking faster walking slow
Right and left the grains to throw
Father knows while he goes
That the grain thrown here and there
By and by good crops will bear
All he loves, will have a share,
So he throws
Sow! sow! sow !

اس نظم پر انہوں نے تین دن لگائے۔

اس لائن All he loves, will have a share کی انہوں نے بہت گہرائی میں جا کر وضاحت کی۔ ''دیکھو، sowing کوئی اور کر رہا ہے۔ toil کوئی اور کر رہا ہے۔ لیکن share کوئی اور۔ اسلئے کہ محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی مشقت کے ثمر کو اپنے پیاروں کے ساتھ share کیا جائے۔ شاعر نے All he loves will have a share کہا ہے۔ اس میں واضح طور پر اپنے خاندان کا ذکر نہیں، all he loves کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ آدمی اپنی محبت کا دائرہ اپنے گھر تک محدود رکھتا ہے۔ انسان کی محبت کا دائرہ پانی کے ripples کی طرح پھیلتا جاتا ہے، بتایئے اس نظم کی سب سے قیمتی لائن کونسی ہے؟ زور کس بات پر ہے؟''۔ ظفر اقبال نے ہاتھ اٹھا کر کہا ''سر آخری لائن''، بہت خوش ہوئے۔ ''God bless you'' پھر وضاحت کی۔ ''دیکھو لفظ Sow جو ہے، Sign of exclamation کے ساتھ تین بار دھرایا گیا ہے۔

تو میرے بچو! sow! sow! sow

زندگی کا سب سے بڑا سبق کیا ہوا؟ ''Sow, Sow, Sow''۔ اس لفظ کو انہوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں ہاتھ کے اشارے سے گرتی ہوئی آواز میں Sow, Sow, Sow کہا جیسے کوئی نغمہ fade out ہو رہا ہو۔ اتفاق کی بات کہ ٹھیک اس وقت گھنٹی بجی۔ دوسرے دن وہ آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ ''آپ بیتی'' بولے ''Sowing کے بعد sharing کیوں ضروری ہے۔ اس کی وضاحت میرے مرشد رشید احمد صدیقی کی زبانی سنو۔ یہ وہ عبارت ہے جو میں نے آج سے 43 سال پہلے پڑھی تھی اور اس نے میری زندگی کا راستہ بدل دیا۔ اگر میں یہ نہ پڑھتا تو آج شاید وہ نہ ہوتا جو ہوں''۔ ساری کلاس ہمہ تن گوش ہوگئی سر لکھوایئے۔ لکھو:

''زندگی کا ماحاصل یا انسانیت کا مقصد یہی ہے کہ آدمی جو زندگی یا زمانہ پائے، اس کو اپنے خیال یا حسن عمل سے خواہ وہ اتنا کم ہو کہ حساب میں نہ آئے۔ بہتر و برتر بنائے۔ دنیا کو بہتر و برتر بنانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان خدمت لینے سے زیادہ خدمت کرے۔ انساں مال اور کھال ہی میں مست نہیں رہتا، کردار میں بھی مست رہ سکتا ہے''

راشد صاحب کی عادت تھی کہ گھنٹی بجتے ہی ایک سیکنڈ کیا ایک لمحہ بھی مزید بات نہ کرتے بلکہ جو جملہ جو لفظ زبان پر ہوتا وہ بھی پورا نہ کرتے اور اپنی خوبصورت ڈائری اٹھا کر دو قدم پیچھے ہٹتے اور دروازے کے قریب جا کر قائداعظم کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے اور تھینک یو جنٹلمین کہہ کر رخصت ہو جاتے۔ میں نے ان سے سال بھر پڑھا مگر اس ڈرل میں ایک بار بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ ایک دن میں نے پوچھا ''سر آپ اس طرح کیوں کرتے ہیں'' بولے ''میں مستقبل کو سلام کرتا ہوں''۔ پھر خود ہی وضاحت کی کہ اس کا بھی ایک قصہ ہے۔ ''اٹلی کے ایک بڑے عظیم فلسفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اکثر صبح سویرے شہر کے ایک ایسے چوراہے پر جا کر کھڑا ہو جاتا جہاں سے چھوٹے بچے اسکول جاتے ہوئے گزرا کرتے۔ وہ ہاتھ اٹھا کر ان کو بڑے اہتمام سے سلام کیا کرتا۔ اس کے ایک عقیدت مند نے جو اس کے مرتبہ سے واقف تھا اس سے ایک روز پوچھا جناب والا آپ ان بچوں کو سلام کرنے کا اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں۔ اس مردِ دانا نے جواب دیا تھا میں مستقبل کو سلام کرتا ہوں۔ یہ بچے اٹلی کا بلکہ انسانیت کا مستقبل ہیں۔ تو بچو تم پاکستان کا بلکہ انسانیت کا مستقبل ہو۔ میں اس مستقبل کو سلام کرتا ہوں۔''

محمد عامر
(کالج نمبر 4926 زمانہ تعلیم 1989-1986ء)

سر راشد بڑے ڈرامائی انداز سے سمجھاتے تھے۔ ایک روز انگریزی کی کاپیاں دیکھ کر واپس کیں۔ حسب عادت ان پر تبصرے بھی لکھے تھے۔ اسد رفیق کی کاپی پر ماشاءاللہ لکھا تھا۔ کلیم اشرف کی کاپی پر God bless you میری کاپی پر ''Drive the Nail Aright'' یہ میری املا کی غلطیوں اور خراب خط کی طرف اشارہ تھا۔ کاپیاں بانٹنے کے بعد وہ گویا ہوئے۔ ''آج کاپیاں دیکھ کر دل بہت خوش ہوا اور کچھ اداس بھی۔ میں تمہاری کاپیوں میں تمہارے مستقبل کو دیکھتا ہوں۔ ان اوراق میں، میں تمہارے بچوں کو کھیلتا ہوا دیکھتا ہوں اور یہ بھی کہ وہ کن اسکولوں میں پڑھیں گے۔ ان کو کس قسم کی تعلیمی سہولتیں میسر آئیں گی۔ ان ہی

اوراق میں یہ اشارہ بھی ہے کہ تمہارے والدین کا بڑھاپا کس طرح گزرے گا اور ان ہی صفحات میں ملک کا مستقبل بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ ان سب باتوں کا تعلق تمہارے ذہن کی روشنی اور کردار کی پختگی سے ہے۔تم قوم کے پاسباں ہوسو چو ذرا''۔ پھر کہا'' بعض کاپیاں دیکھ کر دکھ ہوا۔جس آم کے پیڑ میں بور ہی نہ آیا ہو اس میں تروتازہ آم کہاں سے آئے گا۔کام کی poor quality اس بات کا اشارہ تھی کہ رویے ٹھیک نہیں یا ترجیحات میں خلل ہے۔اللہ خیر کرے مجھے ان کاپیوں پر تاریک سائے لہراتے نظر آئے''۔ پھر کہا'' آج میں علی الصبح سیر کے لئے نکلا تو شیر شاہ ہاؤس میں نماز ہو رہی تھی۔آگے بڑھا تو دیکھا کہ ایم،جی ہاؤس کے لڑکے Athletics کی پریکٹس کے لئے بھاگے جا رہے تھے۔ بابر ہاؤس کے کچھ لڑکے ہاکی لئے گراؤنڈ کی طرف ڈبل کرتے رواں دواں تھے۔ دل خوش ہوا اور افسوس ہوا ان پر جو ابھی بستر سے اٹھے بھی نہ تھے چونکہ پی ٹی نہ تھی۔ کاہلی (Idling) تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور dodging خود تباہی کی سب سے آسان اور یقینی صورت ہے۔dodgers اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہیں۔انجام کار دس بیس برس میں سب سے زیادہ بیوقوف اور بدقسمت ثابت ہوتے ہیں۔اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی بیوقوفی مت کرو''۔اس کے بعد انہوں نے اس دن کا سبق The clever wife پڑھانا شروع کیا۔ پہلے تو یہ بتایا کہ انگریزی میں clever ذہین اور ہوشیار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چالاک کے منفی معنوں میں نہیں۔ ہم ایسے موقعوں پر intelligent کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو کہ انگریزی روزمرہ نہیں۔ پھر وضاحت کی کہ ہمارے ہاں عام طور پر عورت بزدل اور کم عقل سمجھی جاتی ہے۔ یہ دورِ جاہلیت کی سوغات ہے لیکن اس سبق میں عورت کی نئی image سامنے آتی ہے۔ ذہین اور دلیر، شوہر کی باندی نہیں، صحیح معنوں میں ساتھی، دوست اور رفیق ہے۔ یہ پاکستان کی نئی عورت ہے جس میں initiative ہے۔ جرأت ہے، قوت ارادی ہے۔ میں اس نئی عورت کو سلام کرتا ہوں۔ پاکستان کی تقدیر اس نئی عورت کے ہاتھ میں ہے۔ابھی یہ کاغذوں میں ہے، خیالوں میں، تصورات میں ہے، جب یہ زندہ و تابندہ گھروں میں ہوگی، اس دن وطن میں ایک نئی صبح طلوع ہو گی۔ انٹرمیڈیٹ میں ایک ناول "Good bye Mr. Chips" ہے۔اس میں انگلستان کی نئی عورت Katherine Bridge کا تذکرہ ہے جواب مارگریٹ تھیچر کے روپ میں ابھری ہے لیکن ہماری نئی عورت ابھی کاغذوں میں، کتابوں میں، خیالوں میں ہے۔

''The Clever Wife'' کی کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے کہ ایک کسان کھیت جوت رہا ہوتا ہے کہ اچانک ایک ٹائیگر کہیں سے نمودار ہوتا ہے اور کہتا ہے،

Good moring farmer,God has commanded me to eat your bullocks. Now obey God and deliver them to me.

انہوں نے کہا یہ کہانی ایک fable ہے۔ fable ایسی اسٹوری کو کہتے ہیں جس میں جانور، انسانوں کی طرح بولتے اور behave کرتے ہیں۔ دنیا کی مشہور ترین اور قدیم ترین 'fables' کی کتاب Aesop's Fables 'لقمان کی حکائتیں' ہے۔ لقمان کا تذکرہ قرآن حکیم میں بھی ہے۔ آپ لوگ آج یا کل جمعہ کو لائبریری جا کر ''Aesop's Fable'' ڈھونڈ کر پڑھیں یا کم از کم انسائیکلو پیڈیا سے Aesop's کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کریں۔ لومڑی اور انگور، میمنہ اور بھیڑیا، کچھوے اور خرگوش کی جو کہانیاں ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں وہ سب Aesop کی ہی ہیں۔ دنیا کی ایک اور مشہور اور قدیم کہانی کلیہ اور دمنہ جس کا فارسی میں ''انوار سہیلی'' کے نام سے ترجمہ ہوا، مولانا روم نے اپنی مثنوی میں بعض حکایتوں (fables) کو نظم کیا ہے۔ شیخ سعدی کی گلستان میں اسی طرح کی حکائتیں ہیں۔ ان حکایتوں میں بڑی دانائی (wisdom) ہوتی ہے۔ by the way وزڈم اور چیز ہے، ذہانت اور علم اور چیز۔ بہت غور و فکر کے بعد یا صدیوں کے تجربے سے جو سچائی، جو دانائی حاصل ہوتی ہے اسے wisdom کہتے ہیں۔ مثلاً عوامی کہاوتوں میں بڑی wisdom ہوتی ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے Ultimately it is patience that wins یہ بڑے تجربے اور دانائی کی بات ہے۔ ایک فرانسیسی کہاوت جو ایک درس زندگی اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہے۔ "To understand all is to forgive all" ہے۔ یہ بڑی گہری بات ہے۔ نوٹ کر لو۔ کبھی سمجھو گے تو یاد کرو گے۔ اسی طرح پشتو کی ایک کہاوت ہے کہ کچھ دانے گیلے ہیں اور کچھ چکی بھی خراب ہے۔ خرابی اکثر دو طرفہ ہوتی ہے۔ یہ کہاوت زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ یہاں تک پہنچ کر وہ پھر سبق کی طرف پلٹے۔ آپ لوگوں نے چیتے صاحب (ٹائیگر) کا کردار نوٹ کیا کہ ایک غریب کسان کی روزی کے واحد ذریعہ بیلوں کی جوڑی کو ہضم کرنے تشریف لائے ہیں لیکن فرماتے ہیں

> God has commanded me to eat your bullocks, now obey God's command and deliver them to me

یہ ظالموں (tyrants) کی اور بے ایمانوں کی پرانی چال ہے۔ بدترین خواہشوں اور ظلموں کو خدا کے کھاتے میں ڈالنا۔ پہلے بادشاہوں نے divine-right of king کا چکر چلایا ہوا تھا، اب دوسرے ناموں سے exploit کرنے کا یہ سلسلہ جاری ہے

خداوندا ترے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یورپ کے کلیسا کے پوپ نے خدا کے نام پر جو گل کھلائے اس کے خلاف جرمنی کے لوتھر نے چودھویں صدی میں پروٹیسٹ کیا اور اسلام میں خلافت کی جگہ ملوکیت نے لی تو اموی اور عباسی خلفا نے بھی آخر آخر میں مذہب کو exploit کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

عہد عباسیہ میں امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ کو ستر سال کی عمر میں کوڑے محض اس لئے لگوائے گئے کہ انہوں نے آمر الوقت کی آمریت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا تھا۔ یورپ میں گلیلیو اور کوپرنیکس جیسے سائنس دانوں کا جو حشر اہل کلیسا نے کیا وہ تاریخ کا تاریک باب ہے۔ ایک کتاب ہے ''قوموں کی شکست وزوال کے اسباب کا مطالعہ'' ڈاکٹر آغا افتخار حسین کی، اس میں یہ عبرت ناک واقعہ لکھا ہے کہ مشہور مسلمان فلسفی اور سائنسدان محقق طوسی کو محض اس لئے پندرہ برس جیل میں قید رکھا گیا کہ اس نے خلیفہ وقت معتصم باللہ عباسی کو براہ راست قصیدہ بھیج دیا تھا۔

یہ بات خلیفہ کے وزیر مملکت ابن لعلقمی کو ناگوار گزری کہ اس نے قصیدہ through proper channel کیوں نہیں بھیجا۔ وہ غریب پندرہ برس زنداں میں سڑتا رہا۔ اس اسیری کے دوران طوسی نے بوعلی سینا کی مشہور تصنیف ''اشارات'' کی شرح لکھی جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں بھی مقبول ہوئی۔ اس شرح کے خاتمہ پر طوسی نے اپنی اسیری کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ خدا کی شان اس عظیم سائنس دان کی زنداں سے رہائی ہلاکو ایسے جابر انسان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ 655 ہجری میں ہلاکو نے الموت فتح کیا اور اس طرح محقق طوسی کو قید سے نجات حاصل ہوئی۔ اگلے سال ہلاکو نے بغداد فتح کیا۔ 657 ہجری میں ہلاکو کے حکم سے مراغہ (تبریز) میں ایک رصد گاہ قائم کی گئی جس کا ڈائریکٹر اسی محقق طوسی کو بنایا گیا۔ مراغہ کی observatory سائنس کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔''

دیکھا آپ نے، بات کہاں سے شروع ہو کر کہاں پہنچی!

آصف نسیم

(کالج نمبر 4930 زمانہ تعلیم 1989-1986ء)

مجھے سر راشد نے یہ آٹوگراف دیا

How sleep the brave who sink to rest By all the country's wishes blest

اور بتایا کہ یہ لائنز ولیم بلیک کی ہیں۔ میرے لیے انہی سطور میں شاید زندگی کے معنی پنہاں ہیں۔

اظہرامین
(کالج نمبر4935زمانہ تعلیم1989-1986ء)

جب جنوری1988ء میں سر راشد شیر شاہ ہاؤس سے ریٹائر ہوئے تو میں نے آٹو گراف کی فرمائش کی۔ کہنے لگے ابھی حال ہی میں ایک یونانی شاعر کے دوشعرنظر سے گزرے جومشہور مورخ ٹائن بی (Toynbee) نے اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں۔عزم راسخ پیدا کرنے والے اور حوصلہ دینے والے اشعار ہیں۔میرے دل سےتو موت کا خوف نکل گیا۔ One can defeat deathانسان اپنے کاموں میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔پھرانہوں نے یہ سطریں لکھیں۔

I was running a race with the reaper
I hastened, he tarried, I won
Now strike death, you sluggard, you sleeper

You can't undo what I have done.سر راشد نے ایمرسن کی نظم ’ A Nation's Strength‘ پڑھانے سے پہلے امریکی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے امریکی صدر جارج واشنگٹن کی بڑی تعریف کی کہ وہ اپنی زمینوں پر ہل چلاتے چلاتے امریکہ کی جدوجہد آزادی میں شامل ہوا۔اسے کامیابی سے ہمکنار کرکے 1779ء میں امریکہ کا پہلا صدر منتخب ہوا۔امریکی آئین کے مطابق صدارت کے دوٹرم کئے اور پھر خاموشی سے خدا حافظ کہہ کر واپس اپنی زمینوں پر چلا گیا۔لوگوں کے اصرار کے باوجود اس نے اپنے اخذ کئے ہوئے آئین میں ترمیم کروانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اپنے آپ کو indispensable نہیں سمجھا۔اس نے اپنی قوم پر اعتماد کیا اور آئین کی پاسداری کی My hat off to him۔بڑا آدمی تھا۔فرمایا الحمد للہ ابھی ہمارے ہاں کچھ لوگ باقی ہیں۔ابھی حال ہی میں وفاقی محتسب جسٹس سردار اقبال نے اپنے عہدے کے پانچ برس پورے ہونے پر ملازمت میں توسیع کی پیشکش کے باوجود اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کو ترجیح دی اور ایک اچھی روایت قائم کی۔اصل اہمیت افراد کی نہیں اداروں کی ہوتی ہے۔اداروں کو بھی مضبوط بنانا چاہیے۔

انہوں نے ایمرسن کے law of compensation کا ذکر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ دنیا کے تین عظیم رزمیہ شاعر ہومر، رودکی اور ملٹن نابینا تھے۔انگریزی کا ایک اور بڑا شاعر الیگزنڈر پوپ مستقل طور پر بیمار رہتا تھا۔خود اپنے علامہ اقبال کی بائیں آنکھ کی بینائی بچپن میں جونک لگوانے سے جاتی رہی تھی۔ 1901ء میں وہ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کی ڈاکٹری میں اسی وجہ سے فیل ہو گئے تھے۔قدرت کے کھیل

نرالے ہیں۔ محمد علی جناح 1892ء میں انگلستان گئے تھے، اگر اسی زمانہ میں ان کے والد کا کاروبار فیل نہ ہو جاتا تو شاید وہ ''لنکن ان'' میں بیرسٹری کے لئے داخلہ نہ لیتے۔ جب بیرسٹری نہ کرتے تو شاید سیاست میں نہ آتے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا نظام ربوبیت ہے He knows better اس لئے کسی handicap، کسی رکاوٹ کا مطلب یہ نہیں کہ بس قیامت آگئی، زندگی ختم ہوگئی۔ It's not the end of the world۔ Inferiority feeling کبھی کبھی بڑی بڑی کامیابیوں کی محرک بن جاتی ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

نوازش ممتاز
(کالج نمبر 4938 زمانہ تعلیم 1989-1986ء)

ہماری کلاس (نہم سی) کو یہ فخر حاصل ہے کہ سر راشد نے جمعرات 19 جنوری 88ء کو آخری کلاس لی۔ اس روز بارش ہو رہی تھی اور ہوا بہت تیز چل رہی تھی دو منٹ پہلے آ کر کلاس کے سامنے کھڑے ہوئے، گھنٹی بجنے پر اندر داخل ہوئے اور پھر عادت کے مطابق گزشتہ روز کے ہوم ورک پر نگاہ ڈالی، پھر پانچ جملوں کا ٹیسٹ دیا جیسا کہ وہ ہر روز دیا کرتے تھے۔ نئی بات یہ ہوئی کہ انہوں نے باری باری سب کا پیوں کو کلاس ہی میں روسٹرم پر کھڑے کھڑے چیک کیا اور ہر ایک پر ''God bless you'' بھی لکھا، کام کو تواتر سے (regularly) کرنے اور بہت احتیاط سے meticulously کروانے کی تربیت کو اس روز بھی جاری رکھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس روز بارش ہو رہی تھی، تیز ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے ٹھنڈ معمول سے زیادہ تھی۔ ہماری کلاس نے ان کی خواہش کے احترام میں کلاس کے دونوں دروازے اور چاروں کھڑکیاں کھول رکھے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ امکانی حد تک جسمانی، ذہنی وجذباتی قوت برداشت کو بڑھایا جائے۔ انہوں نے بار بار کہا آپ لوگ چاہیں تو کھڑکیاں دروازے بند کر دیں۔ میں آپ لوگوں کی مروت سے خوش ہو گیا ہوں۔ لیکن کلاس نے کھڑکیاں دروازے کھلے ہی رکھے۔ مجھے بھی اس روز ٹھنڈی ہوا محض اس وجہ سے اچھی لگ رہی تھی کہ وہ ایک عظیم استاد کی خوشنودی کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے آ رہی تھی۔ انہوں نے گھنٹہ کے آخری پانچ منٹوں میں بڑے اطمینان سے تین باتیں بتائیں کہ تخلیقی انداز سے پڑھو Learn creatively اور چاروں قسم کے responses یعنی social, intellectual, physical,

اور emotional کو بڑھاتے رہو۔ یہی الفاظ انہوں نے بلیک بورڈ پر لکھے تھے۔ چاک کا وہ ٹکڑا جس سے انہوں نے بلیک بورڈ پر آخری الفاظ لکھے تھے میں نے درخواست کی کہ تبرک کے طور پر وہ مجھے عطا کریں۔ اسی طرح وہ سرخ مارکر جس سے انہوں نے کاپیاں دیکھی تھیں وہ آصف نسیم اور سکندر سلطان نے اصرار کر کے لیا۔ جب گھنٹہ ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو بے اختیار سب لڑکے کھڑے ہو گئے۔ اور وہ ''تھینک یو جٹلمین'' کہہ کر رخصت ہو گئے۔

The end of an era

طارق مظفر

(کالج نمبر 4944 زمانہ تعلیم 1986-1989ء)

ستمبر 1987ء میں سر راشد نے ہمیں دوبارہ انگریزی پڑھانی شروع کی۔ ایک روز کہا صبح سویرے کراچی سے قومی نشریاتی رابطے پر عظیم سرور اپنا پروگرام ''صبح پاکستان'' پیش کرتے ہیں۔ اس میں ایک آئیٹم ملک کی ماؤں کے لئے ہوتا ہے جو اس مصرعہ سے شروع ہوتا ہے۔

تم قوم کی ماں ہو، سوچو ذرا

میں تم لوگوں سے کہتا ہوں

تم قوم کے پاسباں ہو، سوچو ذرا

وہ اس قومی سوچ کو بیدار کرنے اور ابھارنے کے لئے تقریباً ہر روز کتابی کام شروع کرنے سے پہلے کوئی نہ کوئی قول (Quotation) ضرور لکھواتے تھے۔ صارم اور میں ان کو اپنی ڈائریوں میں نوٹ کرتے جاتے تھے۔، پہلے روز یہ بند لکھوایا۔

اور اس کا ترجمہ بھی کروایا۔

We are here not to play, to dream to drift,
We have hard work to do, and loads to lift
Shun not the struggle, it's God's gift.

ایک روز آتے ہی کہا آج ایک نادر quotation ملی ہے۔ یہ 1946ء میں یہاں کے ایک نامور استاد مسٹر حیدری نے کلاس کو لکھوائی تھی۔ ایک خط میں (1223) بریگیڈئر اکرم ظفر نے لکھ کر بھیجی ہے۔ آپ بھی تبرک کے طور پر نوٹ کر لیں۔ یہ لائنیں خود بورڈ پر لکھیں اور کہا ان کو نقل کر لو۔

Life's battles don't always go

To the stronger or faster man,
But soon or late the man who wins
is the man who thinks he can

اوران کا ترجمہ بھی کروایا۔ کردار پر یہ quotation تو میرے دل پر نقش ہوگئی ہے۔

Sow an act reap a habit
Sow a habit, reap a character,
Sow a character, reap a destiny

اسی دن انہوں نے عادت کس طرح بنتی ہے اوراس میں کتنی طاقت ہوتی ہے کے بارے میں کئی قصے سنائے۔ کس طرح انسان اپنی عادت کا غلام ہو جاتا ہے۔ ہر عادت کی ایک فزیکل بنیاد ہوتی ہے۔ جواد نے پوچھا کہ ''سر۔ بری عادت سے پیچھا کیسے چھڑایا جائے؟'' انہوں نے کہا ''یوں تو میں بھی بتا سکتا ہوں لیکن بہتر ہے ولیم جیمس(William James) کی کتاب Psyhology میں 'Habit' پر جو باب ہے وہ خود پڑھو، اس کا مزہ اور فائدہ اور ہی ہوگا''۔ دوسرے روز انہوں نے کتاب لا کر دی۔ جواد، ظفر اقبال اور میں نے وہ chapter پڑھا۔ کچھ سمجھ میں آیا اور کچھ نہ آیا۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ عادت ایک پیچیدہ چیز ضرور ہے لیکن اس سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی نفسیات کا تعارف بھی ہوگیا۔ غالباً ان کا مقصد بھی یہ تھا۔ مجھے ان کے پڑھانے کی تین خصوصیات یاد ہیں۔ Text پر مبنی Why قسم کے سوال بہت پوچھتے تھے۔ جن کے جواب کتاب میں مرقوم نہ ہوتے، سوچ کے جواب دینا ہوتا۔ دوسرے یہ کہ خاص خاص لفظوں کے مختلف معنوں اور استعمال کا تفصیلی مطالعہ کرواتے۔ تیسرے یہ کہ ہر روز تین، حد سے حد پانچ جملوں کا کام دیتے تھے۔ پھر ہر روز چیک کرتے تھے اور چیک کرنے کے لئے اعلیٰ قسم کی سرخ بال پوائنٹ استعمال کرتے تھے۔

کاپی کا گیٹ اپ، سوالوں کا layout حتیٰ کہ تاریخ لکھنے کی جگہ اور طریقہ، حاشیہ وغیرہ کی چوڑائی، سب بہت باریکی سے دیکھتے تھے۔ فل اسٹاپ اور hyphen کہاں اور کیسے لگایا ہے وہ بھی چیک کرتے۔ کہتے تھے کہ Your copy is your future your career وہ کام کے ذریعہ کردار سازی کر رہے تھے۔

طاہراقبال
(کالج نمبر4981زمانہ تعلیم1989-1986ء)

طاہراقبال: سر،تصنیف وتالیف کا سلسلہ آپ نے کب شروع کیا اور کیوں؟ آپ کی پہلی تالیف کون سی ہے؟

سرراشد: لکھنے لکھانے کا شوق خداداد ہوتا ہے۔ساز گار ماحول سے وہ ابھرتا اور تربیت سے اسے جلا ملتی ہے۔ غالباً میں تیسری جماعت میں تھا کہ میرے کسی مضمون کو دیکھ کر میرے بڑے بھائی عبدالخالق صاحب (جنہیں میں اپنا پہلا مربی اور محسن سمجھتا ہوں) نے کہا تھا ''سعید، ایک دن ادیب بنے گا''۔اپنے آبائی مکان کی وہ جگہ اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے جہاں کھڑے ہوکر انھوں نے یہ فقرہ ادا کیا تھا۔ وہ پہلی داد اور حوصلہ افزائی تھی۔اپنے بڑے بھائی مرحوم عبدالحق کے کتب خانہ سے آٹھویں درجہ تک اردو کی خاصی کتابیں چاٹ چکا تھا۔آٹھویں کلاس میں، میں نے قدرت میرٹھی (اسی قسم کا نام تھا ٹھیک سے یادنہیں آرہا) کی ایک کتاب''کنفیوشس'' پڑھی تھی۔اس کا میں نے خلاصہ کیا اور ایک دو جز کا کتابچہ''خیابان اخلاق'' کے نام سے تیار کیا۔چچا اور بھائی کا پریس تھا۔انہوں نے وہ چھپوادیا تھا۔2 آنے قیمت رکھی تھی۔اس کتابچے کو میری پہلی تالیف کہا جاسکتا ہے۔اس کی صرف ایک اہمیت ہے کہ اس سے میری ذہنی اٹھان کے رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔

طاہراقبال: آپ اپنی باتوں میں کم لیکن تحریر میں انگریزی کے اتنے جملے کیوں استعمال کرتے ہیں؟ 'کردارساز' میں بریگیڈئر رفیق پر جوآپ کا مضمون ہے وہ انگریزی کے الفاظ بلکہ جملوں سے بھراپڑا ہے۔یہی حال 'علوی نامہ' میں''علوی صاحب'' کے بارے میں اس انٹرویوکا ہے جوآپ نے بھائی جان آصف سعید کودیا ہے۔

سرراشد: اول تو میرے اندر لسانی عصبیت نہیں ہے۔(اصل میں تو قومی عصبیت کے سوا میرے اندر کوئی عصبیت ہے ہی نہیں) زبان کی ایک قومی حیثیت ضرور ہے۔لیکن بنیادی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اظہار خیال کا وہ ذریعہ بہتر ہوتا ہے جس سے آپ زیادہ مانوس (familiar) ہوں۔ہم سب کم از کم دوزبانی (bilingual) ہیں۔انگریزی کے بعض الفاظ،فقرے استعمال کرنے سے ابلاغ فوراً ہوجاتا ہے۔دیکھئے ابلاغ کا لفظ میں

نے قصداً استعمال کیا communication کے بجائے اور میرا خیال ہے کہ communication ابلاغ سے زیادہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ یہ زیادہ expressive ہے چونکہ ہم اس لفظ سے زیادہ مانوس یا زیادہ familiar ہیں۔ میرا مقصد کسی کو سمجھانا، بتانا، کسی نکتہ کی وضاحت کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر مجھے انگریزی الفاظ کا سہارا لینا پڑے تو میں لیتا ہوں۔ کوئی یہ کہے کہ آپ کو اردو نہیں آتی تو میں کہوں گا کہ اس لحاظ سے تو یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ مجھے اپنی بات کہنے کے لئے غیر اردو الفاظ یا فقرے استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ میں ادبی یا علمی مضامین نہیں لکھتا، میں بول چال کی زبان استعمال کرتا ہوں اور جس طرح اقبال اپنے آپ کو روایتی معنوں میں شاعر نہیں کہتے تھے، میں اپنے آپ کو ادیب نہیں کہتا۔ میں پاکستان کا غلام ہوں۔ پاکستانیت کو آگے بڑھانے کے لئے جو جتن ہو سکے کرتا رہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں حالی کا پیرو ہوں۔ ان کے سامنے ایک مشن تھا، قوم کا درد۔ میں بھی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ پاکستانیت کے حوالے سے زندگی کا کچھ حق ادا ہو جائے۔ اور پھر پاکستان میں زندگی ایک نعمت ہے، ایک blessing ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

طاہر اقبال: سر، اتنے طویل عرصے آپ نے کالج میں پڑھایا، کچھ واقعات تو ضرور ہوں گے جن کو ناقابل فراموش کہہ سکیں؟

سر راشد: جی ہاں۔ بہت سے واقعات ذہن میں خوشگوار اور بعض اوقات قابل فخر تاثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ابھی پچھلے جمعرات کو جو عید میلاد النبی کا دن بھی تھا۔ میں حسبِ دستور جی ٹی روڈ کے پہلو میں کالج کے سامنے کی مسجد کے عقبی قبرستان میں اپنی مرحومہ اہلیہ اور علوی صاحب مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے گیا، میں نے دیکھا کہ وہاں کالج کے دو لڑکے عادل فاروق اور عاصم، علوی صاحب کی قبر پر اور میری اہلیہ کی قبر پر، جو علوی صاحب کی قبر کے متصل دائیں طرف ہے، اگر بتیاں جلا رہے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے آس پاس کی قبروں پر بھی اگر بتیاں جلا رکھی تھیں۔ وہ واکنگ آؤٹ گئے ہوں گے۔ واپسی پر اپنے مرحوم استاد اور مرحومہ آنٹی کے لئے فاتحہ کے لئے رک گئے۔ یہ دیکھیں کہ اب نومبر 87 ہے۔ علوی صاحب کے انتقال کو سال بھر ہونے آیا۔ آنٹی کو تو انہوں نے

بمشکل دیکھا ہوگا۔اس کو کہتے ہیں تربیت۔God Bless them مجھے اس امر سے خاص طور سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے ان دوقبروں کے علاوہ بھی آس پاس کی قبروں پر اگربتیاں جلا رکھی تھیں۔شاید انہوں نے مجھے بھی کبھی قبرستان کے گیٹ سے اپنی اہلیہ اور علوی صاحب کی قبر تک جاتے ہوئے دونوں طرف کی قبروں پر پھولوں کی پتیاں ڈالتے جاتے دیکھا ہو۔یا خود ان کے ذہن میں کارخیر کو پھیلانے کا خیال آیا ہو۔بہرحال یہ دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ایسے بچے ہی ملت کے مقدر کا ستارہ بنتے ہیں۔اس طرح چند ہفتے پہلے میں نے سیکنڈ ایئر کے ایک کیڈٹ کو علوی صاحب کی قبر پر فاتحہ پڑھتے دیکھا تھا۔حالانکہ وہ پچھلے سال فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تھا۔اس نے علوی صاحب سے صرف چند ماہ ہی پڑھا ہوگا۔یہ نہ صرف علوی صاحب کی عظمت کا ثبوت ہے بلکہ اس بچے کے شعور کی بیداری کا ثبوت بھی ہے۔اس کے لئے میرے دل سے دعا نکلی۔استاد کا آخری امتحان یہ ہے کہ اس نے شاگرد کو کتنا بیدار کیا اور شاگرد کا آخری امتحان یہ ہے کہ اس کی اپنی زندگی میں وہ روشنی کتنی آئی اور کس انداز سے آئی۔

طاہر اقبال : کوئی کلاس کی situation

سر راشد: جی ہاں! ہر استاد کے پڑھانے کا اپنا اسٹائل ہوتا ہے،اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔میرا طریقہ یہ تھا میں کلاس میں قدم رکھتے ہوئے پہلے بلیک بورڈ کو دیکھتا تھا کہ وہ meticulously clean ہے یا نہیں۔پھر ڈیسکوں کی ترتیب setting پر نظر ڈالتا۔پھر کلاس میں صفائی، کہیں کوئی ٹکڑا کاغذ، چاک کا تو نہیں، بہرحال چند لڑکے از خود ان چند چیزوں کو سیٹ کرنے، کھڑکیاں دروازے کھولنے door stop لگانے کا اہتمام ضرور کرتے تھے۔یہ کارروائی میری ہر کلاس میں برسہا برس ہوتی رہی۔لیکن جو بات مجھے یاد ہے، غالبًا اس لئے کہ ابھی حال کی بات ہے کہ نویں (اے) کا بلیک بورڈ یکا یک بہت زیادہ صاف نظر آنے لگا۔تو مجھے تجسس ہوا۔وہ راز یہ تھا کہ ایک لڑکا اپنے ہاؤس سے اپنی ٹاول لے آیا تھا۔وہ اس سے میرے آنے سے پہلے بلیک بورڈ صاف کرتا تھا۔

طاہر اقبال: کیا نام تھا؟

سر راشد : نام بتا کر میں اس کا اجر کم نہیں کرنا چاہتا۔جو بھی تھا God bless him۔میں یہاں یہ بتاتا چلوں کہ وقت کی بے انتہا پابندی ، بلیک بورڈ، کلاس روم کی صفائی،

نفاست، ذمہ داری، جز رسی کے رویے پیدا کرنے کی مشقیں (exercises) ہیں۔ یہی ان کی تربیتی قدر و قیمت ہے۔ اگر بنیادی رویے ٹھیک ہوں تو رسمی نصابی تعلیم کا کام ازخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔

طاہر اقبال: طلبہ کی کارکردگی کے حوالہ سے کوئی تجربہ؟

سر راشد: میں تخلیقی تعلیم creative education کا قائل ہوں۔ اس طرح کہ ہر سبق سے کسی مہارت یا معلومات میں اضافہ ہو، یا علم میں آگہی میں اضافہ ہو۔ ابھی آخری دنوں میں نویں میں ''کاسابیانکا'' نظم پڑھائی۔ یہ نظم، ایک بچہ کے احساس ذمہ داری، وفاداری اور فرمان برداری کا ولولہ انگیز واقعہ ہے۔ اس کو ایک علامتی نظم کے طور پر پڑھانے کے بعد میں نے کلاس سے کہا وہ اس کو لکیروں، رنگوں سے مزین کریں اور یہ نظم اردو میں اپنے طور پر لکھیں۔ یہ دونوں کام سب کیلئے لازمی نہ تھے۔ لیکن مجھے بے انتہا خوشی ہوئی کہ گیارہ لڑکوں نے تصویریں بنائیں۔ آرٹ کے ماسٹر مرزا عبداللطیف صاحب نے ان میں سے فرہاد عالم کی تصویر کو فرسٹ کیا اور عامر، ذوالفقار، ظفر اقبال، علاالدین، اظہر محمود، ساجد محمود، 6 لڑکوں نے اس انگریزی نظم پر اردو میں طبع آزمائی کی۔ ان کے عروضی پہلو سے قطع نظر بیشتر میں جذبہ موجود تھا اور دو ایک نظموں میں شعریت بھی تھی جیسے عامر کی نظم کے یہ فقرے:

پریشاں تھے لوگ زخمی ہرن کی طرح
وہ تیر سینہ پر کھا کے چلا
لیکن مسکرا کر چلا
ہواؤں میں آگ کی آندھی مچلتی ہوئی
فضاؤں کی نیت بدلتی ہوئی

دیکھا! ان بے وزن مصرعوں سے تخلیقی جو ہر جھلکتا ہے۔ God bless him God bless him تو یہ مزے تھے پڑھانے کے۔ استاد کی اس سے بڑھ کر کامیابی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ تخلیقی چنگاریوں کو ہوا دیدے۔

طاہر اقبال: سر بحثیت ایک جید استاد کے آپ ایسی پوزیشن میں ہیں کہ آپ سے مسلسل اظہار عقیدت ہوتا ہوگا، اس پر آپکا کیا اندرونی ردعمل ہوتا ہے؟

سر راشد: زور کس پر ہوا۔ اندرونی پر (ہنس کر) جہاں تک میرا تعلق ہے میں محبت، خدمت اور

عقیدت کے ہر اظہار کو ایک انعام، ایک چیلنج، ایک آزمائش اور ایک ٹرسٹ سمجھتا ہوں۔
اس پر پورا اترنے کی مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہوں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سعد اللہ احمد
(کالج نمبر 5000، زمانہ تعلیم 1987-1990ء)

سر راشد نے ہمیں جو آخری سبق پڑھایا وہ ایک نظم تھی۔
عنوان ہے

A Child's Hymn

God make my life a little light,
Within the world to glow
A little flame that burneth bright
Wherever I may go
God make my life a little flower
That giveth joy to all
Content to blossom in native bower
Although the place be small
God make my life a little song
That comforteth the sad
That helpeth others to be strong
And makes the singer glad
God make my life a little hymn
Of tenderness and praise
Of faith that never waneth dim
In all His wonder ways

جب انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ اقبال کی مشہور نظم ''بچے کی دعا''

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے
ہو میرے دم سے یوں ہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

Matilda Bethem Edwords کی اسی ''A Child's Hymn'' سے ماخوذ ہے تو ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی۔ سر راشد نے دونوں نظموں کا تھوڑا سا تقابل بھی کیا کہ اقبال نے '' A Child's Hymn'' کا ترجمہ نہیں کیا، اسکے ایک ایک بند کو ایک ایک شعر میں سمویا ہے۔ اقبال نے انگریزی کے جن دوسرے لوگوں سے استفادہ کیا ہے انہوں نے ان کا ذکر بھی کیا۔ ولیم کوپر William Cooper کی طویل نظم ''The Nightingale and the glow-worm'' جو اس طرح شروع ہوئی ہے۔

A nightingale, that all day sang
had charmed the village with his song
Nor yet at eve his note suspended
Nor yet when eventide was ended

اقبال نے اس کا بھی ترجمہ نہیں کیا بلکہ بلبل اور جگنو کا خیال لے کر اسے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا،

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

اقبال کی ایک اور مقبول نظم 'ماں کا خواب' ہے

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب
بڑھا اور جس سے میرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں
اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں

سر راشد نے بتایا کہ یہ ولیم بارنس William Barnes کی نظم The mother's dream جو

اس طرح شروع ہوتی ہے۔

The Mother's Dream

I'd a dream tonight
As I fell asleep
Oh: the touching sight
makes me still to weep
O my little lad
Gone to leave me sad

کا عکس ہے اور اصل سے زیادہ موثر اور خوبصورت ہے۔ فرمایا ان نظموں کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح ایک جینئس کا ذہن بھی مشاہدہ اور مطالعہ سے نشو ونما پاتا ہے اور یہ بھی کہ تخلیقی مطالعہ تقلیدی مطالعہ سے کس طرح مختلف ہوتا ہے۔ پھر مزید ایک وضاحت کی کہ ایک مطالعہ تنقیدی "critical" اور تحقیقی research orientated بھی ہوتا ہے۔ اس نظم کے ذریعہ سے میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ لوگوں کو تنقیدی اور تحقیقی طریق مطالعہ سے بھی روشناس کراؤں۔ ادبی مطالعہ میں یا کسی بڑے شاعر کے تصورات وخیالات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ سوال بہت دلچسپ بلکہ فکر انگیز ہوتا ہے کہ اس نے خیالات اور احساسات کہاں کہاں سے حاصل کئے اور انہیں کیا آب ورنگ دیا۔

اس تمہید کے بعد انہوں نے نظم کی تشریح شروع کی

God make my life a little light
Within the world to glow
A little flame that burneth bright
Wherever I may go

بنیادی طور پر اس میں وہی احساس ہے جو اقبال کے مصرعوں میں ہے۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

لیکن انگریزی کی نظم 'A child's Hymn' میں A little light اور A little flame

میں a little کے الفاظ سے ایک نئی گہرائی آ گئی ہے۔کبھی کبھی زندگی کے اتنے بڑے میلے یا سمندر میں ایک عام انسان کو اپنے ضعف یا کم حیثیتی کا احساس ہوتا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں اپنی خدمت ،اپنے کام contribution کی معمولیت (ordinariness) کا احساس شدت سے ابھرتا ہے ۔ اس کا جواب اس چھوٹی سی خوبصورت نظم میں ہے

Big Things and small things

I can not do the big things
That I should like to do
To make the earth forever fair
The sky for ever blue
But I can do the small things
That help to make it sweet
Though clouds arise and fill the skies
And tempests beat

زیرنظر نظم کے پہلے بند میں یہ جو مصرعہ ہے

A little flame that burneth bright

قابل غور ہے، مٹی کے دیئے کی لو، ہے تو چھوٹی سی لیکن جل خوب رہی ہے۔(Burneth bright) جو کچھ بھی ہے روشن خوب ہے۔یہی نکتہ ہے جو اس بند کی جان ہے۔دوسرا مصرعہ Within the world to glow اور چوتھا مصرعہ Where ever I may go خدمت کے جذبے کی عالمگیریت کو ظاہر کرتے ہیں ۔ دوسرے بند کے پہلے دو مصرعوں ۔

God make my life a little flower
That giveth joy to all

میں پھر یہی احساس ہے کہ محبت اور خدمت سب کے لئے ہے، تیسرے اور چوتھے مصرعے

Content to bloom in native bower
Although the place be small

پھر وہی A little light اور A little flame شرمندہ نہ ہونے اور اس کو کم نہ سمجھنے کا convictin دہرایا گیا ہے۔ Native bower ایک چھوٹی سی کیاری میں، گھر کے آنگن میں پھول کھلا ہے، یعنی

انسان کی خدمت یا محبت کا دائرہ اگر بہت محدود بھی ہے تو کیا ہوا، لیکن بساط بھر کھلا تو ہے۔ خدمت تو ہے۔

یہاں یہ نکتہ ہے کہ انسان کی جوابدہی (accountability) محدود ہے۔ اسکی جیت یا ہار، عزت یا ذلت اسی میں ہے کہ وہ کیا کر سکتا تھا اور کیا کر سکا۔ اس جگہ پر انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوع position and performance کی وضاحت کی۔ زندگی میں جو مقام جسے حاصل ہے، جس پوائنٹ پر جو کام کر رہا ہے وہ اس کی position ہے۔ چوراہے پر ٹریفک کانسٹیبل کھڑا ہے، یہ اس کی پوزیشن ہے۔ کوئی وزیراعظم ہے، یہ اس کی پوزیشن ہے۔ جس تندہی، دیانت داری سے وہ ٹریفک کانسٹیبل اپنے فرض کو انجام دے رہا ہے، یہ اس کی performance ہے۔ انسان کی بڑائی یا چھوٹے پن کا معیار اس کا عہدہ یا مرتبہ نہیں اس کی کارکردگی، اس کی performance ہے۔ یہی نقطہ نظر ہمارے اسلام کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے آخری خطبہ میں فرمایا کہ عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فوقیت نہیں مگر تقوی کی بنا پر۔ آنحضرت ﷺ اس ہی اصول کو متعین فرما رہے تھے۔ جب فیصلہ پرفارمنس پر ہونا ہے تو جگہ چھوٹی ہو یا بڑی، گھر کا چھوٹا سا آنگن ہو یا چمن زار، پھول کہیں بھی ہو اس کا کام تو کھلنا اور خوشبو پھیلانا اور رنگ روپ سے دوسروں کو خوش کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں نکتہ یہ ہے انسان کی پوزیشن کا انحصار بہت سے عناصر پر ہوتا ہے جن میں سے بیشتر اس کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لیکن انسان کی پرفارمنس، اس کا کردار، اسکا behaviour بڑی حد تک اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس لئے

Content to bloom in native bower
Although the place be small

بہت صحیح رویہ ہے

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے ''کیا عجیب ہے کہ خدا کے حضور اس کے مقرب بندے پیش ہوں تو ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوں جو یہاں دنیا میں کسی کھاتے میں نہ تھے''۔ کھاتے میں کیوں نہ تھے؟ اپنی معمولی ''تھاں'' کی وجہ سے، لیکن ان کا کام، پرفارمنس، کردار بڑا تھا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو چھوٹی جگہ پر بڑا کام کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ اس میں دولت، شہرت اور طاقت کا نشہ نہیں ہوتا۔ غالب نے اسی

لئے کہا تھا:

طاعت میں تا، رہے نہ مے وانگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت

اس Hymn کے تیسرے بند

God make my life a little song
That comforth the sad
That helpeth the weak to be strong
And makes the singer glad

میں نکتہ یہ ہے کہ خود نغمہ کار کو خوشی اس وقت ملتی ہے جب اس کی نغمہ کاری سے دکھی دلوں کو چین اور کمزوروں کو حوصلہ ملتا ہے۔ گویا خوشی، خوشی دے کر حاصل ہوتی ہے۔

اس نظم کے تقابلی مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ نظم ''بچہ کی دعا'' سے زیادہ پُر مغز اور پُر فکر ہے۔ نظم معلومات میں اضافہ کے لئے یا امتحان میں خلاصہ لکھنے کے لئے نہیں، زندگی کی راہوں کو روشن کرنے، شعور کو جگانے، awareness کو بڑھانے کے لئے ہوتی ہے۔ نظم کو ختم کرنے کے بعد لڑکے کو ذہنی جذباتی طور پر تھوڑا سا اس سے مختلف ہونا چاہیے جو وہ اس نظم کو شروع کرنے سے پہلے تھا۔

عمار محبوب (کیپٹن عمار شہید، ستارہ جرأت)

(کالج نمبر 5077، زمانہ تعلیم 1990 - 1987ء)

مئی اور جون 1987ء میں سر راشد نے ہمیں تھوڑے عرصے کیلئے انگریزی پڑھائی۔ انہوں نے چھٹیوں کے لئے نصابی ہوم ورک کے علاوہ غیر نصابی ہوم ورک بھی دیا۔ اس میں اخبار، رسالے پڑھنا ہر روز ڈائری لکھنا، انگریزی اردو کی پانچ کتابیں پڑھنا، اسکریپ بک بنانا، اور روز کوئی نہ کوئی ایسا کام کرنا جس سے پاکستان کی خدمت یا پاکستان سے محبت کا کوئی پہلو نکلتا ہو، ایسے کام شامل تھے۔ ان تمام کاموں کے علاوہ ایک اور بالکل نیا ہوم ٹاسک بھی دیا کہ ہم جہاں بھی چھٹیاں گزاریں وہاں کی پانچ تجربہ کار شخصیات سے ان کی زندگی کے مشاہدات و تجربات کے بارے میں انٹرویو کریں۔ ان میں خاندان کی ایک بزرگ ہستی۔ بستی کی کوئی ایسی شخصیت جو سماجی خدمت کے لئے معروف، ہو، کوئی ریٹائرڈ سول، فوجی یا پولیس افسر، کوئی پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر، کوئی کہنہ مشق وکیل، ڈاکٹر وغیرہ۔ ان پانچ افراد سے ان کی زندگی کے تجربات ومشاہدات کے بارے میں گفتگو کرنی تھی۔ انٹرویو سے پہلے سوالنامہ تیار کرنا تھا میں نے اس وقت کے وفاقی وزیر تعلیم نسیم آہیر صاحب سے انٹرویو کیا

اور مجھے اپنے والد میجر محبوب کے توسط سے جی او سی 37 ڈویژن میجر جنرل سجاد حسین سے انٹرویو کا موقع بھی ملا۔ یہ ملاقات گوجرانوالہ کینٹ میں ہوئی تھی۔ طارق صلاح الدین بھی میرے ساتھ تھا۔

جمیل احمد

(کالج نمبر 5096، زمانہ تعلیم 1987-1990ء)

سر راشد نے میری آٹوگراف بک میں یہ لکھا

Dear God, give us strength to accept
with serenity the things that can not
be changed, give us courage to change
the things that we can, and should be
changed. And give us wisdom to distinguish
one from the other.

دستخط کرنے کے بعد کہا کہ یہ قول ایڈمرل پارٹ سے منسوب ہے۔ یہ بھی نوٹ کر لو۔ میرے ساتھ سعید بھی تھا، اس نے کہا سر، مجھے بھی نواز یئے۔ انہوں نے اس کی آٹوگراف بک پر لکھا۔

''سوال سے خودی ضعیف ہوتی ہے''۔

فیض الحسن

(کالج نمبر 5110، زمانہ تعلیم 1987-1989ء)

سر راشد نے مجھے قرآن مجید کی تفسیر ''تدبر قرآن'' کی پہلی جلد دی اور کہا اس میں سے 'بسم اللہ' اور 'الحمد للہ' صرف دو لفظوں کی تفسیر پڑھ لینا۔ 'الحمد للہ' کا ترجمہ عام طور پر کیا جاتا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ امین احسن اصلاحی صاحب نے ترجمہ کیا ہے کہ تمام شکر گزاریاں اللہ ہی کے لئے ہیں۔ ذرا غور سے پڑھنا۔ بڑی گہرائی میں جا کر تفسیر بیان کی ہے۔ پھر انہوں نے مجھے اپنی کتاب 'مکالمات اقبال' کی ایک جلد دی، تم اسے ہاؤس میں سرکولیٹ کر دینا۔ جتنے زیادہ لڑکے پڑھ لیں اتنا اچھا ہے۔ اس ماہ کے آخر تک واپس کرنا ہے۔ جب میں یہ کتاب واپس کرنے گیا تو میں نے پوچھا۔ سر کالج کو پبلک اسکول کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے۔ فرمایا ''یہ ایک لمبی بحث ہے' وہ تو پھر سہی' فی ا

لحال علوی صاحب کا جواب سن لو، (علوی صاحب اس کالج کے ایک جینئس استاد تھے۔ پچھلے سال انتقال ہوا)۔ وہ 70-1969ء کے 'تربیت' کے اداریے میں لکھتے ہیں۔ ''ایک اقامتی درسگاہ یا پبلک سکول میں اساتذہ کا کردار صرف معلم ہی کا نہیں اتالیق اور والدین کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں سڑک، میدان، مسجد اور لائبریری، ڈائننگ ہال اور ڈارمیٹریاں، باغ اور سبزہ زار بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنی نصابی کتابیں اور درس کے کمرے۔ یہ کالج فقط درسگاہ نہیں ہے زندگی کی تجربہ گاہ بھی ہے جہاں طلبہ زندہ رہنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں۔

عمران احمد

(کالج نمبر 5161، زمانہ تعلیم 1991-1988ء)

جوں ہی تیسرا پیریڈ شروع ہونے کی گھنٹی بجی، سر راشد نے پہلا قدم کلاس کے اندر رکھا چونکہ وہ دو منٹ پہلے برآمدہ میں کھڑے گھنٹی بجنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک لڑکا موسیٰ ہال کے کولر کے پاس کھڑا تھا، وہ وہاں سے بھاگا لیکن آتے آتے اسے چند سیکنڈ کی دیر ہوگئی۔ اس نے پوچھا ''مے آئی کم ان سر'' انہوں نے کہا ''نو، کیپ سٹینڈنگ دیر'' جب سر راشد بورڈ پر ''ڈرائیور دی نیل ارائٹ'' لکھ چکے تو اس سے بھی کہا ''ڈرائیو دی نیل ارائٹ ینگ مین''، پھر پوچھا دیر کیوں ہوگئی۔ اس نے وضاحت کی میں کھیلتے ہوئے موسیٰ ہال کے پیچھے چلا گیا تھا۔ انہوں نے کہا ''ٹھیک ہے۔ بریک تھوڑی سی تفریح ہی کے لئے ہوتا ہے لیکن یہ جو ہاتھ پر گھڑی بندھی ہوئی ہے اس پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ وقت کی پابندی بھی ضروری ہے۔ تمہیں ایک منٹ پہلے اندر آکر بیٹھنا چاہیے تھا''۔ یہ گفتگو کرتے ہوئے ان کی نظر ناصر کے شوز کے فیتوں پر پڑی جو کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس سے کہا۔ پاؤں اوپر پلیٹ فارم پر رکھو اور خود جھک کر اس کے دائیں پاؤں کے جوتے کا فیتہ برابر کر کے باندھا اور اس سے کہا کہ اس طرح دونوں سرے برابر کر کے خود باندھو۔ جب وہ باندھ چکا تو سر راشد نے اپنی پینٹ کی جیب سے ایک ٹشو پیپر نکالا اور اس کے دائیں شو کو اس ٹشو سے اپنے ہاتھ سے صاف کیا اور دوسرا خود اس سے صاف کروایا۔ اس نے ٹشو پیپر زمین پر پھینک دیا تو انہوں نے اٹھا کر اسے دیا اور کہا اسے ڈسٹ بن میں پھینکو یا پھر جیب میں رکھو۔ اس عمل کے بعد ناصر سے کہا ٹیک یور سیٹ، پھر ساری کلاس کو مخاطب کر کے کہا کہ فیتے دونوں سرے برابر کر کے اس طرح سیدھے باندھنے چاہئیں جیسے گھڑی میں سوا نو بجتے ہیں، پھر اپنے چہرے کی طرف اشارہ کر کے کہاں یوں جیسے خانصاب کی مونچھیں، سب ہنس

پڑے۔ ناصر، جوان کے تسمے باندھنے اور ٹشو پیپر سے شوز صاف کرنے سے کچھ شرمندہ سا ہو رہا تھا وہ بھی سیٹ ہو گیا۔ اس نے آئی ایم ساری سر کہا۔ ان کا جواب تھا اٹس آل رائٹ اور بات آئی گئی ہوئی۔ یہ واقعہ 2 مئی 88ء، کلاس آٹھویں بی کا ہے۔

شاہد نبی
(کالج نمبر 5182، زمانہ تعلیم 1991-1988ء)

یہ واقعہ 8 اکتوبر 88ء کی شام کا ہے۔ میں سپورٹس گراؤنڈ سے واپس آ رہا تھا، کیوسٹورز کے سامنے کی سڑک کے کنارے پتھر کا ایک چھوٹا ٹکڑا نظر آیا۔ ہاکی ہاتھ میں تھی، میں اسی سے کھیلنے لگا۔ ٹھیک اس وقت پیچھے سے سر راشد آئے۔ میں نے سلام کیا۔ انہوں نے بھی جواب میں اسلام علیکم کہا اور پوچھا بخیر ہو۔ میں نے یوں ہی بے خیالی میں کہہ دیا۔ ''ٹھیک ٹھاک''۔ وہ رک گئے اور بولے ''ٹھیک ٹھاک اس موقع کے لئے ٹھیک جواب نہیں، اللہ کا شکر ہے یا الحمدللہ کہنا بہتر ہوتا ہے اور چونکہ میں تمہارا استاد ہوں اس لئے تھینک یو سر، بھی کہنا تھا۔ بہرحال God bless you شاہد''۔

حامد سجاد للاّ
(کالج نمبر 5229 زمانہ تعلیم 1991-1988ء)

13 اکتوبر 88ء کی شام کی بات ہے کہ میں واکنگ آؤٹ پر جہلم گیا ہوا تھا، چار بج رہے تھے اور مجھے ساڑھے چار بجے تک واپس آنا تھا۔ ٹھیک اس وقت شاندار چوک کے قریب سر راشد نے اپنی سوزوکی وین روکی اور کہا کسی کو کالج واپس جانا ہو تو آ جائے۔ مجھے اور ایک سینئر بھائی جان کو جلدی تھی، ہم دونوں سوزوکی میں بیٹھ گئے۔ بھائی جان کو کینٹ کے راؤنڈ اباؤٹ پر اترنا تھا۔ سرائے کی مسجد کے قریب گاڑی رکوائی۔ انہوں نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے پھولوں کا تھیلا اٹھاتے ہوئے مجھے بتایا یہاں کالج کے پرانے استاد مسٹر علوی اور میری مرحومہ بیگم دفن ہیں۔ تمہارا نام حامد سجاد ہے نا؟ آؤ ذرا فاتحہ پڑھ لیں، کارثواب ہے۔ جو بات میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ جن قبروں کے پاس سے گزرے، دو دو تین تین پھول کی پتیاں ڈالتے گئے۔ علوی صاحب کی قبر کے قریب کھڑے ہو کر مجھے مٹھی بھر پھول دیئے اور کہا یہ تم ڈالو۔ یہ ایک عالم کی قبر ہے۔ خدا تمہارے علم میں برکت دے گا۔ پھر ہم نے علوی صاحب کے لئے دعا کی۔ آخر میں سر راشد نے بچے ہوئے چند پھول آنٹی کی قبر پر ڈالے اور فاتحہ پڑھی۔

جناب سعید راشد

رفقائے کار کی نظر میں

محمد عبداللطیف عباسی

نئے ہاؤسوں کی تعمیر کے لئے Earthbreaking کا پہلا پھاوڑا لیفٹیننٹ جنرل اقبال نے چلایا اور دوسرا کالج کے کمانڈانٹ بریگیڈیئر نورالحق نے۔ جب جنرل اقبال نے راشد صاحب سے کہا آپ بھی اس مبارک تقریب میں حصہ لیں اور وہ آگے بڑھے تو میرے دل نے کہا راشد صاحب آپ کو یہ تاریخی اعزاز مبارک ہو، اس گھڑی کے لئے آپ نے بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔ جب وہ پھاوڑا چلا کر ہٹے تو بریگیڈیئر مقصود کالج نمبر 2428 نے کہا ''سر مبارک ہو، بڑا اچھا ہے کہ کالج کے نئے دور کی ابتدا میں آپ کا ہاتھ شامل ہے''۔ ٹھیک اس وقت کرنل غلام علی کالج نمبر 2479 چیف انسٹرکٹر کرنل نقوی سے کہہ رہے تھے کہ راشد صاحب کو ایک یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اب تک کسی اور فرد واحد نے کالج کو اس طویل عرصے تک سرو نہیں کیا ہے۔ یہ سن کر میں نے اضافہ کیا کہ صرف سرو ہی نہیں کیا، ہے خون جگر دیا ہے۔

دوسرے دن 12 فروری 88ء کی شب راشد صاحب کو آفیسرز میس میں الوداعی عشائیہ دیا گیا جس میں شرکت کے لئے ڈائریکٹر جنرل اے۔ ای۔ سی میجر جنرل عبدالمجیب اپنے پرانے کولیگ کو الوداع کہنے خود آئے تھے۔ اس تقریب میں کمانڈانٹ نورالحق نے اپنی تقریر میں منجملہ اور باتوں کے کہا ''پاکستان راشد صاحب کا passion ہے۔ پاکستانیت کا فروغ ان کی زندگی کا مشن ہے''۔ (یہ لفظ پاکستانیت بھی انہی کا بنایا ہوا ہے)۔ اپنی جوابی تقریر کے آخر میں شدت جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں راشد صاحب نے جو کچھ کہا، وہ میں ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں۔

''پاکستان میری پہلی محبت ہے اور میرے لئے پاکستان یہ ملٹری کالج ہے۔ اس کی خدمت کرتے ہوئے میں نے کم وبیش چالیس سال گزارے ہیں۔ اب یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ جب تک زندگی ہے یہیں کسی گوشہ میں پڑا کچھ نہ کچھ کرنا چاہوں گا اور جب مر جاؤں تو پاکستان کا پرچم تو بڑی چیز ہے اور وہ شہیدوں کے لئے مخصوص ہے، آپ مجھے کالج کے پرچم میں لپیٹ کر یہیں کسی گمنام گوشہ میں دبا دیجئے گا۔ اور کسی نشان یا سنگ مزار کی ضرورت نہیں تا کہ کالج کی یہ دو گز زمین بھی بیکار نہ جائے''۔

میجر عبدالرشید

راشد صاحب نے علوی صاحب کے انتقال کے فوراً بعد انکی یاد میں 'علوی نامہ' مرتب کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ انہوں نے ان کے چچازاد بھائی فخر الدین صاحب سے پہلا انٹرویوان کے انتقال کے دوسرے دن لیا جب ان کو دفنائے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس سے ان کی شخصیت اور کام کرنے کی لگن پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح میں نے سنا ہے کہ جب ان کی بیگم سی ایم ایچ راولپنڈی میں آئی ٹی سی میں تھیں، ان دنوں وہ عیادت کے لئے آنے والوں سے بھی رسمی عیادت کے بعد کہا کرتے اب آپ کچھ بریگیڈئر رفیق صاحب کے بارے میں بھی نوٹ کروا دیجئے۔ ''علوی نامہ'' پر انہوں نے چار ماہ دن رات ایک کر دیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب علوی صاحب ''علوی نامہ'' کے صفحوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یہ صرف علوی صاحب ہی نہیں ایک معلم کی داستان حیات اور شخصیت کا مطالعہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ ملٹری کالج اور تعلیم دونوں کی برابر کی خدمت ہے۔'' علوی نامہ'' کالج کے میگزین 87-1986ء میں شامل تھا۔ اس کو انہوں نے علیحدہ بھی چھپوایا اور تحفے کے طور پر تقسیم کیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے علوی صاحب کی روح آسودہ ہوئی ہے۔ یہ وہ کام تھا جو شاید کوئی اور نہ کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے مشکل لیکن ضروری کام جن میں شہرت کی گنجائش کم ہو، کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اور امنگ دی ہے۔ 30 اکتوبر 87ء کو علوی صاحب کی بڑی بیٹی کی شادی کا سارا انتظام راشد صاحب نے کیا تھا اور اس طرح کہ علوی صاحب کے چچازاد بھائی جلال الدین صاحب نے، جو کراچی سے آئے تھے، مجھ سے کہا کہ اگر یہ شادی ہم سارے اعزا مل کر کراچی میں کرتے تو یقیناً اس سے بہتر انتظام نہ کر پاتے۔ ہم حیران ہیں کہ ابھی دنیا میں ایسے لوگ ہیں جو ایک دوست اور مرحوم رفیق کار سے اس حد تک وفا کریں۔ اصل حیرانی مجھے یہ ہوئی کہ راشد صاحب کی اپنی بیٹیوں کی شادیوں کا انتظام تو ان کے شاگردوں اور دوستوں نے کیا تھا۔ یہ اہتمام اس پیمانے پر انہوں نے کیسے کرلیا۔ درحقیقت یہ بھی اس لگن کا کرشمہ تھا جس نے برسوں انہیں متحرک رکھا۔

نائب صوبیدار خان بہادر

میں ملٹری کالج میں مئی 1970ء سے مئی 1973ء تک حوالدار سینٹری اسسٹنٹ رہا۔ میرے ہوتے ہوئے راشد صاحب نے شیر شاہ ہاؤس کا میس جاری کروایا۔ یہ جگہ بہت خراب حالت میں تھی۔ اسکو اور آس پاس کے علاقہ کو راشد صاحب نے خود سامنے کھڑے ہو کر صاف کروایا۔ بلکہ گل و گلزار

بنایا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں شیر شاہ ہاؤس کے میس کے آگے پیچھے کا علاقہ چمک اٹھا۔ میرے ہوتے ہوتے ہی راشد صاحب نے شیر شاہ ہاؤس اور کنٹین کے درمیان کا علاقہ بھی جہاں سکھ چین کے درخت تھے، صاف کروا دیا اور وہاں ہارسنگھار اور گڈار کے پودے لگوائے اور ان کے تھالے بنوائے۔ میں نے اکثر ان کو کھڑے ہو کر اپنے سامنے کام کرواتے ہوئے دیکھا۔

مجھے حیرت ہوتی کہ وہ ہاؤس کی صفائی کی پرابلمز کو ڈسکس کرنے کے لئے مجھے بلواتے۔ میں نے جب دیکھا انہیں ہاؤس میں دیکھا۔ اس زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس کالج کا سب سے زیادہ صاف ستھرا ہاؤس تھا۔ انہوں نے ہاؤس میں پودے اس حساب سے لگوائے ہوئے تھے کہ ہر موسم میں چنبیلی، گڈار، گلاب، لیسٹونیاں اور بوگن ویلیاء یا چاندنی میں سے دو تین کے پھول ضرور کھلے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ کام کے قدردان افسر تھے اور عزت کرنا جانتے تھے۔

کرنل محمد ظہور الحق

اکتوبر 1974ء میں جب ملٹری کالج میں ریسرچ اینڈ ڈیویلپمنٹ سیل کھولنے کا وقت آیا تو اس کی سربراہی کے لئے میری نظرِ انتخاب مسٹر سعید راشد پر پڑی۔ وہ جس احسن طریقے سے اس ذمہ داری سے عہدہ براء ہوئے وہ میرے دور کا ایک سنہری باب ہے۔ آر اینڈ ڈی سیل میں جس تحقیقی، تالیفی اور تاریخی کام کی ابتداء اس وقت راشد صاحب نے کی تھی، وہ اب تک سولہ کتابوں کی شکل میں سامنے آ چکی ہے۔ سیل کے زیر اہتمام انہوں نے جو خالص تحقیقی کام کیا جیسے The Psychology of Adolescent اور Learning to think & Problems of Puberty اور Smoking Exercises in thinking وہ بھی کم مفید نہیں ہے۔ انہوں نے میرے ایما پر والدین اور اساتذہ کے رویوں اور قدروں پر ریسرچ کرنے کے لئے ایک سوالنامہ تیار کیا تھا۔ اس کی ایک کاپی مجھے اپنے کاغذات میں ملی ہے۔ پتہ نہیں اس کی کوئی کاپی وہاں محفوظ ہے یا نہیں۔ بہرحال میں اسے ان کی یاد کی نذر کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ پروفیسر سعید راشد کے جانے کے بعد بھی ریسرچ سیل زندہ رہے گا۔

کیپٹن شبیر حسین اے۔ای۔سی

میں نے ان کے اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر کی حیثیت سے کچھ عرصہ کام کیا ہے۔ ہاؤس میں ان کو کام کرتے ہوئے اور کام لیتے ہوئے بہت قریب سے دیکھا۔ کام کرنے کی ادا تو یہ تھی کہ سب سے زیادہ ڈیوٹی کرتے تھے۔ کہا کرتے ''اگر سینئر کام کرنے کی اہلیت اور امنگ میں سینئر نہیں تو بات نہیں بنتی۔''

Senior has to work harder longer and if possible, better too.

ہاؤس کا مشکل ترین کام وہ خود کرتے تھے۔ وہ اپنے جونیئر افسروں کو خاص طور سے جن کی نئی نئی شادی ہوئی ہو، بہت رعایت دیتے تھے۔ اس زمانہ میں ایک مقبول سیریز ''اندھیرا اجالا'' چل رہی تھی، وہ دن انہوں نے خود اپنے لئے مخصوص کرلیا تا کہ ایک ینگ افسر اپنے گھر پہ سیریل دیکھ سکے۔ دوسروں کو خوش کر کے خوش ہوتے میں نے انہی کو دیکھا۔ میں نے ایک بار ان کو ناراض ہوتے بھی دیکھا۔ کسی لڑکے کو ویک انڈ پر جانا تھا۔ انہوں نے اجازت نامہ بنا کر ہاؤس پریفیکٹ کو دیا کہ ابھی دے دو۔ ہاؤس پریفیکٹ نے زیادہ (efficiency) دکھائی اور اس لڑکے سے کہہ دیا کل کلاسز کے بعد Exit لے لینا۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ ہاؤس پریفیکٹ کو ایڈ جوٹینٹ نے بلا لیا۔ وہاں سے نکلا تو کیفیٹیریا چلا گیا۔ وہ بے چارہ لڑکا گھنٹہ انتظار کرتے کرتے ادھر ادھر ڈولتا رہا۔ راشد صاحب نے اسے دیکھا تو پوچھا کہ تم گئے نہیں؟ اس نے کہا سر Exit نہیں ملا۔ انہوں نے خود دوسرا پاس اسے بنا کر دیا اور بہت معذرت کی۔ یہ معذرت کرنے کا نظارہ میں نے بھی دیکھا۔ میں نے کہا سر، آپ کیوں پریشان ہوئے، غلطی ہاؤس پریفیکٹ کی ہے۔ انہوں نے کہا ''نوشبیر نو۔ ماتحت کی غلطی سے کوئی سینئر بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ accountability کا سارا فلسفہ یہی ہے''۔ اتنے میں وہ ہاؤس پریفیکٹ بھی آ گیا۔ اس کو وہ جھاڑ پڑی کہ باید شاید۔ میں نے اس سے پہلے انہیں اتنے جلال میں نہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر بعد دھیمے ہوئے تو سمجھایا۔ ''تم ان جونیئرز کے لئے سب کچھ ہو۔ رات ہی Exit بنانے اور دلوانے کا مقصد یہ تھا کہ اس بچے کی خوشی اس وقت سے شروع ہو جائے اور کل پانچواں پیریڈ ختم ہوتے ہی وہ بغیر کھانا کھائے جانا چاہے تو چلا جائے۔ گھر جلد پہنچنے کی خوشی تھوڑی دیر بھوکا رہنے کی تکلیف کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ اب ہوا یہ کہ تم نے اسے رات سے اب تک خوشی سے بھی محروم کیا اور اس کی چھٹی کا ڈیڑھ گھنٹہ بھی ضائع کر دیا''۔ اس نے وضاحت کی کہ میں نے Exit اس لئے نہیں دیا تھا کہ کہیں یہ بریک کے بعد نہ سرک جائے۔ انہوں نے کہا۔ ''تمہاری 'efficiency' بیشک زیادہ ہو، تمہاری لیڈرشپ کمزور ہے''۔ دوسری بات میں نے یہ نوٹ کی کہ جب ہاؤس فنکشن ہوتے تھے تو وہ زیادہ سے زیادہ لڑکوں کو اسٹیج پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ بغیر talent کے لڑکوں کو کاسٹ سے نہیں نکالتے تھے۔ کہتے بیشک شو خراب ہو جائے لڑکا خراب نہ ہو۔ چونکہ اس طرح پروگرام لمبے ہو جاتے تھے اس لئے ارباب حل وعقد ان سے عاجز رہتے۔ آخر میں ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ شو سوا گھنٹے سے زیادہ کا نہ ہو۔ اس پابندی کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ 16 جنوری 87ء کا ہاؤس فنکشن جو کہ موسیٰ ہال میں ہوا تھا کے سکرپٹ کو انہوں نے دوبارہ لکھا اور زیادہ سے زیادہ کردار شامل کیئے۔ اس کا ایک آئیٹم 'سقراط کی موت' شاید کالج کی تاریخ میں زندہ رہے۔ اس طرح

جمیل اوراحسن وقاص کا ٹیبلو جس کا عنوان تھا ''اے دیس کی ہواؤ کبھی ہم بھی جواں ہونگے''۔ بہت ہٹ گیا تھا

راشد صاحب کی بعض خصوصیات، کام کرنے کی دھن اور فنکارانہ صلاحیت ان کے بیٹے آصف نے بھی ورثہ میں پائی ہیں۔آصف نے شیر شاہ ہاؤس کے سوشل سیکرٹری کے طور پر پہلا ''انٹر ہاؤس پاکستانیات'' اور''اقبالیات'' کا مقابلہ جتوا کرایک ریکارڈ قائم کیا۔

راشد صاحب کے وہ بے شمار شاگرد جو ملک کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں وہ بھی قابل ذکر ہیں۔ جو جس شدت سے انہیں یاد کرتا ہے،اسی نسبت سے وہ ان قدروں کا علم بردار ہوتا ہے جن کی وہ خود علامت تھے۔ ان کے جلائے ہوئے چراغوں کی بھی کم اہمیت نہیں اور اصل کام تو یہی ہے کہ روشنی کا سفر جاری رہے۔

''علوی نامہ'' لکھ کر راشد صاحب نے محترم علوی صاحب کے نقوش حیات کو دوام اور تابندگی دی ہے اور ایک محترم و معظم رفیق کار کی رفاقت کا حق ادا کر دیا ہے۔کوئی مانے یا نہ مانے جن شاہکاروں کو پر تاثیر قلم اور تاریخ کا دامن نصیب نہیں ہوتا وہ بے نام ونشاں ہو جاتے ہیں ۔ راشد صاحب نے ملٹری کالج کے جیالوں اور چراغوں کو اپنے رت جگے دے کر آنے والے زمانے کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اپنی تمام تر قوت اور رعنائی کے باوجود یہ ادارہ ان کا ہمیشہ مقروض رہے گا۔

راشد صاحب نے مخفی گوشوں میں عظمتِ انسان دیکھنے کی اہل نظر کو دعوت دی ہے۔ اہل وطن تو صدیوں کا جبر سہہ سہہ کر خاموشیوں کے عادی ہو گئے،ارباب اقتدار بھی بے زبانوں کو مقرب جانتے ہیں۔ راشد صاحب نے نوا پیدا کرنے والوں کی صف آرائی کی طرح ڈالی ہے۔اس لحاظ سے ''چراغوں کی قطار'' بہت سے طوفانوں کو للکارے گی اور اندھیروں کو برہم کرے گی لیکن نئی سحر کے اجالوں کو کون روک سکے گا۔

پروفیسر طارق محمود چوہدری

راشد صاحب کو دس بارہ برس میں نے شیر شاہ ہاؤس میں کام کرتے دیکھا۔ان کا اپنا لائف اسٹائل تھا۔جس پر وہ سختی سے قائم تھے، جو وقت جس کام کے لئے مقرر ہوتا وہ اس کو فالو کرتے تھے۔گرمیوں میں بھی جوں ہی تین بجنے میں پانچ منٹ رہتے ان کے کمرے کا دروازہ کھلتا۔ جفاکشی ان کی عادت سی بن گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی مستقل مزاجی اور سخت کوشی ان کی بہت سی کامیابیوں کا راز ہے۔ دوسری بات یہ کہ انہیں مخالفت سے بھڑکتے نہیں دیکھا اور مخالف سے الجھتے بھی نہیں تھے۔ اپنا کام کئے جاتے۔ اکثر کہا کرتے کہ کام اور دیانت داری میں بڑی قوت ہوتی ہے۔

پروفیسر اے ڈی خان

دنیائے علم وعمل میں کبھی کبھی اللہ تعالی ایسے صاحب جنوں بندوں کو انسانیت کا پیغام پہنچانے کیلئے منتخب کرتا ہے جو پیغمبروں کی پیروی کرتے ہوئے اپنی زندگی نسلوں کی تربیت اور کردار سازی میں گزار دیتے ہیں۔ میری نظر میں جناب پروفیسر سعید راشد انہی میں سے ایک تھے۔

پروفیسر صاحب سے مجھے ۱۹۵۰ء میں تقریباً دو سال تک مستفید ہونے کا موقع ملا۔ جب وہ بطور معلم ملٹری کالج جہلم میں تشریف لائے۔ آپ بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ آپ ایک رول ماڈل تھے اور آپ کا کردار قابل ستائش تھا۔ محنت اور لگن کی بدولت انہوں نے بہت نام کمایا۔ آپ ایک شفیق اور مقبول ترین استاد تھے۔ جب تک ان کا تربیت یافتہ ایک بھی طالبعلم زندہ ہے وہ امر رہیں گے اور ان کو ہمیشہ ادب سے یاد کیا جائے گا۔ کالج ہذا سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ اکثر کہتے تھے کہ میری شناخت ملٹری کالج ہے۔ آپ نے ملٹری کالج میں تقریباً چالیس سال گزارے۔ بعد ازاں وہ دو تعلیمی اداروں کے پرنسپل رہے۔ اس دوران کالج ہذا کے فوجی اعزاز یافتہ' علامہ محمد اقبال، قائد اعظم اور کردار سازی کے موضوعات پر بیس سے زائد کتب تحریر کیں۔

ملٹری کالج چھوڑنے کے بعد ان کا رابطہ پاکستان کے مختلف تعلیمی اداروں سے رہا۔ طلباء و طالبات کی تعلیم و تربیت کے پیش نظر اساتذہ کی تربیت کا احساس شدت سے پیدا ہوا۔ ٹیچر ٹریننگ ان کا مقصد حیات بن گیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ اگر نوجوانوں کی بہتر خطوط پر تربیت کی جائے تو وہ بہت ترقی کر سکتے ہیں اور ملک وقوم کی قسمت پلٹ سکتے ہیں۔

چند سال تعمیر ملت فاؤنڈیشن میں اساتذہ کی تربیت کی اور ۱۹۹۸ء کے آغاز سے ہی سلطانہ فاؤنڈیشن انسٹیوٹ آف ٹیچر ڈویلپمنٹ میں بطور فاؤنڈر ڈائریکٹر ڈیڑھ سال تک فائز رہے، آپ نے پشاور، کراچی، ملتان، کوہاٹ، راولاکوٹ، مظفر آباد، کھاریاں، جہلم، سکردو، مٹھا ٹوانہ جیسے مقامات تک سفر کیا، لیکچر دیئے اور اساتذہ کی تربیت کیلئے سیمیناروں اور ورکشاپوں کا اہتمام کیا۔ تقریباً دو ہزار سے زائد اساتذہ کی تربیت کی۔ اساتذہ کے مقام اور مرتبہ کے حوالے سے ان کی کتاب مندرجہ ذیل اقتباس ان کے MIssion اور Vision کو اجاگر کرتا ہے۔

Truly
Teacher is the saviour
of mankind

O God !
Bless me
To be a true teacher
A Role - Model
O God !
Bless Me
Bless Me !

پروفیسر سعید راشد کو ملک اور قوم کی بہت فکر تھی موجودہ اخلاقی حالت دیکھ کر بہت پریشان ہوتے تھے۔لیکن وہ نا امید نہیں ہوتے تھے۔ مایوسی ان کی عادت ہی نہیں تھی۔انہوں نے ساری زندگی تعلیم وتربیت اور عمدہ رویوں سے ہماری قدروں کی آبیاری کی اور رویوں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کیں جس کی بدولت نوجوانوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔انہوں نے دلوں میں تربیت کے ذریعے محبت پیدا کی جو ہمیشہ قائم رہے گی۔ان کی کتب اور لٹریچر کی بدولت ان کے Mission اور Vision کی آبیاری جاری رہے گی۔

پروفیسر اے ڈی خان (ڈائریکٹر)
سلطانہ فاؤنڈیشن فاطمہ غنی کالج آف ایجوکیشن
فراش ٹاؤن اسلام آباد

انٹرویوز

ریڈیو انٹرویو

ریڈیو پروگرام	آپ کے ساتھ ساتھ
مہمان شخصیت	پروفیسر سعید راشد
میزبان انٹرویو	شکیل اختر
پروڈیوسر	آفتاب محمود
تاریخ نشر	۱۸دسمبر ۱۹۹۷ء
وقت نشر	9:30 pm

شکیل اختر: السلام علیکم پروگرام ''آپ کے ساتھ ساتھ'' سے شکیل اختر حاضر خدمت ہے۔ یہ پروگرام آپ کے لئے پیش کرتے ہیں پروڈیوسر آفتاب محمود، پروگرام ''آپ کے ساتھ ساتھ'' ہمارے سننے والے واقف ہیں اور جانتے ہیں۔ بہت خطوط ہمیں موصول ہوتے ہیں جن میں محبتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ دراصل اس پروگرام کا بنیادی مقصد بھی یہی ہے جو آپ نے سمجھا اور جو آپ محسوس کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کے مختلف مراحل گزارنے کے بعد یعنی اپنی سرکاری مصروفیات گزارنے کے بعد اب یا تو آرام کر رہے ہیں یا کچھ کام کر رہے ہیں، دونوں صورتوں میں ہم انہیں یہاں مدعو کرتے ہیں کہ انہوں نے زندگی میں کیا کھویا اور کیا پایا، بنیادی مقصد اس پروگرام کا یہ ہے کہ ان کے تجربات کو ہم اس مائیکروفون کے ذریعے ان سننے والوں تک منتقل کریں۔ زندگی مسلسل سفر کا نام ہے اور اس کو کبھی بھی ساکت نہیں ہونا چاہیے، زندگی ترقی اور ارتقا کا نام ہے۔

آج ہمارے مہمان ایک ایسی شخصیت ہیں کہ میری تمہید آسانی سے سمجھ آجائے گی۔ جنہوں نے بہت ساری کتابیں لکھیں، ان سب کتابوں کا تعلق انسانی رویوں، انسان کے کردار اور انسانی حوالوں سے ہے۔ یوں سمجھئے انسانیت کی خدمت کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ آج کے ہمارے مہمان ہیں سعید راشد، بہت سارے ان کے تعارف ہیں اور

بہت ساری ان کی کتابیں میرے سامنے ہیں لیکن جب ان سے ہم بات کریں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ سعید راشد کی شخصیت کیا ہے اور انہوں نے کتنا کام کیا اپنی سرکاری ملازمت کے دوران اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی۔

جناب سعید صاحب میں نے آپ کا تعارف کرانا اس لئے چھوڑ دیا کہ اگر میں ساری کتابوں کا نام لوں اور تعارف کراؤں تو جو ۲۸، ۳۰ منٹ ہمیں ملے ہیں، اسی میں لگ جائیں گے۔ مختصراً ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ سعید راشد کہاں سے پروان چڑھا اور اب جو سعید راشد ہے وہ کون سا سعید راشد ہے۔

سعید راشد: سعید نام میرے والدین نے رکھا اور راشد میرے ایک استاد ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے رکھا۔ انہوں نے کہا سعید کے بعد آگے بڑھو اور راشد بھی بنو، تو 1944ء سے میں سعید راشد ہوں اس سے پہلے محمد سعید تھا۔

شکیل اختر: کہاں سے سعید راشد کا تعلق ہے؟

سعید راشد: میں بریلی میں پیدا ہوا، بریلی میں تعلیم پائی، پھر علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد 1950ء میں پاکستان آگیا پھر اس کے بعد 1990ء تک ملٹری کالج جہلم میں درس و تدریس میں مصروف رہا، ہاؤس ماسٹر تھا، وہاں ریسرچ کا شعبہ تھا اس کا میں ڈائریکٹر رہا لیکن 1988ء میں، میں ریٹائر ہوا اور ریٹائر ہونے کے بعد........اصل میں ریٹائر کوئی صحیح لفظ نہیں ہے۔

شکیل اختر: میں ریٹائر کا لفظ استعمال بھی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ سروس سے ریٹائر ہوئے، آپ خود تو ریٹائر نہیں ہوئے۔

سعید راشد: ہاں میں یہ کہوں گا کہ ریٹائر سے کچھ آرام کا تصور آتا ہے۔ جس طرح کہ کام ختم ہوگیا میرا خیال یہ ہے کہ وہ ایک منزل تھی اور ایک بہتر دور تھا۔

بہتر اس لحاظ سے کہ اصل چیز جو انسان کو اچھا، بہتر بناتی ہے وہ اس کا perception ہے۔ حضرت علی کا ایک قول ہے کہ صاحب بصیرت اپنی آنکھ سے بھی دیکھتا ہے، اپنے دل سے بھی دیکھتا ہے اور اپنے دماغ سے بھی دیکھتا ہے، تو بھائی میرے شکیل صاحب 1988ء تک میں صرف آنکھ سے دیکھتا تھا۔ اس کے بعد میں نے دماغ سے دیکھنا شروع کیا اور اب حال ہی میں دل سے بھی دیکھتا ہوں اور ہر قدم پر خدا کا جلوہ نظر آتا ہے، اس کو میں

perceive کرتا ہوں اور جی چاہتا ہے ہر قدم پر سجدے میں گر جاؤں۔

شکیل اختر: سعید صاحب! اس پروگرام کا بنیادی مقصد یہی ہے، دو جملوں میں آپ نے ہمارا مقصد بھی بیان کر دیا کہ جو کچھ آپ نے آنکھ سے دیکھا اور جو کچھ دل سے محسوس کیا، جو کچھ دماغ سے سوچا اور محسوس کیا وہی ہمارے سننے والوں تک منتقل کر دیں۔ آنکھ سے دیکھنے کا عمل تو 1988ء میں ختم ہو گیا میری مراد سرکاری ملازمت ہے۔ اس کے بعد آپ کے دل کی آنکھیں اور دماغ کی آنکھیں روشن ہوئیں۔ نئے منظر کچھ سامنے آئے یا وہی....؟

سعید راشد: ہاں یقیناً، ایک تو یہ ہے کہ مجھے آدمی اور انسان کا فرق معلوم ہوا جو پہلے اتنا واضح نہیں تھا۔ اس کے بعد، پھر میں استاد تھا لیکن علم اور معلومات کا جو فرق ہے اور جو بصیرت کا فرق ہے وہ بھی....یعنی پڑھا تھا، خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں، لیکن اس کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔

شکیل اختر: اگر میں پوچھوں آپ کا ایک شعبہ کیا ہے تو بتا سکیں گے آپ؟

سعید راشد: شعبہ میرا ہے پاکستانیت اور کریکٹر بلڈنگ۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی شخصیت کی تین بہت واضح dimensions ہیں۔ وہ کسی رول میں ہو، نظر ہے یعنی values ہیں، vision ہے، will ہے۔ تو اس میں ویژن کی بہت اہمیت ہے، ہر خواب کسی درجے پر ہو۔ ویلیوز کی بڑی اہمیت ہے، will کی بڑی اہمیت ہے۔ تو میں نے ویلیوز کو مرکز بنایا۔

شکیل اختر: آپ نے جو کتابیں لکھی ہیں..... ہمارے سننے والوں کو پتا لگے کہ آپ نے کتنا کام کیا اس شعبہ میں۔

سعید راشد: ایک کتاب میری ''کردار کی کرنیں'' ہے اور ایک ہے ''آدمی میں انسان کی تلاش'' اور ایک ہے ''دیئے سے دیئے کو جلاتے چلو'' ''لائٹ اے کینڈل'' ہے۔ پھر اس کے بعد ٹیچرز کیلئے ''بیکن لائٹ'' ہے۔ قائداعظم پر میری دو کتابیں ہیں ''گفتار و کردار قائداعظم''، ''کریکٹر اینڈ کنڈکٹ آف قائداعظم'' اس وقت پریس میں ہے۔ سرسید پر ایک کتاب میں لکھ رہا ہوں ''گفتار و کردار سرسید''۔ اقبال پر ایک کتاب ہے ''مکالمات اقبال''۔ سچ پوچھو تو یہی میرا اصل کام ہے۔

شکیل اختر: پھر کس نے آپ کو کہا ہے کہ آپ ریٹائر ہو گئے ہیں؟

سعید راشد: مجھے کسی نے نہیں کہا۔ بلکہ اگر کوئی مجھ سے یہ کہے کہ "you're that old"، مجھے اولڈ کا لفظ اپنے context میں کبھی محسوس ہی نہیں ہوا۔ I am 70+ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ

I'm growing old but I feel very young۔مزا جینے کا تو اب آیا۔ میں اب creative ہوا ہوں۔

شکیل اختر: اس عمر میں لوگ سرپلس ہو جاتے ہیں آپ +70 ہیں۔ یہ تجربہ آپ کو کیسا لگا؟

سعید راشد: بہت اچھا لگا اور I m looking forward to be 80+

شکیل اختر: اللہ آپ کو اور زندگی دے۔

سعید راشد: لیکن زندگی صحت کے ساتھ اور صحت کار خیر کے ساتھ۔

شکیل اختر: کتابوں کے علاوہ اور کیا کام کیا؟

سعید راشد: 1988ء کے بعد ملٹری کالج جہلم کی تاریخ لکھتا رہا''داستان علم و عمل''۔اس کے بعد میں پنڈی آ گیا۔ اسلام آباد میں یہاں پر میں نے تعمیر ملت فاؤنڈیشن اور سلطانہ فاؤنڈیشن کو جوائن کیا۔ میں ان میں ریسرچ کے شعبوں کا ڈائریکٹر ہوں، ان کا کنسلٹنٹ ہوں، ان کے لئے میں نے curriculum لکھا۔ پھر میں نے ٹیچر ایجوکیشن پر کام کرنا شروع کر دیا۔

شکیل اختر: آپ کے لئے وہی 24 گھنٹے ہیں جو ہم لوگوں کے لئے ہیں۔ اس سے زیادہ وقت تو نہیں ہے۔

سعید راشد: اس سے زیادہ نہیں ہے لیکن میں اپنے ہر گھنٹے کو نچوڑ لیتا ہوں۔ I manage my time، اور میں ٹائم کا اسیر نہیں ہوں۔ ٹائم میرا اسیر ہے۔

شکیل اختر: اچھا اتنی گنجائش ہے زندگی کے ان چوبیس گھنٹوں میں کہ آدمی اتنے سارے کام کرنا چاہے تو کر سکے۔

سعید راشد: ہاں میرا خیال ہے گنجائش تو ہے، کبھی کبھی کوئی short fall بھی ہو جاتا ہے، گلہ بھی ہو جاتا ہے۔ کبھی بچے، کبھی بیوی، کبھی کبھی گلہ کرتے ہیں کہ ہم بھی پڑے ہیں راہوں میں۔

شکیل اختر: تخلیق کی دنیا ہے، تحقیق کی دنیا ہے، ایک آپ کی اپنی دنیا ہے، بیوی بچوں کی، گھر بار، چھوٹا سا گھر ہوتا ہے، آدمی خوش ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹائم ضروری ہوتا ہے دینا۔ کیا آپ اس ٹائم کو مار کر.........؟

سعید راشد: نہیں، نہیں.....ایسا نہیں ہے **الحمد للہ** میری چار بیٹیاں ہیں اور دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا مسعود امریکہ میں ہے چھوٹا آصف یہاں پر''روٹس'' میں پڑھاتا ہے۔ تین بیٹیاں ڈاکٹر ہیں، چوتھی بھی ڈاکٹر ہے۔

شکیل اختر: ماشاءاللہ۔

سعید راشد: اپنی اپنی منزلوں پر ہیں۔ میں تو بڑا پاگل آدمی تھا۔ خدا نے مجھے رسوا ہونے سے بچا لیا اور بچوں کو آگے بڑھا دیا ورنہ میں تو......لوگ مجھے پتھر مارتے کہ تباہ کر دیا اس نے اپنے خاندان کو۔لیکن اللہ تعالیٰ نے گھر بھی دے دیا، بچے بھی آگے بڑھا دیئے اور میرے خیال میں کوئی ادا پسند آ گئی۔

شکیل اختر: جو آج کل ہماری معاشرتی زندگی ہے، ذہنی پریشانیاں ہیں، الجھنیں ہیں، بہت سی الجھنیں ہیں ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں آپ بخوبی واقف ہیں ۔ جو ہمارے سننے والے ہیں وہ واقف ہیں کہ جو ریٹائرڈ ہوتے ہیں اپنی سروس سے تو بہت بد دل ہوتے ہیں، بڑے تھکے ہوئے ذہنوں سے اور بڑے مایوس لہجے میں گفتگو کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا حل کیا ہے؟

سعید راشد: میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں جو انسان کی ویلیوز ہیں، وہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔لوگ اپنی ذات تک اور اپنے خاندان تک محدود ہو جاتے ہیں لیکن اگر values درست ہوں اور ہم اپنی ذات کے دائرے کو وسیع کر لیں تو زندگی آسان ہو جائے۔مَیں ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کوئی اجنبی محسوس نہیں ہوتا۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ آدمیوں کے ہجوم میں اس انسان کو غور سے دیکھو، اس کی آنکھوں میں کوئی بڑا مقصد ہے، اپنی عورت سے بڑا، اپنے بچے سے بڑا۔ یہ خیال منیر نیازی کا ہے اور میں نے تھوڑا تصرف کیا ہے۔

شکیل اختر: اتنا آپ نے لکھا ہے، یہ بتایئے کہ اس کی کوئی پذیرائی ہوئی۔

سعید راشد: بظاہر نہیں ہوئی۔ اب مجھے پتا نہیں کہ آپ لوگوں نے مجھے کہاں سے دریافت کر لیا۔ یہ آفتاب محمود صاحب نے، قیوم صاحب نے۔ پتہ نہیں کیسے میں آپ تک پہنچ گیا ہوں۔ کون دیوانے کو زنجیر سے یہاں اٹھا لایا۔ مجھے تو کوئی پذیرائی نہیں ملی۔ سچ پوچھیئے تو زیادہ نہیں ملی۔

شکیل اختر: ''جب بجی پازیب اُدھر زنجیر اِدھر ہلنے لگی۔ رقص وحشی وہ بصد ناز ادا دیکھا کیے''۔ آپ کی زنجیروں کی آواز اتنی تھی کہ ہم نے آپ کو ڈھونڈ نکالا۔ یہ فرمایئے یہ سب کتابیں جو آپ نے لکھی ہیں، جو کام کیے ہیں ویلفیئر کا کام ہے، اور ابھی ہم آپ سے شاعری بھی سُنیں گے۔ اگر اُسے آپ شاعری کہہ رہے ہیں۔

سعید راشد: میں نہیں کہوں گا۔

شکیل اختر: اتنی dimensions ایک شخص میں؟ یعنی ایک قوس قزح سی بن گئی ہے آپ کی شخصیت میں۔

سعید راشد: نہیں میرا خیال ہے کہ صرف ایک رنگ ہے، وہ ایک رنگ ہے محبت کا، خدمت کا، اُس کے کچھ تھوڑے سے پہلو ہیں۔

شکیل اختر: اچھا یہ سب آپ کی سروس، ریٹائرمنٹ کے بعد شوق پیدا ہوا؟

سعید راشد: حیرت کی بات ہے کچھ کچھ تو دیوانگی تھی۔ کام ہو رہا تھا۔ ملٹری کالج جہلم میں، میں استاد رہا، پڑھاتا رہا اور بچوں کو ایک خاص vision دیا، ویلیوز دیں، اس پر I feel very proud of that period ،اس کے بعد یہاں آ کر بھی۔ لیکن مجھے جو بصیرت، آنکھوں سے دیکھنا، اُس دور کے بعد، دل سے دیکھنا اور ذہن سے دیکھنا، دماغ سے دیکھنا۔ یہ سرپرائزنگ ہے کہ I came of age after my retirement۔

شکیل اختر: جو گوہر آپ نے لُٹائے، جو گوہر آب دار آپ نے پیدا کیے، کبھی کبھی ملاقات تو ہوتی ہوگی۔ جو پروگرام سن رہے ہونگے وہ آپ کو پہچان گئے ہونگے اور عقیدت بھی جھلک رہی ہوگی۔ آپ کے ذہن میں محفوظ ہیں کچھ آپ کے شاگرد؟

سعید راشد: بے شمار نام ہیں لیکن میں تین شہیدوں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ہمارے کالج کے تیس پینتیس ستارہ جرأت ہیں، بہت سے جنرل اور لیفٹنٹ جنرل ہیں، بے شمار لوگ ہیں لیکن عہدے نہیں کام اہم ہے، تین شاگرد میرے ایسے ہیں جو شہید ہو چکے ہیں۔ ایک تو اکرم شہید نشان حیدر، نکا کلاں کا ایک عام سا بچہ، سانولا سا، دبلا پتلا، انگریزی faulty، سب کچھ، لیکن اندر سے اس کے وجود کا ہر ذرہ سونے کا تھا۔ میں نے اسے پانچ سال پڑھایا اور اگر میں کبھی رُک گیا خدا کے سامنے، تو میں کہوں گا کہ اس بچے کو بلاؤ اس سے پوچھو، اکرم سے پوچھو کہ یہ استاد گناہ گار ہے، اس کا کچھ کہے۔ دوسری طرف ایک اور میرے، شاگرد تو نہیں دوست تھے کرنل حق نواز کیانی شہید ستاہ جرأت (دوبار)۔ وہ بھی ڈوبے ہوئے انسان تھے، وہ بھی شہادت کی تلاش میں تھے اور میں نے ان کو دیکھا ہے۔ 1968-1967ء میں، مَیں نے ان کے بیٹے اصغر کو بھی پڑھایا۔ وہ 1971ء میں لیپا میں شہید ہوئے۔ وہ آدمی بھی ایسا تھا کہ جس سے شعلے لپکتے تھے، اُن کے جذبے اور جنون سے۔ تیسرا ابھی آخر میں معظم علی بلوچ جو ابھی سیاچن میں شہید ہوا، یہ وہ شخص، جو اقبال کا شعر ہے کہ ''شہادت ہے مطلوب و

مقصود مومن'' یہ دیوانا تھا شہادت کی تلاش میں اور انہیں راہوں میں گزر گیا، کھو گیا۔ میرے خیال سے، جہاں گلاب کھلتے ہیں۔

شکیل اختر: کچھ ہمیں سنائیں۔

سعید راشد: بالکل میں سناؤں گا آپ کو، پہلے تو میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بچوں سے مجھے بہت محبت ہے، میں نے ایک سلوگن دیا تھا، نومبر کا ایک پروگرام تھا پی ٹی وی سے، میں نے ایک سلوگن دیا، میں نے کہا کہ ''پاکستان کا مستقبل پاکستان کے بچے''۔ اور وہاں میں نے ایک نظم بھی پڑھی تھی۔

کالا یا گورا
بھولا بھالا یا شرارتی
خاموش یا باتونی
شہری یا گاؤں کا
صلاحیتوں کا ایک چھپا خزانہ
قوم کے مقدر کا ستارہ
مستقبل کا عزیز بھٹی، ایدھی، قدیر خان، اقبال یا قائداعظم
ہر بچہ اچھا بچہ ہوتا ہے

بچوں کے سلسلے میں، میں نے کچھ اور بھی چیزیں لکھی ہیں۔ دو چیزیں میں پیش کرتا ہوں۔

میرے بچے کبھی اپنے اندر بھی جھانکا کر
کبھی سوچا ہے تیرے اندر کتنی صلاحیتوں کے بیج ہیں
کبھی سوچا ہے کہ تیرا دماغ کتنی بڑی قوت ہے
تجھے معلوم ہے کہ تیرا علم کتنا طاقتور ہتھیار ہے
تیرا کردار کتنی مضبوط ڈھال ہے
بتا تو سہی محض لکیر کا فقیر ہے یا اپنے دماغ سے بھی کام لیتا ہے
تو نے کبھی اپنی اُمنگوں، اپنے دل میں چھپی ہوئی آرزوؤں، اپنی

ترجیحات کا بھی جائزہ لیا ہے

کبھی اپنے اندر بھی جھانک کر دیکھا ہے، اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کی ہے

میرے بچے میری اُمید، کبھی اپنے اندر بھی جھانکا کر

اپنے رویوں کو بھی تولا کر

ایک اور نظم ہے

میرے بچے کبھی مڑ کر نہ دیکھنا، جو پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے اس کا اگلا قدم رک جاتا ہے

چھوٹی چھوٹی باتوں میں نہ الجھنا، اپنی ترجیحات پر نظر رکھنا تکلیف اٹھا لینا، ذلت نہ اٹھانا

زندگی آزمائش بھی ہے اور انعام بھی، میرے بچے آزمائش سے گزر کر انعام کا انتظار کرنا

''Learn to sequence your pleasure and pain''

گلاب کا پھول کانٹوں میں کھلتا ہے، دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے

میرے بچے کانٹوں کے لئے تیار رہنا، اپنے حصے کی آزمائش کے لئے تیار رہنا،

کوئی مسئلہ الجھنے سے حل نہیں ہوتا، زبردستی کرنے سے کوئی نہیں بدلتا،

غصہ کرنے سے کبھی غصہ کم نہیں ہوتا

میرے بچے ذہن کو اور دامن کو صاف رکھنا اور کسی سے اُلجھے بغیر آگے بڑھتے رہنا

جب تک قدم اُٹھتا رہے گا فاصلے طے ہوتے رہیں گے

میرے بچے غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں (یہ قول ہے علامہ اقبال کا)

میرے بچے اپنی غیرت کی حفاظت کرتے رہنا

سوال سے، مانگنے سے خودی ضعیف ہوتی ہے (یہ قول بھی علامہ اقبال کا ہے)

میرے بچے دست سوال کسی بھی شکل میں دراز نہ کرنا

تعلیم میں بھی اپنی خودی کو ضعیف نہ ہونے دینا

ہمیشہ اپنی عقل سے، اپنے تجربے سے کام لینا، صرف اپنی محنت سے آگے بڑھنا

فرد ہو یا قوم اپنی خودی کی حفاظت اُس پر لازم ہے

دست سوال خواہ وہ کسی شکل میں ہو اپنی خودی، اپنی انا، اپنی شخصیت کی توہین ہے

تکلیف اٹھا لینا بہتر ہے، مانگنے کی ذلت اٹھا لینے سے

میرے بچے اپنی غیرت کی حفاظت کرنا

یہ درس زندگی ہے اوراس میں شعور ہے اور awareness ہے۔شاید وقت کم ہوتو میں عرض کروں۔پھر میں نے ٹیچرز پر بڑا کام کیا ہے،انکے self image پرکام کیا ہے۔

شکیل اختر: یعنی ان کی بنیاد درست کرنے کے لئے

سعید راشد: دیکھیں نا وہ تو سرچشمہ ہے،''گڈ بائی مسٹر چپس'' میں مسٹر چپس کو کیتھی نے کیوں پسند کیا۔ کیوں کہ وہ ہاؤس ماسٹر تھا۔بچوں کی تربیت کرتا تھا۔ان کیلئے رول ماڈل تھا۔اپنے کام سے عشق کرتا تھا....اگر آپ اجازت دیں تو میں نے جو ٹیچرز پر لکھا،ان کی جو self image ہے یعنی کہ وہ اپنے آپ کے متعلق کس طرح سوچتے ہیں، کس طرح Visualize کرتے ہیں،ایک ٹیچر کی self image پیش کرتا ہوں۔

میں مٹی کا وہ دیا ہوں

جس کی دھیمی لو

اندھیرے میں کسی درماندہ مسافر کا انتظار کرتی رہتی ہے

میں سرد ہواؤں میں کھلا

دسمبر کا وہ گلاب ہوں

جس کی خوشبو خزاں میں بھی باقی رہتی ہے، باوجود خزاں بوئے یاسمن باقیست

مجھے خدا نے ایسا بنایا ہے کہ مجھ سے کسی بچے کی کوئی کمی نہیں دیکھی جاتی

مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

مجھے کوئی بچہ اجنبی نہیں لگتا خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہوا ہو

شکیل صاحب میں اس جملے پر بہت رویا ہوں

مجھے کوئی بچہ اجنبی نہیں لگتا خواہ وہ کسی گھر میں پیدا ہوا ہو

میرے رب نے میرے سیلف کے دائرے کو بہت extend کر دیا ہے

میں کبھی مایوس نہیں ہوتا

میں وہ انسان ہوں جو کبھی مایوس نہیں ہوتا

نہ اپنے آپ سے اور نہ کسی اور سے

ان سے بھی نہیں جو بار بار مایوس کرتے رہتے ہیں

بعض زمینوں میں سونے کے ذرات گہرائی میں ملتے ہیں
بعض تناور درختوں کے بیج ذرہ دیر سے پھوٹتے ہیں
میں سنگلاخ چٹانوں میں بیج ڈالتا رہتا ہوں بارش کے پہلے قطرے کے انتظار میں.
پتھروں کا سینہ patience شق کر دیتی ہے
محبت بہار کے موسم کی طرح اپنے پھول اپنے ساتھ لاتی ہے۔
میں کہ ہوں چراغ آخرِ شب میرے بعد اُجالا ہے، اندھیرا نہیں

شکیل اختر: سبحان اللہ، ایسی شخصیتوں سے ہمیشہ روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ میں بڑی اُلجھن کا شکار ہو رہا ہوں کہ کیسے بتاؤں اپنے سُننے والوں کو کہ آپ نے یہ جو کتابیں لکھیں ہیں کس قدر ضخیم اور کتنی اچھی کتابیں ہیں۔ یہ ضرور پڑھی جائیں۔ یہ کتابیں کہاں سے دستیاب ہوں گی؟

سعید راشد: یہ سلطانہ فاؤنڈیشن سے مل سکتی ہیں اور ایک بک سنٹر ہے پنڈی میں وہاں سے مل سکتی ہیں۔

شکیل اختر: بنیادی بات آپ نے جو بتائی کردار سازی ہے۔

سعید راشد: ہاں کریکٹر بلڈنگ، مَیں اس کے لئے شخصیت کی تعبیر وتعمیر کا لفظ استعمال کرونگا یعنی personal development

شکیل اختر: وقت بہت کم ہے، اپنے سُننے والوں کے نالج کے لئے پوچھوں کہ اگر فنگر ٹپس پر چند اصول آپ بتا دیں کہ جس سے کردار سازی ممکن ہو سکے وہ کیا ہیں؟

سعید راشد: ایک تو یہ ہے کہ کردار آسمان سے برآمد نہیں ہوتا، اس کے روٹس زمین سے آتے ہیں۔ کردار کلچر میں ہوتا ہے، کچھ رویے ہوتے ہیں مثلاً میری ماں کہتی تھیں کہ دستک کسی فقیر نے دی ہے تو اس کو پیار سے کہنا کہ بابا میں آ رہا ہوں، خود جا کر دینا۔ اب یہ رویہ مجھے میری ماں نے دیا۔ جو کلچر میں ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد curriculum میں ہوتا ہے۔ یعنی کہ جو ہم پڑھتے ہیں سنتے ہیں۔ مثلا ایک دن فاختہ میرے بچپن میں کوک رہی تھی تو میری دادی نے مجھ سے پوچھا سعید یہ کیا کہہ رہی ہے۔ میں نے کہا فاختہ بول رہی ہے، انہوں نے کہا نہیں بیٹے یہ کہہ رہی ہے ''یا دوست تو''، اب جب میں فاختہ کو سنتا ہوں تو مجھے یہ آواز آتی ہے ''یا دوست تو، یا دوست تو''۔ یا پھر میرے گھر میں ایک طوطا تھا۔ وہ بولتا تھا ''نبی جی بھیجو'' مجھے سمجھ نہیں آتا تھا کہ یہ کیا کہتا ہے۔ میں نے کہا دادی امی یہ کیا کہتا ہے؟ کہنے لگیں یہ کہتا ہے کہ نبی جی بھیجو، رحمت بھیجو، میری ماں کا نام رحمت تھا اور وہ آیائے رحمت تھیں اور میں نے

اُن سے یہ آواز سنی حق اللہ، پاک ذات اللہ.....، تو بھائی میرے، یہ کریکولم تھا، یہ کلچر تھا پھر اس کے بعد کچھ ماڈل تھے۔ تیسرا جو component ہے کریکٹر کا وہ ماڈلز ہیں۔ تینوں چیزیں ہیں، کلچر ہے، کریکولم ہے اور ماڈلز ہیں۔

قائداعظم کی صورت میں ہمارے پاس اتنا بڑا رول ماڈل موجود ہے۔ قائداعظم پر میرا بہت کام ہے اور میں نے ان کو دیکھا ہے اور سچ پوچھیے تو باقی زندگی، میں ان کے کریکٹر کو symbolize کرنے میں گزارنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اتنا بڑا ماڈل بحیثیت انسان ملا، اگر تین چار باتیں آپ پوچھنا چاہیں تو قائداعظم کی زندگی میں پہلا حوالہ انصاف کا، عدل کا اور آئین کا، اصول کا ہے اور یہ افلاطون کے وقت سے آ رہا ہے۔ "The Republic" کے وقت سے آ رہا ہے۔ اتنا بڑا ماڈل، ہماری بدقسمتی کہ ہم نے اس کو اس طرح project نہیں کیا، ہم نے صرف سیاسی لیڈر سمجھا۔ وہ ہمارا مرشد ہے، وہ ایک رول ماڈل ہے زندگی کے حوالوں سے میری دو کتابیں ہیں ''گفتار و کردار قائداعظم'' اور انگریزی میں اب آ رہی ہے ''کریکٹر اینڈ کنڈ یکٹ آف قائداعظم'' اور اس سے پہلے کہ زندگی کی شام ہو جائے تو میں چاہتا ہوں کہ وہ کتاب سامنے آ جائے، میری بڑی اُمنگیں ہیں، میں تو بہت آگے پروگرام بنا کر بیٹھا ہوا ہوں۔

شکیل اختر: سعید صاحب میں تو یوں سمجھئے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ جیسے میرے سوال آپ کا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ جس روانی سے آپ بول رہے ہیں اور جتنا کام آپ نے کیا ہے وہ یقیناً محسوس کرنے والا ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہوں گا آپ سے اور غالباً یہ میرا آخری سوال ہوگا۔ بڑی فاسٹ لائف ہے، تیز بھاگنے والی لائف۔ جس کو دیکھو وہ پریشان ہے survival کے لئے، اپنی زندگی گزارنے کے لئے، جدید معاشرے کی بات کر رہا ہوں اکثر بزرگوں کو شکایت ہوتی ہے کہ جدید معاشرے میں لوگوں کو تہذیب نہیں ہے، اخلاقیات نہیں ہیں اور نوجوان بے راہروی کا شکار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آپ نے ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں کی جب سے میں آپ سے گفتگو کر رہا ہوں۔

سعید راشد: ہاں! میں سمجھتا ہوں کہ یہ کچھ تعلیم کی بنیادی چیزیں ہیں۔ ہمیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ آرام اور سکون میں کیا فرق ہے تو زندگی آسان ہو جائے۔ ایک لطیفہ چلتے چلتے، کسی صاحب نے پوچھا کہ آپ کی بیگم کہاں ہیں، انہوں نے کہا اپنے میکے میں ہیں، گھر کی کیا صورتحال ہے؟

آرام کم اور سکون زیادہ ہے.....تو ہمارے گھروں میں آرام زیادہ ہے سکون کم ہو گیا ہے، اگر ہم تلاش میں رہیں سکون کی، تو آرام آجائے اور کبھی اس کا گلہ نہ ہو۔

شکیل اختر: ضمیر جعفری صاحب نے کہا تھا ''میری بیگم قبر میں لیٹی ہے کس ہنگام سے۔ وہ بھی ہے آرام سے اور میں بھی ہوں آرام سے۔''

سعید راشد: میری بیگم بہت اچھی تھیں اور ہیں۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔ اس لطیفے سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، (ہنستے ہوئے) مجھے گھر بھی واپس جانا ہے۔

شکیل اختر: اچھا پروفیسر صاحب تھوڑا سا وقت ہم اور چاہتے ہیں کہ یہ بتائیں کہ آپ نے اتنا وقت گزار لیا اور بہت کام کیا۔ اللہ کرے چشم بینا آپ کی طرف بھی آئے اور لوگ اس کام کو محسوس کریں اور recognize کریں، وہ کریں گے، انشاء اللہ وقت بہت بڑا عادل ہوتا ہے لیکن میں یہ جاننا چاہوں گا کہ ہماری جو اس وقت کی نسل ہے اور اس کو راستہ نہیں مل رہا، وہ پریشان ہے اس کے لئے کیا مشورہ دیں گے۔

سعید راشد: مشورہ یہ ہے کہ.....ہمیں اپنے اندر جھانکنا ہوگا، دیکھیں تین چیزیں ہوتی ہیں جو زندگی کو بناتی ہیں۔ ایک vision ہوتا ہے زندگی کے مقاصد کا، پھر کچھ values ہوتی ہیں اُسے گزارنے کے لئے، پھر اس process کو بروئے کار لانے کے لئے کچھ will اور motivation, ہوتی ہے۔ تو ہم نے اپنے ایجوکیشن سسٹم میں instruction اور education میں فرق نہیں کیا، ہمیں ایجوکیشن سے شروع کرنا ہوگا، روٹس سے چلنا ہوگا، پھر ٹیچرز کو ماڈل کرنا ہوگا۔

شکیل اختر: ہمارے اس پروگرام میں جتنے مہمان آتے ہیں ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں؟ لیکن میں آپ سے اس لئے نہیں پوچھوں گا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ جو اتنا کچھ کر چکا ہو، وہ مزید بھی کیا کچھ کر رہا ہوگا۔ مختصراً یہ بتا دیں کہ مستقبل میں اللہ آپ کو زندگی دے بلکہ ہماری دُعا تو یہ ہے کہ اللہ آپ کو حیات جاوید دے۔ یہ کام کرتے رہیں۔ کیا ارادے ہیں کام کرنے کے، اس کے علاوہ جو اَب تک آپ نے کر لئے ہیں؟

سعید راشد: میرا خیال ہے کہ میں اس کام کو جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ جو بچے ہیں ان کی ڈویلپمنٹ پر، ہیومن ریسورس ڈویلپمنٹ جوان بچوں کا ہے، اس کے لئے میں کریکولم، ایک اکیڈمی، ایک ایسا طریقہ کار وضع کرنا چاہتا ہوں کہ ہر بچہ اچھا بچہ ہو اور اس کا جو potential ہے، اس

کے اندر کا جو قدیر خان ہے، اس کے اندر کا جو اقبال ہے اور سوشل ورک کے حوالے سے ایدھی ہے، قائداعظم ہے وہ سامنے آئے۔ یہ کردار مختلف dimensions ہیں، ہمیں اس بیسک ہیومن ریسورس کو ڈویلپ کرنا ہے۔

شکیل اختر: پتھروں میں چھپی مورتیں موجود ہیں صرف تراشنے کی دیر ہے، وہ کون کرے گا؟

سعید راشد: ارسطو نے کہا تھا کہ ہر پتھر میں ایک سٹیچو ہے اور ایجوکیشن اُس کو باہر لاتی ہے۔

شکیل اختر: بہت بہت شکریہ پروفیسر سعید راشد صاحب !اللہ کرے آپ کی کوششیں بارآور ثابت ہوں۔ جو باتیں آپ نے کیں وہ اتنی دلچسپ ہیں کہ مجھے ۲۸، ۲۹ منٹ گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔ جو لوگ آپ کی کتابیں پڑھیں گے ان کو مشورہ میں یہ دونگا کہ یہ کتابیں پڑھیں۔ اگر اس پروگرام کے حوالے سے کوئی الجھن ذہن میں ہو، کوئی سوال پوچھنا ہو تو ہمیں خط ضرور لکھیں۔ آفتاب محمود ہمارے پروڈیوسر ہیں بہت خوبصورت جواب دیتے ہیں خطوط کا۔ اگر آپ لکھیں گے تو وہ آپ کو تحریری جواب بھی دیں گے۔ خط لکھنے کے لئے ہمارا پتہ نوٹ کر لیں۔ انچارج پروگرام ''آپ کے ساتھ ساتھ'' ریڈیو پاکستان اسلام آباد۔ آپ خط لکھیں اس پروگرام کے حوالے سے اور مشورے اور شخصیتوں کے نام بھیجنا چاہیں تو شوق سے بھیجیں۔ بہت بہت شکریہ سعید راشد صاحب آپ تشریف لائے لیکن میری اپنی طبیعت ابھی سیر نہیں ہوئی آپ سے گفتگو کر کے۔ انشاءاللہ پھر آپ کو زحمت دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی پروگرام ''آپ کے ساتھ ساتھ'' کا وقت ختم ہوا۔ شکیل اختر کو اجازت دیجیے، آفتاب محمود بھی آپ سے اجازت چاہتے ہیں۔ اللہ حافظ۔

آدمی سے انسان کی طرف اور معلومات سے علم کی طرف سفر ہی میرا مشن ہے

سکالر، ماہر تعلیم اور سینکڑوں کتابوں کے خالق

پروفیسر محمد سعید راشد سے ملاقات

انٹرویو: یوسف عالمگیرین

کسی بھی انسان کا مقصد حیات ہی اسے دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتا ہے۔ جو لوگ صدق دل سے اپنے وطن اور اپنی قوم کے لئے دن رات ایک کرتے ہیں وہی وقار اور امتیاز کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو بغیر کسی طمع اور لالچ کے قوم کو اپنی خدمات سے نوازتے ہیں۔ اچھی اور باوقار قومیں اپنے ان محسنوں کو فراموش نہیں کیا کرتیں اور وہ قومیں جو ان چیزوں کی پرواہ نہیں کرتیں پھر وہ باقی رہنے کا کوئی جواز تلاش نہیں کر پاتیں۔ ایسے ہی ایک خاموش مجاہد پاکستان اور پاکستانیت کا علم لئے لگ بھگ نصف صدی سے برسرِ پیکار ہیں۔ وہ خوبصورت ادیب، معتبر دانشور، ممتاز ماہر تعلیم، مربی استاد اور ایک باعمل انسان ہی نہیں تحریک پاکستان کے فعال کارکن بھی ہیں۔ وہ پروقار ہستی پروفیسر محمد سعید راشد ہیں جو 1927ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ بریلی ان دنوں سیاسی اور قومی مرکز تھا۔ ان کے آباؤ اجداد نے باقاعدہ آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔ انہوں نے اپنے نانا کا وہ گھر بھی دیکھا جو جنگ آزادی میں دشمنوں کی گولیوں کا نشانہ بنا۔ 1944ء میں قائدِ اعظم بریلی تشریف لے گئے تو اپنے ایک استاد کے ہاں ٹھہرے جہاں جناب سعید راشد کو قائد سے ملنے اور سننے کا موقع ملا۔ اور ''لے کے رہیں گے'' پاکستان کے نعرے ذہن میں نقش ہو گئے۔

پھر یہ موقع بھی آیا کہ سعید راشد نے مسلمانوں کے جلوسوں کی قیادت کی۔ جناب سعید راشد ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے بتا رہے تھے کہ'' مجھے اب بھی یاد ہے کہ میں ایک جلوس کی قیادت کر رہا تھا کہ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میں بریلی کے سٹیشن کمانڈر کی کار کے ساتھ ٹکرا گیا تھا اور جب مجھے ہوش آیا تو لوگ اس کی کار کے نیچے سے مجھے نکال

رہے تھے۔ میری بائیں آنکھ زخمی بھی ہوئی۔ تو اس سے ایک قومی ملی اور مذہبی رجحان بنا۔ ان دنوں مسلم لیگ والے سبز شیروانی اور سفید پاجامہ پہنتے تھے۔ خود ہمارے گھر میں اسلام اور انسانی اقدار کی گہری فضا تھی''۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ پاکستان کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے بھرپور لگ رہے تھے ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا جیسے پوری رات کا چاند اور ان کی آنکھیں اس عمر میں بھی پر جوش اور روشن کرنوں جیسی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بولتے جا رہے تھے اور میں سنتا جا رہا تھا۔ وہ بتا رہے تھے میرا نام سعید میرے نانا نے رکھا انہیں بشارت ہوئی تھی کہ لڑکے کا نام سعید رکھیں۔ اس طرح میرا مقدر میرے نام کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ سورہ رحمان کی ہمارے گھر میں بہت تلاوت ہوتی تھی، چکی پیسنے کا رواج بھی تھا۔ وہ کہہ رہے تھے میری دادی مرحومہ نے مجھے ایک مرتبہ اپنے پاس بلایا اور کہا یہ فاختہ کیا کہہ رہی ہے میں فوری نہ سمجھ سکا، دوبارہ غور کیا تو احساس ہوا جیسے حق اللہ پاک ذات اللہ کہہ رہی ہو۔ آج میں نے سکول کے بچوں کے لئے نصاب بنا رکھا ہے۔ ان کا پہلا سبق حق اللہ پاک ذات اللہ ہے۔ اللہ اللہ کیا کرو نام نبی کا لیا کرو۔ پیارو پاکستان بہارو پاکستان، ساڑھے تین سال اور چار سال کے بچے یہ ورد کرتے ہیں۔ اتنا بڑا تعلیمی تجربہ کسی ادارے نے نہیں کیا ہو گا جو میں نے آرمی پبلک سکول منگلا کے پرنسپل کے طور پر کیا ہے۔

جناب سعید راشد کی تمام زندگی حصول علم اور ترویج علم میں گزری۔ ملٹری کالج جہلم سرائے عالمگیر جیسے ادارے میں ایک لمبا عرصہ بحیثیت ایک مربی استاد اور بطور ہاؤس ماسٹر گزارا۔ ان کے شاگردوں میں کئی جنرل اور بریگیڈیئر شامل ہیں۔

جناب سعید راشد بتا رہے تھے کہ تحریک پاکستان کے دور ہی میں میں نے میٹرک کیا۔ 1946ء میں بریلی سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ اس وقت ہندو مسلم فسادات عروج پر تھے۔ 1948ء میں میں نے فرسٹ کلاس انگلش لٹریچر کے ساتھ بی اے کیا۔ سکول کے زمانے میں اسلامیہ سکول میں تربیت ہوئی۔ وہاں پاکستان کے حوالے سے انتہا درجے کا ولولہ اور جوش تھا۔ لائبریری میں بیٹھ کر پڑھنے کا شوق رہا۔ زیادہ لٹریچر تحریک پاکستان کے حوالے سے ہوتا۔ ان دنوں رام بابو سکینہ بریلی میں ڈپٹی کمشنر تھے؟ بریلی میں ادبی محفلیں بھی پورے زور و شور سے جما کرتیں۔ بریلی کے مشاعروں میں جگن ناتھ آزاد، جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، شاہجہان پوری اور جوش ملیح آبادی کو سننے کا موقع بھی ملا۔ بریلی ادبی

سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ غالب کے ایک دوست تھے قاضی صاحب وہ بھی بریلی میں رہتے تھے۔ میرے بچپن کی ایک خاص بات جو آج بھی مجھے حیران کر دیتی ہے کہ میرے اساتذہ مجھے سعید صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ میرا نام سکول میں عام ہوگیا پھر سوائے میری ماں کے چھوٹے بڑے سبھی مجھے سعید صاحب کہتے اس طرح طبیعت میں ایک سنجیدگی سی طاری ہوگئی اس رول کو میں نے خوب نبھایا۔

ایک سوال کے جواب میں وہ کہنے لگے مجھے صحیح طرح سے یاد نہیں کہ لکھنے کا شوق کب بیدار ہوا بس اتنا یاد ہے کہ دوسری جماعت میں میں نے کچھ لکھا تو میرے بھائی عبدالخالق نے کہا سعید بڑا ہوکر ادیب بنے گا۔ پہلی کتاب شاید ''گلستان ادب'' کے نام سے مرتب کی، اس وقت میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ میرے چچا کا پریس تھا وہیں سے کتاب چھپوائی۔ میں ان دنوں مضامین بھی بہت لکھتا تھا پھر یہ سلسلہ بڑھتا گیا اور اب تک میں بیسیوں کتابیں لکھ چکا ہوں۔ یہ تمام کام میں نے تعمیر قوم اور فلاح وطن کے لئے کیا ہے۔

1949ء میں سعید راشد علی گڑھ چلے گئے وہاں شاہ حسن، ڈاکٹر ہادی حسن، مولانا ابوالکلام آزاد اور چراغ حسن حسرت کو سنا۔ راشد صاحب کہنے لگے جب تک آپ سمندر کو نہ دیکھیں تو اس کی وسعتوں کا اندازہ آپ کو نہیں ہوسکتا، اگر پہاڑ نہ دیکھیں تو آپ شاید ٹیلوں کو پہاڑ سمجھتے رہیں۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ انسان کا کسی عظیم انسان سے رابطہ بڑھے۔ جواہر لال نہرو، گاندھی جی، راجندر پرشاد، اس زمانے کے باکمال آدمی تھے۔ مسلمانوں میں قائداعظم محمد علی جناح، ظفر علی خان، عطاللہ شاہ بخاری، مولانا نورالرحمان اور عبیداللہ سندھی جیسے ممتاز اور باوقار لوگ موجود تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر حبیب الرحمان، پروفیسر خلیق، پروفیسر شکور جیسے لوگ موجود تھے۔ ان میں کسی کا سیاست، کسی کا تعلیمی تحریک اور کسی کا مذہبی تحریکوں سے تعلق تھا۔ آگرہ یونیورسٹی سے کل پانچ ہزار طلباء میں سے صرف بارہ لڑکے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے اور پورے ضلع بریلی میں صرف ایک مسلمان طالب علم تھا جو فرسٹ کلاس میں پاس ہوا وہ میں تھا۔ یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ علی گڑھ والے مجھے پی ایچ ڈی کے لئے سکالرشپ دے رہے تھے لیکن میرے ایک استاد نے کہا ''سعید صاحب سکالرشپ کے لئے کوئی کمی نہیں، مسلمانوں میں سے کوئی بھی جا سکتا ہے۔ آپ پاکستان چلے جائیں لیکن وہاں سول سروس

میں نہ جائیں۔ کیوں کہ پاکستان کو سول سرونٹس کی نہیں ٹیچرز کی ضرورت ہے'' شائد استاد صاحب نے میرے اندر ایک ٹیچر کو دیکھ لیا تھا اور انہیں خدشہ تھا کہ میں کہیں سول سرونٹس کی دلدل میں نہ پھنس جاؤں۔ اس طرح 1950ء میں میں ملٹری کالج آ گیا۔

1951ء میں مجھے پاکستان آرمی میں کمیشن آفر کیا گیا لیکن میں نے معذرت کر لی کیوں کہ ملازمت اور گریڈ تو عارضی ہوتے ہیں۔ میں ان دنوں ملٹری کالج میں صرف گریڈ 16 میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ملٹری کالج جیسے ادارے سے لیڈر شپ تخلیق ہونی ہے اور یہ اعزاز کسی کسی ادارے کو حاصل ہوتا ہے، مجھے شروع سے احساس تھا کہ یہاں خدمت کرنا زیادہ اہم ہے۔ ملٹری کالج میں کام زیادہ اور معاوضہ کم لیکن عزت کم نہیں تھی۔ میں ان دنوں ملٹری کالج میں واحد کوالیفائیڈ آدمی تھا کیونکہ میں ایم اے اردو اور ایم اے انگریزی تھا۔ اس طرح میرے لئے ملازمتوں کی کمی نہیں تھی۔

1966ء میں میرا تقرر پی ایم اے (پاکستان ملٹری اکیڈمی) میں ہوگیا۔ میں نے ملٹری کالج کے سابق کمانڈانٹ بریگیڈیئر رفیق (مرحوم) کو خط لکھا اور مشورہ مانگا تو انہوں نے جواب دیا ''پی ایم اے کو افسروں کی ضرورت نہیں، ملٹری کالج کو ایک استاد کی ضرورت ہے۔ 1965ء میں ہم نے 17 دن کی لڑائی لڑی جب کہ آپ سترہ سال سے لڑ رہے ہیں اور ابھی آپ کی لڑائی ختم نہیں ہوئی''۔

1967ء میں مجھے ایک ہاؤس کا ہاؤس ماسٹر بنا دیا گیا۔ میرے لئے ہاؤس ماسٹری کا زمانہ زیادہ اہم اور یادگار تھا۔ اس لحاظ سے کہ مجھے انسانوں کو بنانے اور shape کرنے کا موقع ملا۔ آدمی سے انسان کی طرف اور معلومات سے علم کی طرف سفر آگہی میں میرا خاص رول رہا کیوں کہ ہاؤس ماسٹر مدرس ہوتا ہے کہ درس دیتا ہے۔ وہ معلم ہوتا ہے کہ علم دیتا ہے۔ وہ مربی ہوتا ہے کہ درس زندگی دیتا ہے۔ مدرس اور معلم تو کوئی بھی ہوسکتا ہے لیکن مربی ہونا زیادہ اہم ہے۔ مربی ہونا شان نبوت ہے۔ اچھا ہوا کہ مربی کا عنصر مجھ پر غالب آ گیا۔ میرا ذوق آگہی کی جانب تھا۔ بارش کا پہلا قطرہ آگے بڑھتا ہے، پہلا قدم اٹھاتا ہے اور وہی سب کچھ ہے۔ میں بندوں سے کبھی مایوس نہیں ہوا۔ ملٹری کالج کے شیر شاہ ہاؤس کی لائبریری اوپن لائبریری تھی ہاؤس میں کوئی تالا نہیں تھا۔ اگر دو ہزار کتابیں ہیں تو کبھی دس بیس کم ہو جاتیں لیکن اور بھی آ جاتیں اس طرح بچے مستفیض ہوتے رہتے

اور لائبریری بھی بڑھتی رہتی تھی۔ دراصل میرا ارادہ کتابیں لکھنے کا نہیں تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''لرننگ ٹو لیڈ''(Learning to lead) نفسیاتی اور روشن پہلوؤں کو سامنے رکھ کر لکھی۔ مجھ میں ایک مصنف بننے کی خواہش نہیں تھی۔ میں نے تربیت کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کتابیں لکھیں۔ پھر میں نے ایک کتاب ''تذکرہ شہدا'' ملٹری کالج کے شہداء کے حوالے سے لکھی ابھی تک میرا رویہ صرف کتابیں لکھنا نہیں تربیت کے لئے کتابیں لکھنا ہے اب نئی کتابوں پر میرے سال بھر کی کمائی 67 ہزار روپے خرچ ہو گئے ہیں اور میں یہ خرچ صرف ایک قوم کو بنانے کے لئے کرتا ہوں۔ میں نے کئی سو کتابیں ملٹری کالج کو Donate کی ہیں۔ میں نے کتابیں شائع کیں لیکن کبھی مارکیٹنگ نہیں کی نتیجہ یہ نکلا کہ بیشتر کتابیں اسی طرح پڑی رہیں کوئی آیا ایک دو لے گیا، مجھے کبھی ایک پیسہ کی بھی آمدن نہیں ہوتی لیکن ''آئی ڈونٹ مائینڈ'' میں پبلسٹی نہیں چاہتا کہ اس سے عمل کا ثواب کم ہو جاتا ہے۔ میں نے 'حیات قائداعظم'، 'گفتار و کردار قائداعظم'، 'تذکرہ اقبال'، 'میجر اکرم شہید، نشانِ حیدر'، 'کردار ساز'، 'چراغوں کی قطار، اور بے شمار دوسری کتابیں لکھیں۔

1990ء میں ملٹری کالج سے ریٹائر ہو کر آرمی پبلک سکول جہلم آ گیا، وہاں کیریکٹر بلڈنگ کے حوالے سے ایک کتاب لکھی پھر آرمی پبلک سکول منگلا آ گیا یہاں آ کر 'شاد باد منزل مراد' جیسی کتابیں لکھیں۔ ایک ٹیچر گائیڈ مرتب کی ہے کچھ کتابوں کے نئے ایڈیشن مرتب کئے ہیں تازہ ترین کتاب ''کیریکٹر اینڈ کنڈکٹ آف قائداعظم'' مرتب کی ہے۔

دراصل میں کم معروف اور کم پڑھا جانے والا ادیب ہوں۔ مجھے اپنی تحریر میں بہت کم ادیبوں کا سا انداز نظر آتا ہے۔ کوئی چاہے تو اس اسلوب پر ریسرچ کر سکتا ہے۔ بہت کم اوروں کی تحریر میں مجھے ادبی تاثر نظر آتا ہے۔ میں نے الحمدللہ کبھی اپنی تصنیفات کی تشہیر نہیں کی۔ صرف ایک مرتبہ سلیم اختر کیانی جو اس وقت اے ڈی سی جی جہلم تھے کے کہنے پر کرنل حق نواز کیانی پر کتاب کے حوالے سے تقریب رونمائی ہوئی تھی۔ اس میں ضمیر جعفری آئے تھے۔ وہ بھی سلیم اختر نے میری اجازت کے بغیر خود ہی اس کا اہتمام کیا۔

اگر کتاب اچھی ہے تو پڑھی جائے گی۔ اصل میں اچھی کتاب کو ذریعہ سمجھتا ہوں۔ وہ ذریعہ ہے خیر کا اور یہ جتنا کثیر ہو سکے اچھا ہے۔

میرے تو تمام اثاثے انہیں کتابوں پر لگ گئے۔ مارکیٹنگ کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ 'مکالمات اقبال' میرے پاس پڑی ہوئی ہے۔ ان کو کبھی ذریعہ آمدنی نہیں بنایا۔ تھوڑی بہت پنشن ہے، میں یہ کہتا ہوں "جو ہے وہ بہت ہے جو نہیں ہے کم ہے" میں ایک بات اور کہتا ہوں "جو نہیں ہے اس کی حسرت میں اس کا مزہ خراب نہ کرو کہ جو حاصل ہے" میں نے کبھی اپنی زندگی کو حسرتوں کا شکار نہیں ہونے دیا۔

نامور شاگردوں کے حوالے سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگے دیکھیں نام تو بہت ہیں شاگرد نامور ہوں یا گمنام، میں سمجھتا ہوں استاد کا contribution یہ ہے کہ اس کے شاگردوں کے مقام سے اس کی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، میں سمجھتا ہوں میں اس گمنام شاگرد میں بھی زندہ ہوں جو بظاہر کوئی بڑا مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ لیکن وہ اپنی جگہ ایک بھاری پتھر ہے وہ جہاں بیٹھا ہے وہ بہ سر راہ گزر ہے۔ مجھے اپنے تمام نامور اور گمنام شاگردوں پر فخر ہے۔ مجھے اتنا اطمینان ضرور ہے کہ جس کو میں نے پڑھایا ہے اس نے مجھ سے کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہے۔

انہوں نے کہا ملٹری کالج کے دوران اور پھر دوسرے اداروں میں چالیس سال مجھے میرے شاگردوں نے کبھی لیٹ نہیں دیکھا ہوگا۔ کبھی Improper ڈریس میں نہیں دیکھا ہوگا، کبھی غصے میں نہیں دیکھا، کبھی کام میں کم نہیں دیکھا، کبھی محبت میں کم نہیں دیکھا۔

نظام تعلیم کے حوالے سے گفتگو چھڑی تو کہا قوم کی کوالٹی کو تعلیم کی کوالٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ تعلیم کو تخلیقی ہونا چاہیے۔ اور اس کا مارل کانٹینٹ (Moral content) خوبصورت ہو وہ اسلام، پاکستان اور کیریکٹر بلڈنگ کی جانب سفر کرتا دکھائی دے۔ میرا شروع سے دو چیزوں پر زور رہا ہے ایک تخلیقی تعلیم دوسری اخلاقی تعلیم۔ انہیں دو چیزوں پر میں نے مسلسل ریسرچ بھی کی اور کام بھی کیا۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک کا نظام تعلیم مکھی پر مکھی مارنے والی بات ہے، موجودہ تعلیم میں تفکر اور تدبر کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اصل میں یہ تعلیم کی نفی ہے۔ بغیر سوچے سمجھے رٹے والی تعلیم ملکوں کی تقدیر نہیں بدلا کرتی۔ میری کتابوں اور کاوشوں سے تخلیقی شعور اجاگر ہوتا ہے۔ میں نے ہر بچے کو intelectually, physicaly, socially اور emotionally ایکسپوز کیا ہے پھر وہ سامنے آیا ہے اور بنا ہے۔ ہر بچے کو ہر اعتبار

سے ایکسپوز کیا جائے تا کہ وہ تجربہ کرے سوچے اور کوشش کرے۔

میں نے آرمی پبلک سکول منگلا میں ایک سکول پارلیمنٹ بنائی تھی جس سے بچوں میں فیصلے کرنے کا شعور پیدا ہوا۔ میں نے ایک آنر کورٹ بھی بنائی اس طرح ان کا سوشل ایکسپوژر بھی شروع ہو گیا کہ انہیں فیصلہ کرنا ہے۔ اسے جج بننا ہے میں اسکول میں ہر ذمہ داری ہر بچے کو دیتا اگر پریفیکٹ ہے تو ہر ہفتے بدل جائے گا اگر جج ہے تو بدل جائے گا اگر ہیڈ بوائے ہے تو بدل جائے گا۔ ہر ذمہ داری rotate ہوتی رہتی ہے تا کہ ہر بچے کو کام کرنے کا موقع ملے۔

میں کلاس میں جاتا تو بچے مجھے دیکھتے ہی کہتے پیارو پاکستان' میں جواباً کہتا بہارو پاکستان۔ اگر چھوٹی کلاس ہے تو کہتی حق اللہ پاک ذات اللہ' سبحان اللہ، جان جان پاکستان، دل دل پاکستان یعنی میں نے orientation پر زور دیا۔ جہاں جہاں بھی کام کیا پاکستانیت کا جذبہ بیدار کیا۔

میرے سکول میں پڑھنے والے بچے گھروں میں انڈین ٹی وی اور انڈین فلمیں نہیں لگانے دیتے۔ میں نے پاکستانیت کے فروغ کے لئے بچوں کے لئے آسان زبان میں ترانے خود لکھے ہیں۔ اچھا کام کر کے سکون ملتا ہے۔ جس طرح ماں بچے کو جنم دیتی ہے۔ میری حالت وہی ہو جاتی ہے جب میں اپنی رقم لگاتا ہوں توانائی خرچ کرتا ہوں تو satisfaction حاصل ہوتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کرنے والا تو خدا ہے لیکن اگر کوئی کام میرے ہاتھ سے ہو رہا ہے تو کرم ہے اس ذات کا۔ اگر کوئی بچہ ماں کے پیٹ میں پرورش پاتا ہے تو اس میں ماں کا کوئی کمال نہیں ہے، وہ تو اس میں صرف پرموٹ ہو رہا ہے لیکن اصل زندگی کہیں اور سے آتی ہے۔

اب میں نے راولپنڈی میں ''کردار فاؤنڈیشن'' قائم کی ہے جس کا واحد مقصد پاکستان کے لئے باکردار اور مخلص انسان پیدا کرنا ہے کہ جو ملک وقوم کو اس کا اصل مقام دلانے کے لئے اپنا کردار ادا کریں گے سوچتا ہوں شائد مٹی میں ملنے سے پہلے کسی اور کے کام آ جائے۔

نوٹ : مجوزہ انٹرویو''ماہنامہ پلک لاہور'' کے اگست 1994ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ ان دنوں پروفیسر سعید راشد ملٹری کالج جہلم سے ریٹائرمنٹ کے بعد آرمی پبلک سکول منگلا کے پرنسپل تھے۔

”یارانِ وطن“ کے ساتھ پروفیسر سعید راشد کی گفتگو!

انٹرویو: ہارون رشید، طاہرہ ہارون

س۔ اگرچہ مجھے آپ کا شاگرد رشید ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ تاہم آج ہم، گولڈن جوبلی تقریبات کے اختتام پر ملاقات کا شرف حاصل کرنے آئے ہیں۔ آپ نے وطن عزیز کی تحریکِ آزادی میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور اس کے قیام کے بعد پاکستانیت کے فروغ کے لئے بھی وہی مشنری سپرٹ اپنائے رکھی۔ آج کی صورت حال پر آپ کا تبصرہ؟

ج۔ میں یہ کہوں گا پاکستان کے حوالے سے، کہ صورتحال جو کچھ بھی ہو، لیکن ہماری نظر اور وژن مستقبل کے حوالے سے اور تخلیقی ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ جو صورت حال آج ہے، ہمیشہ تو ایسی نہیں رہے گی۔ بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ تخریب میں ایک صورت تعمیر کی مضمر ہوتی ہے۔ تخریب ایک ردعمل ہے کسی مخصوص صورتحال کا۔۔۔۔ جیسے بیماری ایک ردعمل ہے۔ بیمار آدمی مرے ہوئے آدمی سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی تگ ودو میں ,struggle میں موجود ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اس وقت پاکستان نام کی، پاکستانیت جیسی، پاک نام کی کوئی چیز ارد گرد نظر نہیں آتی۔۔۔ لیکن بیج تو ہے۔ امکان تو ہے، ایک صورت حال تو ہے۔ ملک موجود ہے، اس کا سٹرکچر موجود ہے۔ خرابی سٹرکچرل بھی ہے اور فنکشنل بھی۔ لیکن بندہ تو ہے نا، فرد تو ہے نا۔ تو اس حوالے سے ہمیں پرامید رہنا چاہئے اور اس صورتحال کو بہتر بنانے کے لئے جو بھی کاوش، جو بھی تدبیر، جو بھی سٹریٹیجی ہوسکتی ہے، آزمائی جانی چاہئے۔ مثلاً میں جہاں کام کر رہا ہوں، تعمیر ملت فاؤنڈیشن میں، تعلیم، کریکولم، تحریر، اور تدبیر، خود اپنی ذات اور اپنی اقدار کے حوالے سے کوشش کر رہا ہوں۔ اپنے حصے کا دیا جلانے کی۔ بے شک، آپ لکھئے نہیں، ابھی ایک کام تھا۔ ہزاروں کاموں جیسا، کہ ایک بروشر کو دوبارہ شائع کرانا تھا۔ فاؤنڈیشن کے پاس اس کام کے لئے چھ سو روپے تھے، وہ میں نے پرنٹر کو دے دیئے۔ انہوں نے دو ہزار روپے طلب کئے تھے۔ اب چودہ

سو روپے میں اپنے پاس سے دوں گا۔لیکن وہ کام میں کراؤں گا ضرور۔میری بنیادی دلچسپی یہ ہے کہ وہ کام صحیح، درست اور معیاری ہونا چاہئے۔اب یہ ایک رویئے کی بات ہے۔ میں نے پرنٹر سے یہ بالکل نہیں کہا کہ یہ رقم مجھے ادا کرنا ہوگی۔ میں نے کہا، مہربانی آپ کی، آپ یہ کام معیار کے مطابق کیجئے گا۔نتیجہ یہ ہے کہ وہ چیز اب بہتر ہوگئی ہے۔

پاکستان کے حوالے سے جو کچھ بھی ہوا، میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔لیکن دونوں نقص پیدا ہو گئے ہیں۔سٹرکچرل نقص کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے وطن کے جو ادارے ہیں ان میں بھی نقص موجود ہے۔اور ان اداروں کی جو فنکشننگ ہے، جس طرح وہاں کام ہو رہا ہے، اس میں بھی۔ ہوتا یہ ہے کہ اگر بندہ بہتر ہو تو ادارے کا نقص دور ہوسکتا ہے، اس کمی کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ ہمارا جو تعلیمی نظام ہے، پہلے بھی یہی تھا۔اب جو انحطاط واقع ہوا ہے، سٹرکچر میں اتنا نہیں ہوا، بلکہ اس کی فنکشننگ میں ہوا ہے۔آخر ہم سب اس ہی تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں۔اب ہماری کوشش دونوں سمتوں میں ہونی چاہئے کہ ہم ملک کے اداروں کی شکل وصورت کو بھی بہتر بنائیں اور ان کی عملی صورت کو بھی۔آخر میں صورت حال اس فرد تک پہنچ جاتی ہے جو کام کر رہا ہے۔تاہم، سٹرکچرل نقص کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔مثلاً! اس ملک میں بڑی تبدیلی، آئین کے تحت چار پانچ بڑے اداروں، آئین سازی، مقنّنہ، عدلیہ، انتظامیہ وغیرہ کے ٹھیک ہونے سے ممکن ہوگی۔ اور یہ تبدیلی ممکن ہوگی سیاست کے حوالے سے۔ اس لئے کہ ان کو کوئی فرد تو ٹھیک کرتا نہیں ہے۔ وہ تو ایک سیاسی عمل کی پیداوار ہے۔لیکن سیاسی عمل کا حوالہ بھی تو ہوتا ہے، تعلیم کا۔۔۔۔۔۔ جو بھی طریق کار ہے انسان کے ذہن کو روح کو بدلنے کا، وہ طے کرنا ہوگا۔نہج لبلاغہ کا ایک جملہ، جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے، دہراتا ہوں کہ بصیرت والا انسان آنکھوں سے بھی دیکھتا ہے، ذہن ودماغ سے بھی دیکھتا ہے اور روح سے بھی دیکھتا ہے۔

بصیرت کیسے پیدا ہوتی ہے؟ ظاہر ہے ایک طریقہ، اداروں کے ذریعے دوسرا، افراد کی کاوشوں کے نتیجے میں۔ جو بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔تاریخ شاہد ہے کہ ادارے بعد کو تبدیل ہوئیاور انسان پہلے۔ میں اس امر کے خلاف ہوں کہ آپ سٹرکچرل تبدیلی کا،

اداروں کی تبدیلی کا انتظار کرتے رہیں۔انسان بہت کچھ تبدیل کرسکتا ہے،میکرو لیول پر نہیں تو مائیکرو لیول پر، بڑی سطح پر نہیں تو چھوٹی سطح پر۔ مدعا یہ ہے کہ اگر ملک میں بڑی سطح پر تبدیلی نہیں آسکتی تو چھوٹی سطحوں پر تو آسکتی ہے۔صحرا میں چھوٹے چھوٹے نخلستان تو بن سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، میں ایک لفظ بھائی بہت استعمال کرتا ہوں۔۔۔عمر اور رتبے میں چھوٹوں کے لئے۔اب اس دفتر میں یہ لفظ عام استعمال ہونے لگا ہے۔اب یہ ایک بہتر دفتر ،بہتر ادارہ بن گیا ہے۔کیونکہ ہمارے ہاںInterpersonal Relationship باہمی تعلق، میرے رویئے سے بہتر ہو گیا ہے اور چونکہ یہ بہتر ہو گیا ہے تو اب یہ ایک زنجیر ہے، Chain ہے بہتری کی۔وہی آدمی جو یہ لفظ سمجھتا ہے،استعمال کرتا ہے اس دفتر کے علاوہ اپنے گھر میں بھی رہتا ہے۔دیگر حلقوں میں بھی۔ چنانچہ بہتری کی یہ چین، یہ زنجیر سب کو باہم باندھتی چلی جائے گی ،محبت واخوت کے اس رشتے میں۔مطلب یہ ہے کہ ہمیں کہیں سے تو ابتدا کرنا ہوگی،کہیں سے تو شروع کر سکتے ہیں۔بہترین تو یہ ہے کہ ہم جڑوں سے شروع کریں۔ لیکن اگر ہم کوزہ بھر پانی بھی ڈال دیں تو کچھ تو فرق پڑے گا۔

پاکستان کے حوالے سے تو میں کہتا ہوں کہ پاکستان ایک خواب ہے جو سفر میں ہے۔

س۔ ایک سوال!۔۔۔آپ تحریک پاکستان کے سپاہی بھی رہے ہیں اوراب قیام پاکستان کے بعد، برسوں سے پاکستانیت کے فروغ کے لئے بھی تگ ودو کررہے ہیں۔تحریک کو وطن عزیز کا بچپن سمجھ لیجئے تو پاکستانیت کے فروغ کی یہ کیفیت اس کی جوانی کے شب وروز ہیں۔ماشاءاللہ،وطن کی آزادی کے پچاس سال پورے ہوئے۔آپ اکثر کہتے ہیں کہ بچپن خوف میں گزرے تو تخلیقی قوت متاثر ہوتی ہے۔لیکن اگر بچپن متحرک گزرا ہوتو۔۔۔ذرا اس اصول کا اطلاق تو کر کے دیکھئے آج کی صورتحال پر؟

ج۔ بچپن دوفریقوں کا مرہون ہوتا ہے۔بچوں اور والدین کا۔ بنیادی بات یہ ہے کہ بچوں کی تعمیر و تشکیل وتہذیب میں والدین کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ازخود،۔۔۔باپ ہونے سے، باپ عقلمند اور ماں ہونے سے ماں سمجھدار نہیں ہو جاتی۔ یہ تو ایک رول ہے،ایک کردار ہے۔اب محض ایک

ملک بن جانے سے تو تخلیقی سرگرمی شروع نہیں ہو جاتی ۔ میں سمجھتا ہوں کہ بچپن تو کیا گزرتا، پیدائش تھی ۔ پیدائش تک تو ہمارا ملک ٹھیک رہا کہ ایک چیز عدم سے وجود میں آ گئی۔لیکن اس ملک کا بچپن، بچپن ہی میں خراب ہو گیا۔ جس قسم کے سٹرکچر، جس نوعیت کے اداروں کی ضرورت تھی، شروع کے کچھ ماہ و سال چھوڑ کر،۔۔۔ مجھے معلوم ہے کہ جون ۱۹۵۶ء میں ملک کے وزیراعظم چوہدری محمد علی ۔۔۔ یہ ریکارڈ پر ہے کہ۔۔۔۔لندن، دولت مشترکہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے جانے والے تھے تو ان کے سیکرٹری نے ، جو اس وقت کیپٹن تھے بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے وزارت خزانہ سے تین تنخواہیں ایڈوانس نکلوائیں۔سید امجد علی نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ رقم کتنی اقساط میں لوٹائیں گے تو انہوں نے کہا، تین قسطوں میں۔ یہ واقعہ اس ملک میں ۱۹۵۶ء میں رونما ہوا۔امانت و دیانت، integrity کے حوالے سے دیکھ لیجئے۔

ممتاز مسعود نے غفور مرزا کے حوالے سے ایک اور واقعہ بھی رقم کیا ہے کہ کراچی میں وزیراعظم چوہدری محمد علی نے چند افسروں کو، جن میں سے ایک، آج کے معروف ڈی اے قریشی بھی تھے اپنے گھر بلایا۔ان کی بیگم رضیہ محترمہ (جانے زندہ ہیں یا انتقال ہو گیا) نے خود اپنے ہاتھوں سے ان کو کھانا کھلایا۔ان کے ڈرائنگ روم کا یہ عالم تھا کہ الماریاں وغیرہ خالی پڑی ہوئی تھیں، ایک پرانا قالین بچھا تھا۔بس کام چل رہا تھا، ایک بیرک میں یہ گھر تھا۔محمد علی کو دیکھ کر کوئی شخص کرپشن کی بات نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں، جب عبدالرب نشتر گورنر تھے، ایک واقعہ ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے بیٹے نے دفتر کا ٹیلی فون اٹھایا تو انہوں نے اس کا ہاتھ روک دیا، پوچھا، کیا کر رہے ہو؟ کہا فون کرنا ہے۔ پوچھا، کہاں؟ کہا، جی لاہور میں ہی کرنا ہے۔ پھر کہا، روک کیوں رہے ہیں؟ اس زمانے میں لوکل کال فری ہوتی تھی ۔ باپ نے کہا، بیٹے ! کال تو فری ہے لیکن عادت بُری ہو گی ۔ یہ وہ گورنر تھے اپنے ملک کے، کہ اپنی اولاد کو، گاڑی تو بڑی چیز ہے، ایک فری ٹیلی فون کرنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ ایک اور واقعہ نشتر صاحب کا ہے کہ گھر میں چند

خواتین آئیں۔ پوچھا، یہ کیا؟ بتایا گیا کہ رشتے کیلئے آئی ہیں۔تو کہا کہ ان کو یہاں کیوں بلایا؟ ہمارا گھر جا کر دیکھیں، گورنر ہاؤس ہمارا گھر تو نہیں ہے۔ یہ پچاس کی دہائی تک، آپ کے ملک کا حال تھا، اس سے پہلے کہ ملک ہائی جیک ہوا اور اقبال کے شعر میں تصرف کروں کہ عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آئے تو وہی ہوا جو ہمارے سامنے ہے۔ میں یہ کہوں گا کہ پیدائش تک تو ٹھیک تھا، لیکن بچپن خراب ہو گیا۔اس لئے کہ جو اصل والدین تھے، وہ تو باقی ہی نہ رہے۔ لیاقت علی خان کا قتل ایک سیاسی قتل تھا اور سب لوگ جانتے ہیں کہ وہ غلام محمد کو ہٹانا چاہتے تھے اور عبدالرب نشتر کو لانا چاہتے تھے۔ بہرحال، یہ تاریخ کا ایک باب ہے۔ ہاں، ایسے لوگ اسی پنجاب میں موجود ہیں جو ۱۹۴۷ء کو لوٹ کا سال کہتے ہیں۔جس ملک کی ابتدا ہی لوٹ مار سے ہوئی ہو، بددیانتی سے ہوئی ہو۔۔۔۔

اس کے بچپن کا تجربہ خوف کا تو نہیں البتہ پرداخت اور پرورش غلط ہوئی، صحیح nourishment نہیں ہوئی۔ بحیثیت آدمی کے تو ہم زندہ ہیں، بحیثیت انسان کے زندہ نہیں۔قومی تشخص آگہی سے، awareness سے ممکن ہوتا ہے۔ وہ کام ہم نہیں کر سکے اور آپ نے یہ سوال نہیں پوچھا کہ ہم میں پاکستانیت کی کیوں کمی ہے۔اس کی وجہ ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وطن کی محبت فطری نہیں۔فطری ایک ہی محبت ہوتی ہے کہ ماں بچے کی پرورش کرتی ہے۔ایک ہی محبت، ماں کی بچے سے محبت ہی، فطری ہے۔آدمی کی حیثیت سے، فطری محبت ماں کی جانب سے ملتی ہے۔انسان کی حیثیت سے محبت acquired ہے۔(اخذ کردہ ہے) کنڈیشننگ کے ذریعے ممکن ہے، کلچر سے ملتی ہے، کری کیولم سے ملتی ہے۔ ایک ایسا ملک، جہاں انسان کی جان محفوظ نہیں، مال محفوظ نہیں، جہاں انصاف نہیں ملتا، جہاں افراتفری ہے، وہاں وطن سے ، ملک سے محبت کس حوالے سے پیدا ہو۔کوئی حوالہ تو ہونا چاہئے نا۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر ماں کا کردار نہ رہے،۔۔۔اگر چہ وہ تو موجود ہی ہے۔لیکن اگر اس روئے زمین پر ماں کا یہ کردار، یہ محبت نہ رہے تو ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ اپنے گھروں کو واپس نہیں آنا چاہتے۔ درودیوار تو گھر نہیں کہلاتے۔گھر تو ایک فضا کا، ایک تعلق کا نام ہے۔بعض گھروں میں

بچوں کی مائیں نہیں رہتی ہیں، باپ نہیں رہتا یا کوئی اور خلل واقع ہو جائے تو بچے گھر نہیں جاتے۔ مطلب یہ ہے کہ محبت کوئی مطلق، کوئی Absolute چیز نہیں، ایک اضافی چیز ہے۔ ہے تو ہے ورنہ نہیں۔ اگر اس ملک میں محبت کرنے کے قابل وجوہ ہوں تو کوئی رجوع بھی کرے۔

اب بے شمار لوگ اس ملک کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، جا چکے ہیں، اجنبی سرزمینوں پر جا بسے ہیں۔ ملک کی کوئی Holding Power ہی نہیں رہی۔ یہ ملک کیسے ہولڈ کرے جہاں نہ مال نہ جان کا تحفظ، نہ کوئی مستقبل نہ میرٹ۔ ایک آدمی باہر سے کیوں آئے؟ معلوم نہیں کب ڈکیتی پڑ جائے، کوئی پریشانی ہو جائے۔ کچھ بھی تو محفوظ نہیں۔ محبت تو سکیورٹی کے حوالے سے ہوتی ہے۔ محبت تو ماں کی گود ہے، گھر کا آنگن ہے۔ اگر آنگن میں خدانخواستہ بجلی کی ننگی تار گر پڑے، در و دیوار کو آگ لگ جائے تو کیا ہوگا۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ جاتے ہیں۔ پرندے اپنے مسکن چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ چنانچہ بنیادی شرطیں پوری کیجئے۔ تحفظ ہو، تعمیر کی صورت ہو، تخلیق کے امکانات ہوں۔ لیکن اس کے باوجود، میں پرامید ہوں جو کچھ بھی ہوا ہے، قوموں کی زندگی میں ایسا ہوتا ہے۔ قائداعظم سے کسی نے کہا قومی کردار کے بارے میں کوئی کوتوال صاحب تھے۔

س۔ جی ہاں! این ایم کوتوال سے گفتگو ہوئی تھی۔

ج۔ ہاں، کہا کہ بیس سال لگیں گے۔ قائداعظم نے فرمایا، نہیں! سو سال۔

غالباً اپریل ۱۹۴۸ء میں لاہور میں کسی سے بات چیت ہوئی۔ کوئی بیرسٹر تھے، جانے کیا نام تھا۔ بہرحال، قائداعظم نے فرمایا، کیا کروں، میری جیب میں چند کھوٹے سکے ہیں۔ چند کہا تھا۔ شکر ہے کہ چند کہا تھا سب نہیں کہا تھا۔ اس وقت خیر، چند ہی کھوٹے ہوں گے۔ لین دین تو آپ سکوں کے بل کرتے ہیں۔ جب وہی کھوٹے ہوں تو اب لین دین کیسے کریں۔ چند بھی ہوں تو سب کا اعتبار کہاں سے آئے؟

لیکن اس کے باوجود ایک چیز پاکستان میں اچھی ہے۔ مثال کے طور پر اس ملک میں پیر پرستی ہے۔۔۔ میں ایک نئی بات کہہ رہا ہوں۔۔۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ اس معنی

میں کہ ابھی کچھ مخلص مرید موجود ہیں۔ پیر ریا کار ہوں گے۔لیکن کوئی مرید ریا کار نہیں ہوتا۔تو جس ملک میں اس قدر پیر پرستی ہو، اس میں ایک بات تو طے ہے کہ لوگ کسی پیر کی تلاش میں ہیں۔ یہ ایک مثبت پہلو ہے۔ لاہور کے ایک صاحب نے اپنے پیر صاحب کا تذکرہ کیا کہ پیر صاحب کے پاس کئی ٹب رکھے تھے، بڑے بڑے۔ایک میں پچاس کے نوٹ، دوسرے میں سو کے، تیسرے میں پانچ سو کے، چوتھے میں ہزار روپے کے نوٹ اور سب ٹب بھرے ہوئے تھے۔ یہ کون دے رہا ہے؟ یہ مرید دے رہے ہیں۔تو اس ملک میں جب تک مرید موجود ہیں، اس ملک کا مستقبل پرامید ہے۔ٹھیک ہے۔

عوام کو دیکھئے کوئی مشکل وقت آتا ہے تو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ۶۵ء کی جنگ ہو، چاہئے قرضہ اتارو سکیم۔۔۔ابھی تک اس ملک کا جو عام آدمی ہے کم پڑھا لکھا آدمی ہے، میرا تو خیال ہے کہ اسے صحیح رہنمائی مل جائے تو کام بن سکتا ہے۔ مجھے تو اسی کی تلاش ہے۔اس کا حال بقول اقبال یہی ہے کہ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

میں پرامید ہوں کہ اس ملک کی جو مٹی ہے، اس میں سونے کے ذرات ہیں، اس میں بہت ساری معدنی دولت ہے، ہماری کوئی تھور مٹی نہیں ہے، زرخیز مٹی ہے۔

س۔ آپ نے اب تک جتنی کتابیں لکھی ہیں، آپ نے کتابوں میں جن بے شمار شہرت یافتہ اور گمنام سپاہیوں اور مختلف کرداروں کا تذکرہ کیا ہے، جو اخلاقیات یہ سارے لوگ اپنے ساتھ لے کر آئے، تعلیم و تربیت کی جس روشنی سے وطنِ عزیز کے بام و در روشن کئے، وہ تہذیب، وہ آداب کیا ہمیں اپنے بازو آزمانے کا حوصلہ نہیں دیتے؟ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا تھا:

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اور انتظار مہدی و عیسی بھی چھوڑ دے

ج۔ آپ نے صحیح بات کی۔ ہمارے جو معلم ہیں۔۔۔معلم میں اس کو نہیں کہتا جو کلاس روم میں

پڑھاتا ہے، معلم وہ ہے جو انسان کو تبدیل کرتا ہے۔۔۔ یہ جتنے معلمین ہیں ہمارے ہاں، ان سب کو reorientate کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہمارے علماء ہمارے اساتذہ، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسان ہر رول میں، ہر کردار میں کسی نہ کسی کو تبدیل کرتا ہے، متاثر کرتا ہے۔ لوگوں کو ذہنی روحانی طور پر بدلنے میں میرا یقین و ایمان ہے۔ میں تو لکھتا ہوں، بولتا ہوں، پڑھاتا ہوں۔ لیکن بات وہی ہے کہ یہ کام ہم میں سے ہر ایک کا ہے، حکومت ہی کا نہیں، ہمارے ہاں غلامی کے دور کی ایک کمزوری ورثہ میں یہ آئی ہے کہ ہر کام حکومت کرے۔ ہم نے حکومت کو ایک omnipower سمجھ رکھا ہے، بے انتہا توقعات بھی لگائے رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں حکومت کو بھی manage کرنا چاہئے۔ یہ کام آپ کو کرنا پڑے گا۔

جانے کیوں اور کیسے، لیکن ہمارے ہاں کا آدمی مخصوص devaluation کا شکار ہو گیا۔ devaluation فرد کا بھی ہوتا ہے، قوم کا بھی۔ ہم ہر سطح پر اسکا شکار ہو گئے۔ ہمیں اس ملک کو بدلنا چاہئے اور عام آدمی کو بھی اس میں عام این جی اوز ہیں، مختلف انجمنیں ہیں، ادارے ہیں، معاف کیجئے گا، یہ جو آپ کی تیسری چوتھی قوت، قلم کی قوت ہے، صحافت کی قوت ہے، یہ بھی کرپشن کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اس کی قوت بہت زیادہ ہے۔ دیکھئے کہ اخبار کے فرنٹ پیج پر جرائم کے تذکرے ہیں۔ دوسرے ممالک میں جرائم کیا نہیں ہوتے؟ لیکن ان کا تذکرہ اولین صفحات پر نہیں آتا۔ جب آپ جرائم کو ایکسپلائٹ کرتے ہیں تو پھر اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جرائم کو فروغ دے رہے ہیں۔ میڈیا کو ذمہ دار بننا ہے۔ اخبار سب سے زیادہ موثر میڈیم ہے کیونکہ زیادہ سے زیادہ حلقوں تک پہنچتا ہے۔ حکومت کے جو بڑے بڑے ستون ہیں ان میں ایک بڑا کردار صحافت کا ہے۔ کیونکہ اس میڈیم میں کام کرنے والے معلم اور مرشد کی فہرست میں آتے ہیں۔

اب آپ کا سوال یہ ہوگا کہ جو باہر کا میڈیا ہم پر اثر انداز ہوتا ہے، غیر ملکی، بین الاقوامی، عالمی میڈیا۔۔۔ اور کلچر کی یلغار ہوتی ہے، اس کا کیا ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دروازے بند کرنے سے دیوار کھڑی کرنے سے آپ ہوا کو روشنی کو روک نہیں سکتے۔ اس کا حل تو

یہ ہے کہ آپ react کریں counteract کریں۔

دیکھ لیجئے کہ اسرائیل نے کیا کیا ہے؟ اسرائیل کی مثال اس لئے دے رہا ہوں کہ یہ ایک اور نظریاتی مملکت ہے، پاکستان کی مانند۔۔۔ان کے نوجوان میڈیا کی زد سے کیسے بچے رہے ہیں؟ وہ کرپشن یا پرورشن کا شکار کیوں نہیں ہوئے؟ ہم پر کیا مصیبت ہے؟

جواب یہ ہے کہ ان کے ہاں awareness ہے، آگہی ہے، کومٹمنٹ ہے۔ یہی ہمیں کرنا چاہئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں عام لوگوں کو، اداروں کو mobilize کرنا ہوگا۔ جہاں بھی کر سکتے ہیں جس قدر بھی کر سکتے ہیں۔ میں بڑا رجائیت پسند ہوں کہ جہاں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ممکن ہو۔۔۔کوشش کی جائے۔ اس ملک میں، آپ دیکھیں کہ، پہلے کے مقابلے میں ایک تحریک سی ہے ان دنوں کہ لوگ مسجدوں میں زیادہ جاتے ہیں۔ جس چیز کو بھی وہ اسلام سمجھتے ہیں، اس کو adopt کرتے ہیں، اسی لحاظ سے ہمارے ہاں مسجدیں آجکل زیادہ آباد ہیں، ہمارے ہاں اسلامی رسومات پہلے سے زیادہ ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دین کی interpretation کچھ اور ہے، دین کی سمجھ بوجھ اس معیار کی نہیں جس کی توقع کی جانی چاہئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں میں وہ urge موجود ہے، وہ خواہش، وہ پیاس موجود ہے۔ آج لوگ کسی کو اچھا سمجھتے ہیں تو کسی ایدھی کو تین کروڑ روپے کا محل حوالے کر دیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ عام لوگ اچھے ہیں۔ امیر آدمی بھی چاہتے ہیں کہ کوئی قابل اعتبار آدمی آئے۔ چنانچہ آپ کی بات کا جواب یہ ہے کہ ہماری مٹی تھور کی مٹی نہیں۔ اجزاء ٹھیک ہیں، اس میں سونے کے ذرات ہیں، اس میں زرخیزی بھی ہے۔ لیکن نمی کی ضرورت ہے جو مٹی کو گوندھ ڈالے، متحد کر دے، ایک کر دے۔۔۔اور نمی میرے آپ کے خونِ جگر سے ممکن ہوگی۔

س۔ آپ ایک غلام ملک سے آزادی کی جانب سفر کر کے آئے ہیں۔ لیکن نئی نسل نے غلامی نہیں دیکھی۔ نوجوان کہتا ہے کہ ہمیں کیا خبر، تحریک پاکستان کیا تھی۔ ہم تو آزاد فضاؤں میں پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی اس تحریک کا ذکر کرتا ہے تو اس کا اثر کما حقہ نہیں ہو پاتا۔

ج۔ بڑے سے بڑا پیڑ اپنی جڑوں کے باعث قائم رہتا ہے۔ میں نے اسی لئے اسرائیل کی مثال دی تھی۔ وہ اپنی roots کو بہت مستحکم کر رہے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو پہلے اپنی roots کے ساتھ مانوس کرتے ہیں، ان کو educate کرتے ہیں، ان سے متعلق آگہی اور شعور پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سارے عمل کو systematize کر دیا ہے۔ یہودی بڑا activitst ہوتا ہے، بڑا fundamentalist ہوتا ہے۔ تمام یہودی بنیاد پرست ہیں، اسرائیل کے roots تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اقدار دیکھیئے تو وہ پیسہ دیتے ہیں۔ وقت دیتے ہیں، کیریئر دیتے ہیں۔ آپ کسی اسرائیلی کو Convert نہیں کر سکتے، اس کو spy نہیں بنا سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کو اسرائیلیوں میں جاسوس نہیں ملیں گے۔ آپ ہر قوم میں ایسے افراد خرید سکتے ہیں لیکن وہاں نہیں ملتا۔

آپ اس بات پر غور کیجیئے کہ وہاں ایسا فرد کیوں نہیں ملتا؟ یہودیوں کو خریدنا اتنا مشکل کیوں ہے؟ پاکستان میں ایسے بہت ملیں گے جو دوسروں کے ایجنٹ بنے ہوئے ہیں، اپنے ملک کو بیچتے ہیں، اندر بھی بیچتے ہیں اور باہر بھی۔ یہ تنہا ملک ہے جہاں جاسوس بھی ہیں، adultration بھی ہوتا ہے، دواؤں میں ملاوٹ بھی ہوتی ہے، غذاؤں میں ملاوٹ ہوتی ہے اور کوئی اس کو جرم نہیں سمجھتا۔ اہم کام ہمارے مذہب کو reinterpret کرنے کا ہے۔ فقہ کا کام جو اقبالؒ نے شروع کیا تھا، فقہ کو reinterpret کرنا ہے۔ آپ بتائیں اس وقت کہ دواؤں میں ملاوٹ کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اور ایسے شخص کی کوئی عبادت قبول نہیں ہوگی۔ رسول اللہ کی ایک حدیث شریف موجود ہے کہ تین چیزیں سب کی ملکیت ہیں۔ پانی، گھاس اور ایک اور چیز۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کتنا concern تھا، کتنی فکرمندی تھی۔ فقہ کو سمجھنے اور آج کی صورت حال کے مطابق سمجھنے کی ضرورت ہے۔ فقہ شریعت نہیں ہے۔ دین سے شریعت آتی ہے اور شریعت سے فقہ آتا ہے۔ ہمیں نئے سرے سے اپنے فقہی نظام کو reinterpret کرنا ہوگا۔۔۔ بتانا ہوگا کہ جو شخص ملاوٹ کرتا ہے وہ انسان کا، اسلام کا دشمن ہے۔ اسے سخت ترین سزا دی جانی چاہیئے۔ ہاتھ کاٹنا یا جو بھی ہو۔ ملاوٹ چوری ہے۔ حالانکہ ہم اس کو چوری نہیں سمجھتے

۔اہل اسرائیل کی مثال ہمارے لئے ایک ماڈل ہے۔اسرائیل کے باسی اپنے یہودی ہونے پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے۔وہ دیوار گریہ نئے سرے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔تو ہمیں کیا پرابلم ہے؟ ایک بات سوچنے کی یہ بھی ہے کہ اسرائیل ایک انتہائی جدید،ٹیکنالوجی کے حوالے سے ترقی یافتہ ملک ہے۔

ہمیں اپنے roots کوٹھیک کرنا چاہئے۔ہمارے سامنے اسرائیل کی صورت ایک چیلنج موجود ہے۔نئی سے نئی ٹیکنالوجی، ایجادات۔آج صبح میں نے دیکھا کہ ایک کمپیوٹرائزڈ ڈکشنری سامنے آئی ہے۔یہ تمام کارنامے یہودیوں کے ہیں، انگریز کر رہے ہیں، امریکی کر رہے ہیں، کیا ہم نہیں کر سکتے؟ ہمارے ہاں تعلیم کا کیا حال ہے ارسطو کا ایک فقرہ ہے کہ:

What is respected in a country is valued in that country

ہم غلط چیزوں کی respect کر رہے ہیں۔چنانچہ غلط چیزیں وقعت پاتی ہیں۔ان تمام غلطیوں کا ازالہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم حق کی آواز اٹھائیں اور اس کا چرچا کریں۔جیسے آپ یہ انٹرویو کر رہے ہیں۔

س۔ ماشاءاللہ آپ کی پر بہار شخصیت نے زندگی کی ستر بہاریں دیکھ لیں، غلامی کے ایک بھیانک دور سے آزادی تک۔پاکستان آپ کے سامنے بنا۔کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ آپ ان نتائج تک کیسے پہنچے؟

ج۔ میرا بچپن تحریک پاکستان کا ابتدائی دور تھا۔ہم ایک آزاد ملک کی تدبیر کر رہے تھے۔تدبیر کے دور میں کشمکش اور جدوجہد ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔پھر تعمیر کا دور آیا۔میں علی گڑھ میں پڑھا ہوں۔جو تدبیر کے رویئے تھے، وہی تعمیر وتشکیل کے بھی تھے۔ہم نے اسی تسلسل کو آگے بڑھایا۔میرا خیال ہے کہ تدبیر کا دور سرسید سے شروع ہوا تھا۔میں نے جس سکول میں پڑھا، وہ سرسید کے ایک رفیق طفیل صاحب نے شروع کیا تھا۔میں ایک تسلسل ہوں ایک رویئے کا۔پہلے تدبیر میں شامل تھا، پھر تعمیر میں، میرے لئے کوئی بریک نہیں آیا۔بلکہ ایک موقع ملا کہ یہاں آکر اسی کو

آگے بڑھاؤں۔ اپنی صلاحیت کے مطابق لیکن یہ کام سب لوگوں کے ساتھ نہیں ہوا۔

س۔ اس دوران آپ کی ملاقاتیں بڑے جید علماء اور سیاستدانوں اور دانشوروں سے ہوئیں، قائد اعظم کی زیارت بھی نصیب ہوئی؟

ج۔ جی ہاں، میرے لئے یہ ایک تسلسل تھا، ایک تحریک تھی۔ ایک اور بات بتاؤں کہ ہمارے ہاں دو متوازی نقطہ نظر چل رہے ہیں۔ پاکستان سرسید کی تحریک سے بنا ہے۔ وہاں ندوۃ العلماء کی تحریک بھی تھی اور دوسری تحریکیں بھی تھیں، شبلی کی، مولونا مودودی کی تحریکیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ پاکستان اس راستے سے نہیں بلکہ سرسید کی تحریک سے اور اسی ذہن سے بنا۔ اس میں جدید فکر کا ہاتھ ہے اور قیادت بھی انہی ہاتھوں میں رہی۔ آج بھی انہی ہاتھوں میں ہے۔ سرسید کا حوالہ بھی دوقومی تحریک میں اسلامی ہی تھا۔ ورنہ دوقومیں کس طرح بنتیں۔ ہم قومیت کے نظریئے کی مخالفت نہیں کرتے۔ لیکن وہ قومیت کا جدید تصور تھا۔ ہمیں زمانے کے ساتھ چلنا ہے اور اسلامی اصولوں کے مطابق۔ جیسے اقبال نے فرمایا، بحثیت دین کے اسلام قرآن میں ہے، تمدن کے اصول رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات میں ہیں۔ تو یہاں دین میں اور تمدن میں فرق کرنا چاہئے۔ دینی سرچشمہ وہی ہے لیکن تمدنی رویہ یعنی سٹریٹیجی مختلف۔ پاکستان بنایا بھی سرسید کی تحریک نے اور آج بھی وہی لوگ سینچ رہے ہیں۔ دوسری stream بھی ٹیک اوور کرنے کی کوشش کرتی ہے اور وہ اسلامی نظام کا نعرہ لگاتی ہے۔ بے شک، آپ لکھیں نہ لکھیں، اسلامی نظام کا مطالبہ تو ٹھیک ہے۔ تاہم، پچاس برس میں ہمیں ایک اسلامی آئین بھی تو پیدا کرنا چاہئے تھا۔ تشکیل دینا چاہئے تھا۔ اسلامی نظام کیسا ہو؟ آپ ہمیں ایک اسلامی آئین بتایئے، سٹرکچرز بتایئے، وہ ادارے قائم کیجئے، وہ بستی بنایئے۔ اور بتایئے کہ یہ اسلامی نظام ہے، یہ نہیں ہے۔

س۔ جب قائداعظم نے کہا کہ ہم ایک اسلامی ریاست بنا رہے ہیں۔ اگر یہ لوگ حکومت الہیہ تشکیل دینا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ تو کیا یہ محض سیاسی بیان تھا؟

ج۔ اس کا تذکرہ میں نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ میرے پاس اس وقت حوالہ نہیں لیکن اقبال کے خطوط پر قائداعظم نے جو پیش لفظ لکھا ہے، اسے ذرا غور سے پڑھیئے۔ انہوں نے واضح طور پر

لکھا ہے کہ اقبال ایک مفکر ہی نہیں تھے بلکہ سیاسی مدبر بھی تھے جس کے نتیجے میں انہوں نے ایک ایسے سیاسی نظام کو پروموٹ کیا جو اسلامی اقدار پر مبنی ہے۔سوال یہ ہے کہ وہ اسلامی اقدار کون سی ہیں۔اسلام میں کچھ عبادات بھی ہیں اور کچھ اقدار بھی۔

س۔ کچھ خدمات بھی!

ج۔ جن کا زندگی سے تعلق ہے۔قائداعظم جب اسلام کے دین کی بات کرتے تھے تو ذہن میں بنیادی اسلامی اقدار تھیں، انصاف، عدل، احسان اور ایک ایسا معاشرہ تھا کہ ایک حدیث موجود ہے، رسول حکیم ﷺ نے فرمایا کہ پڑوسی کے کتے کو نہ مارو۔ یہ ایک معاشرتی نظام تھا جس میں آپ پڑوسی کے کتے کو بھی نہیں مار سکتے۔رسول حکیم ﷺ نے ایک اور حکم دیا کہ پھل لاؤ تو یا تو پڑوسی کو شریک کرو یا بیجوں کو باہر نہ پھینکو۔فرمایا کہ اپنے گھر کی دیوار کو اونچا نہ کرو۔اب یہاں سارا زور یا تو پڑھنے پر ہے یا سننے پر ہے۔۔۔سارا ثواب پڑھنے کا یا سننے کا۔۔۔۔معاف کیجئے، یہ جملہ میرا ہے۔۔۔لیکن میں قتل ہو جاؤں گا اگر کہوں کہ اصل میں سارا ثواب جو ہے، میری جان، کرنے کا ہے، حسن عمل کا ہے۔

الذین آمنو و عملو ا صلحت

ایمان عمل صالح میں منتج ہوتا ہے۔ بیچ میں، درمیان میں، کوئی اور منزل نہیں ہے۔ یہاں دائرہ مکمل ہوتا ہے۔اس کے بغیر عبادات کا تمام تر نظام سعی لا حاصل ہے۔۔۔بہر حال، یہ میری اپنی رائے ہے۔

تو پاکستان، میں نے کہا نا کہ، ایک خواب ہے جو سفر میں ہے۔لوگ ہمارے ہاں کچھ چاہتے ہیں، بے چین ہیں، ریا کار نہیں ہیں۔نم چاہتے ہیں۔

س۔ آپ کا بے حد احترام کرتا ہوں۔آج پہلی مرتبہ بے حد خوفزدہ ہوں، طاہرہ سے یہی عرض کر رہا تھا کہ راشد صاحب کا انٹرویو نہیں کر سکتا۔بہر حال۔۔۔۔۔۔

ج۔ نہیں۔ہمیں اپنے بچوں کو سوچنا، نڈر رہنا سکھانا چاہئے۔میں خود خوفزدہ ہوتا ہوں شائع شدہ لفظ سے۔اپنا لکھا ہوا بھی چھپا ہوا ہو تو اسکی تصحیح، کاٹ چھانٹ کرتے جھجھکتا ہوں۔ہم لکھے ہوئے لفظ

کے غلام بن گئے ہیں۔ حالانکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں۔ اسی طرح بچوں کو سوچنا، تعقل، تفکر، تدبر کرنا، اختلاف کرنا، disagree کرنا سکھانا چاہئے۔ اس لئے کہ جو divergent thinking ہے وہ ترقی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ بے تکلف کہیئے۔ تکلف نہ کیجئے۔

س۔ تکلف نہیں کروں گا۔ کیونکہ آپ کا لاڈلا شاگرد بھی ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم و تربیت پائی۔ پاکستان بننے کے بعد آپ نے پاکستان میں بھی اپنی خدمات ایک انتہائی اعلیٰ تعلیمی ادارے کے لئے وقف کر دیں۔ چالیس سال تک آپ نے افواج پاکستان کی خدمت کی۔ بیسیوں کتابیں لکھیں، ہزاروں شاگردوں کو فیضیاب کیا۔ کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ آپ جیسے شخص کو، نابغہ روزگار شخص کو، کہیں اور، عوام الناس کے درمیان ہونا چاہئے تھا؟ کیا آپ اس کا ازالہ کر سکتے ہیں؟

ج۔ ہاں۔ اسی لئے میں نے ایک سکول میں پرنسپل کے عہدے سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ اب یہاں زیادہ exposure ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک استاد کو یونیورسٹی میں بھی پڑھانا چاہئے اور دور دراز گاؤں میں بھی۔ بیرونی ممالک میں ایک سسٹم ہے کہ وہ افسر براہ راست نہیں بناتے۔ پہلے وائی کیڈٹ کے طور نیچے سے گزارتے ہیں۔ تمام منزلوں سے گزر کر وہ افسر بنتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ سسٹم بڑا اچھا ہے۔ وہاں ڈگری یونیورسٹی سے حاصل کرنی پڑتی ہے، فوجی ادارے سے نہیں مل پاتی۔ میں تسلیم کرتا ہوں یہ میرا ہینڈی کیپ رہا ہے کہ مخصوص اداروں میں رہا، مخصوص norms بن گئے۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ انسان بہت برا بھی ہوتا ہے۔ آدمی تو بہت خبیث بھی ہوسکتا ہے۔ حالی کا ایک شعر ہے:

جانور آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں

انسان بہت برا ہوسکتا ہے یہ اس کی آگہی ہے کہ آپ نے اس کے طرز احساس کو کیا رخ دیا۔ آدمی کا برا ہونا اس کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ ایمرسن کا جملہ ہے: A thief only

steals from himself

اور ہم اس برائی کو پروموٹ کر رہے ہیں، بیج بو رہے ہیں۔ کتنا ظلم کر رہے ہیں۔ ہم ان کو برا بنا رہے ہیں، جابر اور ظالم بنا رہے ہیں، جاہل بنا رہے ہیں۔ اور اس جہالت کو پروموٹ کر رہے ہیں۔ کتنی بد قسمتی ہے کہ آدمی اچھا نہیں ہے۔ وہ خوش کیسے ہوگا؟ برا آدمی خوش نہیں ہو سکتا۔ برے آدمی کی تعظیم نہیں ہو سکتی۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے کہ انسان کی Psychie آزاد ہے، حیوان آزاد نہیں، اس کی آگہی محدود ہے۔ کھانا پینا، بیوی بچے۔۔۔ جانور میں یہ احساسات ختم ہو جاتے ہیں۔

س۔ جناب والا! آپ نے گفتگو کے دوران اس خوف کا اظہار کیا کہ اگر میں اظہار کروں تو واجب القتل ٹھہروں گا۔ ہم کیوں خوفزدہ ہوتے ہیں؟

ج۔ بات یہ ہے کہ میں ان مذہبی معاملات کو چھیڑنا نہیں چاہتا۔ پہلے ہمیں وہ بصیرت پیدا کرنا ہوگی۔

س۔ بصیرت کیسے پیدا ہوگی؟

ج۔ تفکر، تدبر سے!

س۔ اگر آپ سوچ اور فکر کے قبلے تبدیل نہیں کریں گے تو یہ بصیرت کیسے پیدا ہوگی؟

ج۔ میں کسی کو پیر پرستی یا قبر پرستی سے منع نہیں کروں گا۔ لیکن بصیرت پیدا کرنے کے لئے تگ و دو کروں گا۔ بصیرت پیدا ہوگی تو معاملات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔ اصل مسئلہ بدعت نہیں۔ پیر پرستی، قبر پرستی نہیں،۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بصیرت کا فقدان ہے۔

س۔ بصیرت کی وضاحت کیجئے!

ج۔ رسول حکیم ﷺ نے حکم دیا کہ پڑوسی کے کتے کو نہ مارو۔ اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ اس میں ایک civic sense ہے۔ اگر آپ یہ sensibility پیدا کر لیں تو آپ بصیرت پیدا کر رہے ہیں۔ جب آپ صلح حدیبیہ کی شرائط بتائیں گے تو آپ محض معلومات فراہم کریں گے۔ لیکن اگر آپ یہ بتائیں کہ اصل بات strategic planning ہے تو یہ بصیرت ہے۔

س۔ یعنی آپ گزرے ہوئے واقعات کی اصل روح، اصل سپرٹ کا آج کی صورت حال پر اطلاق

بھی کرتے جایئے۔

ج۔ حدیثِ رسول کریم ﷺ یہ ہے کہ شام کو بچوں کو گھروں سے باہر نہ جانے دو اور اپنے برتنوں کو ڈھک کر رکھو اور سوتے وقت آگ کو بجھا دو۔۔۔بصیرت یہ ہے کہ آج کی صورت حال میں آپ گیس کے چولہوں کو بجھا دیں اور برتنوں کو ڈھکنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اشیائے خوردونوش کو آلودہ اور contaminate نہ ہونے دیں اور صاف پانی پئیں۔ وغیرہ۔۔۔۔ جب تک آپ ان احکام کی حکمتیں نہیں سمجھ پاتے تب تک بات نہیں بنتی۔

س۔ ابھی ہم آپ سے ملاقات کے لئے آ رہے تھے تو "2010ء کا پاکستان" کے بینر تلے اوٹ پٹانگ لباس پہنے نوجوان، اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتے نظر آئے۔ اپنے بچوں کے حوالے سے ہم والدین کیا کریں۔ بچہ گھر سے باہر نکلتے ہی باہر کے اس رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ قطرہ چاہے کتنا پاک وصاف کیوں نہ ہو، دریا کا حصہ بن جاتا ہے۔

ج۔ قطرہ دریا سے باہر نہیں، وہ ایک chain reaction ہے۔ ایک ڈائریکٹ کنٹرول، ایک ان ڈائریکٹ کنٹرل اور ایک نو کنٹرول پرابلم ہوتا ہے۔ ہر پرابلم کی ابتداء ہم سے ہے، ہماری اپنی ذات سے ہے۔ آج کی صورت حال، درحقیقت، اژدھے کے دانت تھے جو کبھی بوئے گئے تھے۔ فصل کی جڑوں تک چلیئے۔ آج اچھا بیج بوئیے، آرگنائز کیجئے تو تبدیلی کا عمل شروع ہو جائے گا۔ بھلائی کو بھی systematic کرنا چاہئے، اچھائی کی بھی ٹیکنالوجی وضع کرنی چاہئے۔ برائی ایک process سے پیدا ہوئی ہے تو اس کا تدارک کرنے کے لئے اچھائی کا بھی ایک process ہے۔

س۔ سمندر پار پاکستانیوں کے لئے اس بصیرت افروز پیغام کا شکریہ۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۸ء کو گولڈن جوبلی تقریبات کا اختتام ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہماری خواہش تھی کہ ہم آپ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کریں۔

ج۔ سمندر پار پاکستانی حلقوں میں ہماری شنوائی ہو تو وطن عزیز کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ آپ کی آمد کا بے حد شکریہ!

نوٹ : جناب ہارون رشید اور محترمہ طاہرہ ہارون نے یہ ملاقات فروری 1998 میں کی۔ یہ پروفیسر راشد کا آخری باقاعدہ انٹرویو ہے۔

''آنٹی''

(بیگم سعید راشد)

کی یاد میں

لیفٹیننٹ کرنل رشید احمد ستارہ جرأت
(کالج نمبر 752، زمانہ تعلیم 1938-1943ء)

''جرأتوں کے نشان'' کے لئے راشد صاحب نے مجھے جو سوانحی سوالنامہ بھیجا تھا، میں نے اس میں لکھا کہ کس طرح کوئٹہ میں کپتانی کے زمانہ میں مجھے کتے اور بھیڑیئے پالنے کا شوق ہو گیا۔ میری بیوی نے میری خاطر میرے جانوروں کے شوق کو برداشت کیا وغیرہ وغیرہ۔ بیگم راشد نے یہ واقعہ پڑھا ہوا تھا۔ جب 1982ء میں راشد صاحب کے ساتھ ہمارے یہاں آئیں (راشد صاحب ''جرأتوں کے نشان'' کے لئے مواد جمع کرنے دورہ پر لاہور آئے ہوئے تھے اور بیگم صاحبہ انکے ہم رکاب تھیں) تو انہوں نے میری بیگم کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ اگر آپ اپنے میاں کو اتنا سپورٹ نہ کرتیں تو یہ ستارہ جرأت نہ لیتے۔ جو لوگ غیر معمولی کارنامے انجام دیتے ہیں وہ عام لوگوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان کے لوگوں کو بھی کچھ قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہی انکی خدمت بھی ہے۔

یہ باتیں خود ان پر صادق آتی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ بیگم صاحبہ راشد صاحب کے ساتھ کراچی تک گئیں اور ان کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ 'کردار ساز' کے کئی انٹرویو انہی نے لئے۔ راشد صاحب کی کتابیں مکمل کروانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں نے انکو بہت اچھی صحت میں بھی دیکھا تھا اور 1985ء کے اوائل میں شدید بیماری کی حالت میں بھی دیکھا جب ہڈیوں کا ڈھانچا ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس حالت میں بھی بڑی پُرعزم تھیں۔ بیگم سعید راشد نے ہماری بیویوں کو سبق دیا کہ دیکھو میاں کے مشن کا یوں ساتھ دیتے ہیں۔

میجر محمد رفیق
(کالج نمبر 1440 زمانہ تعلیم 1945-1955ء)

جب میں کالج میں تھا تو آنٹی کی میزبانی سے بہت فیض اٹھایا۔ اس زمانہ میں راشد صاحب اسکین ہاؤس (حال بابر ہاؤس) کے بائیں ہاتھ کے کوارٹر میں کمانڈانٹ کے دفتر کے پہلو میں رہا کرتے تھے۔ جب بھی میں جاتا تو پہلے آنٹی سویٹ ڈش سے تواضع کرتیں۔ پھر پوچھتیں کیا کام ہے۔ اگر راشد صاحب موجود ہوتے تو بھی اسی طرح تواضع ہوتی۔ وہ اس زمانہ میں دارجلنگ کی گرین لیبل چائے بہت اہتمام سے پیتے تھے۔ مجھے بھی بعض دوسرے کیڈٹس کے ساتھ اور تنہا اکثر یہ چائے پینے کا موقع ملا۔ چائے کے بارے میں انکی معلومات بہت وسیع تھیں۔ ایک بار ایک کتاب ''غبار خاطر'' دکھائی جس میں چائے پینے کی نزاکتوں

کا تذکرہ تھا۔ پھر کہا بعض لوگ چائے کے نام سے گرم شربت پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ آنٹی سادہ یعنی ہلکے رنگوں کی ساڑھی باندھتی تھیں۔ پہلے تو میں انھیں بنگالی سمجھا لیکن بعد کو پتہ چلا وہ ٹھیٹھ یوپی کی ہیں۔ وہ کلچر کی اس سطح پر تھیں کہ اپنے کلچر سے بالکل مختلف بچوں کو بھی بالکل ماؤں کی طرح چاہتی تھیں۔ اس دور کے طلبہ کی تہذیبی تربیت میں راشد صاحب کے ساتھ ساتھ انکی بیگم کا بڑا ہاتھ تھا۔ کالج سے جانے کے برسہا برس بعد جب میں ایس ایس ڈی جہلم میں اوسی پوسٹ ہوا اور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رابرٹس ہاؤس میں راشد صاحب سے ملنے آیا تو آنٹی نے مجھے فوراً پہچان لیا اور میری بیوی کو رفیق دلہن کہہ کر پکارا اور بے انتہا اہمیت دی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ انہوں نے میری چھوٹی بچی کو اونی سیٹ بھی دیا تھا۔ 1983ء میں جب وہ سی۔ایم۔ایچ راولپنڈی میں زیرِعلاج تھیں تو میں اور مسز ان کو دیکھنے اکثر جاتے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھل اٹھتی تھیں۔ میری مسز آج بھی انہیں یاد کر کے اداس ہو جاتی ہیں۔ علالت کے آخری زمانہ میں جب وہ چکلالہ میں گھر بنوانے کے بارے سوچ رہی تھیں تو میں نے انہیں آفر کی تھی کہ آپ مجھے یہ خدمت بجالانے کا موقع دیں۔ آج وہ موجود نہیں۔ میں نے سر سے ضد کر کے انکے گھر کو مکمل کروانے کی حامی بھری۔ محض اسلیئے کہ اپنی ''ماں'' کی روح کو تسکین پہنچا سکوں۔ راشد صاحب خاص کر آنٹی کے حوالے سے ہم عالمگیریز کو انسانی رشتے کی عالمگیری اور استواری کا تجربہ ہوا۔ مجھے توقع ہے کہ راشد صاحب نے کالج کی تاریخ میں آنٹی کے رول اور خدمات کا جائزہ لیا ہوگا۔ تاکہ سند رہے کہ پبلک اسکول کی ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ اسکی ایک ماں بھی ہو۔

لیفٹیننٹ کرنل ریٹائرڈ اقبال شاہین

(کالج نمبر 2367 زمانہ تعلیم 1964-1956ء)

اپریل 1956ء میں جب میں کالج میں داخل ہوا تو مجھے برڈ وڈ ہاؤس الاٹ ہوا تھا۔ لیکن نہ معلوم کس وجہ سے میں والد صاحب کے ساتھ پہلے اسکین ہاؤس گیا اور کالج کی میری پہلی یاد اسکین ہاؤس کے اس لان کی ہے جو اس کے بائیں ہاتھ کے کوارٹر کے سامنے تھا جس میں اس زمانہ میں راشد صاحب اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے سہ پہر کو جب والد صاحب نے مجھے خدا حافظ کہا۔ اس وقت دس برس کے اس بچہ کی ذہنی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس نے اس سے پہلے گھر سے باہر قدم نہ نکالا ہو۔ قریب تھا کہ میرے آنسو بہہ نکلیں لیکن چونکہ والد کا نام غیور احمد خان تھا اور غیرت مندی میری گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لئے میں شعوری طور پر بہادر بن کر دکھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں کرسی پر اکیلا اداس بیٹھا تھا کہ اتنے

میں کوارٹر کا دروازہ کھلا اور راشد صاحب کی بیگم (آنٹی) باہر آئیں۔ غالباً وہ راشد صاحب کو تلاش کر رہی تھیں، جب کرسی پر گم سم ایک مجسمہ کی طرح مجھے بیٹھے دیکھا تو میرے پاس آئیں۔ وہ میری صورت دیکھ کر سمجھ گئی ہونگی کہ کیا قصہ ہے۔ جب انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تو ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئیں، میرے پاس رومال نہ تھا۔ انہوں نے اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے آنسو پونچھے۔ ایک رومال مجھے دیا کہ لو منہ صاف کرو۔ پھر وہ میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے گھر کی باتیں پوچھنے لگیں۔ پھر چائے بنا کر پلائی بسکٹ کھلائے تا نکہ مغرب کے قریب راشد صاحب آئے تو انہوں نے مجھے انکے حوالے کیا۔ وہ مجھے برڈ وڈ ہاؤس میں علوی صاحب کے سپرد کر آئے۔ اس دن سے میں راشد صاحب کے گھر کو اپنا گھر اور آنٹی کو اپنی ماں سمجھتا رہا اور کالج میں کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ واقعہ 1956ء کا ہے۔ اس سے تقریباً بیس سال کے بعد بیوی بچوں کو لے کر آنٹی کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے میری بیوی کو شاہین دلہن کہہ کر گلے لگایا۔ ہمیں دھوپ میں بٹھایا اور اندر سے کوئی خاص میٹھی ڈش لائیں اور مجھ سے کہا شاہین، ہمارے یہاں دستور ہے جب دلہن پہلی بار گھر آتی ہے تو اسکا اس ڈش سے منہ میٹھا کرایا جاتا ہے۔

غرض کیا بتاؤں کہ کس محبت سے انہوں نے ہماری خاطر تواضع کی اور چلتے ہوئے اپنی دلہن کو ایک دوپٹہ منہ دکھائی کے طور پر دیا۔ ہم دونوں کی زندگی کی بہترین پذیرائی تھی جو ہمیں اس دن ملی۔ میری بیوی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رخصت ہوتے ان کا شکریہ کیسے ادا کریں۔ جب میں نے ان کی ترجمانی کرنی شروع کی، یعنی کوشش کی، تو انہوں نے ہنس کر کہا بچیاں اور دلہنیں ماؤں کا شکریہ ادا نہیں کرتیں۔ ان کا خوش ہونا ہی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔

1985ء میں جب ہم دونوں انہیں دیکھنے سی ایم ایچ راولپنڈی گئے تو انکے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ڈائیلائسز بھی ہو رہی تھی۔ اس حالت میں بھی پوچھا دلہن کیسی ہو؟ ماشاالله اب کتنے بچے ہیں۔ وہ کس رشتہ سے بستر مرگ پر بھی میرے بچوں کو اس چاؤ سے پوچھ رہی تھیں؟ دوسرے ہفتہ انکا انتقال ہو گیا۔ **انا للّٰه وانّا الیه راجعون.**

لیفٹیننٹ کرنل ذوالفقار ارشد

(کالج نمبر 2563، زمانہ تعلیم 1960-1965ء)

میں راشد صاحب پر لکھنے کے لئے بیٹھا تو پہلے آنٹی روحی کا خیال آیا۔ ہے نا حیرت کی بات کہ راشد صاحب کو ان کی بیگم کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ گھر کو تو سب ہی بیویاں سنبھالتی ہیں مگر آنٹی جی نے راشد

صاحب کے کام اوران کے مشن کوسنبھالا۔ بزم ادب کا اجلاس اتوار کےاتواران کے ہاں ہوتا۔ ہارون اور جاوید شاعری بھی کرتے تھے۔ میں صرف افسانے لکھتا،آنٹی جی اکثر ہماری نگارشات کوغوراورتوجہ سے سنتیں اورحوصلہ افزاءتبصرے بھی کرتیں۔انکی مادرانہ موجودگی ہمارے لئے گونا گوں طمانیت کا باعث تھی۔خواہ کبھی وہ بزم میں شریک نہ بھی ہوں،لیکن جاڑوں میں گرین لیبل چائے اورگاجر کےحلوہ اورگرمیوں میں روح افزا کی لسی سےتواضع میں کبھی ناغہ نہ ہوا۔

ایک استاد کا شاگرد سے روحانی رشتہ تو دیکھا ہےلیکن استاد کے پورے گھرانے کا شاگرد کے پورے خاندان سے وابستہ ہوجانا بہت غیر معمولی بات ہے؟ کالج چھوڑنے کےآٹھ دس سال بعد جب دوبارہ میرارابطہ ان سے بحال ہواتو جب بھی راشد صاحب کے ہاں گیاتو آنٹی نے ہمیشہ پہلے یہ پوچھا دلہن کیسی ہیں؟ بخیر ہیں کبھی لاؤ نا انکو۔ میرا دل انکو دیکھنے کو چاہتا ہے۔تمام رہائشی پبلک اسکولوں کی طرح ملٹری کالج بھی خاصی کھردری جگہ تھی۔ بہت سے (ناگزیر)strains تھے۔ بہت سےضروری stresses تھے۔اس ماحول میں آنٹی کی باشعور مادریت ہمارے لئے باعث تقویت تھی۔ان کے امیج سے مجھے اس امر کا بھی ادراک ہوا کہ شوہر کی کارکردگی میں اسکی نصف بہتر کا کتنا اہم رول ہوتا ہے۔

لیفٹیننٹ کرنل اقتدارعلی

(کالج نمبر2510،زمانہ تعلیم1959-1965ء)

ملٹری کالج کی تاریخ میں شاید سٹاف کی کسی اور خاتون نے بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر کیڈٹس خاص طور پر اولڈ بوائز کے لئے وہ رول ادا نہ کیا ہوگا جو آنٹی نے کیا۔ خاندانی رشتوں سے تو سب واقف ہوتے ہیں لیکن استاد شاگرد کے حوالے سے انسانی رشتے کوقائم کرنا اور پھر اسکو زندگی بھر نبھانا انہی کا کام تھا۔ 1982ء میں کالج کی ہسٹری کے سلسلہ میں جب راشد صاحب کراچی گئےتو آنٹی بھی انکے ساتھ تھیں۔ میں اس زمانہ میں نیوی کے ساتھ پوسٹ تھا۔ وہ حلیم کالج نمبر(2069) کے یہاں بھی گئیں اور میرے ہاں بھی آئیں۔جہلم واپس جا کرانہوں نے میری بچی کے لئے اونی سیٹ بھیجا۔ ایسا ہی ایک پارسل حلیم کوبھی ملا۔

سچی بات یہ ہے کہ ملٹری کالج سے جوتعلق، جومحبت آج مجھے ہے، وہ بڑی حدتک آنٹی کی وجہ سے ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ راشد صاحب کا بھی جوامیج اولڈ بوائز میں ہے اسکو بنانے میں اور برقرار رکھنے میں آنٹی

کا بڑا ہاتھ ہے۔ ملٹری کالج خوش قسمت تھا کہ اسے راشد صاحب ملے اور راشد صاحب خوش قسمت تھے کہ انہیں ایسی غیر معمولی خاتون کی رفاقت نصیب ہوئی۔

لیفٹیننٹ کرنل حامد محمد علی

(کالج نمبر 2606 زمانہ تعلیم 1965-1961ء)

جس زمانہ میں راشد صاحب میرے اردو کے ٹیوٹر تھے اکثر انکے گھر جانا ہوتا تھا۔ آنٹی مادرانہ شفقت سے پیش آتی تھیں۔ 1981ء میں جب میں اپنے چھوٹے بیٹے اور اپنی مسز کے ساتھ حاضر ہوا تو انہوں نے میری مسز کا میری بہو کہہ کر اس گرم جوشی سے خیر مقدم کیا جسکی یاد انکے دل سے آج تک نہیں گئی۔ چونکہ شادی کے بعد پہلی وزٹ تھی، انہوں نے دولہا دولہن کی پہلی بار گھر آنے کی رسم باقاعدہ ادا کی۔ اپنی دلہن کو منہ دکھائی میں دوپٹہ دیا، میرا منہ میٹھا کرایا اور عطر لگایا۔

85-1983ء میں جب وہ سی ایم ایچ راولپنڈی میں زیر علاج تھیں تو میں تقریباً ہر روز ان کی مزاج پرسی کے لئے جاتا تھا۔ تقریباً ہر روز پوچھتی تھیں دلہن کا کیا حال ہے۔ بیٹا کیسا ہے۔ میرے علاوہ اور بہت سے اولڈ بوائز انکی عیادت کے لئے آتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ لوگ اتنا راشد صاحب کی بیگم کی مزاج پرسی کرنے نہیں بلکہ اپنی ماں کو دیکھنے زیادہ آتے تھے اور ایسا کرنا بے وجہ نہ تھا۔

میجر ساجد مجید بھٹی

(کالج نمبر 2901 زمانہ تعلیم 1968-1965ء)

یہ واقعہ 1966ء کا ہے جب مجھے کالج میں داخل ہوئے سال ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا اور کسی کسی دن home sickness کی لہر آ جاتی تھی۔ آج وہ سردیوں کی شام آنکھوں میں پھر رہی ہے جب میں ویک انڈ پر نہ جا سکا تھا، اور گھر بہت یاد آ رہا تھا۔ ٹیپو ہاؤس سے میں نکلا کہ اور کچھ نہیں تو کالج کے گیٹ تک ہی ہو آؤں۔ شیر شاہ ہاؤس سے گزرتے ہوئے قدم خود بخود راشد صاحب کے گھر کی طرف اٹھ گئے۔ گھنٹی دی تو ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے آنٹی نے آ کر دیکھا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اتنی دیر میں راشد صاحب کا بڑا بیٹا مسعود (جو اس زمانہ میں تین چار سال کا ہوگا) باہر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ (راشد صاحب کا یہ ڈرائنگ روم اب اولڈ بوائز میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ جو نگار خانہ اور کتب خانہ سب ہی کچھ تھا)۔ مسعود سے میں چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھنے لگا۔ تمہارا نام کیا ہے، کیا پڑھتے ہو، کیرم کھیلتے

ہو وغیرہ۔ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب اس نے خود مجھ سے پوچھ لیا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ (ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات) اتنے میں آنٹی چائے لے کر آ گئیں۔ ایک پلیٹ میں راشد صاحب کے گھر کا معروف گاجر کا حلوہ بھی تھا۔ بہت پیار سے پوچھا۔ ساجد بھٹی ہو؟ میں نے کہا ''جی ہاں''۔ کہنے لگیں ''پچھلے اتوار تم سر سے ملنے آئے تھے، ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں بیٹھے تھے۔ تمہارے ساتھ اور کون تھا''؟ میں نے کہا ''ترین''۔ ''سر تم دونوں کی تعریف کر رہے تھے۔ بیٹے شوق سے پڑھا کرو۔ ماں باپ نے تمہیں بڑے شوق سے یہاں بھیجا ہے۔ کوئی ماں اپنے لاڈلے کو اپنے سے دور نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن بچوں کی ترقی کی خاطر یہ پتھر بھی دل پر رکھنا پڑتا ہے۔'' آنٹی نے یقیناً میری ہوم سک نس (home sickness) کو میرے چہرے پر پڑھ لیا تھا۔ راشد صاحب جیسے کچھ بھی ہیں، اپنی جگہ، لیکن راشد صاحب کی بیگم، ہماری آنٹی! ان کا کیا کہنا! میری طرح نہ معلوم کتنے دلوں کو انہوں نے اپنی شفقت کی ٹھنڈک سے نوازا ہوگا۔ تپتی دھوپ میں ایک پیڑ کی گھنی چھاؤں کتنا سکون دیتی ہے۔ اس دن جس طرح انہوں نے مجھے وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا، جس طرح چائے پیش کی، جس انداز سے تواضع کی، اس سے بحیثیت ایک فرد، ایک انسان کے مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ میری سماجی خود اعتمادی کا پہلا دن تھا۔

اس دن کے بعد سے تو اکثر آنٹی کی میزبانی سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا۔ میں اور ترین انکے ہاں اتوار کو اکثر جاتے تھے اور اکثر فرمائشیں کر کے کھاتے پیتے تھے۔ لیکن اس شام کی تواضع میرے دل پر نقش ہو گئی ہے۔ اس دن میرے تہذیبی شعور نے آنکھ کھولی۔ ایک مادر مہربان کی توجہ کی آغوش میں۔

اس واقعہ کے چودہ پندرہ برس بعد 1980ء کی ایک سہ پہر کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔ میں کھاریاں میں پوسٹ تھا اور کالج کی سالانہ تقریب انعامات میں شرکت کے لئے آیا تھا۔ میری مسز بھی ساتھ تھیں اور میری بڑی بیٹی ندا۔ جو ان دنوں چند ماہ کی تھی، ان کی گود میں تھی۔ اتنے چھوٹے بچوں کو لے کر اس قسم کی تقریبات میں جایا نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ دعوت نامہ پر راشد صاحب نے اپنے قلم سے 'ضرور آؤ' لکھا تھا اور میری مسز بھی آنٹی سے ملنا چاہتی تھیں اسلئے ہم اتنی چھوٹی بچی کو لے کر آ گئے تھے۔ اب میں بتا نہیں سکتا کہ کس بیساختگی سے آنٹی نے ذکیہ کو میری دلہن کہہ کر گلے لگایا۔ بچی کو پیار کیا۔ بلائیں لیں۔ چلتے وقت ذکیہ کو منہ دکھائی دی اور ندا کو دو فراکوں کے علاوہ اونی سوٹ دیا۔ اسی موقع پر انھوں نے ندا سے لاڈ کرتے ہوئے کہا تھا پیڑ سے پھل بہتر ہوتا ہے۔

آنٹی جگت آنٹی تھیں۔ ان کی باشعور ممتا سے بے شمار اولڈ بوائز نے فیض پایا۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ راشد صاحب اور آنٹی نے جس طرح بے شمار اولڈ بوائز سے ان کے کالج

سے جانے کے بعد بھی بے لوث اور پرخلوص مراسم رکھے،صرف کالج پاکستان اور انسانیت کے حوالے سے، اسکے جولاشعوری تہذیبی اثرات ہمارے ذہنوں پر مرتب ہوئے ہوں گے ان پر شاید غور نہیں کیا گیا۔ یہ جو آج ایک عام عالمگیرین ایک عالمگیر رکھتا ہے، بے تعصبی سے،فراخدلی سے سب سے ملتا ہے اس کی تہہ میں وہ تربیت بھی ہے جو کالج میں ہمیں ملی۔

میجر جاوید مجتبیٰ

(کالج نمبر 2984، زمانہ تعلیم 1966-1969ء)

بہت سے اولڈ بوائز کی طرح میرا تاثر بھی یہی ہے کہ راشد صاحب نے کالج میں جو کچھ contribute کیا بحیثیت استاد، ہاؤس ماسٹر یا بحیثیت کالج کے مورخ و مصنف، اس کا کریڈٹ بڑی حد تک آنٹی کو جاتا ہے۔ انہوں نے راشد صاحب کو نہ صرف گھر کی ذمہ داریوں سے بےفکر رکھا، بلکہ ان کے مشن کو ذہنی و علمی طور پر قبول کیا اور اسکو آگے بڑھانے میں ان سے بھرپور تعاون کیا۔ اس تعاون کی ایک صورت یہ تھی کہ کہ وہ اولڈ بوائز کو اپنے بچوں کی طرح چاہتی تھیں اور اس طرح خاطر تواضع کرتی تھیں کہ کوئی اپنے قریبی عزیزوں کا بھی اتنا خیال نہ کرتا ہوگا۔

کیپٹن احسان الحق

(کالج نمبر 3637 زمانہ تعلیم 1974-1979ء)

یہ واقعہ کالج میں میرے پہلے سال کا ہے جب میں شیر شاہ ہاؤس میں تھا۔ ہاکی کی گول کیپنگ کرتے ہوئے گیند میرے منہ پر لگی۔ ہونٹ زخمی ہوئے، ہسپتال لایا گیا، کچھ دوا وغیرہ لگائی گئی۔ چونکہ چوٹ زیادہ نہ تھی، دو دن کا آرام اور اسپیشل ڈائٹ لکھ کر ڈاکٹر صاحب نے ہاؤس بھیج دیا۔ جب آنٹی کو پتہ چلا، پہلے تو مجھے کیانی ڈارم میں دیکھنے آئیں، پھر دو دن تک دودھ، چاول، دلیہ، لائٹ ڈائٹ اور دہی وغیرہ مجھے دیتی رہیں۔ کھانے کے وقت میں ان کا مہمان ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ اس سال غالباً 21 مئی کو انکے چھوٹے بیٹے آصف کی سالگرہ پر بھی ہم سب کو آنٹی نے چائے پر بلایا۔

مرزا اعجاز بیگ

(کالج نمبر 3662 زمانہ تعلیم 1974-1979ء)

یوں تو کالج میں پانچ برس گزارے اور بہت اچھے گزارے لیکن 20 اپریل 1974ء کی پہلی رات

بہت بھاری گزری تھی۔ رات کے فنکشن کے بعد لائٹس آؤٹ کی سیٹی بجتے ہی بتیاں بھی یک دم گل کر دی گئیں۔ یہ بھی نیا تجربہ تھا۔ سیٹی پر سو جاؤ۔ لیکن آنکھوں میں نیند کہاں۔ یوں تو سب ہی ہوم سک تھے لیکن مسعود ستار اور میرا برا حال تھا۔ کمرے (بعد میں جسے ڈارم کہنے لگے تھے) کے مختلف گوشوں سے سسکیوں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ میرا بیڈ چونکہ دروازہ کے ساتھ تھا اور باہر کی روشنی میں دھندلا دھندلا کچھ نظر بھی آ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سر راشد کی بیگم (جنہیں ہم آنٹی کہتے تھے) جنہیں ہم فنکشن پر دیکھ چکے تھے، ہر کمرے میں جا کر بچوں سے کچھ باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے مسعود کو خبردار کیا کہ ہاؤس ماسٹر صاحب کی بیگم ہماری ڈارم میں بھی آئیں گی۔ ان سے کہیں گے کہ ہمیں گھر بھجوا دیں، ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ جیسا کہ توقع تھی آنٹی ہماری ڈارم میں بھی آئیں۔ لائٹ آن کی تو سب لڑکے جو حکماً بستروں میں دبکے ہوئے تھے ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت آنٹی کی موجودگی ہمارے لئے کتنی طمانیت کا باعث بنی تھی۔ ان کا پہلا سوال یہ تھا میرے بچو تم سوئے نہیں۔ کیا امی یاد آ رہی ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہمارے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ مسعود اور میں تو آنٹی کو لپٹ ہی گئے ہمیں یہاں نہیں رہنا۔ آنٹی نے باقیوں کو تسلی دے کر بستروں میں لٹایا اور ہمیں لے کر باہر آ گئیں۔ پھر مجھ سے بہت راز داری سے پوچھا ''تم اپنی امی کیساتھ سوتے تھے نا''۔ میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ''ہاں''۔ انہوں نے اپنی ساڑھی کے پلو سے میرے آنسو پونچھے۔ مجھے گلے لگایا پیار کیا۔ ''کوئی بات نہیں، میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ تم میرے ساتھ سو جانا لیکن بیٹے ذرا ہمت کرو تمہیں فوجی بننا ہے''۔ وہ مجھے پیار سے سمجھا رہی تھیں۔ اتنے میں مسعود ستار جو مجھ سے زیادہ سمجھ دار نکلا ایک دم بول اٹھا ''اعجاز آنٹی کو چھوڑ دے۔ انکو دوسرے کمروں میں بھی جانا ہے۔ وہاں بھی ہماری طرح کوئی انتظار کر رہا ہوگا''۔ میں اس لمحہ اس رات کو پوری زندگی نہیں بھول سکتا۔

کیپٹن جمیل سرور

(کالج نمبر 3744 زمانہ تعلیم 1978-1975ء)

1975ء میں، میں شیر شاہ ہاؤس میں راشد صاحب کے گھر کے ساتھ کی ڈارم حق نواز کیانی شہید ڈارم میں تھا۔ اس ڈارم کے بائیں طرف سر، کا پھلوں کا باغ تھا۔ انار۔ لوکاٹ، امرود، آم کے علاوہ پپیتے کے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ جو گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے اور بعد میں بڑے خربوزے اور چھوٹے تربوز کے برابر پپیتوں سے لدے ہوتے تھے۔ روایت چلی آ رہی تھی کہ ان پپیتوں پر رات کو ہاتھ صاف کیا جاتا تھا اور یہ بھی روایت تھی کہ سر درگزر کرتے تھے۔ میری انٹری کے لڑکے اسی حیص بیص میں تھے کہ روایت

کو قائم رکھیں یا توڑیں کہ ایک روز آنٹی ایک بہت بڑی قاب میں پپیتے کی قاشیں کاٹ کے لائیں اور مسکرا کر کہا ''تم بچوں نے بہت صبر کیا ہے۔ یہ تمہارا حصہ ہے۔ یوں تو خود توڑ کر کھانے میں بھی کچھ حرج نہیں کہ گھر میں بچے ایسا کرتے ہیں لیکن رات کو کود پھاند کرنے میں چوٹ لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور پھل ضائع بہت ہوتا ہے'' اس طرح آنٹی نے دو تین بار پپیتے کاٹ کر بھیجے اور ایک دو بار امرود اور لوکاٹ بھی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہاؤس کیپٹن نے پورے ہاؤس کو کسی بات پر دیر تک رگیڈ کیا۔ آنٹی کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں، باہر آ کر اسے منع کیا اور لڑکوں کی جان چھڑائی۔ میں ایک بار سی ایچ میں بیمار پڑا تھا۔ اسپیشل ڈائٹ میں ڈاکٹر صاحب نے دودھ چاول لکھے تھے جو میس سیکرٹری بھجوانا بھول گیا تھا۔ راشد صاحب نے گھر چٹ لکھی اور آنٹی نے فوراً دودھ میں پورج بنا کر بھجوایا۔ شیر شاہ ہاؤس کی جو عظیم روایت تھی اسکو آنٹی کے بغیر سوچا بھی نہیں جا سکتا۔

کیپٹن شجاعت علی قاضی

(کالج نمبر 3897، زمانہ تعلیم 1976-1981ء)

یہ واقعہ ستمبر 1976ء کا ہے۔ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد گھر سے آنے پر ایک بار پھر مجھ پر Home Sickness کا دورہ پڑا ہوا تھا اور ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ بیمار پڑ گیا۔ سی ایم ایچ والوں نے بیماری کو ڈاجنگ سمجھا اور صبح سویرے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا۔ دو دن سے کھانا پینا بھی چھوٹا ہوا تھا۔ ایک تو نہ کھانے کی کمزوری اوپر سے بے بسی کا ڈیپریشن۔ میں مایوس سا احمد ضیا ڈارم میں اپنے بستر پر خاموش بیٹھا سسکیاں بھر رہا تھا کہ ٹھیک اس وقت آنٹی ڈارم کا دروازہ کھول کر اندر آ گئیں۔ ''کیوں کیا بات ہے شجاعت اس طرح کیوں پڑے ہو؟'' ان کا یہ پوچھنا تھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ انہوں نے مزید پوچھا ''ہسپتال سے کب آئے۔ ناشتہ کیا ہے؟'' میں چپ رہا۔ وہ سمجھ گئیں کہ ناشتہ نہیں کیا۔ گھر گئیں اور چائے تیار کر کے لائیں اور چائے کے ساتھ رس کیک کے دو ٹکڑے بھی تھے۔ وہ مجھے انہوں نے اپنے ہاتھ سے کھلائے۔ پھر شاید مجھے بہلانے کے لئے میرے بھائی تیمور کی باتیں کرنے لگیں۔ یہ واقعہ میری زندگی کے ناقابل فراموش واقعات میں سے ہے۔ اس نے مختلف انداز سے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

ڈاکٹر زاہد نوید احمد

(کالج نمبر 3901، زمانہ تعلیم 1976-1979ء)

میں شیر شاہ ہاؤس کی کیانی شہید ڈارم میں رات کی پریپ کر رہا تھا۔ ایک تو ہوم سک نس، اوپر سے

ہلکا سا بخار، اس خیال سے دل بھر آیا کہ اگر میری امی ہوتیں تو شاید اس قید خانے میں مجھے نہ دھکیلتیں اور میں سسکیوں سے رونے لگا۔ میں خود ڈارم کیپٹن تھا، دوسرے لڑکے چپکے چپکے میرے ڈیسک پر آتے اور تسلی دے کر چلے جاتے۔ (پریپ کا وقت تھا) ٹھیک اسی لمحے جب میں ماں کے تصور میں غرق تھا، آنٹی برآمدہ میں اپنے چھوٹے بیٹے آصف کے ساتھ نمودار ہوئیں۔ میں چونکہ سر ڈیسک پر رکھے سسکیاں لے رہا تھا۔ وہ فوراً اندر آئیں، ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا ''تمہیں تو بخار ہے، سک رپورٹ جاؤ''۔ لڑکوں نے انہیں بتایا کہ یہ خود ہی سک رپورٹ نہیں جا رہا۔ انہوں نے زبردستی مجھے اسپتال بھیجا اور میرے جانے تک وہیں میرے بستر پر بیٹھی رہیں۔ میں ہسپتال چلا تو گیا لیکن جو دل میں حسرت آئی تھی وہ پوری ہو گئی۔

دوسرے تیسرے روز وہ پھر سامنے سے گزریں تو مجھے باتیں کرتے دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے پوچھا'' کیسے ہو؟''۔ اپنی ماں سے بہت کم عمری میں محروم ہوا تھا۔ انکی کوئی یاد ذہن میں نہیں۔ جب اِس ماں کے مرنے کی خبر سنی تو دل بہت اداس ہوا۔ جو محبت کرے وہی اپنا ہوتا ہے۔

کیپٹن عتیق الرحمان

(کالج نمبر 3904، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

1976ء میں شیر شاہ ہاؤس سے کالج کی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جاتے ہی بیمار ہوا، میرا خیال ہے شدید home sickness کی وجہ سے اعصابی دباؤ تھا۔ نیم بے ہوش سا ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ راشد صاحب اس وقت کوئی کانفرنس اٹینڈ کر رہے تھے۔ آنٹی کو خبر ہوئی تو صاحب زاد گل ڈارم میں آئیں۔ کچھ دیر میرے پاس بیٹھیں اور ماں کی طرح میرے ہاتھ سہلاتی رہیں۔ پھر اٹھوا کر گھر لے گئیں۔ بڑی باجی سے دودھ گرم کروا کر منگوایا اور اپنے ہاتھ سے پلوایا۔ کچھ دیر میں کچھ ٹھیک ہوا تو ہسپتال بھجوا دیا۔ ہسپتال سے اسپیشل ڈائٹ منظور ہوئی یعنی دودھ چاول۔ وہ بھی انہوں نے پہلے وقت اپنے گھر سے بنوا کر بھیجی۔ شیر شاہ ہاؤس ہمارا ایک دوسرا گھر تھا۔ اور آنٹی ماں!

کیپٹن علی طاہر سید

(کالج نمبر 3962، زمانہ تعلیم 1979-1976ء)

شیر شاہ ہاؤس کا وہ مخصوص ماحول دینے میں جو آج بھی ہمیں یاد آتا ہے، آنٹی کا بڑا حصہ تھا۔ جب 1976ء میں ہم آئے تو ہاؤس میں حضرات کا خیر مقدم راشد صاحب نے کیا۔ خواتین کی خاطر تواضع

اپنے گھر میں آنٹی نے کی۔اس سے ہماری ماؤں کو بہت اطمینان ہوا۔جب سہ پہر کو ہمارے والدین ہم سے رخصت ہونے لگے تو ماں باپ دونوں مطمئن لوٹے۔جس میں بعد کے تجربات سے مسلسل اضافہ ہوتا گیا۔ آنٹی ہمارے پہلے روز کے فنکشن میں ہماری حوصلہ افزائی کے لئے موجود تھیں۔اس روز کے تعارفی فنکشن میں کام صرف اتنا تھا کہ ہر نیا لڑکا آئے، اپنا تعارف کرائے اور اگر اسکا جی چاہے تو وہ لطیفہ، شعر، یا گانا سنائے۔ساٹھ ستر اجنبی لڑکوں اور نئے اساتذہ کے سامنے آکر اتنا کہنا بھی ایک مسئلہ تھا۔ایک آنٹی کی موجودگی نے میری طرح سب کی ڈھارس بندھائی ہوگی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوا تھا کہ جیسے میری ماں سامنے بیٹھی تھی اور میں محفوظ تھا۔

اس زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس میں ہر جمعہ کو بریک فاسٹ کے بعد انٹر ڈارم انسپکشن ہوتا تھا۔جس میں بیسٹ ڈارم اور بیسٹ لاکر کا اعلان ہوتا تھا۔کیانی ڈارم کے نسبتاً چھوٹے بچوں کو آنٹی انسپکشن میں مدد دیتی تھیں۔آڑے وقت میں لڑکے آنٹی سے بٹن بھی ٹانکوا لیتے تھے۔ ہفتے کے کالج انسپکشن کے لئے ایک لڑکے کو قمیض پر استری کرانی تھی، دھوبی کو بھیجنے کا وقت نہ تھا۔اس نے بے تکلفی سے دروازہ پر دستک دی۔آنٹی آئیں تو صاحب زادے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اپنی پرابلم بیان کی۔انہوں نے اسکے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور آن کی آن میں استری کر دی۔ بلکہ آستینوں کے فولڈ بھی بنا دئے۔

آنٹی کی ایک اور بات مجھے یاد آتی ہے۔وہ اکثر ویک اینڈ (weekend) پر ان بچوں کے لئے جنہیں والدین ملنے نہ آتے تھے کچھ نہ کچھ کھانے کے لئے بھیجتی تھیں۔جس سے ہمیں اس سے زیادہ خوشی ہوتی تھی جتنی اپنے والدین کے چیزیں لانے سے ہوتی۔آنٹی کے پائیں باغ میں پپیتے، امرود، اور آم کے پیڑ تھے۔ان میں ہمارا بھی مستقل حصہ تھا۔میرا خیال ہے پپیتے اور امرود انہوں نے کبھی اکیلے نہیں کھائے۔ کچھ شریر لڑکے پپیتوں اور امرودوں کے پکنے کا انتظار نہیں کر پاتے تھے اور صبح و شام ان پر ہاتھ صاف کرتے تھے۔آنٹی ضرور دیکھتی ہوں گی لیکن انہوں نے کبھی شکایت نہیں کی۔آنٹی کے بغیر شیر شاہ ہاؤس کبھی وہ نہ ہوتا جو وہ تھا۔

کیپٹن طارق محمود

(کالج نمبر 4089، زمانہ تعلیم 1984-1978ء)

اس روز 18 مئی 1978ء کو میں آٹھویں درجہ میں کالج میں داخل ہوا تھا۔شیر شاہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں راشد صاحب نے ہمارا خیر مقدم کیا۔مہمان خواتین کو آنٹی اپنے ہاں خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔آنٹی

سے ملکر میری والدہ کی طرح دوسری خواتین بھی بہت خوش اور مطمئن ہوئیں اور وہ جو ماؤں کے دل میں بچوں کو اجنبی ماحول میں چھوڑنے کا وسوسہ ہوتا ہے وہ جاتا رہا۔شام کو کھانے پر آنٹی سر کے ساتھ میس آئیں۔ ٹھیک اس وقت ہم اپنے گھروں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔انکو وہاں دیکھ کر ماحول کی اجنبیت دور ہوئی۔اس رات ہاؤس میں جو تعارفی فنکشن ہوا۔اس میں وہ موجود رہیں اور مہمان خصوصی کے طور پر انہوں نے نئے لڑکوں میں انعامات تقسیم کیئے۔ان کی موجودگی سے ہاؤس میں ایڈجسٹ ہونے میں ہمیں لاشعوری طور پر مدد ملی۔شیر شاہ ہاؤس کا جو گھریلو ماحول تھا وہ بڑی حد تک آنٹی کی وجہ سے تھا۔

یوسف عالمگیرین

(کالج نمبر 4319،زمانہ تعلیم 1983-1980ء)

یہ 1983ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔راشد صاحب اور طارق صاحب آفیسرز میس میں کوئی فنکشن اٹنڈ کرنے گئے ہوئے تھے۔ہم لوگ میٹرک کی تیاری کر رہے تھے اسلئے دیر تک پڑھتے رہتے تھے۔اس رات دس بجے ملکی و غیر ملکی پہلوانوں کی ریسلنگ کے مقابلے ٹی وی پر دکھائے جا رہے تھے۔ہم دیکھنا چاہتے تھے، چونکہ دونوں ہاؤس ماسٹرز موجود نہیں تھے اسلئے سوچا کہ آنٹی سے اجازت لی جائے۔چنانچہ میں، احمد علوی، حماد لکھمن، ارشد جاوید اور طارق حمید ایک مضبوط وفد کی صورت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ہم نے' آنٹی'،' امی' کہہ کر ہر حربہ استعمال کیا لیکن انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ وہ اجازت دینے کی مجاز نہیں۔دوسرے اس بات پر زور دیا کہ یہ جو تم لوگوں کو لائٹس آوٹ کے بعد بھی پڑھنے کی اجازت ملی ہے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔اگر ریسلنگ دیکھنا اتنا ضروری ہے تو سارے ہاؤس کو دیکھنا چاہیئے۔جاؤ وہ سامنے آفیسرز میس ہے، وہاں کمانڈانٹ بھی موجود ہیں۔ضروری ہوا تو ہاؤس ماسٹر ان سے بات کر لیں گے وغیرہ وغیرہ۔چند منٹ بحث جاری رہی۔آخر کار ہم مایوس لوٹے۔کسی نے کہا آنٹی کے پاس دلائل تو راشد صاحب سے بھی زیادہ ہیں۔یہ واقعہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آنٹی مہربان بہت تھیں لیکن اپنے دائرہ میں۔آج میرا خیال ہے کہ وہ مثالی ماں تھیں کہ بوقت ضرورت ڈسپلن کا خیال بھی رکھتی تھیں۔

جی سی محمد زبیر

(کالج نمبر 4404،زمانہ تعلیم 1984-1981ء)

میں نے 28 اپریل 1981ء کو شیر شاہ ہاؤس میں قدم رکھا تھا۔اسی رات تعارفی تقریب ہوئی تھی جس میں سب نئے کیڈٹس نے باری باری روسٹرم پر آ کر اپنا تعارف کرایا اور کوئی ایک آئیٹم (لطیفہ، شعر،

گیت،نعت یا تلاوت) پیش کیا۔اس فنکشن میں آنٹی بھی موجود تھیں اورانہوں نے انعامات تقسیم کئے تھے۔
ان کی شخصیت کا جو اصل اور گہرا تعارف اسی رات ہوا، وہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے۔ ہوا یہ کہ ہاؤس کے حجام نے سارے ہاؤس کے نئے لڑکوں کے بال سہ پہر کو کاٹنے شروع کئے اور جب شام ہوگئی تو دو اور حجام بلوائے گئے جنہوں نے اکرم شہید ڈارم میں بال کاٹنے شروع کئے۔فنکشن کے بعد بال ایک طرف سمیٹ کر وہاں دو بیڈ بچھوا دیئے گئے جن میں سے ایک میرا تھا دوسرا طارق کا۔ جب ہم اس کمرے میں آئے اور پنکھا آن کیا تو پنکھے کی تیز ہوا سے بال اڑنا شروع ہو گئے اور پھر تو بالوں کے ایسے مرغولے بنے کہ ہم چیخ کر باہر آ گئے۔اس وقت تک ہاؤس کے دفتر میں سر راشد موجود تھے۔انہوں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا ہوا۔ ہم نے بتایا تو پہلے انہوں نے پنکھا بند کیا پھر گھر گئے، کچھ دیر کے بعد آنٹی آئیں۔ جھاڑو ان کے ہاتھ میں تھی۔انہوں نے اسی وقت رات کے گیارہ بجے ہماری ڈارم کو صاف کیا، سارے بال جمع کئے اور انہیں ایک اخبار میں رکھ کر اندر لے گئیں۔ یہ کام صرف کوئی ماں ہی اپنے بچوں کے لئے کر سکتی تھی۔

یہ آنٹی کی شخصیت سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔اس واقعہ نے ہماری آدھی ہوم sickness ختم کر دی۔ ہاؤس کی اجنبیت آن واحد میں ختم ہوگئی۔ مجھے تو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں اپنے گھر میں ہوں۔

جس طرح بچے اپنا دکھ سکھ پہلے ماں سے بیان کرتے ہیں اور چین کی نیند سوتے ہیں، اسی طرح ہمارے لئے آنٹی تھیں۔آنٹی کیانی ڈارم کے نسبتاً چھوٹے لڑکوں کا خاص طور سے خیال رکھتی تھیں اور گلا خراب ہو جائے یا نزلہ ہو جائے تو اکثر خود ہی غراروں کے لئے گرم پانی کا انتظام کرتی تھیں۔ایک بار مغرب کے بعد ہاؤس پریفیکٹ سعید نے چند لڑکوں کو ریگ کرنا شروع کیا۔اتنے سائڈ رول اور فرنٹ رول دیئے کہ میرا برا حال ہو گیا۔ یہ دیکھ کر کیانی ڈارم کا وسیم سر کے گھر گیا اور یوں ہی بہانہ کیا کہ ایک لڑکے کی طبیعت خراب ہے اسے آ کر دیکھیں۔ وہ باہر نکلیں تو سزا کا منظر دیکھا۔ وہ الٹے پاؤں اندر گئیں۔سر راشد کو باہر بھیجا۔ انہوں نے سزا بند کروائی۔لڑکوں کا برا حال تھا۔آنٹی ان کو لے کر اندر گئیں، گرم پانی سے منہ ہاتھ دھلوایا اور چائے پلائی اور ہمارے سامنے راشد صاحب سے شکایت کی کہ یہ سزا نہیں ظلم ہے۔آپ اپنے پریفکٹس کو ذرا کھینچیں۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ آنٹی کو ہماری سزا سے بہت تکلیف ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ہم کیانیز(Kiyanies) (کیانی شہید ڈوم سب سے چھوٹے بچوں کی ڈوم تھی) پپیتوں، امرودوں، لوکاٹ، شہتوتوں سے خاطر تواضع کرتی رہتی تھیں۔ شیر شاہ ہاؤس جو اتنا یاد آتا ہے اسکی ایک وجہ آنٹی بھی ہیں۔ان سے میری امی اور چچی کی بھی ملاقات ہوئی تھی۔انکے انتقال پر ہمارے گھر میں باقاعدہ سوگ منایا گیا۔اب شیر شاہ ہاؤس کے ذکر کے ساتھ انہیں بھی یاد کیا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

لیفٹیننٹ ذکاالحسن

(کالج نمبر 4413، زمانہ تعلیم 1984-1981ء)

یہ جنوری 82ء کا واقعہ ہے کہ بہت سے لڑکوں کے گلے خراب ہو گئے۔ آنٹی کو بتایا گیا تو وہ لائٹس آؤٹ کے وقت اندر سے پانی گرم کر کے لائیں اور جگ میں ڈال کے غرارے کروائے۔ کچھ لڑکوں کو تو جیسے کھیل ہاتھ آ گیا۔ دو چار دن تک اچھی خاصی لمبی قطار بننے لگی۔ لیکن آفریں ہے آنٹی پر کہ سب کو بڑے پیار سے غرارے کرواتیں اور ساتھ ہی احتیاطیں بھی بتاتی جاتیں۔ یہ نہ کھانا، یہ پانی نہ پینا۔ ان کے ہونے سے ہاؤس ہمیں اجنبی محسوس نہیں ہوا۔ ایک آدھ بار انہوں نے پریفکٹس سے بھی ہماری جان چھڑوائی۔

لیفٹیننٹ سہیل فاروق

(کالج نمبر 4521، زمانہ تعلیم 1987-1982ء)

اپریل 1982ء میں جب میں کالج میں داخل ہونے آیا تو میرے ابا امی میرے ساتھ تھے۔ شیر شاہ ہاؤس کے گیٹ پر جولڑکے ہمارا استقبال کر رہے تھے وہ مجھے اور میرے ابا کو شیر شاہ ہاؤس کے کورٹ یارڈ میں لے آئے اور میری امی کو سامنے راشد صاحب کے گھر کی طرف جانے کا اشارہ کیا جہاں آنٹی نئے طلباء کی ماؤں اور بہنوں کا استقبال کر رہی تھیں۔

پھر شام کے روایتی تعارفی فنکشن پر بھی آنٹی موجود تھیں۔ فنکشن کے بعد انہوں نے نو واردوں میں ٹافیاں اور سوئٹس تقسیم کیں۔ مجھے ان کے ہاتھ سے لی ہوئی سوئٹس اور زیادہ میٹھی اسلئے محسوس ہوئیں کہ ان کے دینے میں خاموش پیغام تھا۔ ''میرے بچے گھبرانا مت میں جو ماں ہوں''۔ مجھے امید ہے کہ میری طرح سب پریشان خاطر نئے بچوں نے انکی مامتا کا یہ خاموش پیغام سنا ہوگا۔ نئے داخل شدہ بیشتر بچے نوگرفتار پرندوں کی طرح ہوتے ہیں، اس لمحے انہیں ذہنی سکون کی اور احساس تحفظ کی جتنی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایک روز میں شیر شاہ ہاؤس کی افتخار شہید ڈارم میں قمیض کا بٹن ٹانک رہا تھا اور سوئی ٹوٹ جانے کی وجہ سے پریشان تھا کہ حسن اتفاق سے ٹھیک اس وقت آنٹی ڈارم میں داخل ہوئیں اور مجھے بٹن ٹانکنے کی ادھیڑ بن میں دیکھ کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے بتایا کہ سوئی کا ناکا ٹوٹ گیا ہے۔ انہوں نے قمیض مجھ سے لے لی اور کچھ دیر بعد نہ صرف بٹن ٹانک کر بلکہ استری بھی کر کے مجھے بھجوادی۔

1982ء کی سردیوں میں مَیں نے اکثر دیکھا کہ لاسٹ پریپ ہونے کے بعد وہ ایک جگ میں گرم پانی اور نمک کی شیشی لا کر بنچ پر رکھ دیتی تھیں اور جن لڑکوں کے گلے خراب ہوتے تھے وہ انہیں غرارے

کرواتی تھیں۔

راشد صاحب اور آنٹی لائٹس آوٹ کے بعد اکثر ہاؤس کے صحن میں ٹہلا کرتے تھے۔سرکلر روڈ کے کنارے سے شروع ہو کر ہاؤس کے بیچ کے کاریڈور کا چکر لگاتے تھے۔اس میں غالباً ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ دیکھیں کہ سب بچے وقت پر آرام سے سو گئے یا نہیں۔ایک رات میں لائٹس آوٹ کے بعد دیر تک کھانستا رہا۔ راشد صاحب نے مجھے باہر بلایا اور آنٹی نے مجھے ایک دوا (غالباً ملیٹھی) لا کر دی کہ اسکو چوستا رہوں۔ اسطرح کی بیسیوں باتیں ہیں۔میری والدہ بھی انہیں بہت یاد کرتی ہیں۔شیر شاہ ہاؤس جو ہمیں اتنا یاد آتا ہے اس میں اس لاشعوری طور پر سکون کا بھی حصہ ہے جو آنٹی کی وجہ سے ہمیں وہاں میسر تھا۔

محمد عبدالطیف عباسی
(استاد ملٹری کالج)

1970ء میں، میں چند سال راشد صاحب کے ساتھ شیر شاہ ہاؤس سے وابستہ رہا۔شیر شاہ ہاؤس میں صرف آٹھویں درجے کے لڑکے ہوتے تھے۔رات کو کھانے اور پریپ کی ڈیوٹی پر ہفتہ میں ایک دو بار جاتا تھا۔راشد صاحب تو حسب عادت ہاؤس آفس میں بیٹھے کام کرتے رہتے۔میں ڈیوٹی آفیسر کے طور پر ڈارمز کا چکر لگاتا رہتا۔اسی طرح نگرانی کے دوران میں نے دیکھا کہ کیانی ڈارم میں ایک لڑکا سر کے درد سے کراہ رہا ہے۔اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا اس لڑکے نے کہا آنٹی کو بلاؤ۔چنانچہ آنٹی کو بلایا گیا۔ان کے آنے پر میں برآمدہ میں آ گیا۔پہلی بات جو میں نے نوٹ کی کہ انہوں نے اس لڑکے کو نام سے پکارا، غالبا یونس نام تھا اس کا، جس سے اندازہ ہوا کہ وہ ڈارم کے لڑکوں کو جانتی تھیں۔پھر وہ اس کو بیڈ پر لٹا کر اس سے باتیں کرنے لگیں اور ہاتھ سے سر دبانے لگیں۔وہ ان کے ساتھ اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے بیٹا ماں سے باتیں کرتا ہے۔کچھ دیر کے بعد میں دوسرے چکر میں ڈارم کے سامنے سے گزرا تو جو منظر میں نے دیکھا وہ میری زندگی کے روشن لمحوں میں سے ہے۔وہ بچہ ان کے زانو پر سر رکھے سو رہا تھا اور وہ ماں جن کا ہاتھ اس بچہ کے سر پر تھا۔

میرے بیٹے نئیر نے جو بعد میں شیر شاہ ہاؤس میں رہا، بتایا کہ آنٹی کیانی اور علم الدین ڈارمز میں اکثر آتی جاتی تھیں۔بٹن ٹانکنا ہو، ایمرجنسی میں استری کرنا ہو یا کوئی تکلیف ہو تو وہ خود دیکھ بھال کرتی تھیں۔کالج اسپتال میں دیکھنے آتی تھیں۔ان کے گھر کے پیچھے امرودوں اور پپیتوں کا باغ تھا اس کے پپیتے اور امرود وہ اکثر بچوں کو کھلاتی تھیں۔اس زمانہ میں شیر شاہ ہاؤس میں ہفتہ میں دو دن بدھ اور جمعہ کی رات دوسرے پریپ میں فنکشن ہوتا تھا۔وہ اس میں پابندی سے شرکت کرتی تھیں۔بچوں کی ماؤں

سے بھی مسلسل ملتی رہتی تھیں۔

میں پچیس سال سے ملٹری کالج میں ہوں۔ ملک کے دوسرے بڑے کیڈٹ کالجوں، پبلک اسکولوں سے بھی تھوڑا بہت رابطہ ہے، میرا خیال نہیں کہ یہاں یا کسی اور پبلک اسکول میں کسی ہاؤس ماسٹر کی بیگم نے اس طرح ہاؤس کی تربیت اور تعلیم میں حصہ لیا ہو۔ جس طرح مسز راشد نے لیا۔ یہ ایک یکتا اور unique کردار تھا جو انہوں نے اس کالج کی تاریخ میں ادا کیا، یہ اعزاز شاید کسی اور کو حاصل نہیں رہا۔ ہاؤس ماسٹر یا اسٹاف کا کوئی اور رکن خواہ کیڈٹس کے لئے کتنا کچھ کرے، وہ بڑی حد تک اس کی ڈیوٹی میں شمار ہوگا اور ہوتا ہے۔ اور اس کی ایک limitation ہوتی ہے۔ 12 یا 13 برس کے بچہ میں خاص طور سے مامتا کی جو پیاس ہوتی ہے، وہ جو emotional security چاہتا ہے، جو جذباتی سکون چاہتا ہے وہ سب کی نہیں تو اس عمر کے بیشتر لڑکوں کی ایک نفسیاتی ضرورت ہوتی ہے۔ اس صورت میں ایک اختیار شدہ مادر مہربان (Foster mother) کی موجودگی ایک بہت بڑی کمی اور محرومی کو پورا کرتی ہے۔ شیر شاہ ہاؤس جب جونیئر ہاؤس تھا (87-1967ء) وہاں لڑکوں کو یہ ضروری جذباتی ذہنی تحفظ ملا۔ اس میں راشد صاحب سے بہت زیادہ ان کی بیگم کا ہاتھ تھا۔ میرا بیٹا جو 87-1967ء تک کے عرصے میں شیر شاہ ہاؤس میں آٹھویں درجہ کے کیڈٹ کی حیثیت سے رہا ہے۔ اس کی زندگی میں یہ ایک سال کئی اعتبار سے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے بیٹے نیرّ (اب کیپٹن نیر عباسی) نے مجھے بتایا کہ آنٹی اکثر جاڑوں میں جن لڑکوں کا گلہ خراب ہوتا ان کے لئے دس ساڑھے دس بجے رات پانی گرم کر کے انہیں غرارے کرواتی تھیں۔ کیانی ڈارم چونکہ ان کے گھر کے بالکل ساتھ تھی، ان کی خاطر تواضع زیادہ ہوتی تھی اور وہ چھوٹے بھی بہت زیادہ تھے۔ میں یہاں یہ عرض بھی کرتا چلوں کہ زندگی میں، وہ بھی ابتدائی زندگی میں، بے لوث محبت، شفقت و مروت کا رویہ زندگی کو بہت گہرائی میں جا کر متاثر کرتا ہے بلکہ اسکے اثرات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ شیر شاہ ہاؤس کے لڑکے خصوصاً وہ جوان کی محبت وشفقت سے براہ راست مستفیض ہوئے، ان کی زندگی میں مروت و دردمندی کا رویہ ایک مستقل عنصر (behavioural pattern) کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ تبدیلی میں نے خود اپنے بیٹے میں محسوس کی اور دیکھی۔ زندگی کے خوشگوار تجربات (اور ناخوشگوار بھی) لاشعور میں جذب ہو کر بہت دور رس اثرات رکھتے ہیں۔ شیر شاہ ہاؤس کے بچوں میں عام طور پر جو شائستگی، نفاست، دردمندی، انسان دوستی اور وطن دوستی پائی جاتی ہے اس میں راشد صاحب کے ساتھ ساتھ مسز راشد کا اثر بھی ہے۔

اب میں چند باتیں اپنے ذاتی تعلقات اور مشاہدات کے حوالے سے بھی کہوں گا۔ یہ اس زمانے

کی بات ہے جب میری بڑی بیٹی چھوٹی سی تھی اور ہم لوگ پرانی سائنس لیب کے پیچھے ان اسٹاف کوارٹرز میں رہتے تھے جو اب شکستہ حالت میں ہیں اور عنقریب گرائے جانے والے ہیں۔ میرے کوارٹر کے دائیں طرف اس وقت کے مولوی صاحب رہتے تھے۔ کوئی آٹھ نو بجے رات کا وقت ہوگا، وہ سال سوا سال کی بچی یکا یک چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ان دنوں میری والدہ بھی میرے پاس نہ تھیں۔ میں اور میری بیوی حیران و پریشان کہ کیا کریں۔ قریب کے مولوی صاحب کو بلایا۔ انہوں نے جن بھوت یا سایہ کا تعویز کیا۔ ان کا تعویز گنڈا بھی کیا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ میں باہر نکلا کہ اسپتال لے جاؤں یا کچھ اور کروں۔ سامنے محمد دین چوکیدار کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس سے کہا تم راشد صاحب کے ہاں جاؤ اور ان کی بیگم صاحبہ سے کہو کہ میری بچی کو تکلیف ہے، آ کر دیکھ لیں۔ کوئی پانچ منٹ بعد وہ آ گئیں۔ آتے ہی کہا بچی کے کان میں یا پیٹ میں درد ہے۔ پہلے تو کوئی تیل گرم کر کے بچی کے کان میں ڈالا۔ پھر بچی کو گود میں لٹا کر اس کے پیٹ کو خاص انداز سے سہلایا۔ اجوائن کے ساتھ کوئی اور چیز ملا کر اس کا پانی پلایا۔ دیکھتے دیکھتے بچی ان کی گود میں سو گئی۔ اب میری مسز ان کو جانے نہ دیں۔ بھابھی آپ ٹھہریں۔ پھر بچی جاگ جائے گی رونے نہ لگے۔ مختصر یہ کہ وہ اور گھنٹہ سوا گھنٹہ ہمارے یہاں ٹھہریں۔ دوسرے دن پھر پوچھنے آئیں۔

انہوں نے میری بیوی کو بہن بنایا ہوا تھا اور اس رشتہ اور تعلق کو انہوں نے تا زندگی نبھایا اور کس طرح نبھایا یہ بھی ایک داستان ہے۔ اس کی تفصیل میں جائے بغیر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ زندگی میں ان کا عام رویہ کیا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں پھلوں کے بہت سے درخت تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں چند پیڑ پپیتے۔ امرود، لوکاٹ وغیرہ کے انہوں نے پرندوں کے لئے وقف کر رکھے تھے۔ شہد کی مکھیوں کے لئے چلچلاتی دھوپ میں، خود جا کر باہر کا نلکا آدھا کھول آتیں تھیں اور نیچے چھوٹا سا ٹب رکھ دیتی تھیں۔ یہ خاطر شہد کی مکھیوں کی تھی جو وہاں آتی تھیں۔ کوئل وغیرہ چند پرندے ان کے مستقل مہمان تھے۔ کالج کے گیٹ پر جو چوکیدار متعین ہوتا وہ خاص خاص کھانوں اور باہر سے آئے پھلوں مٹھائیوں میں اسکا مستقل حصہ تھا۔ چوکیدار رفیق نے مجھے بتایا کہ رمضان میں ان کے یہاں سے افطاری کی ٹرے آتی تھی۔ جس زمانہ میں انہوں نے گولڈن بف مرغیاں پالی ہوئی تھیں، ان کے قیمتی انڈے وہ تقسیم کرتی رہتی تھیں۔ برسات میں پپیتے کی نرسری تیار کروا کے پنیری بانٹتی رہتی تھیں۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شیر شاہ ہاؤس کے کیڈٹس کے ذریعہ (چونکہ سارے نئے کیڈٹس شروع کا ایک سال یہاں گزارتے تھے) پورے کالج کی تربیت میں اس عظیم خاتون کا حصہ تھا۔ آخر میں، میں اپنا یقین بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ راشد صاحب نے جو کچھ ہاؤس میں، کلاس روم میں یا تصنیف و تالیف کی صورت میں

کالج کو دیا اس کا کریڈٹ بھی بڑی حد تک بیگم راشد کو جاتا ہے۔ دوطرح سے ایک تو وہ براہ راست ان کی شریک کار تھیں پھر رفیق کار بھی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے انکو گھر کی تمام ذمہ داریوں سے جس میں بچوں کی تعلیم بھی شامل تھی تقریبا آزاد اور بے نیاز کر دیا تھا۔ ورنہ بہت سے تخلیقی کام کرنے والوں کا ایک اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں گھر سے وہ تعاون نہیں ملتا جس کے بغیر یکسوئی سے کوئی تخلیقی کام کرنا مشکل ہو جاتا۔ میں نے کبھی راشد صاحب کو اپنے بچوں کو پڑھاتے یا ان کے بارے میں تگ ودو کرتے نہیں دیکھا۔ یہ محاذ بھی میری عظیم بہن نے سنبھال رکھا تھا۔ ' مال و دولت، دنیا اور رشتہ و پیوند' سے راشد صاحب کی بے نیازی ان کے لئے بڑی سنگین عملی مشکلات پیدا کر سکتی تھی۔ اگر میری بہن ان کی رفیق زندگی نہ ہوتیں۔ ان کی فراست بار بار راشد صاحب کے آڑے آئی اور ان کی بات مختلف معاملات میں آخر تک بنی رہی وہ بڑی حد تک ان کی بیگم کی وجہ سے تھی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کو یہ منظور تھا کہ کالج کے طلبہ کی ایک خاص انداز اور معیار کی تربیت کے لئے اس نے جہاں خاص خاص بندوں کو یہاں خدمت کے لئے متعین کیا، ان میں ایک خاص اور اہم کردار کے لئے مسز راشد کو منتخب کیا۔ جو خدمت انہوں نے یہاں انجام دی وہ ایک صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری دعا ہے اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ایسی انسانی نعمتوں سے نوازتا رہے۔

پروفیسر طارق محمود چودھری

میں جب 1975ء میں شیر شاہ ہاؤس کا اسسٹنٹ ہاؤس ماسٹر مقرر ہوا اور راشد صاحب کے بالمقابل گھر میں رہائش اختیار کی تو مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ نہ صرف بیگم راشد بہت اچھی پڑوسن ہیں بلکہ ہاؤس کے کام میں راشد صاحب کی معاون بھی ہیں۔ شیر شاہ ہاؤس اس زمانہ میں آٹھویں کے بچوں کا بے بی ہاؤس تھا۔ وہ بچوں کی ماں بنی ہوئی تھیں۔ سب بچے انہیں آنٹی کہتے تھے اور بے تکلف انہیں اپنا دکھ درد بتاتے تھے۔ وقت ناوقت اکثر میں نے انہیں ڈارمیٹریوں میں آتے جاتے دیکھا۔ کسی لڑکے کو کوئی تکلیف ہو جائے تو وہ سب سے پہلے انہیں کو بلاتا تھا۔ پیٹ کے درد کا علاج ''احمرین'' اور سونف سے اور سر کے درد کا علاج بھی اسی قسم کے سفوف سے کرتی تھیں۔ غالباً سب سے بڑا علاج تو ان کا اپنا مادرانہ رویہ تھا۔ جاڑوں میں رات کے دس بجے دوسرے پریپ کے بعد لڑکوں کو نمکین پانی کے غرارے کراتے اکثر دیکھتا۔ وہ ہاؤس کے تمام فنکشن اٹینڈ کرتی تھیں اور لڑکوں کی ماؤں سے ہر جمعہ کو ملتی تھیں۔ راشد صاحب ہمیشہ ہاؤس کے کام میں ڈوبے رہتے تھے۔ یہ بیگم راشد کی ہی ہمت تھی کہ انہوں نے بڑے بیٹے کو انجینئر اور تین بیٹیوں کو ڈاکٹر بنایا۔ میرا خیال ہے کہ بیگم راشد نے جسطرح ہاؤس سے اپنے آپ کو مربوط رکھا وہ کالج کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔

راشد نامہ

پورے چاند کا منظر

کرنل یونس

راشد صاحب کے بارے میں میں اپنی یادیں " چراغوں کی قطار" کے سلسلے میں تقریباً بیس سال پہلے لکھ چکا ہوں لیکن اب آصف کا اصرار ہے کہ سر کی زندگی کے آخری دس سالوں کو بھی chronicle کیا جائے۔ جب میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں تو کالج چھوڑنے کے بعد، 1990ء سے راشد صاحب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

ملٹری کالج کے چالیس سال کی تپسیا اب رنگ لا رہی تھی۔ سونا کندن بن رہا تھا اور راشد صاحب کو وہ exposure اور کام کرنے کے مواقع حاصل ہو رہے تھے جو ملٹری کالج کی مخصوص فضا اور محدود مقاصد کی وجہ سے ممکن نہ تھے۔ آرمی پبلک اسکول جہلم اور منگلا کی سربراہی نے اُن کو وسیع تر دنیا کے مواقع اور مسائل دونوں سے آگاہ کیا اور اُن کو معاشرے کے تمام طبقات کے ساتھ interact کرنے کا موقع ملا۔ ان ہی اداروں میں رہتے ہوئے اساتذہ کی تربیت اور بچوں کے لیے زیادہ ہمہ گیر نصاب تعلیم بلکہ نصابِ تربیت کی اہمیت اور ضرورت کا احساس ابھر کر سامنے آیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جہاں اِن اداروں میں اُن کو کام کرنے کے بے اندازہ مواقع حاصل ہوئے وہیں گوناگوں مسائل کا سامنا بھی رہا لیکن وہ اپنے مخصوص انداز میں بغیر کسی سے الجھے اپنا کام جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔ اس دور کی ملاقاتوں میں، میں نے انہیں بہت excited پایا۔ دراصل یہیں انہوں نے وہ خواب دیکھنا شروع کیے جو اگلے پانچ سال میں 15 کتابوں پر منتج ہوئے۔ بچے کبھی بھی اُن کے لیے اجنبی نہ تھے لیکن اب خود اُن کے بقول اُن کی self کا دائرہ بہت extend ہو چکا تھا اور اگر میں اپنے استاد محترم کا ہی ایک اور جملہ استعمال کروں تو وہ 99 + ہونے کی طرف بڑھ رہے تھے یعنی اپنی commitment میں سو فیصد ہو جانا۔

ان دو اسکولوں میں انہوں نے morning assembly اور دوسرے پروگراموں کے تحت جو تجربات کیے وہ اب ''دیئے کو دیئے سے جلاتے چلو'' "Beacon Light"، "Light a Candle" اور ''روشن راہیں'' وغیرہ کی صورت میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

1994ء میں منگلا چھوڑ کر راولپنڈی آنے کا مقصد ایک وسیع تر کینوس کی تلاش بھی تھا۔ یہ میرے لیے ذاتی طور پر انتہائی خوشی کا باعث تھا کہ اب میں اپنے استاد اور مرشد سے زیادہ براہِ راست فیض یاب ہو

سکوں گا۔ راشد صاحب سے میرا خصوصی تعلق تو ہمیشہ سے تھا لیکن 1994ء سے 1999ء تک کا دور یادگار رہے گا۔ ہفتے میں دو تین ملاقاتیں معمول کی بات تھی اور ٹیلی فون پر تو تقریباً روز ہی بات ہوتی تھی۔ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ راشد صاحب کے پنڈی آنے کا ایک مقصد اپنا ذاتی اسکول کھولنا بھی تھا۔ ''کردار فاؤنڈیشن'' کے بورڈ تک بن چکے تھے اور راشد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں تمام پیپر ورک مکمل کرلیا تھا مگر یہ سب تعلیمی نقطہ نظر سے تھا۔ انتظامی پہلو سے نہیں۔ یہ ایک الگ کہانی ہے کہ وہ اسکول کیوں نہ کھل سکا۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے، شاید اس کی منشا ہی یہی تھی کہ راشد صاحب اپنے ذاتی ادارے تک محدود نہ ہو جائیں اور ان کی محبت اور علم کی روشنی وسیع تر حلقے تک پہنچے۔

مجھے جون 1994ء کا وہ گرم دن اب بھی یاد ہے جب ہم شفا انٹرنیشنل کے CEO ڈاکٹر ظہیر احمد سے ملنے گئے جو 'تعمیر ملت' کے نام سے فلاحی ادارے کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ ظہیر صاحب کو تو راشد صاحب کی صورت میں من کی مراد مل گئی۔ 'تعمیر ملت' کے تحت راشد صاحب نے کردار سازی کے نصاب کو عملی صورت دی اور اپنے نظریات اور تصورات کو تعلیمی اداروں کی مخصوص فضا میں اس طرح ڈھالا کہ پڑھائی کا بنیادی کام متاثر ہوئے بغیر بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ تعمیر کردار کا مقصد بھی پورا ہوتا رہا۔

دو سال میں ہی انہیں 'تعمیر ملت' کا کینوس بھی کچھ محدود محسوس ہونے لگا اور راشد صاحب نے یہ تعلق برقرار رکھتے ہوئے سلطانہ فاؤنڈیشن جوائن کر لینے کا فیصلہ کیا جہاں ڈاکٹر نعیم غنی صاحب نے انہیں زیادہ free hand دیا۔ چار سال میں سلطانہ فاؤنڈیشن کے حوالے سے جس کثرت سے کام کیا وہ حیرت انگیز ہے۔

ان دونوں اداروں نے راشد صاحب کو نوجوانوں اور خاص طور شعبہ تعلیم سے وابستہ افراد سے interact کرنے کے وسیع مواقع فراہم کیے اور انہوں نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا (فائدہ راشد صاحب کا نہیں، سننے والوں کا تھا)۔ موثر speaker تو وہ ہمیشہ سے تھے۔ معلومات کی کمی تو پہلے بھی نہ تھی۔ الفاظ تو یوں بھی اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے لیکن اب تجربے کی آخری آنچ بھی پوری ہو چکی تھی اور محبت کی چاشنی اور خلوص کی گرمی ہر ایک محسوس کرسکتا تھا۔ کراچی سے سکردو تک، مٹھاٹو انہ سے اسلام آباد تک، لاتعداد لوگ اُن کی محبت سے فیض یاب ہوئے۔ یہاں میں محبت کا لفظ دانستہ طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ کیونکہ جب تک بات کرنے والا مکمل involvement کے ساتھ، مکمل خلوص کے ساتھ اظہار خیال نہ کر رہا ہو اُس وقت تک وہ موثر نہیں ہوسکتا۔ میں لاتعداد مواقع کا چشم دید گواہ ہوں کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک لیکچر ہال میں pin drop silence ہوا کرتا تھا۔ ایسا نہیں کہ حاضرین دلچسپی نہ لے

رہے ہوں یا relax نہ ہوں، بلکہ اِس کے برعکس اُن کے سامنے بیٹھے ہوئے افراد گویا اُنکے لیکچر کے بہاؤ میں اُن کے ساتھ ہوتے تھے۔ راشد صاحب کی آواز کی گرم جوشی، اپنے نظریات پر conviction اور اِن سب سے بڑھ کر اُن کا انتہائی دوستانہ down to earth انداز سننے والوں کو mesmerize کر دیتا تھا۔ اور جب وہ اپنے مخصوص انداز میں کوئی نظم سنانے کے بعد Thank you Ladies and Gentlemen کہہ کر لیکچر ختم کرتے تو سحر ٹوٹتا اور اُس کے بعد چائے کا وقت اور پھر اُن کے گاڑی تک جاتے جاتے اُن کے پروانوں کا ہجوم اُن کے اِردگرد رہتا۔ میں ایسے لاتعداد نوجوانوں سے ملا ہوں جنہوں نے شاید ایک آدھ مرتبہ ہی اُن کو سنا ہو مگر جس وارفتگی سے، جس محبت سے بلکہ اکثر اوقات عقیدت سے اُن کا ذکر کیا جاتا ہے وہ میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے کہ جو بات دل سے کہی گئی ہو وہ دل تک ضرور پہنچتی ہے اور اثر کرتی ہے۔

1997ء میں راشد صاحب کو ایک اور ذریعہ ابلاغ میسر آیا جب انہیں ریڈیو اور T.V کے پروگراموں میں شرکت کرنے کا موقع ملا۔ اگر چہ اس کے فوری اثرات کا اندازہ تو ممکن نہیں لیکن میرا یہ یقین ہے کہ بہت سے دلوں تک اُن کا پیغام پہنچا ضرور ہوگا۔

ذاتی سطح پر ان آخری چند سالوں میں ہم دونوں ہی کسی ندی کے کنارے کھلے آسمان تلے، ماہِ تمام کا نظارہ کر رہے تھے۔ یہ تشبیہہ بھی راشد صاحب کی پسندیدہ حکایتوں میں سے ایک تھی۔ یعنی منظر کو اُس کے وسیع ترین تناظر میں ڈوب کر دیکھا اور سمجھا جائے۔ اس دور میں مجھے راشد صاحب کے ساتھ لاتعداد ملاقاتوں کا موقع ملا اور ہر بار ایک نئی روشنی، ایک فکرِ تازہ لے کر واپس آیا۔ استاد شاگرد کا رشتہ، دوستی کا روپ دھار رہا تھا اور وہ مجھ سے ہر طرح کی نجی اور غیر نجی بات ڈسکس کر لیا کرتے تھے۔ لیکن ایک رکھ رکھاؤ جو شروع سے اُن کے مزاج کا خاصا تھا اب بھی قائم تھا۔

مسلسل محنت نے 1996ء کے اواخر میں اپنا خراج وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1996ء میں ان کا prostate کا پہلا آپریشن ہوا لیکن اس سے کام کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ اب اُن کے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ "دانائی کی تلاش" کی دونوں جلدیں، سرسید پر کتاب اور حکیم سعید پر نا تمام مسودہ اُن کے اس جذبۂ جنوں کی گواہی دے رہے تھے۔ وہ مئی کے وسط تک سلطانہ فاؤنڈیشن میں اپنے دفتر جاتے رہے اور 30 مئی 1999ء کو سی ایم ایچ راولپنڈی میں داخل ہونے کے دن تک وہ حکیم سعید پر اپنی کتاب پر کام کرتے رہے۔ اس کے باوجود کہ بیٹھنا اور لکھنا اُن کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ ITC میں اُن کے ہاتھ کی آخری تحریر نعیم غنی صاحب کے نام resignation کا

ناتمام خط ہے۔

میں گھنٹوں ITC کے باہر موجود رہتا لیکن یہ ہمت نہ ہوتی کہ چند منٹ سے زیادہ اُن کے پاس کھڑا رہ سکوں۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کو راشد صاحب جیسے استاد، معلم اور مرشد مل جائیں۔ راشد صاحب ہر خط میں لکھا کرتے تھے۔ God bless you اس لیے آخر میں، میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں۔

God Bless You Sir!

اکیسوں صدی کیلئے زادِراہ

پروفیسر سعید راشد مرحوم!!

ہارون رشید

"جراُتوں کے نشان" نامی کتاب کے نوترمیم شدہ چوتھے ایڈیشن میں "تعارف" کے عنوان سے خاکسار پروفیسر سعید راشد سے متعلق اپنی معروضات ستمبر 98ء میں پیش کر چکا۔ ان دنوں راشد صاحب حیات تھے۔ تب "ان کا حکم" تھا کہ ان کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کروں۔ اب "اپنی مرضی" ہے۔

دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں گن بوٹ ''راجشاہی'' کے فرار کی مہم کے مرکزی کردار ستارہ جرأت پانے والے کموڈور سکندر حیات خان اسی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جس طرح گھنٹی بجتے ہی کلاس میں داخل ہوتے تھے۔ اسی طرح گھنٹی بج جانے پر جملے کو پورا کئے بغیر "تھینک یو جینٹلمن" کہہ کران کا رُخصت ہوجانا ہمیں اچھا معلوم ہوتا تھا"۔

اس طرح راشد صاحب کی ایک اور کتاب "شہید سیاچن" میں کیپٹن معظم علی بلوچ اپنے گھر میں یہ کہتے سنائی دیتے ہیں۔

آج سر راشد نے ڈسپلن کی ایک نئی تعریف بتائی ہے

"Discipline is freedom. More discipline, more freedom!"

پوچھتے چلے جایئے۔

کوئی کہتا ہے لباس بے داغ تھا۔ کوئی بے حد شائستہ لب و لہجے کی تعریف کرتا ہے۔ کسی کو ان کی وقت کی پابندی متاثر کرتی ہے۔ کسی کو کلاس روم میں داخل ہوتے ہی ان کا بلیک بورڈ صاف کروانا، کرسیوں ڈیسکوں کی الائنمنٹ ٹھیک کروانا یاد رہ گیا ہے، کسی کو ان کا چاک کا چھوٹے سے چھوٹا ٹکڑا استعمال کرنا اچھا

لگا۔کم رو' شرمیلے اور کم صلاحیت والے بچوں کو "سر راشد" اس لیے اچھے لگے کہ انہوں نے ان کو دوسروں کے مساوی اہمیت دی۔کسی کو ان کی ہتھیلی کا لمس ابھی تک یاد ہے، جب وہ پانچویں درجے کے بچے کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر اردو انگریزی لکھنا سکھاتے تھے۔

کوئی کہتا ہے کہ شاگردوں سے محبت کرنے والے بھی دو چار استاد ہوں گے لیکن راشد صاحب چھوٹوں کی عزت کرتے تھے کہ خود انہیں یہ اعزاز بچپن میں نصیب ہو گیا تھا۔ بولتے بولتے رک جاتے، اپنا جملہ دوبارہ دیکھتے، پھر سب کو دکھاتے، دہراتے، جو کچھ سیکھتے، سب کو حسب توفیق سکھاتے، سمجھاتے چلے جاتے۔کمال یہ تھا کہ حکم بھی دیتے تھے تو حکیمانہ انداز میں، ہر حکم کی حکمت سمجھاتے، اپنا نقطہ نظر زور وشور سے نہیں بلکہ دھیمے نرم لہجے میں پیش کرتے، سننے والا چاہے چالیس منٹ میں، یعنی پہلے پیریڈ میں تسلیم کرلے، چاہے چالیس سال بعد بھی نہ مانے۔ہاں! راشد صاحب کے "ڈسپلن" کے دائرے میں اتنی ہی "فریڈم" اتنی ہی آزادی تھی۔کہ "ان کے حکم" اور ''اپنی مرضی'' میں کوئی فرق، کوئی فاصلہ برقرار نہیں رہتا تھا۔اقبال کی زبان میں

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

چنانچہ، راشد صاحب سے متعلق جس قدر من مانیاں خاکسار نے کیں۔آپ تصور کریں تو

sky is the limit!

لیکن مجھ سے پوچھیئے تو دم رخصت میں تو ہسپتال سے بھی لوٹ گیا تھا۔اور "آخری دیدار" کرنے والوں کی قطار سے بھی کہ میں تو قبل از موت اور بعد از موت کو ایک ہی جانتا ہوں، ایک ہی مانتا ہوں، میرے لیے تو یہی ایک آسمان نہیں، آسمان نہیں..... ''آسماں اور بھی ہیں'' ...... آسمان اور بھی ہیں!

جس زمانے میں مَیں ملٹری کالج آیا۔اُن دنوں بریگیڈیئر رفیق، جناب ایف ایچ حیدری اور جناب عین الدین علوی کا طوطی بولتا تھا۔راشد صاحب اتنے جونیئر تھے کہ طوطی کی آواز ''نقار خانے میں'' کون سنتا تھا۔پھر بھی پہلے دن سے نظر آنا، سنائی دینا، اپنا کردار منوانا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا" پہلے دن سے اپنا آپ منوانا'' بڑی بات تھی۔

11 جون 1950ء کو جب آپ تئیس برس اور چند ماہ کے بانکے، سجیلے اور نازک مزاج نوجوان تھے پاک سرزمین پر قدم رکھا اور پاکستان کے ہو گئے۔پھر 1950ء کی 22 اگست کی صبح اس ادارے سے وابستہ ہوئے اور ادارے کے ہو گئے۔1950ء سے 1990ء تک چالیس سال کا پیریڈ اس کالج میں پورا ہوا۔

شاید یہ بتانا ضروری نہ ہو کہ 1960ء کے دوران ملٹری کالج میں داخل ہونے والا ہارون رشید

کیسا بچہ تھا؟ شاید آپ جیسا، شاید مختلف، لیکن کلاس روم میں داخل ہونے والے راشد صاحب جیسے تھے 19 جون 1999ء کی صبح رخصت ہونے تک ویسے ہی رہے، اسی راستے پر، وہی موقف اختیار کئے ہوئے۔ ہاں تعارف اور تعلق کے اس دورانیے میں میں نے انہیں مدرس سے معلم اور مربی بنتے دیکھا، مائی باپ بنتے، مرشد بنتے، باعث خیر کثیر بنتے ہوئے دیکھا۔

میرے اللہ! چالیس منٹ کے اس پیریڈ میں چالیس برس گزر گئے۔ ہمارے والے batch میں ذوالفقار ارشد "عظیم افسانہ نگار" تھا۔ جب کہ جاوید اختر اچھا مضمون لکھنے کے علاوہ اچھی تقریر بھی کر لیتا تھا۔ لہولگا کر خاکسار بھی ان شہیدوں میں شامل ہوا۔ پہلی ہی ملاقاتوں میں ہم نے راشد صاحب کا دل جیت لیا۔ آخر کار توجہ بھی!

توڑ پھوڑ کرنے والے شرارتی بچوں کی طرح جب ان کی بے شمار قیمتی اشیا جن میں ان کا قیمتی وقت بھی شامل ہوتا، توڑ پھوڑ کر ضائع کر دیتے۔ بے حد رکھ رکھاؤ اور مروت کے باوصف، بے حد شائستہ لہجے کی شہرت پانے والے، راشد صاحب فکرمندانہ لہجے میں کہتے،

"اب دفع ہوجاؤ"

"دفع ہوجانے کو" جی نہیں چاہتا تھا۔ پس دنیا بھر کے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور فن پاروں سے متعارف ہم راشد صاحب کی ہی صحبت میں ہوئے۔ قصہ مختصر مطالعے کے دن وہی تھے۔ دنیا راشد صاحب ہی کی نظر سے دیکھی۔ ان کی کلاس میں ایسے بچے بھی تھے جو ان کے پیریڈ کی پہلی گھنٹی کے منتظر رہتے تھے۔ ایسے بھی ہوں گے جو آخری گھنٹی کے منتظر رہتے ہوں گے۔ ہمارے ایک ساتھی ہارون الطاف کی، جو ایک عرصہ قبل فوت ہو چکا، راشد صاحب سے جنگ چھڑی رہتی تھی۔ راشد صاحب ہارون الطاف سے ہار جاتے تھے۔ ہار تو وہ مجھ سے بھی جاتے تھے۔ تاہم، میں خاصا مختلف بچہ تھا۔

مجھے درحقیت، اردو، انگریزی نہیں پڑھنا تھی۔ ساری اردو، انگریزی، میں ہر نئی جماعت میں پہنچ کر پہلے ہی دنوں میں پڑھ لیتا تھا۔ میری visual memory کمال کی تھی۔ جو دیکھتا، پڑھتا، ذہن پر نقش ہوجاتا۔ میں یقیناً مختلف بچہ تھا۔ محبت اور توجہ سے محروم رہ جانے والا، لمس سے محروم، شدید احساس کمتری میں مبتلا، بدصورت بچہ!

ہاں، بھلے لوگو! شاید آپ لوگ ایک ''شفیق استاد'' سے محروم ہوئے۔ آپ کے لیے راشد صاحب ایک ''رول ماڈل'' تھے۔ ہاں وہ ''کردار ساز '' تھے۔ لیکن مجھ جیسے محروم بچوں کے تو وہ معالج تھے۔ ''مسیحا'' تھے۔ ''مائی باپ'' تھے۔

بریگیڈیئر رفیق جنہیں کچھ ساعتوں کیلئے دیکھنے کی سعادت مجھے بھی نصیب ہوئی ہے، واقعی ''کردار ساز'' تھے۔ کہ میرے بڑے بھائی اقبال فرید جب گرمیوں سردیوں کی چھٹیوں میں گھر آتے تھے تو کالج سے متعلق دوتہائی گفتگو بریگیڈیئر رفیق کے بارے میں ہوتی تھی۔ راشد صاحب کی ''مجلس یادگار رفیق'' انہی کے ایماء پر مرتب کی گئی کتاب ''کردارساز'' میری اہلیہ طاہرہ غزل نے بھی اس ذوق وشوق سے پڑھی جس کی توقع ہم کسی ''عالمگیرین'' سے کر سکتے ہیں۔ راشد صاحب کی ایک اور کتاب ''چراغوں کی قطار'' میں حیدری صاحب اور علوی صاحب واقعتاً بے حد روشن چراغ ہیں۔ لیکن راشد صاحب کو دیکھئے کہ ان کتابوں کے مصنف ہیں، ایسی درجنوں کتابوں کے خالق ہیں، لیکن اپنی کتابوں میں ایک جملہ بھی، ایک جھلک بھی نظر نہیں آنے دیتے۔ پھر دیکھئے کہ نظر نہیں آتے لیکن موجود ہیں، رخصت ہو چکے لیکن زندہ ہیں۔

اگرچہ ''پہلی ملاقاتوں'' میں پیدا ہونے والی خوش فہمی دم آخر تک قائم رہی۔ تاہم ''آخری ملاقاتوں'' کے دوران ملاقاتیوں کا تانتا دیکھ کر، ہسپتال کے انتہائی نگہداشت کے شعبے میں داخلے کے دوران دور دراز سے تیمارداری کے لیے آنے والوں کو تیز دھوپ میں دوڑ دھوپ کرتے دیکھ کر حسد بھی ہوا اور حیرت بھی۔ نماز جنازہ کے موقع پر سبھی اجنبی و آشنا چہرے اور اس اجتماع میں یہ ساری چمکتی، جھلملاتی، نم آنکھیں دیکھ کر یقیناً حیرت ہوئی ہے۔

حیرت ہوتی ہے راشد صاحب نے اپنے ایک ایک شاگرد سے، اپنے ایک ایک ملاقاتی سے کیسے نبھائی ہوگی۔ کتنی محبتیں لٹائی ہوں گی۔ کتنا پیار بانٹا ہوگا۔ کس قدر مروتیں، کتنے تعلقات، کتنے مجادلے، جانے کیا کیا فکرمندیاں ہونگی اور کس قدر! ہاں اس کام میں حساب نہیں ہوتا۔

چشم تصور میں اس نحیف ونزار شخص کو دیکھتا ہوں جس نے ۷۲ برس کی عمر میں مزید کتابیں لکھنے کے خواب دیکھے اور خاکسار کو ان خوابوں میں شریک کیا۔ ''گفتار و کردارِ قائداعظم'' وہ لکھ چکے تھے۔ چنانچہ ''گفتار و کردارِ سرسید'' لکھنے بیٹھ گئے۔ ادھر پہلی کتاب کو صدارتی ایوارڈ ملا ادھر دوسرا مسودہ مکمل ہوا۔

12 اکتوبر 98ء کی صبح حکیم محمد سعید کی شہادت کے بعد تو راشد صاحب کو آج کا کام آج، بلکہ ابھی مکمل کرنے کی فکر لگ گئی، جنون ہوگیا۔ ہاں، شاید انہیں وقت کی کمی کا احساس ہو چکا تھا۔ پھر محسوس ہوا کہ وہ مہلت کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔

پہلے وہ فون کر کے طلب فرماتے تو انتظار کرتے تھے۔ صبر وشکر سے انتظار کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بار بار فون کرنے لگے۔ ایک روز مجھے بلا بھیجا اور حکیم محمد سعید مرحوم سے متعلق اڑھائی تین سو اصحاب کے ساتھ انٹرویوز کی منصوبہ بندی کی، انہوں نے مجھے اس امر پر قائل کیا کہ تاثرات بیان کرنے کے بجائے واقعات

بیان کرنا زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم ان اصحاب سے پوچھیں، جنہوں نے حکیم صاحب کو اپنی اچکن، اپنے موزے وغیرہ دھوتے دیکھا، مطالعہ کرتے، روزہ رکھنے کیلئے سحری پر اٹھتے، غور فکر کرتے اور کام کرتے دیکھا۔

معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتے تھے۔ ''حکیم محمد سعید'' سے متعلق یا 'پروفیسر محمد سعید' سے متعلق؟ راہ وہی ہے، چلتے چلے جایئے تو چہرے بدلتے جاتے ہیں۔

اب محمد سعید صاحب، سعید راشد صاحب رخصت ہو گئے ہیں تو خاکسار چاہتا ہے کہ ہم ان اصحاب سے پوچھیں جنہوں نے ان کا بچپن، لڑکپن دیکھا ہے۔ ایک عرصہ قبل، کالج کی انہی سڑکوں پر چلتے چلتے انہوں نے میرے کسی سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ گھر میں سب بزرگ انہیں چھ برس کی عمر سے ''سعید صاحب'' کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ معلوم نہیں ''سعید صاحب'' اپنی معصوم کم عمری کے دنوں میں کیسے بچے رہے ہوں گے۔ انہوں نے بنٹے کھیلے؟ سائیکل چلائی؟ باکسنگ یا کشتی کی؟ پیراکی کا، سوئمنگ کا شوق پورا کیا یا نہیں؟ جانے انہوں نے کبھی جھگڑا فساد کیا، گالی گلوچ کی، بزرگوں سے مار کھائی یا نہیں؟ جانے سعید راشد صاحب ان ساری غلطیوں، کوتاہیوں سے کیسے بچے رہے ہوں گے جن سے بچ بچا کر بچپن ہی میں ''سعید'' ہوئے اور جوان ہو کر ''راشد''۔ خود راشد صاحب بتاتے ہیں کہ نانا نے ان کا نام ''سعید'' رکھا۔ جبکہ کئی برس بعد ان کے ایک استاد نے اضافہ کر کے ان کا نام مکمل کیا ''سعید راشد!''

حکیم محمد سعید ہی سے متعلق اس نشست کے دوران راشد صاحب نے تعلیم و تربیت کی اہمیت اور اولیت واضح کی۔ پھر اس شعبے سے متعلق ایسی ہی ایک کتاب کا خاکہ بھی پیش کیا جس کے لئے ہمیں مل جل کر ہزار سے زائد اساتذہ کو انٹرویو کرنا تھا۔

ہاں میں اس شخص کو دیکھتا ہوں جس نے حوصلے مجتمع کر کے، ہسپتال کے بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے، اشاروں کنایوں سے پوچھا کہ پرنٹر کب تک مسودہ کمپوز کر دے گا؟ تم کب تک پروف پڑھ لو گے؟ کتاب کب تک شائع ہو جائے گی؟ میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا، جس نے ہسپتال میں داخل ہونے سے پہلے خاکسار کو اس انداز میں بلا بھیجا جیسے قافلہ روانہ ہوا چاہتا ہو۔

''میں نے اپنا کام پورا کر دیا''

''ہاں آپ نے کر دیا''

اپنے حصے کا سورج جلانے والے اس دیوانے نے کیا تو یہ کیا کہ آنے والے دنوں، برسوں، صدیوں کا، بے شمار لوگوں کے حصے کا کام کر دیا اپنے حصے کا سورج جلانے والا دیوانہ پوچھتا ہے۔

''میں نے اپنا کام پورا کر دیا''

''ہاں آپ نے کر دیا''

''میں جا رہا ہوں''۔

''یس سر!''

اگلے روز اطلاع ہوئی کہ راشد صاحب کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔کبھی ایک شکایت، کبھی دوسری، کبھی ایک امید، کبھی دوسری، کبھی ایک آنکھ نم، کبھی دوسری!

باہر پروفیسر سعید راشد کی حیات نو کے منتظر لوگوں کو یہ بتانا بہت مشکل تھا کہ ابن آدم کیلئے کبھی یہ دنیا ہے، کبھی وہ!

میں نے اس شخص کو ہر مرتبہ چھپ چھپ کر دیکھا۔ مجھے ڈر تھا تو یہی کہ راشد صاحب ابھی آنکھیں کھول، مجھے وہاں کھڑا دیکھ، یہی کہیں گے، کہنے کی کوشش کریں گے:

''ہاں ہاں! اب تم جاؤ۔ جا کر کام کرو۔ پروف کب تک پڑھ لو گے؟ کتاب کب تک شائع ہو جائے گی؟ میں انتظار کروں گا''۔

" I can wait"

"I can, I will"

میں نے اس شخص کو غور سے دیکھا، جو چھ برس کی عمر میں ''صاحب'' ہوا۔ پبلک سکول میں تدریس اور تعلیم و تربیت کو''منچلے کا سودا'' قرار دیتے ہوئے سعید راشد صاحب نے کہا تھا''اس میں کام کا حساب نہیں ہوتا'' البتہ یہ بھی کہا کہ؛۔

''میں نے ایک ایک لمحے کا حساب رکھا ہے۔ چالیس سال میں چالیس بار بھی کہیں لیٹ نہیں ہوا۔ کبھی شارٹ کٹ نہیں کیا۔کبھی improper لباس نہیں پہنا''۔

لیکن مجھ سے پوچھئے تو میں کبھی ان کے اس ظاہری ڈسپلن سے متاثر نہیں ہوا۔ وہ ملٹری کالج میں چالیس برس رہے اور میں صرف پانچ برس۔ ہم میاں بیوی اور بچے ان سے ملنے ان کے گھر جاتے تو وہ اپنے بیڈ روم سے اس وقت تک برآمد نہیں ہوتے تھے جب تک اپنے گریبان کا آخری بٹن بھی بند نہ کر لیتے۔ اگر میں متاثر ہوا تو اس لیے کہ گریبان کا آخری بٹن بند کرتے ہوئے بھی وہ اپنی دیوانگی کو زنجیر نہیں کر پائے۔

اگر میں متاثر ہوا تو یہ دیکھ کر کہ ان کیلئے یہ اہم نہیں رہا کہ بات کرنے کیلئے وہ کس کا جملہ بول رہے ہیں؟ لکھتے وقت وہ کس کا فقرہ لکھتے لکھتے اپنی جانب سے وضاحتی بیان شامل کر دیتے ہیں اور اپنے جملے کو

واضح کرنے کیلئے کس کا فقرہ لکھ لیتے ہیں۔ان کیلئے کام اہم تھا۔کام کی خاطر رقم خرچ کرنا، وقت صرف کرنا اہم نہیں۔کام کیلئے چاہے ساری جمع پونجی خرچ ہو جائے، ساری زندگی صرف ہو جائے۔

میں نے انہیں پریشانی کے عالم میں بھی پریشان نہیں دیکھا، غم و غصے کے عالم میں غم کرتے، غصہ کرتے نہیں دیکھا۔انتہائی ناامیدی اور مایوسی کے عالم میں ناامید یا مایوس ہوتے نہیں دیکھا، انتہائی بے تکلفی کے عالم میں ''بے تکلف'' ہوتے اور غفلت کے لمحوں میں غافل ہوتے نہیں دیکھا۔خوشی اور سرمستی کے عالم میں کبھی آپے سے باہر ہوتے اور غم واندوہ میں چھلکتے نہیں دیکھا۔اس بڑھاپے میں تنہائیاں برداشت کرتے، شدید جسمانی تکلیف کے دوران خود تنقیدی کرتے دیکھ کر میں یقیناً راشد صاحب سے متاثر ہوا۔ ہاں میں نے اپنے ''مائی باپ'' کی طرح فکرمندی کرتے کسی اور کو نہیں دیکھا۔ایک دنیا دیکھی، لیکن دنیا میں ان جیسا نہیں دیکھا۔ان جیسا "caring and sharing" کوئی نہیں دیکھا۔راشد صاحب سے وصول شدہ چھوٹے چھوٹے تحفوں پر نظر کیجئے تو کہیں یہ نظم ضرور شامل ہوگی۔

لوگو!

آدمیوں کے ہجوم میں اس انسان کو غور سے دیکھو!

اس کی آنکھوں میں کوئی بڑا مقصد ہے

اپنی عورت سے بڑا، اپنے بچے سے بڑا!!

اب ذرا اس انسان کو غور سے دیکھئے جس کی آنکھوں میں ہمیشہ اپنی عورت اور اپنے بچے سے بڑا مقصد روشن رہا۔سب جانتے ہیں کہ راشد صاحب کو روز اوّل سے شدید ذاتی، ازدواجی، گھریلو مسائل درپیش رہے۔لیکن ہم میں سے کسی نے کبھی ان کی زندگی میں جھانکنے کی خواہش کی نہ کوشش، ایک قیامت کا تذکرہ انہوں نے ۲ستمبر ۱۹۸۵ء کو ایک کتاب کے آغاز میں ان الفاظ میں کیا:

''اس عرصے میں خود مجھ پر ایک قیامت یہ ٹوٹی کہ میری اہلیہ روحی جن کی مہربان رفاقت میں میَں نے اس کام کا آغاز کیا تھا۔مئی ۱۹۸۵ء میں اللہ کو پیاری ہوئیں''

۱۹۶۷ء تا ۱۹۸۵ء شیر شاہ ہاؤس کے اس گھریلو ماحول کو یاد کرتے ہوئے راشد صاحب نے کہا تھا:

''اس دور کو میں آخرت میں پیش کروں گا، اگر اللہ کریم اس خدمت کو قبول فرمائے تو اس کا کرم ہوگا۔''

بیوی سے جھگڑا ہوتا یا اولاد سے کوئی شکوہ، یہ پوچھنا ہوتا کہ دفتری معاملات میں کیا موقف اختیار کریں یا یہ سوال کہ ایٹم بم کا دھماکہ کیا جائے یا نہیں۔میں وقت بے وقت انہیں فون کر لیتا تھا۔ان سے ملنے چلا جاتا تھا۔

راشد صاحب ایک پیش بیں شخصیت تھے۔ پیغمبرانہ انداز میں، جہاں وہ عین اسی موضوع پر گفتگو کا آغاز کرتے جس میں الجھے ہوئے ہم ان کے ہاں پہنچتے تھے۔ وہاں وہ آئندہ سے متعلق بھی اکثر و بیشتر پیش گوئی کر دیتے تھے۔ میری موجودہ خوشگوار ازدواجی زندگی ان کی ایک پیش گوئی تھی جو آج سے کئی برس قبل انہوں اس کالج کے میس میں کالج کے سابق طالب علم اوران دنوں کوارٹر ماسٹر کے طور پر تعینات، میجر حکیم خان آفریدی کے سامنے کی تھی۔ اس روز میں نے راشد صاحب کی ناراضگی سونگھ کران کا پیچھا کیا تھا۔ ہاں راشد صاحب بھی ناراض ہو سکتے تھے۔ کہانی یہ ہے کہ کالج میں میرے قیام کے آخری ایام میں راشد صاحب نے میری تربیت کی کچھ کمیاں دور کرنے کیلئے مجھے مرحوم علوی صاحب کے حوالے کیا۔ راشد صاحب کی خفگی کا سبب یہ تھا کہ میں علوی صاحب کا ہو کر راشد صاحب کو یکسر بھلا بیٹھا تھا۔ ناراضگی ان کے کسی ''حسد'' کی بنا پر نہیں بلکہ میری ابن الوقتی، موقع پرستی اور بے وفائی کے باعث تھی۔ اس ناراضگی میں بھی میری اصلاح کا پہلو غالب تھا۔

ایک طویل عرصے سے ہم میاں بیوی سمندر پار پاکستانیوں کیلئے مختص ایک ماہنامے کیلئے بھی راشد صاحب کو وقفے وقفے سے انٹرویو کرتے آئے ہیں۔ اگر چہ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والے لوگ ہیں۔ تاہم راشد صاحب اپنی متعدد کتابوں کے ابتدائی صفحات پر ہمارے نام شامل کر کے ہمیں طلب فرماتے' تاکہ ہمیں دکھائیں اور ہمیں خوش دیکھ کر خوش ہوں۔ ملٹری کالج کو الوداع کہتے ہوئے میں نے اپنی آٹوگراف بک اپنے سبھی اساتذہ کی خدمت میں پیش کی۔ لیکن راشد صاحب کو نہ تو حکم دینے کا سلیقہ تھا، نہ تلقین کرنے کا۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا۔

''خوش رہو''

ایک اختلاف رائے بھی مجھے ہمیشہ ان سے رہا، انہیں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے دیکھ کر، چھوٹے چھوٹے کام کرتے دیکھ کر میں نے بھی ان پر تنقید کی۔ لیکن مسکرا کر وہ یہی کہتے کہ یہ کام چھوٹے چھوٹے سہی، لیکن کرنے کے ہیں۔ یہ راشد صاحب ہی تھے جنہوں نے زندگی کے کارزار میں گمنام سپاہیوں کو تلاش کیا اور ان کی قبروں پر چراغ جلائے۔ مجھے راشد صاحب اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ وہ ''بڑے آدمی'' نہیں ہیں نامور ہیرو نہیں ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے ''گمنام سپاہی'' ہیں۔ بہت سارے کام جو ہیرو بوجوہ نہیں کر پاتا، سپاہی کر جاتا ہے۔ شاید اسی لیے راشد صاحب کے بقول:

''خدا کے یہاں کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں، صرف اچھا یا بُرا ہوتا ہے''

ملٹری کالج میں راشد صاحب آئے تو غالباً اردو پڑھانے کو تھے لیکن موت کی گھنٹی بجی ہے اور حسب

سابق جملے کو پورا کیے بغیر ''تھینک یو، جینٹلمین'' کہہ کر رخصت ہوئے ہیں۔ تو اب ہم اُنہیں اُنہی کے جملوں میں، انہی کے کاموں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ جاتے جاتے وہ ہمیں ''دانائی کی تلاش'' تھما گئے ہیں۔

اپنی شادی کی سالگرہ کے دن ۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ہم راشد صاحب کی دعائیں لینے ان کی رہائش گاہ ''کردار منزل'' پہنچے تو ہمیں یہی تحفہ ملا تھا۔ سو چند جملے آپ کی نذر!

''اصل مقابلہ اپنے آپ سے ہوتا ہے دوسروں سے نہیں''۔

''سوچ سمجھ کا فتور نیت کے فتور سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے''۔

''آدمی پیدا ہوتا ہے اور انسان اپنی جدوجہد سے بنتا ہے''۔

''انتظار وہی کر سکتا ہے جسے اعتماد ہو''۔

''اچھے برے لوگ مر جاتے ہیں لیکن ان کے اچھے برے کام نہیں مرتے''۔

''بہت چھوٹی چھوٹی باتیں آدمی کو بڑا بناتی ہیں''۔

میرے کم سن بچے انہیں ''راشد نانا'' کہتے تھے۔ ''سر نانا جان'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ شاید اس لئے کہ ان کے ڈسپلن میں محبت غالب تھی۔

ہم اب اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں۔ ذاتی سطحوں سے اجتماعی سطحوں تک ہمیں جس کردار کا ،جس دانائی کا اور جس ڈسپلن کا مظاہرہ کرنا ہوگا، مجھے خوشی ہے کہ میرے بچے وہ ''رول ماڈل'' دیکھ چکے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ بریگیڈیئر رفیق، جناب ایف ایچ حیدری، جناب عین الدین علوی اور جناب سعید راشد جیسے عظیم رول ماڈل، بڑے کردار ساز ہماری راہیں روشن کریں گے۔ یاد رکھئے۔

SKY IS NOT THE LIMIT!

آسمان اور بھی ہیں!

ابا جی

آصف سعید راشد

بہت سے مضمون لکھے۔ بہت سی تحریریں ہر موضوع پر لکھنے کا اتفاق ہوا۔ مگر شاید جتنا مشکل قلم اٹھانا آج محسوس ہو رہا ہے، پہلے کبھی نہ تھا۔ ابا کے بارے میں کچھ لکھنا چاہوں تو سوال یہ سامنے آجاتا ہے کہ ان کی شخصیت کے کس پہلو پر بات کروں بحیثیت مصنف، بحیثیت معلم اور مربی یا صرف بحیثیت ابا جی کے، میں ان سبھی پہلوؤں سے واقف ہوں۔ جانتا بھی ہوں، تجربہ بھی رکھتا ہوں اور سمجھتا بھی ہوں لیکن میں تو صرف

بیٹے کے طور پر ہی بات کر سکتا ہوں۔ وہ مصنف، استاد اور مربی تو بہت سے لوگوں کے تھے اور ہیں، لیکن میرے لئے تو صرف ابا جی ہی تھے اور رہیں گے۔

تقریباً 25 سال کی یادیں صرف چند سطروں میں مقید کر لینا کچھ آسان نہیں۔ ملٹری کالج کا بچپن ،ملٹری کالج ہی کا زمانہ طالب علمی، دو سال لاہور میں گزرے اور پھر چار سال ان کے ماتحت کام کرنے کا تجربہ،سب کچھ میرے سامنے ہے اور میں حیران ہوں کہ کیا لکھوں اور کیا چھوڑ دوں۔

میرے ذہن میں پہلی یاد شیر شاہ ہاؤس کی ہے، جب بدھ اور اتوار کی رات function کے بعد ابا کیڈٹس کو ایڈریس کیا کرتے۔ ان کی اس زمانے میں کہی ہوئی بہت کم باتیں اب یاد ہیں لیکن شیر شاہ ہاؤس کا ماٹو "I can, I will!" اور اس کی تشریح جو اس وقت سنی، اس نے دوسروں کی طرح مجھ پر بھی انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ملٹری کالج اور خاص طور پر شیر شاہ ہاؤس میں ہمارا گھر خوشبو اور سکون کا حسین امتزاج تھا۔ پھول اور خاص طور پر گلاب، چنبیلی اور رات کی رانی کے پھول ابا اور امی دونوں ہی کی کمزوری تھے۔ میرا بچپن انہی پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے۔ کالج جاتے ہوئے ابا کا سفید لباس اور رات کو چائے پر ابا کی باتیں یہ دونوں ہی زندگی کے لوازم تھے۔ بہت سے لوگ یہ جانتے ہیں کہ ابا رات کو کھانا نہیں کھاتے تھے اور صرف چائے پی جاتی تھی۔ لیکن میرے لئے یہ صرف چائے ہی نہیں تھی۔ بلکہ فیملی get- together کا وقت تھا۔ جب ہم سب جمع ہوتے، دن بھر کی مصروفیات بیان کی جاتیں اور زیادہ تر ابا ہی کسی نہ کسی موضوع پر بات کرتے۔ مجھے اب یاد نہیں کہ کیا کیا کہا گیا لیکن وہ نرم لہجہ، محبت اور تحفظ کا احساس آج بھی تازہ ہے۔ شیر شاہ ہاؤس میں ابا کی مصروفیات اور خاص طور پر مختلف مواقع پر ہونے والے functions، خصوصاً شیر شاہ ہاؤس کا کئی سال تک جاری رہنے والا Annual Function تو خاصے کی چیز تھا اور ان سب کے پیچھے ابا کی محنت اور motivation کا ہاتھ تھا۔ شیر ینز (Sherians) اس بات کی گواہی دیں گے کہ شیر شاہ ہاؤس کو شیر شاہ ہاؤس ابا ہی نے بنایا تھا۔

میں 1983ء میں DS کے طور پر ملٹری کالج میں داخل ہوا، ابا نے ہماری کلاس کبھی نہیں لی اس لئے میں بحثیت استاد ان کے teaching style سے اب بھی ناواقف ہوں۔ وہ میرے ہاؤس ماسٹر بھی نہیں رہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ محض اتفاق تھا یا consciously ایسا کیا گیا لیکن جو کچھ بھی ہوا میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ کالج میں ہونے والے انٹر ہاؤس تقریری مقابلوں کیلئے انہوں نے مجھے تقاریر بھی لکھ کر دیں, تیاری بھی کروائی لیکن جس مقابلے میں میں شریک ہوتا وہ کبھی بھی اس کے جج نہیں بنے۔ میری زندگی کی پہلی تقریر اقبال ڈے پر تھی اور خاصی ڈانٹ کھانے کے بعد کی تھی اور اس کے بعد تو پھر جیسے سٹیج کا

خوف نکل گیا۔ 1984ء میں کالج کی بزم ادب کا احیا ہوا۔ اس کے پہلے سیکرٹری کی اضافی ذمہ داری کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے سیکرٹری بھائی جان زاہد کو دی گئی اور میں اس کا دوسرا سیکرٹری مقرر ہوا۔ تقریباً دس سال کے وقفہ کے بعد بزم ادب کے اجلاس منعقد ہوئے، جن میں تمام کالج نے شرکت کی۔ انہیں دنوں اقبالیات اور پاکستانیات ٹرافی کا بھی اجرا ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے ایک Joke Show بھی کروایا تھا۔ یہ سب ابا ہی کی کاوشوں کا اعجاز تھا اس زمانہ کے کمانڈانٹس بریگیڈیر آئی آر صدیقی اور بریگیڈیر نورالحق کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔ مجھے ان functions کا انتظام کرنے اور پھر سٹیج سیکرٹری کے طور پر کمپیئرنگ کرنے کا موقع ملا۔ ان functions سے میں نے ذاتی طور پر جتنا اعتماد اور تجربہ حاصل کیا، اب احساس ہوتا ہے کہ کتنا ضروری تھا اور اب بھی ہر موقع پر کام آتا ہے۔

ملٹری کالج کے بعد دو سال کے لئے لاہور چلا گیا۔ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ابا نے مجھے میری تمام معذوری کے باوجود بھیجنے کا فیصلہ کیسے کر لیا تھا اور میں اتنے آرام سے کیسے چلا گیا؟ یہ ان کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ مشکل ترین حالات کا بھی مقابلہ کیا اور یہ ان کی دعاؤں کا اعجاز تھا کہ قدم قدم پر اچھے سے اچھے لوگ ملے اور مشکلات خود بخود ختم ہوتی گئیں۔ اس دوران ابا کے معروف مختصر خطوط بھی ملتے رہے، ہر ہفتے خط آنا گویا معمول تھا۔ چند الفاظ اور بس۔ لیکن یہ چند الفاظ ہی ان کی محبت کا آئینہ تھے۔

اگست 1990ء میں جب میں واپس آیا تو ابا ملٹری کالج چھوڑ کر آرمی پبلک سکول جہلم کے پرنسپل کے طور پر نئی ذمہ داری سنبھال چکے تھے۔ یہاں سے ان کی زندگی ایک نیا موڑ لے رہی تھی۔ ملٹری کالج کی محدود دنیا سے نکل کر اب وہ ایک وسیع کینوس پر کام کر رہے تھے۔ یہیں سے پاکستانیت اور کیریکٹر بلڈنگ کے اصل مشن کا آغاز ہوتا ہے۔ APS جہلم کی ٹیچرز ٹریننگ ورکشاپس سے ہی ان کو اندازہ ہوا کہ اساتذہ کی تربیت اور صحیح تربیت کس قدر اہم اور ضروری ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے کتابیں لکھیں، لیکچرز دیئے، سیمینار اور ورک شاپس کا اہتمام کیا۔ بچوں کی تربیت اور Exposure Theory کا آغاز بھی یہیں سے ہوا۔ APS منگلا اس کا نقطہ عروج بھی تھا اور اختتام بھی کہ جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ صرف ایک سکول کے پرنسپل بن کر اپنے آپ کو محدود کر رہے ہیں۔ انہوں نے راولپنڈی آ کر ٹیچرز ٹریننگ کو ہی مقصد حیات بنا لیا۔

APS جہلم اور منگلا ایک بالکل نیا تجربہ تھا اور سچ پوچھئے تو ہمیں بھی یقین نہ تھا کہ ابا اس کام کو کس حد تک کر سکیں گے۔ کیوں کہ وہ تو مصنف تھے یا یوں کہئے کہ الفاظ اور کتابوں کی دنیا کے آدمی، کجا ایک پرنسپل کی انتظامی ذمہ داریاں، مگر ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں نے انہیں ایک انتہائی پریکٹیکل منتظم بھی پایا اور

بڑے پیار سے کام کروانے والا hard task-master بھی۔ ان کے ساتھ کام کرنے میں جتنی محنت کرنا پڑی وہ اپنی جگہ حقیقت ہے لیکن صرف مجھ سے ہی نہیں وہ سبھی سے اسی انداز میں کام لیا کرتے تھے۔ پتہ بھی نہ چلتا کہ ہم کتنا زیادہ کام کرتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے committed آدمی بہت مضبوط ہوتا ہے اور جو کام commitment کے بغیر کرنے کی کوشش کی جائے وہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

یہ چار سال میری زندگی کا انتہائی اہم حصہ ہیں، جب میں نے عملی زندگی اور خاص طور پر پڑھانے کے اسرار و رموز ان سے سیکھے۔ صرف یہ نہیں کہ کلاس روم میں کیسے پڑھایا جائے بلکہ یہ بھی کہ کلاس کے باہر بھی استاد، استاد ہی ہے۔ وہ ہمارے لئے رول ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے اور ہم ٹیچرز سے ایسا کوئی کام نہیں کہتے تھے جو وہ خود نہ کر رہے ہوں۔ اگر ہمیں ٹائی باندھنے اور سیاہ اکیڈیمک گاؤن پہننے کا حکم ملا تو یہ ان کے اپنے لباس کا بھی حصہ تھیں۔ انہی سالوں میں، میں نے صحیح بات پر سٹینڈ لینا بھی سیکھا اور یہ بھی جانا کہ غلط موقع پر شہید ہو جانا بیکار کی بات ہے۔ یہ بھی سمجھا کہ جنگ جیتنے کیلئے کچھ قربانیاں بھی دینا پڑتی ہیں۔

راولپنڈی آنے کے بعد ان کی زندگی کا سنہری دور شروع ہوا، جس کے بارے میں انہوں نے خود کہا کہ زندگی کا مزا تو اب آیا ہے۔ یہ ان کی زندگی کے سب سے زیادہ بار آور سال تھے۔ کتابیں، لیکچر، سیمینار غرض یہ کہ ایک نئی دنیا تھی اور ہم نے ابا کو بالکل ایک نئے روپ میں دیکھا۔ 1990ء تک ابا کیلئے سرائے سے جہلم جانا بھی ایک مسئلے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ لیکن پھر وہ وقت بھی آیا کہ پشاور، کراچی، ملتان، کوہاٹ، مظفر آباد، کھاریاں، جہلم، سکردو اور مٹھا ٹوانہ جیسے لاتعداد مقامات تک انہوں نے سفر کیا، وہاں رہے، لیکچر اور سیمینار کروائے۔ وہ سفر کرنے سے بہت گھبراتے تھے تو پھر اچانک تبدیلی کیوں؟ پھر مجھے احساس ہوا کہ سفر کرنا انہیں اب بھی ناپسند ہے لیکن چونکہ یہ سفر ان کے مشن کو آگے بڑھانے کا ذریعہ ہیں اور دیئے سے دیئے کو جلانے کے عمل کو آگے بڑھاتے ہیں، اس لئے وہ یہ زحمت بخوشی اٹھا لیتے ہیں۔ بات صرف commitment کی تھی، بات صرف مشن کی تھی، جب ایک کام کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر کیا دیکھنا کہ اس کی راہ میں کون کون سے مسائل حائل ہیں؟

یہ ان کی اپنے کام سے commitment ہی تھی جو بیماری کے خلاف ان کا سب سے مضبوط دفاع تھی۔ وہ اس سال (1999ء) مئی کے وسط تک اپنے دفتر جاتے رہے اور راولپنڈی سی ایم ایچ کے آئی ٹی سی میں ان کیلئے جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی وہ یہ تھی کہ حکیم سعید پر کتاب مکمل ہو جائے۔ جون کے دوسرے ہفتے میں جب وہ کچھ بہتر تھے تو انہوں مجھ سے کہا کہ ان کا کام جاری رکھوں۔ محنت اور مسلسل محنت ہی ان کی زندگی کا خاصہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اس کو عملی طور پر بھی کر دکھاتے۔ ہمیں کبھی یہ احساس نہیں

ہوا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ کریں گے نہیں ۔ اگر انہوں نے کہا کہ میرے لئے کوئی اجنبی نہیں تو واقعی ایسا ہی تھا۔ اس کا ثبوت وہ لاتعداد لوگ ہیں، جن سے شاید وہ چند لمحے کو ملے، وہ طلبہ اور طالبات ہیں، جن کا تعلق ایک دو لیکچرز تک ہی محدود تھا، لیکن ان چند لمحوں میں بھی اتنی اپنائیت اور پیار تھا کہ دوسرا اس کا اسیر ہو جاتا۔ بہت سے طلبہ، طالبات ملے جوان سے ایک ملاقات کے حوالے سے محبت کے رشتے میں بندھ گئے تھے۔

ذاتی طور پر ابا شاید محبت کے اس قسم کے عملی اظہار کے قائل نہ تھے جو عام طور پر والدین اور بچوں کے درمیان سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ابا نے کبھی مجھے گلے لگایا ہو، حتیٰ کہ عید کے موقع پر بھی نہیں۔ جب میں لاہور سے واپس آتا یا کہیں اور جا کر واپس آتا تو وہ مجھے پریشانی کے عالم میں برآمدے میں ٹہلتے ہوئے ملتے، لیکن بات کبھی ہاتھ ملانے سے آگے نہیں بڑھی۔ ہاں اس سال 21 مئی کو میری سالگرہ کے دن انہوں نے مجھے گلے لگایا، پیار کیا اور خوش رہنے کی دعا دی۔

میں نے اور ابا نے بہت سا وقت ایک ساتھ گزارا۔ 1983، 1984ء کے وہ دن بھی شامل ہیں جب امی بیمار تھیں اور کچھ عرصہ ایسا بھی گزرا کہ جب میں اور ابا گھر میں بالکل اکیلے رہ گئے اور صبح کا ناشتہ اور رات کی چائے بنانا میری ذمہ داریوں میں شامل ہو گیا۔ کیا بنتا ہوگا اور کیسا بنتا ہوگا؟ یہ سوچنے کے لئے کچھ زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت نہیں! پھر 1990ء سے 1994ء تک اکٹھے کام کرنے کا تجربہ بھی ہوا۔ جہلم اور منگلا میں کچھ بہت کٹھن گھڑیاں بھی آئیں جب بہت مشکل فیصلے کرنے پڑے لیکن میں نے انہیں ہمیشہ پرسکون پایا۔ کسی قسم کی پریشانی یا hesitation نہیں تھی ۔ بہت مشکل لوگوں سے بھی انہوں نے بہت آسانی سے معاملہ کیا اور اکثر اوقات جلد یا بدیر اس میں کامیاب بھی رہے۔ ہر قسم کے حالات میں اپنے آپ پر قابو رکھنا، اپنے جذبات اور ردعمل کو اپنے کنٹرول میں رکھنا میں نے ان سے ہی سیکھا۔

ابا کی انگلی پکڑ کر شیر شاہ ہاؤس جانے والا بچہ، ملٹری کالج کی سڑکوں پر ابا، امی کے ساتھ شام کو چہل قدمی کرتے ہوئے، جہلم اور منگلا میں علی الصبح تیز قدموں سے سکول کی جانب رواں یا پنڈی اسلام آباد میں مختلف تقریبات میں شرکت کرتے ہوئے، 19 جون 1999ء کی دوپہر اپنے گھر سے ریس کورس گراؤنڈ کے قبرستان تک ایمبولینس میں ابا کے آخری سفر کے دوران، میں ہر جگہ ان کے ساتھ تھا، خوشیوں میں بھی اور آزمائش کی گھڑی میں بھی۔

شاید میں یہ کبھی حساب نہ کر سکوں کہ میں نے کیا سیکھا اور کیا نہ سیکھا۔

ابا تو بس ابا تھے۔

THE (LATE) PROF SAEED RASHID

Lt Col (Retd) SFH Zaidi

Beset with grief at the personal loss of an able colleague, it is really a painful realization that I will be left to write the epitaph of a comrade some 15 years younger. He was the last emblem of my acquaintance and cherished memory of a dedicated team of missionaries who shared the hard times with me to give this institution the shape of a Public School, which was established on the pattern of another such institution. I dare say I knew, and discovered the abilities and dimensions of capabilities of (late) Mr. Rashid more than anyone in spite of his much longer association.

The (late) Prof has left so many admirers that enough will be written about his qualities of head and heart and his capabilities as a teacher. I will therefore confine myself to describe some historical facts unknown to most of them, which will interest and inspire the student community. I have always described him as a valuable gift, which the College got through my humble efforts.

Destiny had prepared the ground for his advent into the scholastic organization as early as the summer vacation of 1948, hardly within months of my arrival as the Commandant. Here is an extract form the first publication of the College magazine "Tarbiat" 1949 (p 7):

"A great change took place in the staff during the summer vacation. Some half a dozen officers, along with four JCOs, who had served this College long and well and had become veritable limbs of this scholastic body, have been

Aandhi Maen Chargh

of his character. Mr. Rashid ("marhoom") had such a genial temperament that in a few months almost endeared himself even to those, including the Chief Instructor, who were opposed to his entry. I had also heard whispers that the Commandant was favouring him for unknown reasons. However, I never lost an opportunity to project his qualities as a writer. 1950 was the year of the Jubilee celebration. At first I appointed him as an Assistant Editor (Urdu Section) of "Tarbiat", it was a pleasant surprise that everyone welcomed this step, including Mr Siraj Ahmed Alvi, Editor of the Urdu Section and the Head of Urdu Department. I went a step further to request Mr Rashid to contribute an article also for the Silver Jubilee Edition of "Tarbiat". He asked me to suggest the subject and to provide guidelines. I readily agreed and asked him to write a descriptive picture of the College, which could provide enough knowledge about this unique institution to the reader, even without a physical visit, to create an impression of appreciation and project its main features of being an asset to the future of the Armed Forces. Since this article is in Urdu and possesses some literary technical aspects, I cannot do full justice with a commentary in English. I have decided to write an appreciation in Urdu so that every one may enjoy and appreciate the late praf's in that early age. However my physical condition is such that I may not be able to do it in time. If that happens, I request and hope that I will be forgiven.

With the sad demise of Prof Saeed Rashid, memory recalls many faces who emerge clearly on the screen of imagination, shedding the dust of the past. May God bless

transferred".

The C-in-C had given me a free hand in dealing with the staff and students. I wrote a paper insisting on the need of professional instructors with the temperamental qualities of a teacher, recommending to recruit qualified civilian teachers so that the teaching methods had continuity. Knowing fully well that such a scheme would be unpopular among the staff; I chose the summer vacation for implementation.

In early 1950, the late Mr Rashid was interviewed. One could hardly miss the glint of intelligence in the eyes behind the thick glasses of this frail looking individual. He was selected and sent for medical examination, but was rejected because of his weak eyesight with - 10 and -9 numbers.

I had to attend an important meeting of the Punjab University Academic Council. I had instructed that after the medical tests, the papers should be sent to GHQ immediately so that the vacancies could be filled, which the Chief Instructor Capt AH Ibrahim did. The next morning when I was told about Mr. Rashid's rejection, I showed my anguish at the tragedy. The Chief Instructor and some others were not in favour of inducting a physically unfit person. I called Mr. Rashid and asked him if he wanted to adopt this noble profession permanently or just as a stepping stone. On his assurance I asked him to hang about in the College until my return. I rushed to GHQ and brought back the medical board proceedings. Lt Col (later Lt Gen) M Ayub had kindly agreed to declare him fit for the purely civilian job of a teacher.

I have given the rather monotonous description of his selection to highlight his perseverance and tenacious quality

cause(s) of life which he actually lived in day to day activity.

As a teacher he was a great Role model.Keenly conscious of teacher's critical role in nation building and hence towards the grooming of an individual student his efforts were always student centred.He attended to all dimensions of education i.e. academic , intellectual, social and moral in order to nurture wholesome, balanced and virtuous personalities.

The idea of Pakistan as envisioned by the founding fathers was close to his heart. Thus in guiding and moulding his students, concept of nation-hood, Pakistaniat, regard for the national interest, always attracted his studied focus.

As for classroom teaching, whatever the topic he almost always related the lesson to the bigger perspective thereby expanding the horizon of students' mind. In the process he engineered enabling environment , raising the level of curiosity and facilitating further study and discussion.

In a full time residential institution like MCJ, handling of students in their teens is a constant challenge. At occasions, many a good teacher get frustrated or worked up.Professor Rashid never lost his calm and dignified disposition.Indeed he was an epitome of moral authority.

He authored about two dozen books, which are all related to character building, education and development of intellect.Besides other phenomenal contributions these books truly reflect his legacy.

Such are my leading thoughts at the time of his adieu to this transitory world.Some wiseman aptly said that a teacher's influence extends to eternity.While everyone employed in the

them!

For his students I will quote a stanza of my own poem "Farewell" written on the departure, at retirement, of my Prof Mr LRM Brenda, a Scot who taught English for a long time.

"O teacher and friend
With a genial face you e'er met
To remember you have always taught
Now teach me how to forget"

As for myself, I will close this article with Dante's words:
"A green memory is a gift of God"

"GREAT TEACHERS NEVER DIE"

Brig (Retd) Maqsud ul Hassan

I am among those fortunate Alamgirians who have had the honour of having an extended association with Professor Saeed Rashid.Spread over four decades, my earliest exposure to him was in 1957 as a class 6th student.Over the long haul,it culminated into a rich relationship in the last decade of his life when he lived in Rawalpindi and I was serving my innings as the commandant M.C.J.(1991- 98). Indeed it is an uphill task to sum-up Professor Saeed Rashid' s life in a few short paragraphs.Some of the leading strands of his brilliant life may be capsuled as under:

Professor Saeed Rashid lived a value and virtue inspired life.He was moved by the higher purpose (s) and the great

the stage and asked him all these things in an interview format, he then took over and spoke on the specific topic,

This little incident took place in Peshawar in early 1996, where I was on a visit along with Uncle Saeed Rashid. Now when I look back and think about it, I realize that he provided me not only with a learning opportunity but also a unique experience that will never happen again in my life. That day marked my first lesson from him and even though physically he is not here for me anymore, I am still learning from him. The process has not ended but it has surely changed its shape. Previously I had the luxury to always give him a call and ask him to explain the riddles of life, but now I have to struggle with them myself. But I strongly feel that he still helps me. Interestingly enough, in the past two months, I have found myself thinking "How might he have reacted to or what advice would he have given me if I had discussed such and such matters with him".

Although I am his daughter-in-law, his behaviour towards me was different from what most fathers-in-law and daughters-in-law share in our society. I spent about six months with him before I came to the United States in 1996, and I must say that I will treasure those six months for the rest of my life. His busy schedule is known to all those who have seen him, and in fact, he admitted that he didn't spend much time with his own family. However, I always had this feeling that he was there for me if I needed him. Although after coming to the US I only talked to him once a week, he knew well how to use fifteen or twenty minutes to transfer bits and pieces of knowledge. Often he used to tell me about his

profession of classroom instruction may not deserve this dictum, Professor Saeed Rashid comfortatbly sits in this elite class.It is, thus, that a great teacher like him never dies.

His patient and steadfast handling of afairs earned him deap respect of students. Indead he exercised great moral authority over his students.

AJEEB MANOOS AJNABI THA, MUJHAY TOU HAIRAN KAR GIA WHO"

Neelam Masood Rashid

It was around five in the morning, when I heard a knock at the door. I got up and opened the door, and found Uncle standing there with a piece of paper in his hand. He looked at me and while handing over the paper to me, he said, " I have prepared a little interview for you, take a look at it, we will do it this afternoon at the beginning of my lecture. '' The next moment, he was gone. When I looked at the paper, I found an interview that consisted of his biographical information, and I was the interviewer.

Here I was, his daughter - in- law he knew little about. He certainly did not know whether I had ever spoken publicly before, and yet he knew that I could do it. That was his quality, knowing people and what they are capable of. This expressed his uniqueness. It made the lecture very interesting, instead of plainly stating information such as, "where was he born and raised, who were his teachers and which institutions had he been affiliated with," I called him on

will keep on affecting people positively, like he did with my porfassor. All of us will keep him alive by continuing from where he left, and that was his goal all along, to teach us how to keep on lighting candles, one from the other.

I THANK YOU 'ABBA' I THANK YOU SO MUCH

Dr Humera Azeem

So many days have passed, but it seems only yesterday that my elder sister told me that 'Abba' was not feeling well, and she would take him to the hospital for check-up. We were surprised when he was admitted for detailed examination and check-up. Once in the hospital, his condition deteriorated rapidly. He was a known case of cancer of prostate. He was being followed up regularly and all his tests were normal. There was nothing to worry, but in the hospital he developed complete renal shut down. We were shocked to know that the cancer had slowly and very quietly involved both his kidneys. There was no cure at that stage. The doctors were as helpless as we were. The doctors were doing their best to make his life as comfortable as possible but it was hoping against hope. At times he would open his eyes, try to say someting, write something but his efforts were in vain. He wanted to complete his books on Hakim Muhammad Saeed and Sir Syed Ahmed Khan. He had undertaken an arduous job, he wanted to do so much in life for others but alas! as he had said a few weeks earlier to my sister, Attia:

”بیٹے! لگتا ہے، زندگی کی شام ہوگئی ہے۔“

current work, the things that he was writing at that time, or some new thought provoking sentence that just dawned on him that morning. He always showed keen interest in my activities. I will not be wrong if I say that he was happy for my achievements more than anyone else in this world. He knew how to love unconditionally and give without expecting any return whatsoever.His message was always powerful enough to make everyone react in the same manner. It was as if you could not do anything but love and respect him. He touched an immense number of lives, and hundreds of people are his living achievements, but the journey he began has not finished yet.

Two days after I came back from Pakistan after his death this summer, I met one of my Professors at the University who had known me well for the past three years. She asked me about Uncle and I told her what had happened, and suddenly I found myself talking to her about Uncle, his life and his works.

After I came back from her office, in about fifteen minutes, I received an e-mail from her with a subject, "Thank you." Surprised, I opened it. It read: I so appreciated your visit this morning, just as your father-in- law touched many lives during his life, he touched mine this morning through you. I had been feeling rather weary of my responsibilities … but your reflections on his life and kind spirit lifted me up … my energy and belief that things will work out despite life's frustrations."

And at that moment my heart said, " Though according to all the laws of nature he is dead, yet he will live forever and

after food. These small things, I don't remember he ever taught us formally, but unconsciously these have become a part of ourselves, gone into our bones and blood.

'Abba' could never think bad about anybody, he always thought good about others. He was always hopeful about others. We would, at times, lose patience,but never would he.

Military College Jhelum was his first love. He was always proud to be associated with such a great institution. I remember, when he was in Military College, he would spend a lot of time in Sher Shah House, grooming the new entrants. Many times, we would have a small tea-party in the evening in our home. It was to celebrate the birthday of some boy in the House. 'Abba' would often give him a small present on his birthday. No wondert, his old students remember him so fondly. 'Abba' gave love to everybody; in return he got much, much more.

When 'Abba' was admitted in ITC in CMH during his last days, he needed one pint of blood. One of his old students, commanding an engineers unit in Rawalpindi, visited the CMH. When he found that 'Abba' needed blood, he offered his own blood (though he had 700 people under his command, and he could have sent anybody from his unit) saying that he would not allow anyone else to steal from him the pleasure of donating blood for his beloved Rashid sahib. This is just one of many many instances of love, affection and respect showered by his old students, colleagues, friends and well-wishers. It brings tears into my eyes when I think of it. He was not just my father, he was everybody's 'Abba'.

I often wonder what was so special about Abba, he was

'Abba' left us on 19 June 1999. it's all like a dream, a nightmare, I would say. How could 'Abba' die, I cannot believe it. I don't want to believe it. But it is true. Throughout his life, he had so much love for everybody; he wanted to do good to everybody irrespective of age, sex and finacial status. He was باعثِ خیرِ کثیر for everybody.

When I went for Haj in 1997, I asked ' Abba' what should I bring for him from Saudi Arabia and he said, بیٹے! تم میری زندگی کی دعا کرنا، خدا مجھے زندگی دے، صحت کے ساتھ اور صحت ہو تو کارِ خیر کرتا رہوں' Since that time, it had become my first 'dua' after prayers ''یا اللہ تو ابا کو زندگی اور صحت دے کارِ خیر کے ساتھ'' When he was unable to do کارِ خیر God Almithy called my beloved father back.

There is so much to write, memories, memories and memories. When I think about my childhood, I don't remember anything except flowers, laughter and love. I wish my children could have my childhood. We had just a lovely, wonderful and memorable childhood. Ours was family knit with love and affection. I remember 'Ammi" and 'Abba' going out for long walks after evening tea and after dinner, occasionally we would also join them. Daily after tea and sometimes at night, we all would sit around the table and 'Abba' would talk in his soft, gentle and convincing manner, with a smile on his face. We would listen to him for hours; time would just fly away. He never gave us sermons, yet he taught us to respect elders, to be polite, kind and helpful to others. He taught us to say ''شکریہ، شکر الحمد اللہ، السلام علیکم, to open doors for elders, offer them chairs, and not to laugh too loudly. He was particular enough to teach us how to mix sugar in a cup without spilling tea, how to push the chair back in its place

noting but joy and happiness.

"I am grateful to you both for giving me such a wonderful past.

Thank you 'Abba' for making me a better human being.

Thank you 'Abba' for helping me do a little good to everybody.

Thank you 'Abba' for making, what I am, which without your help and guidance would not have been possible. Please forgive me, when I falterr and I don't come up to your expectations.

Thank you 'Abba' thank you so much,

I'll miss you so much.

May Almighty Allah shower His blessings on you in the heaven!

Professor Saeed Rashid

(DR. NAEEM GHANI)
Chairman, Sultana Foundation
Islamabad

No words would ever describe Prof. Saeed Rashid's urge, optimism and Faith to discover beauty of human life.

His writings possess a rare distinctive flavour, experience of aches and simultaneously peace in his heart. His thoughts flow like a continuous spring at a steady speed and search vocabulary to be expressed.

When reader strolls over Prof. Rashid's writings, he feels making a walk in a quite wood which sooths his spirit and other times opens up new avenues of thoughts.

a teacher par excellence, no doubt about it; but it is not a quality enough that his students remember him so fondly. He touched innumerable lives and changed them forever. His gentle smile, twinkle in his eyes, his encouraging words and the soft and reasuring touch in his eyes, his encouraging words and the soft and reasuring touch of his hands. He was a person who believed in

مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

'Abba' led a very disciplined life. He was always punctual. He was never late for his classes. He would waste, not a single second. In my whole life, I never saw 'Abba' resting in his bed except at night. He was so active and energetic. Always up and doing. He kept this routine till the very end. He went to his office, even one day prior to his admission in the hospital. He was very meticulous about his dress. He wore white in summers and black suit in winters. his clothes were always spotless, shoes shining. The buttons of his shirt were always buttoned to the top. His clothes, even at home, were always pressed, he never wore shabby clothes at home. I never, ever remember him preaching us the etiquette and manners, but somehow or the other, he himself was a perfect role model for us. We never heard him speak aloud or in a harsh tone to anybody. He said that everybody had self-respect. He used to address everybody as "Aap". He said that even a person doing a menial job, who is honest and sincere in his work, is contributing his share and has to be acknowledged. He taught us, never to expect life giving its best to us, when we don't give our very best to life. He taught us so many things which none else could have done. I can think of nothing but love and harmony in our home when 'Ammi' was alive. Both 'Ammi' and 'Abba' together gave us

With simplicity of his style he immediately brings message to the inner core of the reader. He was a teacher who brought out springs of his own heart which descended into hearts of his students. It was not a tongue to ear relation, it was a heart to heart equation.

Opening of brains is normally considered purpose of education but here was a Professor who did not restrict himself to this but opened hearts and changed the perception of his students. This could only happen when teacher's heart is pure and full of conviction, which can open the heart of recipient and give birth to a new person and a new world around him.

Prof. Saeed Rashid's talks and writings, one could easily summarize "From heart it sprang and into heart it penetrated".

He was a rare person with qualities of humanity and humanness dominating his life.

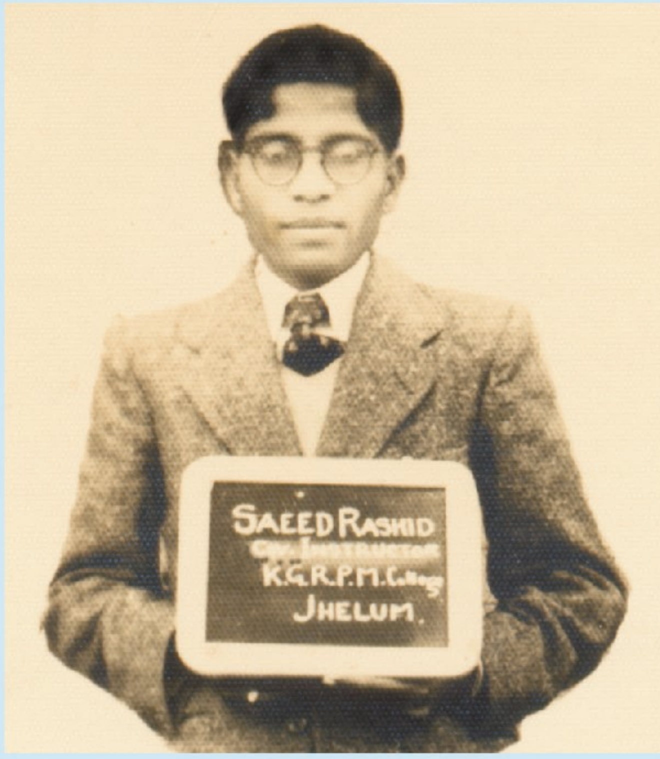
He was a rare educationist whose vision was moulded by societal knowledge.

He was a rare teacher who became a role model for his students.

He was a rare leader who knew how to be a perfect team member also.

He was a rare individual who had creative mind and compassionate heart.

Candles he lit in minds and hearts of so many near and far from him will continue to enlighten and enrich their lives.



ملٹری کالج جہلم کے اولین دنوں کی یادگار تصویر



ماضی کے جھروکوں سے ایک جھلک



ایک ہونہار طالب علم



بیتے ہوئے لمحوں کی ایک یادگار تصویر



ایک باصلاحیت نوجوان



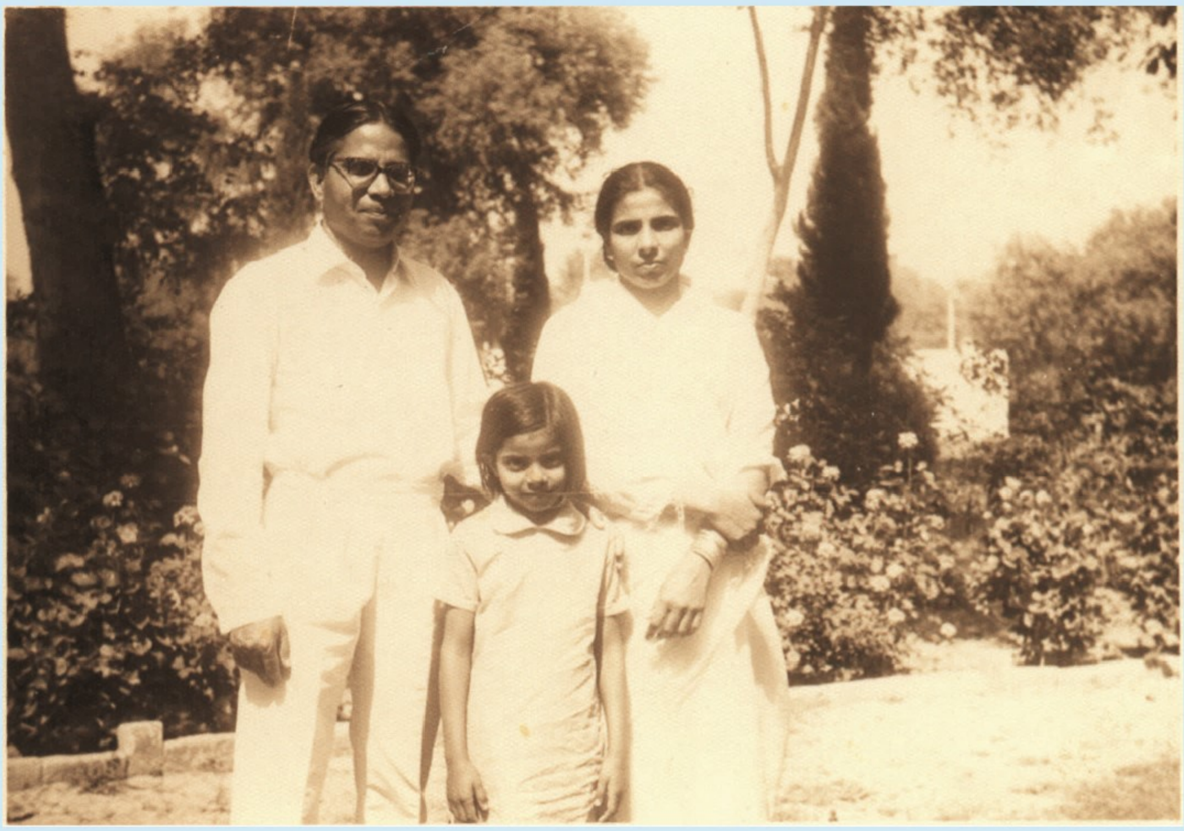
ایک معلم ایک مربی



زمانہ طالب علمی اپنے دوست کے ہمراہ



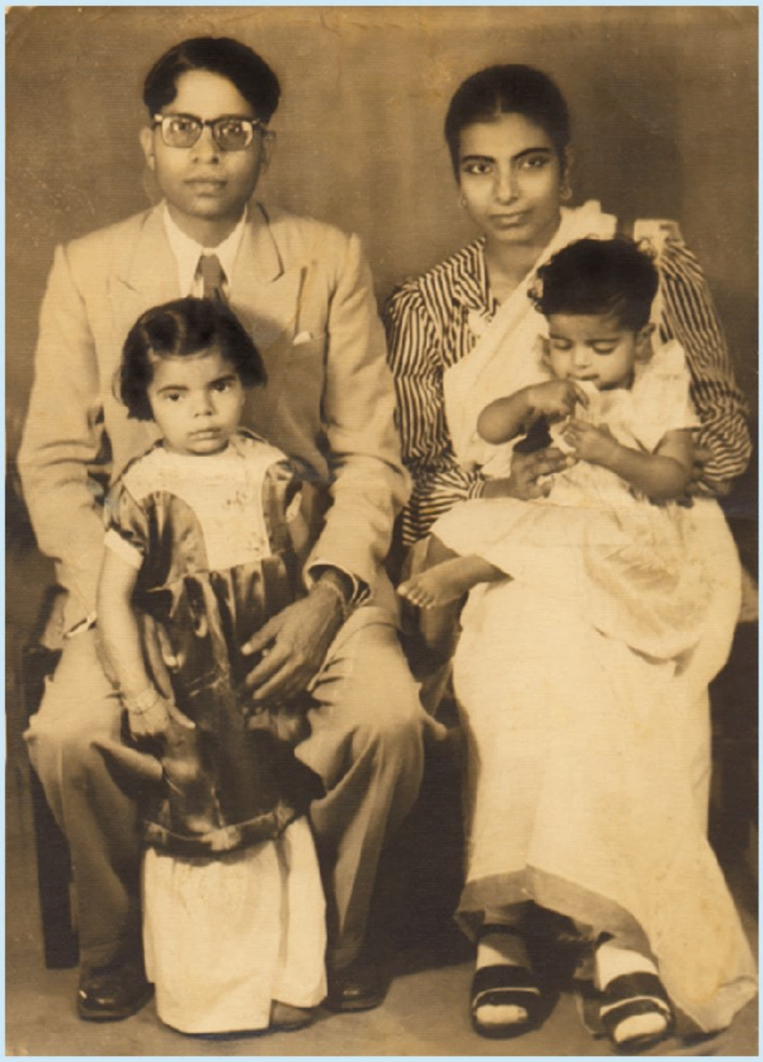
ملٹری کالج کے فطری نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے



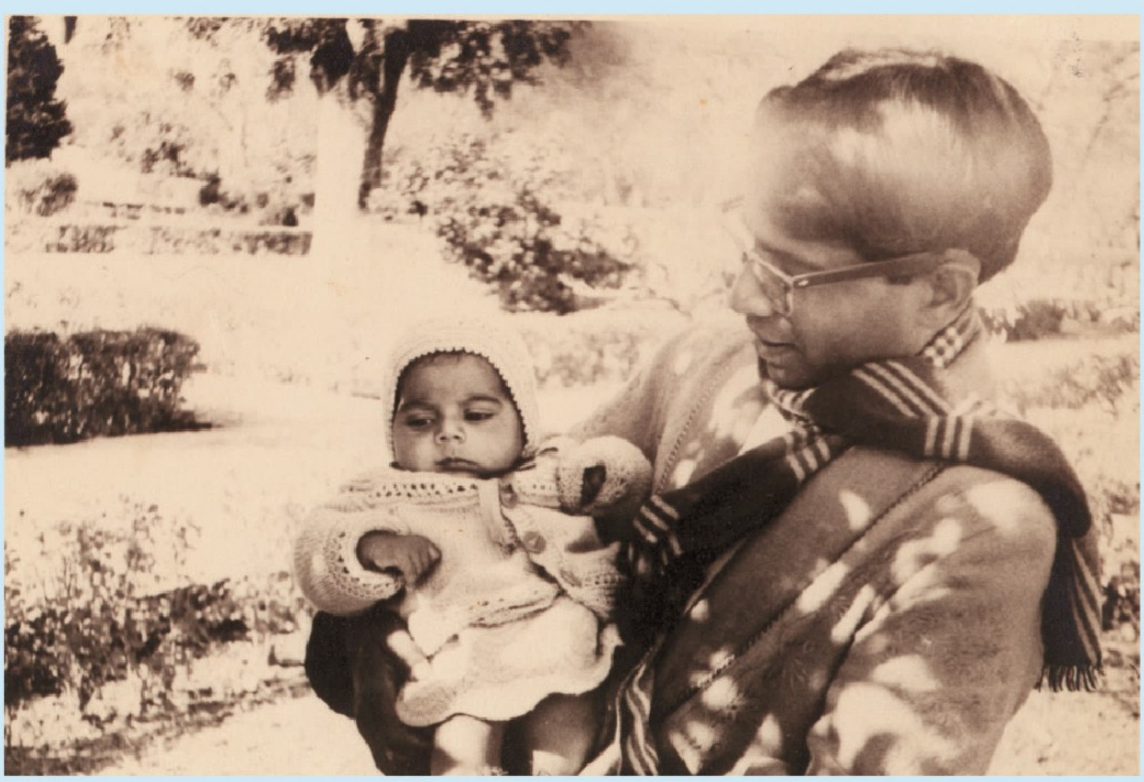
پروفیسر سعید راشد اپنی بیگم اور بیٹی کے ہمراہ



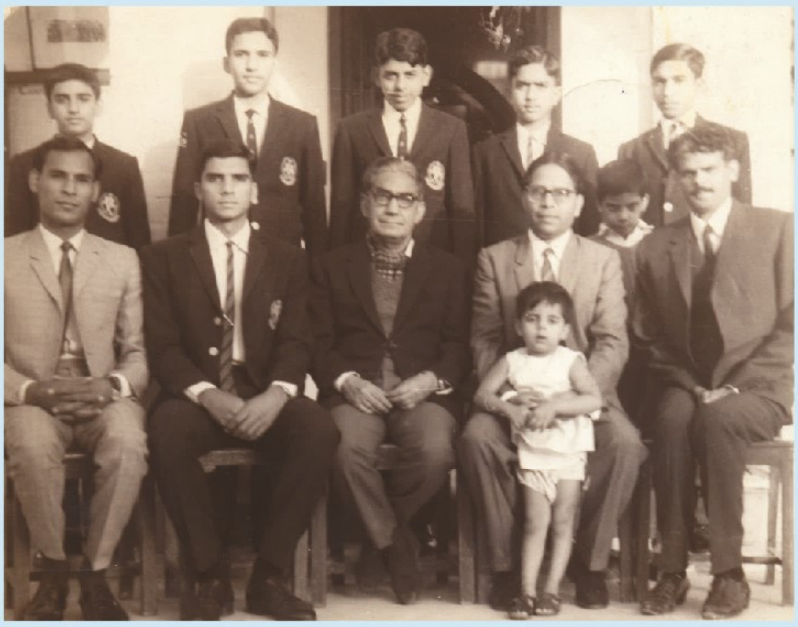
اپنی اہلیہ کے ہمراہ



اپنی اہلیہ اور بچوں کے ہمراہ ایک یادگار تصویر



شفقت پدری کا ایک عکس



پروفیسر سعید راشد طالب علموں اور اساتذہ کے ہمراہ۔ پروفیسر عین الدین علوی اور لیفٹیننٹ کرنل منظور ظفر بھی نمایاں ہیں



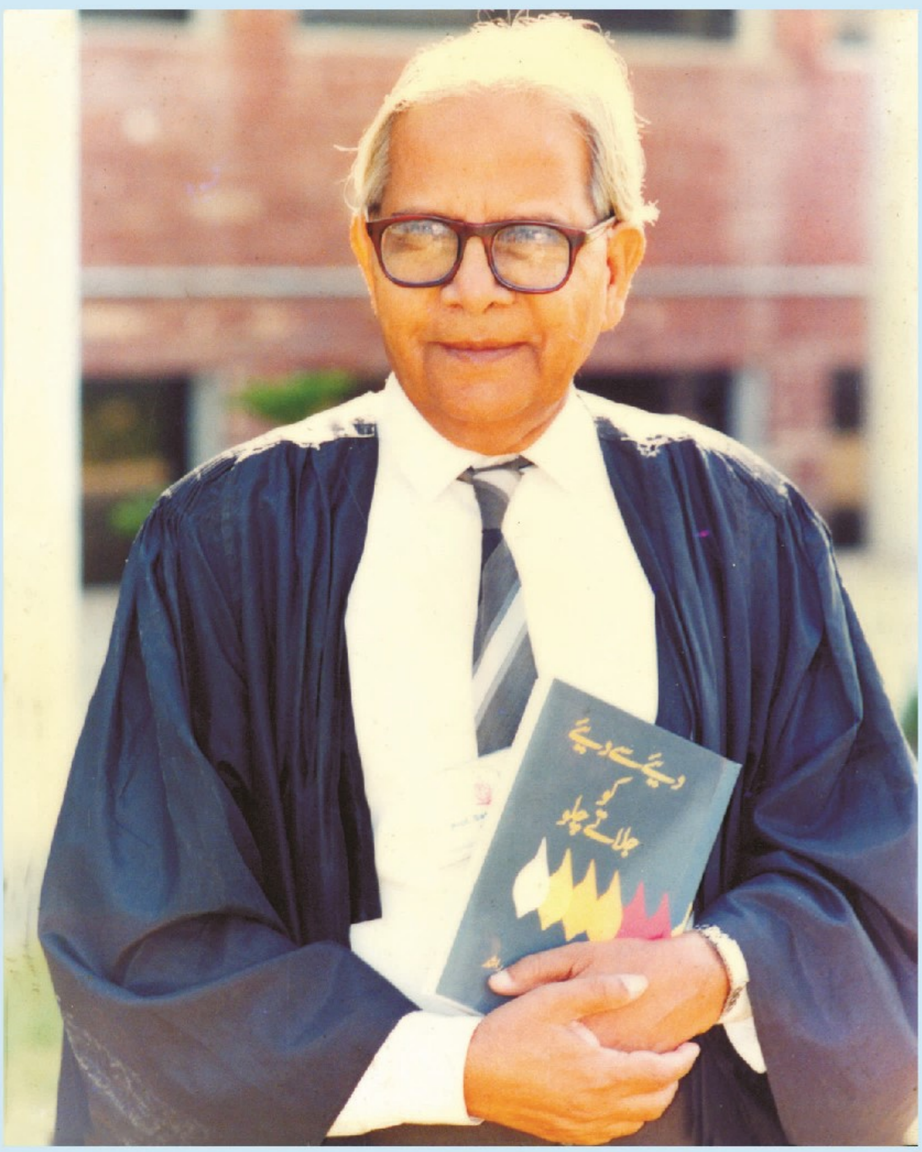
پروفیسر سعید راشد ملٹری کالج جہلم میں اپنے ساتھی افسران کے ہمراہ



ری یونین کے موقع پر عالمگیر ینز کے ہمراہ



پروفیسر سعید راشد بطور پرنسپل آرمی پبلک سکول منگلا اپنے دفتر میں



ایک پراعتماد شخصیت، ایک لاجواب معلم



پروفیسر سعید راشد شیروانی اور جناح کیپ زیب تن کیے ہوئے



شیر شاہ ہاؤس میں واقع اپنے دفتر میں تحریر و تحقیق میں مصروف عمل



مہمانوں کے ساتھ کالج کے دورے کے دوران



پروفیسر سعید راشد اپنے بیٹے آصف سعید راشد کے ہمراہ شیر شاہ ہاؤس کے پھولوں بھرے لان میں



ملٹری کالج کے کیڈٹس کے ہمراہ ایک یادگار تصویر



ایک تقریب میں اس وقت کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر مقصود الحسن کے ہمراہ



سالانہ تقریب تقسیم انعامات کے موقع پر پروفیسر سعید راشد اور ملٹری کالج کے دیگر سٹاف کا

اس وقت کے ایڈیجوٹینٹ جنرل پاکستان آرمی میجر جنرل شاہد حامد کے ہمراہ گروپ فوٹو.1958



ایک منفرد انداز میں



طالب علموں کو منفرد انداز میں لیکچر دیتے ہوئے



پروفیسر سعید راشد ایک تقریب میں صدارتی خطاب فرماتے ہوئے



وزیراعظم جونیجو سے مصافحہ کرتے ہوئے، پروفیسر عین الدین علوی بھی ہمراہ ہیں



ملٹری کالج میں وزیراعظم نواز شریف کی آمد کے موقع پر دیگر سٹاف کے ہمراہ ایستادہ



جنرل کے۔ایم عارف (اس وقت کے وائس چیف آف آرمی سٹاف) سے سونیئر وصول کرتے ہوئے



اپنے شاگرد چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل عبدالعزیز سے سونیئر وصول کرتے ہوئے

اس کے ساتھ ان کے دوسرے شاگرد عزیز کمانڈنٹ ملٹری کالج بریگیڈیئر مقصود الحسن کھڑے ہیں



جنرل محمد اقبال خان کی یاد میں منعقدہ تقریب کے موقع پر دیگر مہمانانِ گرامی کے ساتھ



ایک طالب علم کو انعام سے نوازتے ہوئے



موسیٰ ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں



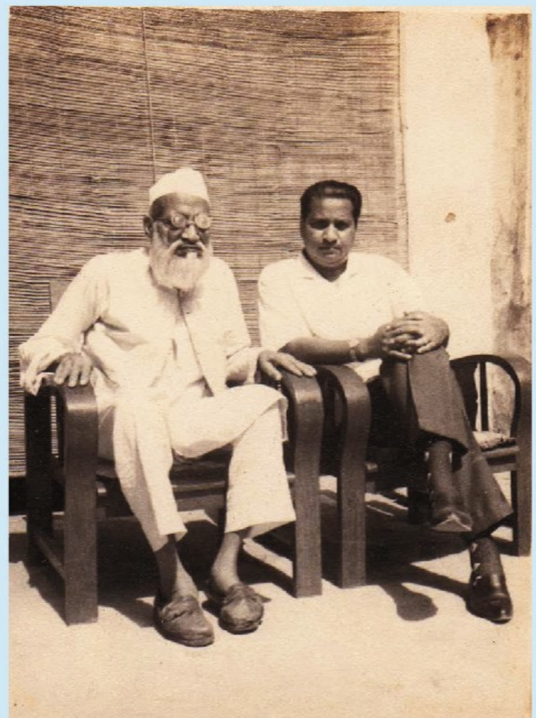
ملٹری کالج کے اس وقت کے پرنسپل کرنل ظہور الحق کے ہمراہ افتتاحیہ تقریب کے موقع پر



ملٹری کالج جہلم میں پروفیسر سعید راشد بلاک کے افتتاح کا ایک منظر



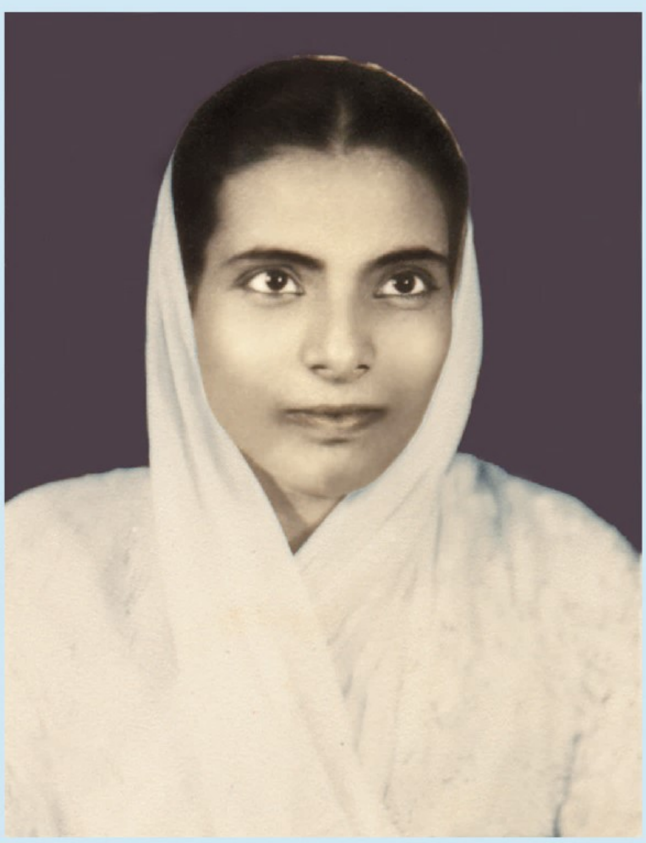
ایک پراعتماد شخصیت



پروفیسر سعید راشد کے والد محترم اور انکے ایک عزیز



پروفیسر سعید راشد کی والدہ محترمہ رحمت بی



آنٹی روحی (مسز پروفیسر سعید راشد)

آدمی سے انسان کی طرف اور معلومات سے علم کی طرف سفر ہی میرا مشن ہے

سکالر، ماہر تعلیم اور سینکڑوں کتابوں کے خالق

پروفیسر محمد سعید راشد سے ملاقات

انٹرویو: یوسف عالمگیرین



یوسف عالمگیرین، پروفیسر سعید راشد سے انٹرویو کرتے ہوئے، ایک یادگار تصویر



یوسف عالمگیرین، پروفیسر سعید راشد سے انٹرویو کرتے ہوئے، ایک یادگار تصویر

اپنے حصّے کا دیا

چینی
معلم اخلاق
کنفیوشس
نے کہا
بہتر ہے
مٹی کا
ایک چھوٹا سا
دیا
جلا دینا
اندھیرے کو
مسلسل
برا کہتے رہنے سے

بہتر ہے
گھپ اندھیرے
میں
سر راہ
ایک چھوٹی سی
موہوم
جلا دینا

کسی
سورج کا
انتظار
کرتے رہنے سے
کسی اجنبی
مشعل بردار
جلوس کی
راہ
تکتے رہنے سے

خود غرضیوں کی
ڈسی ہوئی
ارضِ وطن کی
ہر اندھیری راہ
پر
تاریک گلی
اپنے سر سے
اپنے لہو کا
انتظار
کر رہی ہے

ارضِ پاکستان کی
ہر شب گزیدہ
بستی
سے
ایک دردناک
صدا
آ رہی ہے
میرے بیٹو!
میری بیٹیو!
کہاں ہو
کہاں ہو
دیا جلاؤ
دیا جلاؤ
اپنے حصے
کا
اپنے حصے
کا

پروفیسر سعید راشد